امام زہری و امام طبری
تصویر کا دوسرا رُخ
محدث العصر جامع العلوم
حضرت علامہ تمنا عمادی
اور
دیگر علمائے کرام
الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

امام زہری و امام طبری

حدیث و سیرت کے مدوّن اوّل

تفسیر و تاریخ کے مدوّن اوّل

تصویر کا دوسرا رُخ

از

محدّث العصر جامع العلوم
حضرت علامہ تمنّا عمادی
اور
دیگر علمائے کرام

ناشر
الرّحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
۳-۷-اے بلاک نمبر ۱-ناظم آباد-کراچی ۷۴۶۰۰
فون نمبر ۶۲۱۴۴۹

نام کتاب ـــــــــــــ امام زہری حدیث وسیرت کے مدون اول
وامام طبری تفسیر و تاریخ کے مدون اول
تصویر کا دوسرا رخ
مؤلف ـــــــــــــ علامہ تمنا عمادی مجیبی رح
صفحات ـــــــــــــ ۴۶۴

قیمت کتاب ـــــــــــــ پچاسی روپیہ صرف (۸۵/=)
کتابت ـــــــــــــ کمپیوٹرائزڈ
مطبع ـــــــــــــ روحانی ڈائجسٹ ۔ ناظم آباد

ناشر
الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
مکان نمبر ۳ ۔ ۷ ۔ اے ۔ بلاک نمبر ۱ ۔ ناظم آباد ـــــ کراچی ۷۴۶۰۰
فون، ۶۲۱۴۳۹ ــ ۶۲۷۸۴۰

فہرست عنوانات

ـــ حصہ اول ـــ
روایات حدیث و سیرت کے مدون اول
ـــ محمد ابن شہاب زہری ـــ

از علامہ تمنا عمادی

حرف اول

ابن شہاب زہری اور ابن جریر طبری اسلامی تاریخ کی دو عظیم شخصیات میں شمار کی جاتی ہیں ۔ ان کا رعب و داب روایت حدیث اور تاریخ و تفسیر میں علی الترتیب مسلمات کا درجہ رکھتا ہے یہی ہم اپنی زندگی کے ابتدائی ایام سے سنتے چلے آرہے تھے متاخرین نے بھی ان کی آراء سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کی بھاری بھرکم شخصیات کے سامنے سر تسلیم خم کرتے چلے آرہے ہیں ۔ ہم ان کو اہل سنت کے مشاہیر میں تصور کرتے رہے ہیں لیکن کچھ عرصہ قبل اس سلسلہ میں چند متضاد آراء سے بھی سابقہ پڑا تو پھر تلاش ہوئی کہ ذرا گہرائی میں جاکر ان دو حضرات کے متعلق صحیح پوزیشن معلوم کی جائے ۔ تلاش بسیار کے بعد معلوم ہوا کہ اردو میں کوئی بھی کتاب ان دو حضرات کے کارناموں پر محیط اب تک زیور طبع سے آراستہ ہو کر نہیں آئی ۔ بہر حال جب ان علمائے کرام اور محققین کے مضامین نظر سے گذرے تو معلوم ہوا کہ ان ہر دو پراسرار شخصیات کی پراسراریت میں بڑی گہرائی و گیرائی ہے اور آسانی سے کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہے ۔ اسی کاوش کے نتیجے میں یہ کتاب ترتیب کے مراحل سے گزری اور تصویر کا دوسرا رخ دکھانے میں ہم کتنے کامیاب ہوتے ہیں ، یہ قارئین فیصلہ کریں ۔

ابن شہاب زہری کو پہلا جامع حدیث و روایت شمار کیا جاتا ہے وہ بخاری کے بھی راوی ہیں اور بہت سی احادیث ان سے مروی ہیں جو بخاری میں موجود ہیں ان کی مرسلات بہت مشہور ہیں ۔ سرسری ورق گردانی سے تو کسی نتیجہ پر پہونچنا دشوار ہوتا ہے اس لئے جب اس مجموعہ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ جتنے اختلافی مسائل ہیں ان سب میں زہری ہی نظر آرہے ہیں۔ ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جس میں موضوع احادیث کی بھرمار تھی خاص خاص مقاصد کے لئے احادیث وضع کی جاتی تھیں اور ان کو تشہیر کے مراکز پر پہونچا دیا جاتا تھا جہاں سے وہ پورے عالم اسلام میں گردش کرتی تھیں ۔ ان مقاصد میں خود قرآن پر حملے شامل تھے ۔ جمع و تدوین قرآن ، اختلاف قرأت اور ناسخ و منسوخ کی طبع زاد روایتیں انہیں ابن شہاب زہری سے منسوب ہیں پھر ورقہ بن نوفل کی آغاز وحی والی روایت جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ہی مشکوک کرنے کی ایک بھرپور کوشش کی گئی تھی ۔

ان کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو داغ دار کرنے کے لئے روایت افک کی افسانہ طرازی، سقیفہ بنی ساعدہ اور میراث نبیؐ کے واقعہ میں رنگ امیزی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت فاطمہؓ کے فرضی اختلاف کی تشہیر. حضرت علیؓ کا بیعت ابو بکرؓ میں تخلف وغیرہ وغیرہ چند واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ زہری غالی محب آل علیؓ تھے اور چھپے ہوئے شیعہ تھے۔ خود شیعوں کی معتبر بنیادی کتابوں میں انہیں شیعہ ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

اسی طرح ابن جریر طبری کی تاریخ و تفسیر پر بھی اہلسنت حضرات کا بڑا اعتماد رہا ہے۔ حتیٰ کے موجودہ دور کے ایک عالم، مصنف، مفسر اور ایک تحریک کے بانی نے تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ اگر ان حضرات کی تاریخی روایات پر اعتبار نہ کیا جائے تو پھر اسلامی تاریخ میں رہ ہی کیا جاتا ہے کیونکہ ۹۰ فیصد تاریخی واقعات تو انہیں کی کتابوں میں ملتے ہیں (حالانکہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں اگر ان روایات کو پرکھ لیا جائے تو کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ تاریخ کے لئے تو قرآن کریم سے زیادہ معتبر مواد کہاں سے مل سکتا ہے) پھر طبری کو شیعیت کے الزام سے نکالنے کے لئے دو دو تین تین طبری روشناس کرانے گئے جو مغالطہ دینے کی ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی۔

ابن جریر طبری کی تاریخ و تفسیر کے ایک سرسری مطالعہ سے ہی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ طبری شیعہ تھے انہوں نے ان کتابوں میں واقعات کو شیعی تناظر میں پیش کیا ہے اور اہل سنت کے مطمع نظر کو مسخ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے جس کے ذریعہ اسلام کی عظیم الشان شخصیات کے دامن داغدار ہوئے ہیں۔

یہ تھا ایک مختصر سا تعارف اس کتاب کا۔ آپ اس میں اور بہت کچھ پائینگے جو آپ کو اس نتیجہ پر پہونچنے میں ممدو معاون ہوگا۔ کہ ان حضرات کا تحریف قرآن کریم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، ازواج مطاہرات کی عفت اور صحابہ کرامؓ کے کردار کو داغدار کرنے میں کتنا حصہ رہا ہے۔ اور دشمنان اسلام کو اسلام پر حرف زنی کا کتنا موقعہ فراہم کررہا ہے۔

میں اپنی ان گذارشات کو مفتی محمد طاہر مکی صاحب کے بقول اس تبصرہ پر ختم کرتا ہوں کہ ابن جریر طبری نے تو اپنی تاریخ کے مقدمہ میں ہی یہ کہہ کر اپنی برئیت پیش

بسم اللہ الرحمان الرحیم

تقدیم

مفتی محمد طاہر مکی

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے :-

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے؟
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت سے اس قسم کے بعض تجربات عہد جدید کے مسلمانوں کو بھی ہوئے ہیں ، اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :

اس میں کیا شک ہے کہ مذہبی طور پر مسلمانوں کے لئے مایہ افتخار دو چیزیں ہیں۔ شخصیت کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کی سیرت طیبہ اور دستور و آئین کے اعتبار سے قرآن محفوظ جس کے نہ آگے سے باطل آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ (۴۱ - ۴۲)

ان دو چیزوں کی اسی اہمیت کی بنا پر دشمنان اسلام نے اپنے باقی حربوں میں ناکام ہو کر اور مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے علاقوں کو مفتوح کرنے کے بعد بھی بے اطمینانی محسوس کر کے ، اپنی تمام توجہات کا مرکز اور اپنے تمام حملوں کا ہدف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر انگشت نمائی کرنا اور اسلام کی مقدس الہامی کتاب قرآن محفوظ کو غیر محفوظ ثابت کرنا قرار دیا ۔ اپنے اس کام میں انھوں نے مسلمانوں کے تمام کمزور پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ، اور ان کی تاریخی و حدیثی روایات ، ان کے فرقوں کے باہم اختلافات وغیرہ سب کو استعمال کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان دشمنان اسلام کا جواب دینے کے لئے سیرت رسول اللہ کے محاذ پر علی گڑھ کے سرسید احمد خان کو کھڑا کیا جنھوں نے خطبات احمدیہ کے ذریعے مستشرقین کے سرخیل سر ولیم میور کی لکھی ہوئی سیرت پر زہریلی کتاب کا جواب دیا اور حفاظت قرآن کے محاذ پر مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء کو کھڑا کیا جنھوں نے جمع و تدوین قرآن کے متعلق دشمن کے حملوں کو روکنے کے لئے خود بھی کام کیا (جیسا کہ ان کے مطبوعہ مکاتیب کے پہلے مکتوب سے واضح ہے)، اور خاص طور پر اپنے خلیفہ حضرت مفتی عبداللطیف رحمانی سے "تاریخ القرآن" کے نام سے کتاب مرتب کروائی جس کے متعلق مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں :۔

"محترم مصنف کو اسلامی علوم پر ایسا عبور ہے کہ عالم اسلام کے علماء جدید بھی شاید نہ سمجھتے ہوں۔ اس رسالہ میں انھوں نے قرآن عزیز کی تاریخی بحث علمی عدالت عالیہ میں اس انداز سے اٹھائی ہے جس طرح ایک با صلاحیت وکیل مخالف فریق کے ناپاک ارادوں پر وار کرے اور اس کے پر فریب تخیل کے ہر پیچیدہ موڑ پر سخت گرفت کرے اور اپنے مقدمہ کی تکمیل میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔

اشتباہ رکھتی روایات کے پس پردہ جو پس منظر ہے مصنف کی اس پر گہری نظر ہے۔ اس مبحث کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا دماغ علم و دانش کا مخزن ہے۔ کتاب کے اندازِ نگارش سے یہ حکمت بھی صاف صاف نمایاں ہے کہ وہ مہینوں لگاتار اس عنوان پر لگاتار اس عنوان پر عمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ اس تمام عرصہ میں ان کی زندگی کی کوئی صبح یا شام ایسی نہیں گزری ہوگی جس پر انھوں نے اس مسئلہ کی مثبت اور منفی پہلو پر فہم و تدبر کے ساتھ نہ سوچا ہو ان کے قلم سے کاغذ پر سیاہی نہیں گرتی جو پھیلے اور بڑی جگہ گھیر لے اور ذوق سلیم پہ گرانی کا باعث بنے۔ یہاں ان کے قلم کی نوک احتیاط کا دامن تھام کر احتیاط سے صحیح صحیح واقعہ نگاری کرتی ہے۔ کیونکہ مصنف نے عنوانات اہم مقرر کئے ہیں جن سے یہ امر بخوبی روشن ہوگیا ہے کہ وہ روشن دماغ ہی نہیں روشن ضمیر بھی ہیں، لہٰذا

ضرب وہیں لگاتے ہیں جہاں تشبیب ہے۔

بہرحال اس رسالہ میں جو حوالجات ہیں وہ سب مستند کتابوں کے ہیں۔ ہر موضوع کے تحت کارآمد مگر اختصار کے ساتھ تقریباً سب ہی سمیٹ لئے ہیں اور کوئی بات غیر ضروری نہیں۔ ایک ایک سطر شہادت دے رہی ہے کہ جو کچھ پیش کیا گیا ہے ایماندارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔"[1]

مفتی صاحب کی اسی کتاب سے متعلق امام اہلسنت مولانا عبد الشکور لکھنوی تحریر فرماتے ہیں:-

"عام طور پر یہ خیال لوگوں میں شہرت پاچکا ہے اور بعض روایات کے ظاہری الفاظ سے بھی ایسا وہم ہوتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں قرآن شریف مجموع و مرتب نہ تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں یہ کام ہوا مگر پھر بھی اس کی اشاعت نہیں ہوئی اور حضرت عمرؓ کو بھی اپنے زمانۂ خلافت میں اس کی اشاعت کا موقع نہ ملا، حضرت عثمانؓ نے ۲۵ھ میں رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پندرہ برس بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جمع کئے ہوئے قرآن کی نقلیں کرا کر تمام ممالک اسلامیہ میں شائع کیں۔ پہلے اس حقیر راقم سطور کا خیال بھی تقلیدی طور پر ایسا ہی تھا، چنانچہ النجم کے مناظرہ حصہ اول میں، میں نے ایسا ہی لکھا ہے، مگر اس کے بعد نورِ توفیق نے مدد کی، اور تحقیق کا دروازہ کھلا، بے شمار دلائل عقلیہ فطریہ اور براہین نقلیہ نے میرے خیال سابق کو محو کر دیا اور روزِ روشن کی طرح یہ بات ظاہر ہو گئی کہ خود رسول رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کے اہتمام سے قرآن شریف کی جمع و ترتیب کا کام نہایت کامل طریقہ سے ہو چکا تھا اور اس کی اشاعت بھی خود آپ ہی کے سامنے ہو چکی تھی جس وقت آپ نے رفیق اعلیٰ کی طرف رحلت کی تو بے شمار سینوں اور سفینوں میں پورا قرآن شریف محفوظ کر گئے

---

[1] تذکرہ یمون میں واقع لائبریری میں کتاب کا نمبر یہ ہے۔ ایکسیشن نمبر ۲۹۶۵ کال نمبر ۲۹۶ - ۱۲۰۹ اے بی جی ملاحظہ کریں صفحہ ۱۰۱ سے ۱۱۲ تک۔

تھے۔ تواتر قرآن کا سلسلہ جو آپ کے سامنے شروع ہوا، وہی سلسلہ اسی شان کے ساتھ اب تک چلا آرہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گا، پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ محققین سابقین سے بھی اس کی تصریح منقول ہے اور کوئی صحیح روایت بھی اس تحقیق کی مزاحمت نہیں کرتی۔

اس تحقیق کے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی حاجت ہے جسکو ایک حد تک میرے ایک فاضل دوست نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں پورا کیا ہے۔ (مؤلفہ مولانا مفتی عبداللطیف رحمانی) اور یہ کتاب کئی سال ہوئے چھپ گئی ہے مَنْ شَاءَ فَلْيُطَالِعْهُ اگر عنایت ایزدی نے مدد کی تو یہ ناچیز بھی عنقریب اس موضوع پر کتاب لکھے گا، واللہ وَلِیُّ التَّوْفِیق۔ (شیعہ اور قرآن المعروف تنبیہ الحائرین مؤلفہ امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی شائع کردہ المکتبۃ الاشرفیہ جامعہ اشرفیہ لاہور)

سیرت النبی اور قرآن کریم کے ان دونوں محاذوں پر کام کرنے میں سب سے اہم دشواری یہ تھی کہ دشمن نے مسلمانوں ہی کی بعض تاریخی و مذہبی روایات کو استعمال کر کے حملہ کرنے کی جسارت کی تھی، اسلئے جواب دینے والوں کو یہ نازک اور خطرناک کام بھی کرنا پڑا کہ اپنے ہاں کے ان کمزور مقامات پر غور کریں اور بصورت مجبوری اس گلے سڑے حصہ کو کاٹ کر پھینکدیں۔

یہ تھی وہ صورت حال جس کے پیش نظر جمع و تدوین قرآن کے اہم ترین راوی امام زہری پر حضرت مفتی صاحب کو قلم اٹھانا پڑا۔ ان کے بعد اس محاذ کے پر جوش اور ان تھک سپاہی علامہ تمنا عمادی مرحوم ہوئے جنھوں نے مفتی صاحب کے کام کو تکمیل تک پہونچانے کی حتی الوسع کوشش کی۔ اور اس راہ میں ہر قسم کی رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہونے جمع القرآن اور اعجاز القرآن پر اپنی تحقیقات مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ اس عنوان کے اہم ترین راوی امام زہری پر بھی کام کرتے رہے۔ موجودہ کتاب ان کی انھیں کاوشوں کو منظر عام پر لانے کے لیئے ہے۔ ان کے علاوہ اور جن جن حضرات نے اس

سلسلہ میں کام کیا ہے اسے بھی ہم نے اس کتاب میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ قارئین کرام کا افق زیادہ سے زیادہ وسیع ہو، اور کسی فیصلہ تک پہونچنے میں انھیں بہتر سے بہتر سہولت حاصل ہو سکے۔ مزید تفصیلات کے لئے حضرت مفتی صاحب کی کتاب " تاریخ القرآن " اور علامہ تمنا کی کتاب " جمع القرآن " اور " اعجاز القرآن " ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ مفتی صاحب کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن دہلی کی خانقاہ شاہ ابوالخیر کے سجادہ نشین حضرت زید ابوالحسن شاہ ازہری نے شائع کیا ہے جس کا عکسی ایڈیشن پاکستان میں پروگریسو بکس ۴۰۔بی اردو بازار لاہور نے شائع کر دیا ہے۔ علامہ تمنا کی کتابوں کے لئے ایڈیشن الرحمان پبلشنگ ٹرسٹ کراچی نے شائع کر دئے ہیں۔

-----(۲)-----

حضرت مفتی عبداللطیف رحمانی اور علامہ تمنا عمادی مرحوم جمع قرآن کی روایات کے حوالے سے امام زہری کے متعلق جن نتائج تک پہونچے تھے، کچھ دوسرے محققین امام زہری کے متعلق انہیں نتائج تک ایک دوسرے ذریعے سے پہونچے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ [illegible] سے مولانا احمد شاہ بخاری (فاضل دیوبند) نے اپنے اردگرد کے شیعہ ماحول کی وجہ سے شیعہ جارحیت کے جواب میں " تحقیق فدک " کے نام سے کتاب مرتب کی جس کے لئے خدا جانے انھیں کتنے کتب خانوں کی خاک چھاننی پڑی ہوگی۔ اسی سلسلہ میں وہ حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی کے قابل قدر کتبخانے میں بھی گئے جہاں انھیں شیعہ حدیث و رجال کی کئی کتابیں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا، وہیں ان پر انکشاف ہوا کہ امام زہری تو تقیہ باز شیعہ تھے، سنیوں میں سنی اور شیعوں میں شیعہ۔ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ انھوں نے سیالوی صاحب کو بھی اپنی تحقیقات دکھائیں وہ بھی حیران رہ گئے۔ بالآخر ان دونوں حضرات نے امام زہری کے متعلق یہ حقیقت اپنی اپنی کتاب میں درج کر کے آنے والوں کے لئے محفوظ کر دی۔

مولانا قمرالدین سیالوی: ۔ خواجہ قمرالدین سیالوی صاحب اپنی کتاب " مذہب شیعہ " میں لکھتے ہیں: (۱)

---

(۱) خواجہ صاحب پنجاب کی ایک اہم خانقاہ کے سجادہ نشین، مولانا معین الدین اجمیری کے شاگرد، اور مولانا احمد شاہ نورانی سے پہلے جمعیۃ علماء پاکستان کے صدر تھے۔ خواجہ صاحب کی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن خود انھیں کی زیر نگرانی شائع ہوا تھا۔ ہمارے پیش نظر جو ایڈیشن ہے وہ دارالکتاب ۲۴ سک نالہ فخ شیر روڈ۔ نیا مزنگ لاہور نے شائع کیا ہے۔ مندرجہ بالا عبارت اسکے صفحات ۹۳ سے ۹۵ تک

اہل السنت والجماعت پر اعتراض کرنے سے پہلے اہل سنت والجماعت کے مذہب کے متعلق واقفیت ضروری ہے۔ ذاکرین اہل تشیع جب اپنے اصول مذہب سے ناواقف ہیں تو اہل السنت والجماعت کے اصول کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ میاں!! اہل سنت والجماعت کے مذہب کا اصل الاصول یہ ہے کہ حدیث کی صحت یا ضعف، راوی کی صحت یا ضعف پر موقوف ہے۔ اگر حدیث کا راوی صحیح العقیدہ، سچا صحیح حافظہ والا ہے تو اس کی روایت کو صحیح مانا جائیگا۔ ورنہ وہ روایت ضعیف کہلائے گی۔ اب فدک والی روایت میں ایک شخص محمد بن مسلم ہے جس کو ابن شہاب زہری بھی کہتے ہیں۔ صرف یہی راوی یہ روایت کرتا ہے۔ اس کیساتھ دوسرا کوئی شاہد نہیں اور یہ ابن شہاب زہری اہل تشیع کے اصول کافی میں بیسیوں جگہ پر روایتیں کرتا نظر آتا ہے۔ اور اہل تشیع کی فروع کافی نے تو اسکی روایتوں کے بل بوتے پر کتاب کی شکل اختیار کی ہے تو بھائیو! اہل تشیع کے اس قدر مشہور اور معروف کثیر الروایت آدمی کی روایت سے اہل السنت پر الزام قائم کرنا اور ائمہ صادقین کو جھٹلانا عجیب نظر و فکر ہے۔ اگر اہل تشیع کے راویوں کی روایات اہل السنت کے لئے قابل توجہ ہوتیں۔ تو پھر بخاری ہو یا کافی کلینی اس میں کیا فرق تھا۔ آپ کی مزید تسلی کے لئے اسی محمد بن مسلم بن شہاب زہری صاحب کو کتاب منتہی المقال یا رجال بوعلی" میں شیعوں کی صف میں بے نقاب بیٹھا ہوا دکھاتے ہیں۔ دیکھو کتاب رجال بوعلی جہاں صاف لکھا ہوا ہے کہ محمد بن مسلم بن شہاب زہری شیعہ ہے تو فدک کا جھگڑا اب ختم کرو۔ ہم تو ابن شہاب زہری کو اچھا سمجھتے۔ اگر گھر کے بھیدی یہ بھید نہ کھولتے۔ اس کے باوجود بھی اس کی روایت پر غور کرتے۔ اگر کوئی ایک دوسرا بھی اس کے ساتھ مل کر شہادت دیتا۔ اہل سنت والجماعت غریب اس قدر مظلوم ہیں کہ ان کے مذہب کے خلاف اگر کوئی شیعہ اور وہ بھی اکیلا روایت کرے تو اس کو اہل سنت پر بطور الزام پیش کیا جاتا ہے۔ اور اہل تشیع اس قدر با اختیار ہیں کہ ان کی اپنی کتابوں میں ائمہ معصومین کی سند سے کوئی حدیث بیان کی جائے تو ان کو یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا کہ یہ امام اکیلے روایت کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی دوسرا شاہد نہیں لھذا یہ خبر احاد ہے۔ اور قابل اعتبار نہیں (دیکھو تلخیص الشافی جلد ۱ صفحہ ۲۱۴ مطبوعہ نجف اشرف یہ عبارت گزر چکی ہے)

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام   اور وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اب رہا یہ سوال کہ اہل سنت کی کتاب میں شیعہ صاحب نے روایت کو کیسے لکھ دیا تو

اس کے جواب میں ہمارا صرف یہ کہنا کہ ہمیں پتہ نہیں چلنے دیا۔ کافی ہو سکتا ہے۔ میاں! جب پہلے زمانہ میں نہ چھاپے خانے تھے۔ نہ کاپی رائٹ محفوظ کرائی جاتی تھیں۔ قلمی کتابیں تھیں۔ ہر شخص نقل کر سکتا تھا۔ علی الخصوص وہ لوگ جن کا مذہب و دین ہی تقیہ و کتمان ہو۔ نہایت آسانی کے ساتھ تشریف لا سکتے تھے اور علمائے اسلام کے نہایت محبب بن کر ان کی کتابوں میں حسب ضرورت کارستانیاں کر سکتے تھے اس پر بھی ثبوت کی ضرورت ہو تو قاضی نور اللہ شوشتری کی مشہور ترین کتاب مجالس المؤمنین مدے مطالعہ فرمالیں۔ کہ ہم لوگ شروع شروع میں سنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی بن کر اہل سنت کے استاذ اور ان کے شاگرد بنے رہے۔ ان سے روایتیں لیتے تھے۔ ان کو حدیثیں سناتے تھے اور تقیہ کی آڑ میں اپنا کام کرتے رہے ہے۔ کتاب ایران کی چھپی ہوئی ہے۔ فارسی زبان میں ہے ہر شخص مطالعہ کر سکتا ہے۔ تو یہ کیا مشکل تھا۔ کہ اسی آڑ میں کسی غریب سنی کی کتاب میں یہ کارفرمائی بھی کر لی ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے حوالہ سے کہنا کہ انہوں نے بخاری شریف کی تمام روایات کو برحق اور صحیح ہی تسلیم فرمایا ہے۔ غلط اور جھوٹ ہے۔ شاہ صاحبؒ مرحوم فقط مرفوع حدیث کے متعلق صحت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور باغ فدک کی تقسیم نہ کرنے کی روایت مرفوع نہیں۔ (مرفوع حدیث صرف وہی ہوتی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہو یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہو یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانۂ اقدس میں کوئی عمل ملاحظہ فرمانے کے بعد اس کو جائز اور برقرار رکھا ہو۔ دیکھو فن حدیث شریف کے متعلق علمائے حدیث کی تصریحات) اور فدک کے متعلق روایات بعد کے واقعات پر مشتمل ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم اہل تشیع کے اس راوی کو سچا بھی مان لیں اور بغیر مذہب ہونے کے باوجود اس کی روایت کو اپنی کتاب میں لکھ بھی لیں۔ اور یہ بھی تسلیم کریں کہ خود ہم نے اسکی روایت کو اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ تو پھر بھی ہمارے اصول کے مطابق بلکہ اہل تشیع کے اصول کے مطابق بھی یہ روایت قابل حجت نہیں۔ کیونکہ صرف ایک راوی ہے لہٰذا خبر احاد ہے۔

اور خبر احاد حجت نہیں ہوتی۔ اہل السنت کے اصول کو نظر انداز کر کے خود اہل تشیع کے امام الطائفہ ابو جعفر طوسی کی کتاب تلخیص الشافی جلد ۲ صفحہ ۱۴۲ کا مطالعہ کریں جہاں صاف لکھا ہے کہ خبر احاد ناقابل حجت ہوتی ہے۔"

مولانا احمد شاہ بخاری :- مولانا احمد شاہ بخاری اپنی کتاب "تحقیق فدک" میں لکھتے ہیں: (۲)

ابن شہاب زہری شیعہ میں سے ہے اس لیے اس کی یہ زیادتی ہم پر حجت نہیں ہو سکتی۔ کتب شیعہ میں سے ابن شہاب زہری کا تشیع ثابت کیا جاتا ہے۔ سنیئے شیخ عباس قمی اپنی کتاب تتمۃ المنتہیٰ کے صفحہ ۱۲۸ پر لکھتے ہیں واختلف کلمات علمائنا فی مدحہ وقدحہ وقد فصل صاحب الروضات فقال انہ کان فی بدء امرہ من جملۃ علماء اہل السنۃ وندمائے حزب الشیطان ثم ان علمہ واحداکہ ادرکاہ وارشداہ الی الحق المبین فصیراہ فی اواخر عمرہ من الراجعین الی الامام زین العابدین علیہ السلام وفی زمرۃ المستفیدین من برکات انفاسہ الشریفۃ ثم ذکر شواھد قولہ و لیس مقام ذکرہ فراجع ثمہ۔ ترجمہ: ابن شہاب زہری کی مدح وقدح میں ہمارے علمائے شیعہ کے اقوال مختلف ہیں صاحب روضات نے تفصیل کرتے ہوئے اپنی کتاب روضات میں لکھا ہے

---

(۲) مولانا احمد شاہ بخاری کی یہ کتاب سن ۱۹۵۵ء میں مدرسہ عربیہ دار الہدیٰ چوکیرہ ضلع سرگودھا کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اسکے صفحہ ۲۲۹ پر کتاب کی تائید میں مندرجہ ذیل حضرات کی تقریظیں موجود ہیں۔ مفتی محمد شفیع صاحب مہتمم سراج العلوم سرگودھا۔ اشاعت التوحید والسنہ کے مولانا عنایت اللہ شاہ گجراتی۔ قاضی شمس الدین صاحب گوجرانوالہ، انجمن خدام الدین کے امیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری۔ جامعہ اشرفیہ کے مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔ اور مولانا شمس الحق افغانی۔

کہ وہ ابتدا میں تو سنی علماء میں سے تھا اور شیطانی پارٹی کے ہمنشینوں میں سے۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے علم اور فہم نے اُسے کھلے ہوئے حق کی طرف راہ نمائی کی اور زندگی کے آخری حصوں میں اسے ان لوگوں میں سے بنا دیا جو کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اور آپ کی خدمت شریف سے فیض حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد اپنے اس قول کے گواہ ذکر کئے ہیں۔ جن کے ذکر کرنے کا یہ مقام نہیں ہے۔ بس وہاں دیکھ لیا جائے۔ ترجمہ ختم

ناظرین کرام! شیخ عباس قمی کے اس طریقے سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ ابن شہاب زہری کو شیعہ جانتے ہیں اور اس قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی واسطے روضات الجنات کے مصنف کی تحقیق کو اپنی کتاب میں خوشی کے ساتھ درج کیا ہے۔ اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ نیز ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی نے اپنی کتاب کافی میں ابن شہاب زہری سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ راقم الحروف کے ناقص مطالعہ کا جہاں تک تعلق ہے۔ نو مواضع کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں۔ اصول کافی ص۱۸۱ باب ذم الدنیا والزہد فیہا و ص۱۹۱ باب الاستغناء عن الناس و ص۲۲۳ باب العصبیۃ و ص۲۲۵ باب حب الدنیا و ص۲۲۶ باب الطمع و ص۲۲۹ باب الکذب و ص۲۳۰ باب ذی اللسانین و ص۲۸۵ باب فضل القرآن اور فروع کافی جلد دوم ص۲۴۵ کتاب النکاح باب التوادد اور فروع کافی جلد سوم ص۱۴۳ باب فی القاتل یرید التوبۃ۔

ناظرین کرام! ان حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ ابن شہاب زہری کافی کے رجال میں سے ہیں اور کہ آپ شیعہ ہیں۔ کیونکہ مولوی کلینی

کا آپ سے اس کثرت سے روایت کرنا آپ کے تشیع کے لیے کافی ہے۔ کافی کے رجال کی تحقیق کے لیے ایک رسالہ نامی عین الغزال فی اسماء الرجال کتاب کافی کے ساتھ طبع کیا گیا ہے جس میں ابن شہاب زہری کے نام کے ساتھ شیعی لکھا ہوا ہے پس دو گواہ زہری کے شیعہ ہونے پر ہم نے پیش کیے ہیں۔ ایک شیخ عباس قمی اور دوسرے محمد بن یعقوب کلینی۔ اور اگر ذرا غور سے کام لیا جاوے تو چار گواہ ہو چکے ہیں۔ دو مذکورالصدر اور تیسرا مصنف کتاب روضات الجنات اور چوتھا صاحب عین الغزال فی اسماء الرجال

اب اگر کوئی شیعہ اعتراض کرے کہ اہل سنت کے علمائے رجال نے ابن شہاب زہری کو سنی لکھا ہے۔ کسی نے شیعہ نہیں لکھا۔ اس واسطے اس کی روایت اہل سنت پر حجت قائم کردے گی۔ تو جواب یہ ہے کہ تقیہ جن کی زندگی کا جزو لاینفک ہو اور تقیہ ہی اصل الاصول ہو اور تقیہ ہی اوڑھنا بچھونا ہو۔ ایسے لوگوں کے اصل مذہب کا پتہ لگانا اتنا مشکل ہے۔ جتنا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہو جانا مشکل ہے۔ چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری صاحب اپنی کتاب مجالس المومنین کے اول میں اقرار کرتے ہیں کہ سلاطین صفویہ کی حکومت سے پہلے ہمارے علما تقیہ میں زندگی گذارتے تھے اور اپنے آپ کو حنفی یا شافعی ظاہر کرتے تھے۔ تبایئے جن لوگوں کا یہ حال ہو ان کے اصلی نظریات اور باطنی اعتقادات کا پتہ چلے تو کس طرح چلے۔

محدثین کی چھان بین ہزار شکر کی مستحق ہے۔ ان کی محنت اور کاوش عنداللہ مقبول ہے لیکن تقیہ باز کے مذہب کا معلوم کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ محدثین کرام نے ظاہر کو خوب دیکھا، بھلا باطن کو وہ کس طرح دیکھ سکتے تھے سے

چو در بستہ باشد چہ داند کسے
کہ جوہر فروش است یا پیلہ ور

پس محدثین کرام معذور ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں البتہ تقیہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اصول حدیث میں وضاحت کر دی ہے کہ جس فرقے سے کسی بدعتی کی بدعت کو امداد پہنچتی ہو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ تحقیق فدک ص ۱۱۲ تا ۱۱۵

مولانا دوست محمد قریشی:۔ ایک موقعہ پر شیعوں کے فتنہ پرداز اور بے لگام مناظر و مبلغ مولانا اسماعیل دیوبندی[1] کے مقابلہ کے لئے خواجہ سیالوی صاحب کے ارشاد کے مطابق، انہیں کی سرپرستی میں، سنی شیعہ مناظرہ طے پایا جس میں اہل سنت کی طرف سے مولانا دوست محمد قریشی صدر تنظیم اہلسنت کو مناظر مقرر کیا گیا۔ اس مناظرہ کی تفصیلات "مناظرہ جھوک دابہ" کے نام سے مکتبہ اہلسنت کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ نے شائع کر دی ہیں۔ اس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

---

(۱) دیوبندیت کی دم لگانا بھی فتنہ پردازی کا ایک انداز تھا، ورنہ اسماعیل صاحب کے پاس دارالعلوم دیوبند کی کسی قسم کی سند نہیں تھی۔

سنو اس کی روایت میں ایک راوی محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہے
جو شیعوں کا بھی راوی ہے اور سنیوں کا بھی ہے۔ اصول کافی ص۳۴۱ ،
ص۴۶۹ ، ص۴۲۷ میں یہی راوی محمد بن مسلم بن شہاب زہری موجود ہے۔ خلاصہ یہ کہ
یہ شیعوں میں جا کر شیعہ بن جاتا تھا۔ اور سنیوں میں جا کر سُنی بن جاتا ہے
پس جب روایت مقبول نہ رہی تو استدلال ہی نہ رہا۔ مولوی صاحب
کوئی صحیح دلیل پیش کرو شیعوں کی روایت پیش کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے ہو۔

"تائید مزید) مجالس المومنین ص۳ میں ہے۔ چوں علماء شیعہ بعلت تمادی
اہل شنعان در زمانہ تقیہ متواری شدہ خود را حنفی شافعی نمودہ اند۔
یعنی شیعوں کے عالموں کی یہی عادت رہی ہے کہ تقیہ کر کے وہ حنفیوں
میں حنفی۔ شافعیوں میں شافعی مالکیوں میں مالکی بن کر گزارا کر رہے ہیں۔
امام بخاری کو تقیے کی وجہ سے پتہ نہ چلا۔ انہوں نے اس سے روایت
کو قبول کر لیا۔
منتہی المقال ص۳۲۸ یہ شیعوں کی کتاب ہے اس میں لکھا ہوا ہے کہ
زہری شیعہ ہے یعنی یہ میری دوسری تائید ہو گئی۔

اگر دیانت ذرا بھی آپ کی طبع میں ہے تو انشاء اللہ آج کے بعد اس کو
میدان مناظرہ میں پیش کرنے کی جرأت نہیں کریں گے کہتے ہیں کہ ابو بکرؓ نے
فدک نہ دیا۔ اے مولانا پہلے محمد مصطفیٰ ﷺ نے نہ دیا۔ اور آخر میں علی المرتضیٰؓ نے
نہ دیا۔ درمیان میں ابو بکرؓ صدیق نے نہ دیا۔ اب آپ کو دو کا جواب پہلے دینا
پڑے گا۔ اور ایک کا جواب بعد میں لینا پڑے گا۔

کہتے ہیں سیدہ ناراض ہو گئی۔ ایسے مفتی صاحب اَخَذَ بِرَأْسِ اَخِیْهِ موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر ناراض ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام پر فتویٰ لگائیے۔

شیعی مناظر | حضرات میں نے وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ والی آیت پڑھی لیکن قریشی صاحب نے اس کا جواب نہیں دیا۔ قریشی صاحب نے زہری پر اعتراض کیا۔ اگر سنی نہ ہو پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔

حجۃ اللہ البالغہ میں ہے جو بخاری و مسلم کی توہین کرے وہ بدعتی ہے۔ قریشی صاحب کہتے ہیں کہ شیعہ راوی بخاری مسلم میں داخل ہو گیا تو گویا پہلے سنیوں کے گھر داخل ہوا تھا۔

اب باتیں دو ہیں۔ یا تو شاہ ولی اللہ صاحب کا فتویٰ مانو اور یا انکار کرو۔ اور سنو مسلم شریف ص۹۱ فَوَجَدَتْ فَاطِمَةُ عَلٰى اَبِیْ بَكْرٍ اب بخاری و مسلم موضوع ہو گئے۔ تو باقی کیا رہا۔ سیرۃ حلبیہ ج۲ ص۴۸۴ میں بھی یہی مضمون موجود ہے۔

مناظر اہلسنت | حضرات آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ میں پہلے مولوی اسمٰعیل کے سب اعتراضات کا جواب دیتا ہوں اس کے بعد اپنے اعتراضات کرتا ہوں یا دلائل پیش کرتا ہوں۔ لیکن مولوی اسمٰعیل میرے دلائل کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا۔ میں نے زہری کو دونوں کا راوی اور مشتبہ الحال ثابت کیا۔ لیکن میرے فاضل مخاطب نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اب پہلے ان کے مطاعن کے جوابات سنیئے۔

حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت پڑھ کر مواہن بخاری کو بدعتی بتلاتا ہے۔ مولانا میں توہین نہیں کر رہا۔ میں تو تحقیق و تنقید کر رہا ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ تحقیق و تنقید کا حق سب کو حاصل ہے۔ شاہ صاحب کے زمانہ کی اپنی تحقیق میری اپنی تحقیق تحقیق هُمْ رِجَالٌ وَّنَحْنُ رِجَالٌ۔" مناظرہ جھوک دایہ ص ۵۲ تا ۵۵

اسی مناظرہ کے ص ۵۸ - ۵۹ پر لکھتے ہیں۔

علامہ قریشی کی تقریر :- حضرات میں تو سب دلائل کا جواب دے چکا ہوں مگر جو نہ مانے اس کا علاج کیا۔ حضرت عائشہ رضؓ کے متعلق تو حضورؐ کا بیان ہے وَاللّٰہِ مَا اَدرِیۡ فِیۡ اَھلِیۡ اِلَّا خَیۡراً کی قسم میں اپنے گھر کے متعلق تو بہتر حالت جانتا ہوں۔ لاؤ مسلم میں دکھاؤں آپ کی وہ حدیث جس میں آپ غَادِراً خَائِناً پڑھ رہے ہیں۔ قریشی صاحبؒ نے کے فرمایا لوگو اس روایت میں بھی وہی راوی محمد بن مسلم بن شہاب زہری موجود ہے جس کی تحقیق میں پہلے کر چکا ہوں۔ بس لوگوں نے واہ واہ کے نعرے لگائے قریشی صاحبؒ نے کہاں شیعی روائتوں کے بغیر اور روائتیں ملتی ہی نہیں۔

اصول کافی ہیں میں نے ۲ مقامات پر اس کی روایت دکھائی ہے۔ معلوم ہوا کہ شیعہ راوی۔ مولوی اسمٰعیل نے مطالبہ کیا اس کا شیعہ ہونا ہماری کتابوں سے دکھاؤ۔ قریشی صاحب نے جھٹ منتہی المقام اٹھائی اور اس کا صـ ۲۴۸ کھول کر پڑھا ھٰذا تدل علیٰ تشیعہ یہ ہے عبارت جس میں زہری کا شیعہ ہونا لکھا ہے۔ اسمٰعیل نے کہا کتاب دکھاؤ جب کتاب دیکھی تو شور زیادہ کیا کہ یہ تشیع کا لفظ ہے شیعہ کا نہیں ہے قریشی صاحبؒ نے فرمایا یہ ہے مناظرے کا شرائط نامہ اس میں آپ کے مناظر کو اہل تشیع لکھا گیا ہے۔ اگر یہاں اہل تشیع سے مراد شیعہ ہے تو وہاں بھی شیعہ"

موقعہ کی مناسبت سے اس جگہ، شہید حق مولانا حق نواز مرحوم کے ساتھ ایک یادگار نشست کا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے :-

مولانا مرحوم پر مصائب کے پہاڑ تو ٹوٹتے ہی رہتے تھے، ایسے ہی ایک خطرناک موقعہ پر مولانا کے نمائندے کراچی آئے اور مدارس و مساجد کے اصحاب اہتمام و خطباء سے ملاقاتیں کیں۔ اکثر و بیشتر نے زبانی دعاؤں پر ٹرخا دیا، وہ حضرات میرے پاس بھی تشریف لائے تو میں نے

حسب استطاعت ان سے عملی تعاون کیا، مولانا اس وقت سرکاری مہمان (جیل میں) تھے، انھوں نے جب اپنے نمائندوں سے یہ روداد سنی تو حیران ہوئے اور بے ساختہ ان کی زبان پر وہی شعر آ گیا جو حضرت شیخ الہند نے اس وقت پڑھا تھا جب ان کے حلقے کی اکثریت مولانا ابوالکلام آزاد مدیر الہلال سے شیخ کے روابط کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ مفتی صدر الدین آزردہ کا وہ شعر یہ ہے۔

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

پھر جب مولانا کراچی تشریف لائے تو ان کا پیغام آیا کہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، میں نے عرض کیا بسرو چشم! وہ آئے اور بہت سے عنوانات پر گفتگو رہی۔ یہ بھی گفتگو ہوئی کہ مذہبی اور غیر مذہبی حلقوں میں ان کے مشن کے لئے کیا طریق کار اپنایا جائے میں نے اس سلسلہ میں کھل کر ان سے گفتگو کی اور عرض کیا کہ کام کے دو طریقے ہیں عوامی اور علمی، اور دونوں کا مزاج یکسر جدا ہے۔ دونوں کاموں کو یکجا کرنے والے کوئی کام بھی صحیح طور پر نہیں کرپاتے۔ ماضی قریب کی تاریخ میں ہی اس کی کئی مثالیں موجود ہیں ---- البتہ یہ ضرور ہونا چاہئے کہ دونوں قسم کے کام کرنے والوں کے درمیان کم از کم خاموش قسم کا رابطہ ہو، تاکہ علمی کام کرنے والوں کے تجربات سے عوامی قائدین فائدہ اٹھا سکیں۔ اور علمی کام کرنے والوں کو عوامی حالت کی اطلاع ہوتی رہے اس طرح وہ اپنے کاموں کی ترجیحات متعین کرنے میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرسکیں گے، غیر ضروری مباحث پر اپنی توانائیاں ضائع نہیں کرتے رہیں گے جیسا آج تک ہمارے ہاں ہوتا رہا ہے کہ آمین بالجہر، رفع یدین اور فاتحہ خلف الامام جیسے مباحث پر تو علمی کاوشوں کا انبار لگا دیا گیا لیکن جو امت کو درپیش حقیقی مسائل تھے ان کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر رہی۔ چھوٹے چھوٹے فتنوں پر تو اتنی ہنگامہ آرائی کی گئی کہ الامان و الحفیظ۔ لیکن ام الفتن کے متعلق بڑے بڑے "شیخ الحدیث" اور "مفتی اعظم" لاعلم رہے بلکہ غلط فہمیوں میں مبتلا رہے ----- غرض یہ کہ فکری کام کرنے والوں کے تفردات کی وجہ سے ان سے کٹنے کے

بجائے ان سے ربط رکھنے کی ضرورت ہے۔ خواہ یہ ربط علی الاعلان نہ ہو۔ خاموشی سے ہو تاکہ اپنی فرصت کی کمی یا مطالعہ کی کمی کی وجہ سے جن حقائق تک نگاہ نہیں پہنچی اس کا مداوا اس طرح ہوتا رہے ------ اس پر مرحوم شہید نے کہا کہ اس کی کوئی مثال؟ میں نے کہا آپ کے مشن کے حوالے سے ایک مثال پیش کرتا ہوں بشرطیکہ آپ جھوک نہ جائیں --- انھوں نے کہا فرمایئے! میں نے کہا حدیث و سیرت کے مدون اول امام ابن شہاب زہری میں شیعیت کے جراثیم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وہ تمام روایات جو سنی شیعہ مباحث سے متعلق ہیں یہ جراثیم لئے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کی جمع و تدوین کا معاملہ ہو، صدیق اکبرؓ کی خلافت و بیعت کا معاملہ ہو، وراثت نبوی (فدک) کا معاملہ ہو، ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کا معاملہ ہو (افک) ہر جگہ یہی بزرگ نظر آتے ہیں ------ مولانا نے کہا کہ یہ تو آپ نے بڑی خطرناک بات کہہ دی۔ اس کی وجہ سے تو آپ پر منکر حدیث ہونے کا فتویٰ لگ سکتا ہے ---میں نے کہا اسی لئے تو یہ مثال میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے، اچھا یہ فرمایئے بریلوی مسلک کے علماء کی جماعت کے قائد مولانا قمرالدین سیالوی منکر حدیث تھے؟ کہنے لگے نہیں۔ میں نے کہا آپ کے استاد محترم صدر تنظیم اہلسنت مولانا دوست محمد قریشی مرحوم تو ضرور منکر حدیث تھے بلکہ عام مولویوں کی رٹی ہوئی عبارت کے مطابق **من شک فی کفرہ فقد کفر**۔ مولانا ہنس کر کہنے لگے کیا آپ مجھ سے پہیلیاں بجھوا رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا جناب ان دونوں حضرات نے امام زہری کے شیعہ ہونے کا اقرار کیا ہے، لہٰذا آپ کے فتوے کے اصل مصداق وہ ہیں، میں تو صرف ان کا ناقل ہوں --- مولانا حیران رہ گئے۔ میں نے اسی وقت اپنی لائبریری میں سے مولانا قمرالدین سیالوی کی کتاب "مذہب شیعہ" اور مولانا دوست محمد قریشی کا "مناظرہ جھوک دایہ" منگا کر انہیں دکھائے۔ مولانا مرحوم انہیں پڑھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں۔ بالآخر مولانا کی فرمائش پر میں نے ان دونوں کتابوں کی فوٹو اسٹیٹ کرا کے مولانا کے سپرد کی اور عرض کیا کہ اب فرمایئے میرا مشورہ اور میری پیش کردہ مثال درست ہے یا نہیں مولانا نے فرمایا بلاشک وشبہ ------ مرحوم کی شہادت کے بعد ان کے ایک پرجوش عقیدت مند نے بتایا کہ شہید مرحوم نے یہ بات اپنی کسی تقریر میں بھی ببانگ دہل کہہ دی تھی اور کہا کہ ہم سے تقیہ نہیں

ہو سکتا - رحمہ اللہ تعالیٰ و جعل الجنۃ مثواہ۔

------(۳)------

حدیث و سیرت کے مدون اول امام زہری کے متعلق معلومات جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے مناسب سمجھا کہ امام ابن جریر طبری کے متعلق بھی کچھ حقائق پیش کر دئے جائیں کیوں کہ ان کی تفسیر کو ام التفاسیر (تمام تفسیر کی کتابوں کی ماں) اور ان کی تاریخ طبری کو بعد والی تمام تاریخوں کی ماں قرار دیا جاتا ہے - حتیٰ کہ کتنی چیزیں علامہ ابن کثیر کی نظر میں درست نہیں ہوتیں - مگر وہ اپنی تاریخ کی کتاب البدایہ والنہایہ میں یہ کہہ کر درج کردیتے ہیں کہ یہ باتیں اگر طبری نے نہ لکھی ہوتیں تو ہم کبھی نہ لکھتے - اس سے امام ابن جریر کے رعب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ---- مگر اللہ کے فضل و کرم سے ہم اپنی کتابِ معصومؑ لاریب فیہ قرآن مجید اور اس کے حامل صحابہ کرامؓ کے معاملے میں کسی کے رعب میں آنے کے لئے تیار نہیں ---- معیار حق قرآن کریم ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرتیں اس کا چلتا پھرتا نمونہ ایک امام زہری و طبری کیا؟ ان جیسے بے شمار علماء و مشائخ کو صرف ایک صحابی کی جوتی پر قربان کیا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ صحابیؓ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کے قرآنی خطاب یافتہ ہیں - جبکہ ان فقہاء و محدثین اور علماء و مشائخ کو یہ شرف حاصل نہیں ہے -

امام طبری کی اس شہرت و اہمیت کے پیش نظر علامہ تمنا عمادی نے ان کے بحیثیت مفسر اور بحیثیت مورخ ہونے کے متعلق جو تحقیقات کی تھیں ان کو بھی ہم نے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے - مزید بصیرت کے لئے مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمد اسحاق صدیقی ندوی سابق شیخ الحدیث و مہتمم دارلعلوم ندوۃ کی معرکتہ الاراء کتاب " اظہار حقیقت جلد اول و دوم " سے امام طبری سے متعلقہ اقتباسات پیش کردئے ہیں - اور جس طرح امام زہری کے متعلق ہم نے " دیوبندی علماءؒ کی تحقیقات کے ساتھ " بریلوی مسلک " کے حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی اور حضرت زیدابوالحسن شاہ ازہری کے اقتباسات پیش کئے ہیں، اسی طرح امام طبری کے متعلق بھی بریلوی مسلک کے ایک عالم مولانا محمد علی صاحب کی کتاب " میزان الکتب " سے اقتباس پیش کر دیا ہے

امام طبری کے متعلق کئی کام ابھی باقی ہیں ۔ اللہ کی توفیق سے امید ہے کہ انہیں بھی کر لیا جائے گا ۔ سب سے پہلا کام رجال طبری کا ہے ۔ جب تک ان کے راویوں کے متعلق معلومات واضح نہ ہوں اس وقت تک ان کی روایات پر کس طرح اطمینان کیا جا سکتا ہے ؟ امام طبری نہایت گہرے شخص ہیں ، ان کو جو کچھ پیش کرنا تھا وہ تو پیش کر دیا ، اور اپنی صفائی یہ کہہ کر کرلی کہ :

ولیعلم الناظر فی کتابنا ھذا ان اعتمادی فی کل ما احضرت ذکرہ فیه مما شرطت انی راسمه فیه انما ھو علی ما رویت من الاخبار التی أنا ذاکرھا فیه ، والا ثارالتی أنا مسند ھا الی فیه دون ماأدرک بحجج العقول وأستنبط بفکر النفوس إلاالیسیر القلیل منه ، اذکان العلم بما کان من أخبار الماضین وماھو کائن من انباء الحادثین غیر واصل الی من لم یشاھد ھم ولم یدرک زمانھم الا باخبار المخبرین ونقل الناقلین دون الاستخراج بالعقول والاستنباط بفکر النفوس فمایکن فی کتابی ھذا من خبر ذکر ناہ عن بعض الماضین بما یستنکرہ قارنه أویستشنعه سامعه من أجل انه لم یعرف له وجھا فی الصحته ولا معنی فی الحقیقة فلیعلم انه لم یؤت فی ذلک من قبلنا وانما أتی من قبل بعض ناقلیه الینا ، وانا انما ادینا ذلک علی نحو ما أدی الینا ۔

" ناظرین کتاب یہ بات سمجھ لیں کہ میں نے جو احوال اس کتاب میں درج کیے ہیں ، اس میں میرا اعتماد انہیں روایات پر ہے جنہیں میں نے سند کے ساتھ ذکر کر دیا ہے ۔ اس میں وہ حصہ بہت ہی کم ہے جسے میں

نے عقلی دلائل اور فکری استنباط یعنی درایت کی رو سے پیش کیا ہو۔
کیوں کہ گزشتہ واقعات و حوادث نہ ہمارے چشم دید ہیں، نہ ہم
نے وہ زمانہ پایا ہے۔ ان کا علم ہمیں صرف نقل کرنے والوں
اور راویوں کی اطلاعات سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں عقل و
درایت کو کوئی دخل نہیں۔

لہذا ہماری کتاب کی بعض روایات کے پڑھنے یا سننے سے
اگر قاری اس بناء پر تکلف محسوس کریں یا ناراض ہوں کہ اس
میں انہیں صحت و حقیقت نظر نہ آرہی ہو تو انہیں معلوم ہونا
چاہیئے کہ ان کا اندراج ہم نے خود اپنی طرف سے نہیں کیا بلکہ
اس کا منبع وہ ناقل ہیں جنہوں نے وہ روایات ہم سے بیان کیں
ہم نے وہی روایات اسی طرح بیان کر دیں۔ جس طرح ہم تک
پہنچیں۔

(مقدمہ تاریخ طبری۔ ص ۵ مطبع الاستقامہ قاہرہ ۱۹۳۹ء)

امام طبری کا یہ " معروضی اور سائنٹیفک " انداز اتنا متاثر کن ہے کہ اچھے
اچھے ان کے اس سحر سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ " خلافت و ملوکیت " کے مصنف
اگر اس سے متاثر ہوں تو تعجب کی بات نہیں، تعجب تو یہ ہے کہ خلافت و ملوکیت
کا جواب لکھنے والے بھی امام طبری کے اس سحر میں گرفتار ہیں۔ مولانا حافظ
صلاح الدین یوسف صاحب اپنی کتاب " خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت
میں لکھتے ہیں:

" دوسرے ابن جریر طبری ہیں، ان کی کتاب میں ان کے غیر
جانبدارانہ طرز عمل کی چھاپ اتنی گہری اور نمایاں ہے جس سے
کسی کو مجال انکار نہیں، مزید برآں اپنے اس طرز عمل کی وضاحت
خود انہوں نے اپنی کتاب کے آغاز میں بھی کردی ہے۔

(ص ۱۴۸، اڈیشن ۱۹۸۵ء)

(اس کے بعد یوسف صاحب نے طبری کی اس عبارت کا ترجمہ دے دیا ہے جسے

تقریباً انھیں کے الفاظ میں ہم پیش کر چکے ہیں)

امام طبری نے اپنے اس مقدمہ میں دو باتیں کہی ہیں ، پہلی کا خلاصہ یہ ہے کہ نقل راچہ عقل ، ظاہر ہے ایسے اندھے روایت پرستانہ نقطہ نظر کی تائید کوئی ہوش مند شخص نہیں کر سکتا ۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے روایات بیان کر دی ہیں عقل و درایت سے کام نہیں لیا ، اس حد تک بھی غنیمت تھا ۔ مگر وہ ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ تاریخ میں عقل کو کیا دخل ۔ ان کے اس نقطہ نظر پر تنقید کے لئے مناسب ہے کہ امام ابن خلدون کے مقدمہ کا مطالعہ کر لیا جائے جس کے فلسفہ تاریخ کو اب مسلمہ کی حیثیت حاصل ہے ۔ دوسری بات طبری نے یہ کہی ہے کہ ہم نے تو روایات پیش کر دی ہیں ، کسی کو اگر اس کے مندرجات پسند نہیں آتے تو وہ راویوں پر گرجے برسے ، ہمیں کچھ نہ کہے ۔

ان کی یہ دوسری بات اس قسم کی ہے جیسی " رنگیلا رسول " کے مؤلف نے لاہور کی عدالت میں کہی تھی اور جس سے " متاثر " ہو کر عدالت عالیہ نے مؤلف کے موقف کو صحیح تسلیم کر لیا تھا کہ واقعی مؤلف نے اس کتاب میں مسلمانوں کی کتابوں سے حوالے پیش کئے ہیں ، ان حوالوں کے مندرجات اگر ناپسندیدہ ہیں تو اس میں مؤلف کا کیا قصور ؟ گرجنا برسنا ہے تو اس کے مآخذ پر گرجو برسو ۔ یا اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی مؤلف بانی پاکستان کی سوانح کا نوے فیصد ان کے سیاسی مخالف کانگریسی اخبارات کے رپوٹروں کی بنیاد پر اور دس فیصد مسلم لیگی رپوٹروں کی بنیاد پر مرتب کرے ، اور کتاب کے مقدمہ میں امام طبری کا یہی اصول درج کر کے خود کو غیر جانبدار قرار دے دے ۔ یا علامہ اقبال کی سوانح کے اکثر حصے ان کے مذہبی مخالف اور ان سے جلے بھنے قادیانی راویوں کی بنیاد پر مرتب کر کے کتاب کے شروع میں امام طبری کا یہی اصول درج کر کے سرخرو ہو جائے ۔

----------- تو -----------

یہ طرز عمل کس حد تک صحیح سمجھا جائے گا ؟ ایسی جانبدارانہ کتابیں تو تاریخ کی کھتونی یا ذخیرہ روایات بھی قرار نہیں دی جا سکتیں چہ جائے کہ انہیں مستند تاریخ سمجھا جائے ۔

لیکن بہرحال ابو مخنف کے ذہنی غلاموں نے اپنا کام کر دکھایا، جب کہ دوسروں نے جمع و تدوین کے اس دور میں نہ ان کا علاج بالمثل کیا، نہ مثبت طور پر کچھ کام کیا لھذا آج ہمیں مجبوراً حریف کی شرائط پر، اس کے پسندیدہ میدان میں اپنی مدافعانہ جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ جس کے لئے طبری کے رجال پر کام کرنا نہایت ضروری ہے۔

تفسیر طبری کے رجال پر تو مصر کے محمود شاکر صاحب کا کام موجود ہے۔ تاریخ طبری کے رجال پر علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی لکھنے سے پہلے سید سلیمان ندوی صاحب سے کام کروایا تھا جیسا کہ مقدمہ سیرت النبی اور مکاتیب شبلی سے واضح ہے۔

علامہ شبلی مقدمہ سیرت میں " اصول تصنیف و ترتیب " کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں

> " (۳) روز مرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں۔ لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں انکے متعلق تنقید و تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کدو کاوش کی ہے اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام راوۃ کے نام الگ منتخب کر لئے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔، پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح وتعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس سلسلہ روایت کی تحقیق مقصود ہو، بہ آسانی ہو جائے " (صفحہ ۱۰۱)

علامہ شبلی کا رجال پر یہ کام نہایت قیمتی اور اہم تھا مگر افسوس اب اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔ ایک مرتبہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کراچی تشریف لائے تھے اور خالد اسحاق صاحب ایڈوکیٹ کے یہاں ان کی دعوت تھی تو میں نے ان سے اس کے متعلق دریافت کیا لیکن انہیں اس کام کا علم ہی نہیں تھا، میں نے عرض کیا کہ واپس جاکر تحقیق کر کے مطلع فرمایئے گا تو عرصہ دراز کے بعد بھی جواب آیا کہ سب سے معلوم کر لیا۔ اس کا دارالمصنفین میں کہیں وجود نہیں ہے۔

بالآخر ہمت کر کے دوسرے کاموں کے ساتھ تاریخ طبری کے رجال پر اور اس کی روایات پر درایت کی رو سے کام کی میں نے ابتداء کر دی، رجال پر جس حد تک کام میں

کر چکا تھا اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے میں نے مولانا حبیب الرحمن صدیقی کاندھلوی صاحب سے فرمائش کی مگر وہ اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں کر سکے وراتی کام بھی رکا ہوا ہے۔ ورنہ میری آرزو یہ تھی کہ جس طرح احناف نے تاریخ خطیب کے متعلقہ حصہ پر محنت کر کے اسے مستقر نہیں رہنے دیا بلکہ اس مقام پر پہونچ کر ان کی محنتوں کے نتیجے میں ہر قاری کی تنقیدی حس بیدار ہوجاتی ہے۔ اسی طرح تاریخ طبری کے متعلقہ حصوں کے متعلق اتنی محنت ہوجاتی کہ ان مقامات پر مطالعہ کرنے والے حضرات بے حس نہ رہیں بلکہ انہیں احساس رہے کہ یہاں دوسرا رخ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے۔ تا کہ متوازن رائے قائم کی جاسکے۔

مگر یہ آرزو معلوم نہیں کب پوری ہوگی۔ فی الوقت تو زیر نظر مجموعہ پیش خدمت ہے جو حدیث و سیرت کے مدون اول امام زہری اور تفسیر و تاریخ کے مدون اول امام طبری کے رجحانات کو سمجھنے میں انشاء اللہ یقیناً ممد و معاون ثابت ہوگا اور تاریخ اسلام کی ان دو اہم اور غیر معمولی شخصیات کو نہ سمجھنے سے مت کو جو نقصانات ہوئے ہیں، ان کے مداوے کے لئے اہل علم و دانش اپنی توجہ مبذول کر سکیں گے۔ **وماذلک علی الله بعزیز** ۔ **اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه** ۔

محمد طاہر

- مفتی و مہتمم جامعہ مدینۃ العلوم اورنگ آباد کراچی ۱۸
  سرپرست عالمی جمعیت تدریس القرآن
- سرپرست یوم خاتم المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم
- اولین ناظم اعلیٰ کل پاکستان سنی کونسل
- جنرل سیکریٹری ادارہ فکر اسلامی کراچی
- ترجمان متحدہ سنی محاذ برائے عظمت قرآن کریم و صحابہ کرامؓ

---

(۱) اس کی ایک مثال مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمان سنبھلی کی کتاب ہے جو پاکستان میں بھی کئی اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

(ماہنامہ نقیب ختم نبوت، دار بنی ہاشم، مہربان کالونی ملتان کے دفتر سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے)

اس میں مولانا عتیق الرحمان صاحب نے کربلا کے حوالے سے تاریخ طبری کی روایات کا تجزیہ کیا ہے اور باوجود حد سے زیادہ احتیاط کے اس عنوان پر اہل فکر کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کردیا ہے

(طاہر)

تاثرات بروفات
علامہ تمنا عمادی مجیبی

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی استاد فلسفۂ لسانیات، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ مشیر امور اقلیات، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ۔ حال ناظم تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

برصغیر ہند و پاک کے ایک مقتدر عالم دین، وسیع النظر محقق اور اردو فارسی کے بلند پایہ ادیب و شاعر مولانا محی الدین تمنا ۷۰ سال کی عمر میں گزشتہ ماہ وفات پائی۔

وہ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز قصبہ پھلواری کے رہنے والے تھے، اور ایک ایسے علمی و دینی خاندان کے رکن تھے۔ جہاں کچھ اوپر دو سو سال سے علم و مشیخت کا سلسلہ قائم ہے، ان کو فارسی اور فن عروض میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مقالہ میں بہار کی باکمال شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے، اس میں مولانا عمادی مجیبی کا تذکرہ اسی حیثیت سے کیا ہے، یہ مقالہ سید صاحب کے مجموعۂ مقالات نقوش سلیمانی میں موجود ہے۔ مولانا عمادی مجیبی بہت ہی ذہین، اعلیٰ درجہ کے طباع اور نکتہ سنج تھے، انھوں نے درس نظامی کی تکمیل اپنے والد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں مولانا حکیم علی نعمت اور مولانا محمد منظور احمدؒ سے کی تھی، اور کچھ عرصہ[1] تک متوسطات کی کتابوں کا درس بھی دیا تھا ان کے والد مولانا شاہ نذیر الحق فائز ایک وسیع الاستعداد

---

[1] خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق اور علامہ کے شاگرد مولانا اسد القادری کی تحریر کے مطابق درس و تدریس کا زمانہ چودہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ اور اس دوران ابتدائی کتابوں سے انتہائی کتابوں تک سب کا درس دیا۔ (طاہر)

عالم تھے۔ فارسی میں فکر سخن کرتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ پروفیسر ڈاکٹر افضل امام صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ مولانا عمادی کا ابتدائی تعارف بھی ایک شاعر کی حیثیت سے ہوا، ان کی شاعری زیادہ تر بلکہ تمام تر نعت نبوی پر مشتمل تھی، وہ فارسی اور اردو میں پرجوش اور پر کیف نعتیں کہتے تھے۔ نعتوں کے ضمن میں اصلاح و موعظت کے مضمون بھی بڑی خوبی سے نظم کرتے، ان کے شیخ طریقت اور استاد شاہ رشید الحق عمادی سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ پٹنہ، جو ان کے آبائی رشتہ سے چچا بھی تھے۔

مولانا تمنا عمادی کو "حسان الہند" کہا کرتے تھے، چنانچہ ان کی نظموں کے ابتدائی مجموعے "حسان الہند علامہ تمنا عمادی مجیبی پھلواری" کے نام سے شائع ہوا کرتے تھے افسوس کہ ان سطور کی تحریر کے وقت ان کے اشعار کا کوئی مجموعہ نہیں ہے جو نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ البتہ چند متفرق اشعار جو حافظے کے گوشوں میں پراگندہ پڑے ہوئے ہیں ان کا یہاں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

حضرت جابر بن سمرہؓ کی ایک روایت شمائل ترمذی میں ہے کہ وہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کو یمنی چادروں میں ملبوس دیکھ رہے تھے کبھی وہ چاند کو دیکھتے اور کبھی حضور انور کو! اور کہتے کہ مجھ کو حضورؐ انور چاند سے زیادہ خوبصورت نظر آرہے تھے اس واقعہ کو مولانا تمنا عمادیؒ نے نظم کیا تھا! اس نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا ہی کروں
ان کی صورت سے بہت ملتی ہے صورت تیری

شاعری ان کے فن عروض میں ماہرانہ دستگاہ کا نتیجہ تھی۔ مگر پھر بھی اکثر اشعار سلیس اور رواں ہوتے تھے مثلاً ایک نظم کا پہلا شعر ہے۔

شیوۂ احبابؔ جدا، شکوۂ اغیار جدا
میرے افسانے کے ہیں دو باب، ہر اک باب جدا

لہ یہ مصرع فن عروض نگار کے سہو قلم نے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ شاید اصل مصرع یوں ہو۔ "شکوۂ غیر جدا، شکوۂ احباب جدا"

ان کی شاعری کا اصلی رنگ فارسی میں کھلتا تھا، ایک مشہور زمین میں ان کے یہ دو شعر سنئے۔

حاشا کہ دل از ناوک جاناں گلہ دارد ٭ برباد سرائے کہ ز مہماں گلہ دارد

دیوانہ بکار است چہ داد ند ز دستش ٭ داماں گلہ دارد کہ گریباں گلہ دارد

مولانا تمنا عمادی کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی جن میں بعض بہت کامیاب شعرا بھی رہے ہیں جیسے نجم، ارمان اور شفیع تمنائی پھلواروی، ان کے علاوہ خاندان کے اکثر و بیشتر نوجوان جن کے اندر شاعری کی امنگ پیدا ہوئی، مولانا سے ہی رجوع کرتے تھے۔ مگر شعر و ادب سے دلچسپی جوانی ہی کی عمر میں کم ہو گئی تھی، علمی و تحقیقی مصروفیات نے اس ذوق پر غلبہ حاصل کر لیا تھا لیکن شعر و ادب سے وہ کلیتہً مستغنی نہیں ہوئے تھے، اپنے وسیع اور عالی شان مکان کا نام انھوں نے "دارالادب" ہی رکھا تھا جو ان کی ہجرت پاکستان کے بعد دوسروں کے قبضے میں آیا مگر اس کے دروازوں کا کتبہ اب بھی باقی ہے۔

وہ خاندانی صوفی تھے، تصوف کی گودوں میں پلے تھے، ان کے جدامجد (چھٹی پشت کے دادا) حضرت تاج العارفین شاہ محمد مجیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کے اخلاف کی دو خانقاہیں پھلواری اور پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان کی خانقاہوں کے "رسوم و آداب" نہ خالص دیوبندی طرز کے ہیں نہ بریلوی انداز کے، ان دونوں کے درمیان ایک معتدل اور متوسط انداز کی رسمیں وہاں رائج ہیں جن میں رسم سماع بھی شامل ہے۔ مولانا تمنا عمادی ان مروجہ مراسم تصوف سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ذکر، شغل، مراقبہ، قبور سے لے کر حال قال میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان مراسم سے دل برداشتہ ہو گئے بلکہ ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس تبدیلی کا سبب خواہ کتاب و سنت کے مطالعہ کا خاص انداز رہا ہو یا کوئی دوسرا نفسیاتی سبب اس کا تعین دشوار ہے[1]۔ بہرحال یہ باتیں راقم الحروف

[1] خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق (جیسا کہ مولانا ظفر احمد عثمانی کے نام خط میں انھوں نے تحریر کیا ہے) تصوف اور اس کی رسوم سے علامہ کے بُعد کی وجہ کتاب اللہ، سیرت رسول اللہ اور سیرت اصحاب رسول اللہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ تھا۔ ورنہ ظاہر ہے ایک خاندانی پیر گھرانے کے فرد کے لئے صوفیانہ رسوم سے فائدے ہی فائدے تھے۔ (ظاہر)

کے وجود سے پہلے کی ہیں۔ اس لئے ان پر رائے زنی آسان نہیں ہے کہ تصوف سے انحراف و انکار کا باعث کیا تھا۔ البتہ جو چیز ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھی اور سُنی وہ یہ تھی کہ مولانا تصوف، خانقاہ اور خانقاہیت کے شدید منکر تھے۔ وہ اپنے گھر پر ہر جمعہ کو درسِ قرآن کا جلسہ کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم سے ان کو شغف تھا، عربی لغت و نحو پر ان کو عبور کامل تھا تفسیروں پر نظر تھی۔ تصوف پر جب وہ نکیر کرتے تو کہا کرتے تھے کہ مجھے یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ ؎ لذت ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

تصوف کے انکار سے ان کے اندر ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی عمر میں بار بار رائے نہیں بدلی۔ یہی ایک تبدیلی تھی جو اوائل و آخر ہوئی مگر اس کے نتائج بہت دور رس اور بعد میں تکلیف دہ حد تک غلو کی شکل میں نمایاں ہوئے۔ پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ تحقیق میں تقلید سے آزاد[1] ہو گئے وہ مسائل میں تحقیق کے وقت براہ راست قرآن و احادیث اور زیادہ تر قرآن کریم سے استشہاد کرتے۔ ائمہ مجتہدین اور ان کے پیرو بزرگوں کے اقوال ان کے لئے دلیل کا درجہ نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقالات میں حوالے کبھی ثانوی ماخذ ———— (SECONDERY SOURCES) کے نہیں دیتے تھے۔ انکار تصوف کا دوسرا نتیجہ بظاہر ہوا کہ تصوف کے "سلسلۃ الذہب" سے ان کے اندر ایک کد پیدا ہو گئی اور مناظرانہ جوش میں وہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہٗ اور خاندان رسالت کے افراد پر اس طرح تنقید کرتے[2] جس طرح شیعہ سنی مناظرہ کرنے والے بعض اہل سنت علماء کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے۔

---

[1] یہ نتیجہ تو بہت مبارک تھا اسے "تکلیف دہ حد تک غلو" کہنا بڑی زیادتی ہے۔ تحقیق حق میں اگر کوئی شخص اپنے خاندانی یا علمی اکابر یا فرقہ کی تقلید سے آزاد نہ ہو تو وہ تحقیق کر ہی نہیں سکتا۔ (طاہر)

[2] علامہ تمنا خود محترم مقالہ نگار کے ارشاد کے مطابق حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے تھے یعنی ہندی محاورہ کے مطابق سید تھے لہٰذا حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ ان کے جدّ امجد تھے۔ پھر صحابی تھے اور علامہ کا مسلک تو از اول تا آخر اسوۂ صحابہ کی تعمیل تھا جسے وہ قرآنی اصطلاح میں سبیل المؤمنین کہا کرتے تھے اور اس عنوان پر انھوں نے باقاعدہ ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ لہٰذا اگر وہ صحابۂ کرام کی اکثریت کے مقابلہ میں اپنے اجداد کی ایک آدھ خطاءِ اجتہادی کا اعتراف کرتے تھے تو یہ تو ان کی حق شناسی کا بہت بڑا ثبوت ہے نہ کہ تکلیف دہ حد تک غلو" کا

غالباً یہی رگ تھی جس نے ان کے قلم سے محمود عباسی کے ان خرافات کی بھی تائید کرادی۔ جن پر تحقیق کا لیبل علم پر ایک بدترین تہمت[1] ہے۔ جس میں کھلا دجل، عبارتوں کی قطع و برید، غلط انتساب سب کچھ ہے۔

وہ حدیث کے منکر نہیں تھے۔ یہ ان پر اتہام ہے۔ وہ نام نہاد اہلِ قرآن کی طرح علم حدیث سے کورے نہیں تھے۔ بلکہ رجال احادیث پر ان کا اتنا بڑا کام ہے جس کی نظیر بہت سے شیخ الحدیثوں کے یہاں نہیں مل سکتی، وہ صرف یہ کہا کرتے تھے کہ حدیثیں قرآن کی ناسخ نہیں ہوسکتیں اور جو حدیثیں نصِ قرآن سے متعارض ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں ہوسکتیں۔ مگر ہند و پاک کے اس گروہ نے جو اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتا ہے، مولانا کی تحریروں سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ احادیث کے متون اور رجال سند کی بحثیں جن کا جائزہ لینا ان کے بس میں نہ تھا۔ اس کام کو مولانا عمادی انجام دیا کرتے تھے اس میں ان کی تائید کے پہلو ل جاتے، اُس کو اجاگر کرکے پیش کرتے، اس طبقہ کے اس طرز عمل نے مولانا کو کئی نقصان پہنچائے۔ ایک طرف تو مدارس کے علماء لے ان کو بھی

(بقیہ ملک کا حاشیہ) اگر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ۔ حواری رسول حضرت زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی خطأ اجتہادی پر زور دینا اور اس کا پروپیگنڈہ کرنا بلکہ اسے عقیدہ بنا لینا جرم نہیں ہے تو حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ کی کسی خطأ اجتہادی کا قائل ہونا جرم کیوں ہو؟ کیا ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حواری رسول حضرت زبیرؓ کی خطائے اجتہادی کا تذکرہ کرنے والے بھی "تکلیف وہ حد تک غلو" کے مرتکب کہلائیں گے یا ان کے خطأ اجتہادی کا تذکرہ کرنا جرم نہیں ہے؟ حضرت! اگر اصول ہو تو سب کے لئے یکساں ہونا چاہیے۔ ورنہ صحابہ کرام میں سے کچھ کے لئے معیار جدا ہو اور کچھ دوسروں کے لئے جدا معیار ہو یہ طرز عمل اصول اور عدل کے خلاف ہے اور فی الحقیقت "تکلیف دہ حد تک غلو" یہ طرز عمل ہے نہ کہ علامہ تمنا کی اصول پسندی جس کی وجہ سے تمام صحابہ کرام کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ (طاہر)

[1] محترم مقالہ نگار کا یہ فیصلہ بھی انتہا پسندانہ ہے۔ عباسی مرحوم کی یہ کتاب نہ اس قدر بُری ہے جیسا کہ مقالہ نگار کا ارشاد ہے۔ نہ ایسی غیر معمولی جیسا کہ اس کتاب کے معتقدین سمجھتے ہیں۔ اگر محترم مقالہ نگار اس کتاب کو اس حد تک بدترین سمجھتے ہیں تو انھیں کسی مختصر مقالہ ہی میں ہی اس کتاب کی علمی تنقید کرنی چاہیے تھی جذباتی انداز کے الزامات نامناسب ہیں۔

پرویز جیسا مدعی علم سمجھ لیا اس لئے ان کی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا اور کبھی ان کا نام بھی لیا تو اسی انداز سے جس طرح پرویز صاحب کا نام تحقیر و استخفاف کے ساتھ علمی و دینی حلقوں میں لیا جاتا ہے۔

دوسری طرف ان محمود عباسیوں، پرویزیوں اور اہل قرآنوں نے مولانا تمنا کی مکمل بات سامنے نہیں آنے دی۔ چند ماہ پہلے ماہنامہ فاران میں مولانا تمنا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اس مظلومیت کا اظہار کیا تھا۔

عالم باعمل بہرحال اپنے "موتی" کا ذکر خیر کرنا چاہیے، ان کی خاص بات جس کی شہادت ان کے انتقال کے بعد دی جا سکتی ہے اور جس کی شہادت میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ وہ مخلص اور سچے مسلمان تھے، انھوں نے جو کچھ لکھا اور کہا وہ ان کے ضمیر کی آواز تھی اور ان کی تحقیق کا نتیجہ تھا، انھوں نے اپنے نظریہ کے تحت (کسی یافت کے لئے نہیں) اپنا جما جمایا گھر، نیک نامی اور عزت کی زندگی، خوشحالی اور فارغ البالی کی معیشت کو چھوڑ کر ——— مشرقی پاکستان میں ہجرت کی، اپنے اعزہ اور خاندان کے افراد جن کی بے پناہ محبت ان کے دل میں تھی اور جن کے نازک سے نازک جذبات کا وہ احترام کرتے تھے، ان سب کی بے رخی مول لی، ان کے اخلاص و صداقت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی ایسے خاندان میں کر دی جس کو بہار کی ہندوانہ معاشرت سے متاثر مسلم معاشرہ نسبی اعتبار سے پست سمجھتا تھا، اور خاص طور سے "پھلواری" کے مشائخ کا خاندان جو اس کو "ناک کٹانے" کے مرادف سمجھتا تھا، وہاں انھوں نے کسی تنقید کی پروا نہ کی، یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ اقدام وہی کر سکتا تھا جس کو اپنے عقائد پر اطمینان کامل ہو، یوں وعظ کہنا اور مضمون لکھ دینا آسان ہے مگر عملی اقدام وہی کر سکتے ہیں جو اولوالعزم ہوں!

ان کا دوسرا وصف یہ تھا کہ وہ عمر بھر ایک نہ تھکنے والے محنتی طالب علم رہے۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر بستر مرگ تک جبکہ ان کو اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی علمی تحقیق و جستجو میں مصروف رہے، راقم الحروف کے پاس ان کا آخری خط نومبر کی کسی تاریخ کا ہے انتقال سے

دس پندرہ روز پہلے لکھا تھا۔ اس کی ابتداء اس طرح کی تھی کہ یہ خط اپنے بستر مرگ سے لکھ رہا ہوں، اس خط میں بھی قرآن کریم کے چند الفاظ اور ان کی تعبیر پر تحقیقات کا مفصل ذکر تھا۔ ان کے اس خط کو پڑھ کر مجھے ایک بزرگ عالم کا واقعہ یاد آیا کہ انھوں نے اپنے آخری لمحات زندگی میں کسی سے فرائض کے ایک مسئلہ کو دریافت کیا، لوگوں نے کہا یہ آپ کا آخری وقت ہے اس وقت آپ یہ معلوم کر کے کیا کریں گے انھوں نے جواب دیا کہ کسی شے سے واقف ہو کر مرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ جاہل رہ کر مروں!

مولانا تمنا عمادی مجیبی ۱۳۰۵ھ میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۳۹۲ھ میں کراچی میں مسافرانہ بیکسی کی حالت میں فوت ہوئے حق تعالیٰ جل شانہ کی شانِ رحمت جو مغفرت کے لئے بہانہ ڈھونڈتی ہے ان کو بخش دے۔ (آمین)

(ماہنامہ فاران کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء ص ۹ تا ۱۰)

(علامہ تمنا کے علمی و تصنیفی کارناموں کی مزید تفصیلات کے لئے جمع القرآن و اعجاز القرآن شائع کردہ الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ کے شروع میں ہماری تحریر ملاحظہ ہو۔ طاہر)

حصّہ اوّل

روایات حدیث وسیرت کے مدوّن اول محمد ابن شہاب زہری

فتنہ روایات کا پس منظر

اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تقریباً تیئس سال تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے مستفیض ہوتے رہے اور علماً و عملاً دین کی ساری باتیں قولاً وفعلاً سیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ تعامل کے ذریعے تمام صحابہ میں دین کلاً و جزءً ہر طرح مروج ہوگیا۔ سارے مسلمان ہدایت قرآن پاک و تعلیم و تبیین رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے مطابق دین پہ چلنے لگے۔ پھر جب رسول صلے اللہ علیہ وسلم اپنا فرض انجام دے چکے اور اپنا کام پورا کر چکے اور اس عالم سے تشریف لے گئے۔ کل نفسٍ ذائقۃ الموت ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ کے بعد آپ کی تعلیم و تبیین کے مطابق تمام صحابہ کرام قرآن پاک پر عمل کر رہے تھے۔ عقائد و عبادات میں کسی قیاس و اجتہاد و اختراع و احداث کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فریضہ اولین یہی تھا کہ عقائد و عبادات جو دین لذاتہا ہیں۔ اور محض ابتغاءِ لمرضاۃِ اللہ ہی ان کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اور جن کا علم صحیح بغیر تعلیم کتاب رسول کسی کو کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ (اٰل عمران) یعنی اللہ تم میں سے کسی کو بھی عالم غیب کے حالات سے مطلع کرنے والا نہیں۔ ہاں اللہ اپنے رسولوں میں سے اس کے لئے جس کو چاہتا ہے۔ منتخب کرلیتا ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام کے پاس کوئی ذریعہ علم، آخرت کے نفع و نقصان سے متعلق بجز قرآن و سنت کے کچھ نہ تھا۔ البتہ معاملات میں آئے دن نئے واقعات ایسے ایسے آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر واقعہ کی جزئیات کے بالکل مطابق کوئی آیت یا کوئی تعلیم نبوی کی جستجو یقیناً محال عقلی ہے۔ اس کے لئے

ضرورت قیاس و اجتہاد کی پڑے گی اور صحابہ رضؓ کو معاملات کے فیصل کرنے میں قیاس و اجتہاد کی ضرورت پڑتی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی صحابی نے خلیفۂ وقت سے کہا کہ اسی قسم کا معاملہ میری موجودگی میں رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تھا تو آپؐ نے اس وقت یہ فیصلہ دیا تھا۔ اگر وہ روایت قرآن پاک کے خلاف نہ ہوئی تو خلیفۂ وقت نے پوچھا کہ تمہارے اس بیان کے گواہ بھی ہیں۔ اگر وہ گواہی میں دوسرے دو صحابیوں کو لے آیا، تو اس کی بات مان لی گئی۔ یا خلیفۂ وقت کو اس کے بیان سے قرآن پاک کی کوئی آیت بھی سند میں یاد آگئی۔ یا کسی دوسرے صحابی نے یاد دلادی تو اب ضرورت گواہی کی کیا رہی؟ ورنہ اگر وہ گواہ نہ لا سکے تو پھر اس بیان کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے خلیفہ نے اپنے قیاس و اجتہاد سے کام لیا۔

اور اگر اس صحابی کا وہ قول قرآن کے خلاف نظر آیا تو حضرت عمر فاروق رضؓ کیطرح صاف کہہ دیا کہ لَانَتْرُکُ کِتَابَ رَبِّنَا بِقَوْلِ اَعْرَابِیٍّ یعنی: ہم اپنے رب کی کتاب کو ایک بدّو کی روایت کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ وہ بدّو جھوٹا ہو سکتا ہے۔

عہدِ صحابہ رضؓ میں روایت

غرض یہ کہ عہدِ صحابہ رضؓ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد روایت کی ضرورت صرف فصلِ خصومات اور تصفیۂ معاملات ہی کے وقت محسوس ہوتی تھی کبھی کبھی خلیفۂ وقت یا جن کے ہاتھ میں اس وقت کسی مشکل معاملہ کا تصفیہ ہوتا تو دوسرے صحابہ رضؓ سے پوچھتے کہ کسی کو یاد ہے کہ اس قسم کا کوئی مقدمہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا ہو اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ فرمایا ہو۔

تصریحِ ضرورت

اور یہ ضرورت کیوں پڑتی تھی؟ صرف اسلئے کہ حتی الوسع وہ احتیاط کرتے تھے، وہ اپنے کو خواہ مخواہ کے قیاس و اجتہاد سے بچاتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ جب تک اسوۂ نبوتہ مل سکے ہم بطورِ خود کوئی راہ اختیار کریں۔ اسلئے جہاں قیاس و اجتہاد کا موقع ہوتا بھی، پہلے پوچھ لیتے تھے کہ مجھ سے پہلے خود رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے معاملہ کے متعلق اگر کوئی

فیصلہ دیا ہے تو بہتر ہے کہ وہی فیصلہ یہاں بھی رہے، ورنہ مجبورًا قیاس واجتہاد سے کام لیا جائے۔ پھر اگر وہ روایت جو ملی قرآن کے خلاف ہے تو فورًا رد کر دی گئی۔ یہ سمجھ کر نہیں کیا کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے خلاف یہ فیصلہ کیا ہے۔ بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ راوی غلط بیان کر رہا ہے۔ خواہ اسلئے کہ راوی کو جھوٹا سمجھا یا اسلئے کہ اسے ضعیف الحافظہ سمجھا یا اسے بے وقوف سمجھا۔

بے ضرورت روایت

اور بے ضرورت روایت بطور تذکرہ وذکرِ خیر کہ جب مجمع میں بیٹھے تو بیان کرنے لگے کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا اور اس طرح کیا۔ وغیر ذٰلک۔ اس کا مشغلہ تھا اور ضرور ہوگا۔ کیونکہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ یعنے، جس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے اس کو بہت زیادہ یاد کیا کرتا ہے۔ صحابۂ کرام رض کو جو محبت رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے تھی پوشیدہ نہیں۔ اسلئے یقینًا تابعین کی جماعت میں ہر صحابی جب بیٹھتے ہوں گے۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر ضرور کرتے ہوں گے۔ اور تابعین بھی ان سے ذرا ذرا بات ضرور پوچھتے ہوں گے۔ مگر یہ محض بہ تقاضائے محبت ذکرِ خیر ہی کے رنگ میں ہوتا تھا۔ اس کو دین کی تبلیغ نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اکابر صحابہ رض اس سے بھی احتیاط برتتے تھے۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر اس سے دین میں کوئی رخنہ پڑے اور لوگ کتابُ اللہ سے غافل ہو جائیں۔ اسی لئے امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وجزاہ عنّا وسائر المسلمین جزاءً حسنًا روایت حدیث کے بارے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ اور سختی سے صحابۂ کرام رض کو اس سے روکتے تھے اور صاف فرما دیا کرتے تھے۔ کہ حَسْبُنَا کتابُ اللّٰہِ یعنی ہم لوگوں کے لئے کتابُ اللہ کافی ہے۔

منافقینِ عجم اور فتنۂ روایت کی ابتداء

صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض کے عہدِ مبارک کی مجاہدانہ کوششوں کے نتیجہ میں جب ایران فتح ہوا تو اہل ایران پر اس کا بیحد اثر پڑا۔ اور پڑنا تھا۔ کیونکہ عرب کا اکثر خطہ ایران

کا باجگذار تھا۔ حجاز باجگذار تھا۔ توکم ازکم ایک حد تک زیر اقتدار ضرور تھا اور ایران اس وقت کے متمدن ترین ملکوں میں تھا جو فنون حرب واسالیب جنگ کے ماہر تھے۔ مگر مٹھی بھر عربوں نے نہایت قلیل مدّت میں اس طرح پورے ایران پر تقریباً غلبہ و تسلط حاصل کر لیا اور ایسا تسلط حاصل کیا کہ ایران کسی طرح بھی ان کے پنجۂ اقتدار سے نکل نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ آج تک اس وقت سے ایران مسلمانوں ہی کے قبضہ میں ہے۔ اور ان شاءاللہ رہے گا۔ ایران کے بعض مدبّرین نے انتقام کی راہیں سوچیں، مگر اسکے سوا کوئی دوسری راہ نہ نکلی کہ کچھ ایسے نوجوان منتخب کئے جائیں۔ جو ایران و عرب کے تجارتی و سیاسی تعلقات کی وجہ سے عربی زبان سے بھی آشنا ہوں اور ایران کے علوم متداولہ یعنی رمل و نجوم و جفر وغیرہ میں جن کا ایران میں بہت رواج تھا معقول مہارت رکھتے ہوں اور فنون حرب وغیرہ سے بھی باخبر ہوں۔ اور ہوشیاری و چالاکی، مکر و فریب، لبّاقی و عیّاری میں بھی ممتاز ہوں۔

غرض ایسے نوجوان ایک معقول تعداد میں ایران کے مختلف شہروں اور دیہاتوں سے چن کر مہیّا کئے گئے اور مناسب ہدایتیں اور تعلیمات انہیں دی گئیں۔ اور مدینہ طیبہ کی طرف سب کو روانہ کر دیا گیا۔ یہ مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت امیر المؤمنین فاروق اعظم رضؓ کے حضور میں حاضر ہو کر مشرّف بہ اسلام ہوئے کیونکہ بہ ظاہر اسی ارادہ سے آئے تھے۔ یہ سب مسلمان ہونے کے بعد تعلیم قرآن کے لئے حضرت ابوہریرہ رضؓ کے سپرد ہوئے اور وہ انہیں تعلیم قرآن کرنے لگے۔ اس دوران یہ لوگ صحابۂ کرام رضؓ اور یہاں کے مسلمانوں کا انداز دیکھتے رہے کہ ان کا اصول زندگی کیا ہے اور کس طرح رہتے ہیں۔ اور کہاں کہاں پانی مر سکتا ہے۔ چند ہی دنوں کے بعد اس کو خوب محسوس کر لیا کہ جب تک حضرت فاروق اعظم رضؓ زندہ ہیں۔ ہم لوگوں کی کوئی ریشہ دوانی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور ان کو عداوت بھی سب سے زیادہ ان ہی سے تھی۔ کیونکہ ایران کی فتح ان ہی کی سیاست دانی اور دور اندیشی کا نتیجہ تھی۔ مگر یہ لوگ اپنی جماعت میں سے کسی ایک کے ہاتھ سے بھی ایسا کام ہونا مناسب نہیں سمجھتے تھے جس سے ان کی جماعت بدنام یا مشتبہ ہو جائے

اس لئے اس جماعت نے ان اساری (قیدیوں) کو اپنا ہمراز بنایا۔ جو ایران سے جنگ کے موقع پر فتوحات کے سلسلے میں آئے تھے۔ اور یہ چونکہ اہل ایران نے ان کا فدیہ نہیں دیا۔ اور احسان کر کے چھوڑ دینا مناسب وقت نہ تھا۔ اسلئے ان کی ایک خاصی بڑی تعداد مدینہ منورہ ہی میں موجود تھی۔ وہ بہت آسانی سے اس جماعت کے ہمراز اور شریک مکر و فریب ہو گئے۔ خصوصاً وہ قیدی جو کہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جن میں فیروز لؤلؤ بھی تھا مؤرخین جو وجہ بھی لکھ دیں کہ اس کو فلاں وجہ سے فاروق اعظمؓ سے عداوت تھی۔ مگر درحقیقت وہ ایک ظاہری بہانہ تھا۔ اصل حقیقت اور حقیقی راز کو اس قاتل ملعون نے افشاء نہیں کیا۔ بلکہ ایک مصنوعی وجہ کا اعلان کیا گیا اور پھر روایات نے اور بھی اس غیر حقیقی وجہ کو حقیقی بنا کر چمکایا اور اصلی وجہ پر پوری طرح پردہ ڈالا۔ کیونکہ روایات کا سرچشمہ تو پھر یہی جماعت بنی جس کی تشریح آگے آتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ اس جماعت منافقین نے اپنا رسوخ تو صحابہ اور عام مسلمانوں میں خوب خوب قائم کیا اور اپنے ہر فرد کو ایک مخلص مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی مگر اندرون خانہ ابو لؤلؤ فیروز کے ہاتھوں امیرالمؤمنین حضرت فاروق اعظمؓ کو آخر شہید کرا چھوڑا۔

اب انتخاب خلیفۂ ثالث کے وقت ان منافقین قاتلہم اللہ فی الآخرۃ نے چاہا۔ کہ یہ موقع مسلمانوں میں انتشار ڈالنے کا ہے۔ اس وقت کچھ کرنا چاہیئے۔ حضرت عبیداللہ بن عمرؓ کے معاملہ میں کچھ اختلافی فضا پیدا کرانے کی کوشش بھی کی۔ مگر کوئی مفید راہ نہ نکلی اور حضرت امیرالمؤمنین ذوالنورین رضؓ کی خلافت مستحکم ہو گئی۔

یہ ایرانی منافقین کی جماعت اس انتخاب کے وقت تو کوئی کامیاب فتنہ برپا نہ کر سکی۔ مگر اس نے اس انتخاب ہی کو اپنا مرکز فتنہ بنایا اور نوجوانان بنی ہاشم میں اس انتخاب کے خلاف نہایت دانش مندانہ ریشہ دوانی آہستہ آہستہ شروع کی۔ مگر دیکھا کہ مدینہ طیبہ میں ابھی فیض یافتگانِ صحبت رسول ﷺ کی کافی جماعت موجود ہے۔ اس لئے یہاں اگر سرگرمی زیادہ دکھائی تو مشتبہ ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ جماعت مصر، عراق، شام، کوفہ

بصرہ اور مختلف مقامات میں منتشر ہوگئی اور وہاں انقلاب پیدا کرنے کی ریشہ دوانیاں اسی ایرانی قدیم اصول کے مطابق شروع کر دیں۔

ایران کا یہ دستور تھا کہ جب کبھی موجودہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی ضرورت کسی شخص یا جماعت کو محسوس ہوئی۔ تو موجودہ سے پیشتر جو خاندان برسر اقتدار تھا۔ اسکے کسی ممتاز فرد کو لے کر اچھالنے تھے۔ اور عام پبلک میں اس کا پروپیگنڈا کرتے تھے کہ یہ حکومت موجودہ افراد نے اس کی اصلی مستحق اور حقیقی حقدار کے حق کو غصب کر کے حاصل کر لی ہے۔ اس حکومت کا اصلی حقدار یہی شخص ہے اور اس خودساختہ حقدار کے فضائل و مناقب کا زبردست طور سے عوام میں خوب خوب اشتہار و اعلان کیا جاتا تھا اور موجودہ برسر اقتدار اشخاص کے قبائح و مثالب کی تشہیر کی جاتی تھی

بالکل اسی طرح یہ منافقین ایران میں دور دور مقامات اور قصبات و دیہات میں گھوم گھوم کر تو تعلیم دین و تبلیغ قرآن کے لئے پھرتے تھے۔ مگر اسکے ساتھ ساتھ موجودہ خلیفہ ثالث حضرت امیر المؤمنین ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے خلاف آہستہ آہستہ موقع موقع سے زہر افشانی بھی کرتے رہتے تھے اور کہتے کہ یہ خاندان بنوامیہ سے ہیں جب کہ خلافت کا حق خاندان بنوہاشم کا ہے۔ کیونکہ پیغمبر انہی میں مبعوث ہوئے اور کہتے کہ ساری دنیا میں بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کے خاندانی افراد کو اس کی سلطنت وراثت میں ملتی ہے۔ مگر یہاں دوسرے خاندانوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ لہذا ان غاصبوں سے چھین کر بنوہاشم کے اصل نمائندے حضرت علی رضؓ کو خلافت ملنی چاہیئے۔ غرض حضرت علی رضؓ کو ان کے مقابل حق دار بنا کر دکھاتے تھے اور کہتے تھے کہ خلافت کمیٹی نے انتخاب میں غداری سے (نعوذ باللہ) کام لیا۔ اسکے علاوہ حضرت علی رضؓ کے فضائل و مناقب ضرورت اور واقعیت سے جہت زیادہ خوب بڑھا بڑھا کر بیان کرتے۔ قرآن پاک کی اکثر آیتوں کا مورد ان ہی کو ثابت کرتے اور ان کی شان میں جھوٹی جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر لوگوں کو سناتے۔ وغیر ذالک

رفتہ رفتہ جہاں جہاں خاندان بنی امیہؓ کے افراد گورنر تھے۔ وہاں وہاں باقاعدہ

پلان کے تحت ہر ایک کے خلاف ریشہ دوانی شروع کر دی اور پھر مدینہ پہنچ کر اور ان مقامات بعیدہ سے وہاں کے مقامی لوگوں کو بھیج بھیج کر ان کے فرضی مظالم کی داستانیں مدینہ طیبہ میں سنانے اور سنوانے لگے اور شکایات بھی بارگاہِ خلافت میں مسلسل بھیجتے رہے ساتھ ہی بنی ہاشم کو ابھارتے رہے کہ چونکہ خلیفہ وقت خود بنی اُمیہ میں سے ہیں۔ اس لئے اپنی قرابت والے عمّال کی اس قدر شکایتیں سنتے ہیں اور پھر بھی کوئی صحیح انسداد نہیں کرتے حالانکہ حضرت امیرالمؤمنین ذوالنورین رضہ شکایات کا حال پوری دریافت و تحقیق کے بعد خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کو پتہ لگ گیا تھا کہ یہ سب مخالفین کی ریشہ دوانیاں ہیں، اسلئے وہ غلط شکایات پر کیا انسداد کرتے ؟ اور اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ ان عمّال کو بدل دینے سے ریشہ دوانی ختم ہو جائے گی. تو وہ یہ بھی ضرور کر دیتے۔ مگر اس کے بعد تو اور بھی میدان صاف ہو جاتا ہے اور وہ ان مقامات میں جہاں ان عمّال کیوجہ سے کھل کر اپنا کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے ہٹا دیئے جانے کی وجہ سے اور کُھل کھیلتے۔ اسلئے وہ شکایتوں کی تحقیق کرا کے ان کی بے بنیادی واضح کر دیتے تھے۔ ادھر بنی ہاشم کے خیالات ان منافقین کی ریشہ دوانیوں کے اثرات سے ان کیطرف سے خراب ہو جاتے تھے۔ ؎ حتیٰ کہ حضرت علی رضہ تک متاثر ہونے سے نہ بچ سکے۔

غرض تقریباً دس سال کی جدوجہد کے بعد یہ ایرانی منافقین کی جماعت مصر سے کچھ باغیوں کی ایک ٹولی کو مدینہ طیبہ بھیجنے میں کامیاب ہو گئی۔ جس نے مدینہ طیبہ میں بغاوت کا فتنہ برپا کیا اور حضرت امیرالمؤمنین ذوالنورین رضہ کو شہید کر ڈالا۔ بنی ہاشم بدگمانیوں کے اثر سے متأثر تھے ہی۔ اگر شریکِ بغاوت سب کے سب نہ ہو سکے۔ تو فتنہ

؎ یہ پروپیگنڈے کی طاقت اچھے بھلے آدمی کو بھی مریض کر دیتی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ بعض طلبا نے چھٹی کے لیے یہ پلان بنایا کہ مختلف مقامات پر کھڑے ہو کر مختلف الفاظ وانداز میں ماسٹر صاحب پر یہ ظاہر کیا جائے کہ ماسٹر صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ آخر ماسٹر صاحب سچ مچ کی حرارت محسوس کرنے لگے اور اسی ناسازیٔ طبع کی بناء پر وہ طلبا کو چھٹی دے کر آرام فرمانے گھر چلے گئے۔

پر دازوں کی مخالفت بھی نہ کی۔ ان کے علاوہ محمد بن اسماءؓ، اور محمد بن حذیفہ۔ جیسے دو ایک تو مستقل طور سے اس فتنہ میں شریک رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا فتنہ ان ہی ایرانی منافقین کا تھا۔ مگر مؤرخین نے ان ہی راویوں کی روایتوں کی بناء پر بعض غیر متعلق اکابرین کے نام بھی متعلقین میں درج کر دیئے مگر یہ سب تاریخ کو صحیح مان لینے کے بعد ورنہ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

مجھے چونکہ ان واقعات کی تشریح اس وقت مطلوب نہیں۔ اسلئے زیادہ تفصیل وحوالہ جات سے پرہیز کرتے ہوئے اصل مقصد کیطرف آتا ہوں۔ اتنی طویل تمہید بھی ضرورت کی بناء پر ضمناً ہو گئی۔ ناظرین معاف فرمائیں۔

منافقین ایران کی جدوجہد کے نتائج بد

غرض یہ کہ حضرت امیر المومنین ذوالنورین کی شہادت کے بعد جنگ صفین وجمل وغیرہ کے ہنگامے اور مسلمانوں کی خانہ جنگیاں، پھر امیر المومنین حضرت علی رضؓ کو مدینہ طیبہ سے کوفہ کھینچ بلانا اور وہاں ان کو طرح طرح کی ایذائیں دینا۔ پھر انہیں بھی شہید کر ڈالنا۔ پھر حضرت حسن رضؓ کو امیر المومنین حضرت معاویہ رضؓ سے لڑنے پر آمادہ کرنا۔ مگر ان کا نہ لڑنا اور مصالحت کر لینا اور اس جرم مصالحت کی سزا میں ان پر بھی قاتلانہ حملہ کرنا۔ اور پھر حضرت حسین رضؓ کو مدینہ طیبہ سے کوفہ سینکڑوں خطوط لکھ لکھ کر بلانا اور بلا کر غداری کرنا اور ان کو بھی شہید کر دینا۔[۲] غرض یہ سب کچھ ان ایرانی منافقین نے کیا اور اس حد تک مسلسل جدوجہد اور مسلسل فتنہ کوشیوں کے ساتھ نہایت ہوش گوش سے کیا کہ اگر کوئی دوسری قوم ہوتی تو خدا جانے کب کی فنا ہو گئی ہوتی اور دنیا میں اس کا کہیں نام ونشان باقی نہ رہتا۔ مگر چونکہ مسلمان آخری امت اور دین محمدی آخری

---

[۱] حضرت ابوبکرؓ کی بیوی اسماءؓ کے بطن سے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد ان اسماء سے حضرت علیؓ نے نکاح کر لیا تھا اس وقت یہ محمد بن اسماء چند سال کے تھے۔ اسلئے ان کی تعلیم وتربیت حضرت علیؓ کی آغوش میں ہوئی۔ [۲] بعض مؤرخین کی تحقیق ہے کہ واقعہ کربلا درحقیقت ایک افسانہ ہے جس طرح حضرت عمرؓ پر الزام لگانے کے لئے کتب خانہ اسکندریہ جلانے کا واقعہ یا برصغیر کے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے بلیک ہول کا واقعہ۔ ورنہ درحقیقت حضرت حسینؓ واقعہ کربلا سے آٹھ دس برس قبل قسطنطنیہ والی جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ وہاں ان کا مقام شہادت مقام حسین کے نام سے اب

دین اسلام ہے۔ اس کو قیامت تک رہنا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو بچالیا۔ ورنہ ان منافقین نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔

یہ منظر ان منافقین کے لئے بیحد باعث حیرت و استعجاب تھا کہ اصول پسند عجیب و غریب قوم ہے، اشخاص پرستی سے اس قدر پاک تو دنیا میں کوئی جماعت دیکھی ہی نہیں گئی۔ یہ فقط اصول جانتی ہے اور جان دینے کے لئے ہمہ دم تیار ہے۔ مگر حکم خدا کے مطابق۔ جب تک حکم خدا ثابت نہ ہو، اس وقت تک کیسا ہی عزیز ترین شخص کیوں نہ مارا جائے۔ یہ صبر کر کے رہ جائیں گے اور کبھی اپنے آپے سے باہر ہونگے۔

آخر کئی سال لگا تار جد و جہد اور پروپیگنڈے اور واقعات کربلا کی تصنیف کردہ مفصّل داستان ظلم کی کافی تبلیغ و اشاعت کے بعد توابین کے نام سے شیعوں کی ایک جماعت نے کچھ ہنگامہ برپا کیا جس کی سربراہی مختار کذاب کے ہاتھ میں تھی (اس نے جدید نبوّت کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ مگر شیعیت بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن بہر حال جوئندہ یابندہ۔ آخر ان ہی منافقین، ایران اور ان کے شاگرداِن رشید کی ریشہ دوانیوں کی بدولت ایک مدّت دراز کے بعد ہی سہی۔ مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اور بالآخر دشمن کا پروپیگنڈا رنگ لایا اور ہاشمی و اموی کشمکش شروع ہوگئی جس کے نتیجہ میں خلافت اموی کا خاتمہ اور عباسی ہاشمیوں کی ابتدا ہوئی۔

قرآن چھین لینے کی جد وجہد

حضرت حسین رضؓ کی شہادت کے بعد ان منافقین ایران نے اس کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ مسلمان ہزار آپس میں لڑیں مگر کبھی کمزور نہیں ہوسکتے۔ اس قوم کو کوئی ہزار مارنا چاہے۔ یہ قوم اس وقت تک کبھی نہیں مر سکتی۔ جب تک اس کے پاس قرآن موجود ہے۔ اس لئے جس طرح بھی ممکن ہو، اس قوم کے ہاتھ سے اسکے قرآن کو چھین لینا چاہیئے۔

مگر قرآن تو ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہے۔ کیونکہ ہر گھر میں بوڑھا، بچہ، جوان عورت، مرد سب پڑھتے ہیں اور اگر ہر گھر میں نہیں، تو ہر محلہ میں متعدد حافظ

پورے قرآن کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھنے والے موجود ہیں۔ اسلئے اس قوم سے قرآن کا چھین لینا تو محال تھا اور آج تک محال ہے اور قیامت تک محال رہے گا۔

تو اس دشواری کو محسوس کرتے ہوئے ایرانی منافقین اور ان کے شاگردان رشید نے یہ صورت نکالی کہ کسی طرح کوئی دوسری چیز ایسی ان مسلمانوں کے سامنے پیش کیجائے جو قرآن کا بدل ہو سکے اور اس کی اہمیت ان کے خواص پر نہ سہی، ان کے عوام ہی پر اتنی ثابت کی جائے کہ یہ لوگ قرآن سے زیادہ اس بدل قرآن کی طرف جھک پڑیں

آغاز روایاتِ کاذبہ

روایات حدیث کا رواج حضرت امیرالمومنین فاروق اعظم رضؓ کے بعد بر سبیل تذکرہ محبت و ذکر خیر عام طور سے ہونے لگا تھا۔ کیونکہ اب فاروق اعظم جیسا دوراندیش روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ جس کی بات سب مان سکیں۔ اور انفرادی احتیاط بھلا کب تک قائم رہ سکتی تھی۔ صحابہ کرام احتیاط فرماتے بھی تھے تو کتنے ہی منافقین تابعی بن کر ان کی کبھی کبھی کی بیان کردہ روایات تو چاروں طرف پھیلا دیتے تھے تاکہ لوگوں کی توجہ ان زبانی روایات کی طرف زیادہ ہو۔ اور قرآن مجید سے توجہ ہٹے

پھر یہ منافقینِ ایران حضرت امیرالمؤمنین علی رضؓ کے فضائل و مناقب کی جھوٹی روایتیں اور اہل بیت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے معنی بدل کر فضائل اہل بیت کی روایتیں خوب خوب گھڑ گھڑ کر کوفہ، بصرہ، عراق و شام اور مصر وغیرہ میں کافی طور سے مشہور کر چکے تھے۔ قرآن پاک کی شان نزول کے متعلق من گھڑت روایتیں بنا بنا کر سینکڑوں آیتوں کا مورد حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین رضؓ کو قرار دے کر اچھی طرح شائع کر چکے تھے اور شخصیت پرستانہ مزاج کی وجہ سے لوگوں میں عموماً اور عجمی نومسلموں میں خصوصاً ان روایتوں کیطرف رجحان محسوس کر چکے تھے۔ بات آسانی سے ذہن میں آگئی کہ ان ہی روایات موضوعہ کے ذریعہ مسلمانوں کی توجہ قرآن پاک کی طرف سے پھیر کر ان کو روایات مختلفہ کے الجھاوے میں ڈال دینا چاہیئے اور ان ہی روایات کے ذریعے قرآن کو جس حد تک بھی ممکن ہو، نا قابلِ اعتبار، نا قابل فہم اور نا قابل

عمل بنا کر رکھ دینا چاہیئے اور طرح طرح کے اختلافات قرآنی، الفاظ اور معانی ڈال کر قرآن کو ان سے معطل و مہجور چھوڑوا دینا چاہیئے۔

یہ ایک ایسی کامیاب رائے اور ریکس کے مطابق کامیاب کوشش تھی کہ اگر واقعی اللہ تعالٰی نے خود اپنے ذمّے قرآن پاک کی حفاظت نہ لے لی ہوتی۔ تو کبھی قرآن پاک محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ کاش اس وقت وہ منافقین اور ان کے وہ تلامذہ ہوتے تو یقیناً ایمان لے آتے اور سچّے دل سے مومن مسلم ہو جاتے کہ ان کی ساری مسلسل جدّ وجہد اور لگاتار ایسی خطرناک کوشش اور مسلمانوں کی پوری غفلت وسہل انگاری کے باوجود آج تک قرآن پاک اپنے اسی تواتر تام کے ساتھ ہر مسلمان کے گھر میں اور لاکھوں حافظوں کے سینوں میں محفوظ موجود ہے۔ اور اسی طرح موجود ہے جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت امت کے لئے چھوڑا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ

غرض ان منافقینِ ایران نے حضرت علی رض و حضرت حسین رض کی شہادت کے بعد سے خاص طور سے وضع احادیث کا مستقل کام شروع کر دیا اور روایتوں کا سلسلہ اتنے زبردست طریقے سے شروع کیا۔ کہ عوام مسلمین کی ساری توجہ ان ہی روایات کی طرف منعطف ہو گئی اور عوام کا رجحان دیکھ دیکھ کر متاخرین خواص بھی آخر ان کی طرف جھک پڑے۔ کچھ تو اسلئے کہ خربُزے کو دیکھ کر خربُزہ رنگ پکڑتا ہے۔ یہ منافقین ایران بھی تو عام طور سے اکابر اور تابعین ہی سمجھے جاتے تھے۔ ان کا اثر ورسوخ بھی تو عوام وخواص میں کچھ کم نہ تھا۔ اسلئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک وہ جماعت جو بظاہر اکابر تابعین سمجھی جاتی ہے اور علم وفضل میں شہرت رکھتی ہے۔ وہ جس کام کو اتنے انہماک کے ساتھ دینی تبلیغ اور اسلامی اشاعت کے نام سے کرے۔ اور پھر عوام کا ایک کافی طبقہ ان کی طرف متوجہ نہ ہو۔ یہ سارے مناظر دیکھ کر بھی کیا کچھ اصاغر تابعین بھی ؟ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" پر عمل نہ کرتے ؟ اسلئے کچھ بھولے بھالے کم عمر تابعین ان منافقین کے دھوکے میں اگر آ گئے ہوں، تو تعجب کیا ہے ؟ یا ممکن ہے کہ یہ بھی ان پر اتہام ہی ہو۔ جب

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جھوٹی روایتیں گھڑنے میں ان منافقین کو کچھ باک نہ ہوا تو ان کے تلامذہ کو کچھ تابعین پر تہمت لگانے اور ان کو بھی خواہ مخواہ اپنا شریک ثابت کر دینے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

تبع تابعین کا خطرناک دور

بہر حال تبع تابعین کا نہایت خطرناک دور گذرا۔ کیونکہ یہ دور روایات حدیث کا عجیب بے پناہ دور تھا۔ جس کا جس سے جو جی چاہتا تھا۔ روایت کیا کرتا تھا۔ نہ روایات کی جانچ پڑتال تھی، نہ راویوں کی دیکھ بھال۔ جس شخص نے قال رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کہا اور سننے والے دوڑے، چاہے وہ کہنے والا کوئی بھی ہو۔ کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ تم نے تو رسُول اللہ صلَّے اللہ علیہ وسلّم کا زمانہ پایا نہیں۔ پھر آخر کس سے سُنا؟ جس دیہات میں پہنچ کر جس نے قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی رٹ لگائی اور اس کی آؤ بھگت شروع ہو گئی۔ اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لئے پہلے دس پانچ صحیح روائتیں بیان کیں یا ایسی باتیں کہیں، جو قرآن پاک کے مطابق ہوں۔ اسکے ساتھ ساتھ ایک آدھ روایت قرآن کے خلاف بھی گھڑ دی، جس کی مخالفت زیادہ نمایاں نہ ہو یعنی عوام جس کی مخالفت کو محسوس نہ کر سکیں اور جس کی کوئی تاویل بھی ہو سکے۔ اگر کسی نے کوئی اعتراض یا سوال کیا۔ تو استادانہ شان دکھاتے ہوئے کسی نہ کسی منطقی استدلال کے ساتھ تاویل پیش کر دی۔

روایات کی چھان بین

روایات کا ذبہ کا یہ طوفان بے پایاں جو اُٹھا اور ذرا بھی تھمتا نظر نہ آیا تو آخر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جو خلفاء بنی امیہ ہی میں کے ایک فردِ فرید اور اسلام کے ایک خلیفۂ رشید تھے، اس فتنہ کو بڑھتے ہوا دیکھ کر بہت گھبرائے تھے۔ بنی امیہ میں کے ایک فرد، جن کے خلاف سینکڑوں طرح کی ریشہ دوانی جاری تھیں۔ اگر روایات کا بالکل سدِ باب کر دیتے، تو صرف چند اکابر ہی ان کا ساتھ دیتے۔ سارے منافقین اور ان کے تلامذہ اور عوام جو روایات کے بے پایاں سمندر میں تیر رہے تھے سب

کے سبب ان کے خلاف ایک بارگی بغاوت کر بیٹھنے اور کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد نہ ہوتا اسی لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار انھیں نظر نہیں آیا کہ روایات کی جانچ پڑتال کے لیے روایات قلمبند کرنے کا حکم تمام ممالک میں نافذ کر دیا جائے، تاکہ جو ذخیرہ روایات جمع ہو جائے۔ پھر اس کے علاوہ جو روایتیں کی جائیں۔ وہ ناقابل قبول قرار دیدی جائیں۔ کذّابین و وضاعین کو کم سے کم اب آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے، آئندہ کے لئے وضع سیلاب بند ہو جائے اور جمع شدہ مجموعہ روایات کی پوری جانچ پڑتال کے بعد صحیح اور موضوع روایات کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔

مگر افسوس کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی، خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالے ابھی تین سال بھی نہ ہوئے تھے۔ کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور یہ مہم ان کے عہد میں سَر نہ ہو سکی۔ لیکن خلیفۂ وقت کے حکم جمع و تدوین کا بہانہ راویان حدیث کو مل گیا۔ اور پھر ہر شخص کچھ نہ کچھ جمع کرنے لگا۔ مگر جانچ پڑتال کا صرف نام رہا۔ نہ کسی نے اس کا کوئی اصول بنایا۔ نہ واقعی اس کی کوشش کسی نے کی۔ ہر جامع روایات کی یہی کوشش تھی کہ سب سے زیادہ ذخیرہ میرے پاس جمع ہو اور سب سے زیادہ لوگوں سے میں روایت کروں اور سب سے زیادہ مجھ سے لوگ روایت کریں۔

جمع فقہ و جمع حدیث

بعض اکابر نے ابتدا میں ہر قسم کی احادیث کے جمع کرنے کے بجائے صرف قانونی (فقہی) احادیث کو جمع کرنا زیادہ مناسب سمجھا کیونکہ جمع فقہ کا مطلب یہ تھا کہ تعامل عہد نبوی و تعامل عہد خلفائے راشدین کو جمع کر لیا جائے اور حقیقتاً کام کی چیز یہی تھی۔ وہ دور روایات میں عن فلان و عن فلان کرنے کا یعنی عنعنہ کا نہ تھا۔ بلکہ ہر شخص فقط قال رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کہہ دیا کرتا تھا اور یہ کہہ کر ایک قول پیش کر دیتا تھا۔ اس لئے فقہاء نے جمع فقہ میں عنعنہ کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ کیونکہ اس وقت تو عنعنہ کا رواج ہی نہیں ہوا تھا۔ مگر جب روایات کی جانچ پڑتال شروع ہوئی اور یہ پوچھا جانے لگا کہ تم نے یہ کس سے سُنا اور انھوں نے کس سے سُنا۔ تو مجبوراً راویان حدیث کو عنعنہ ایجاد کرنا پڑا۔ مگر فقہاء سے نہ کبھی یہ پوچھا گیا۔ نہ ان کو اس کی ضرورت پڑی،

کیونکہ یہ تو وہی باتیں لکھ رہے تھے۔ جو عمل درآمد میں تھیں جن کو ہر مسلمان جانتا تھا کسی کو ان باتوں کے صحیح ہونے میں اس وقت کچھ اشتباہ نہ تھا۔ بخلاف عام احادیث کے کہ ان روایات کے ذخائر میں ہزاروں باتیں تعامل کے خلاف تھیں۔ قرآن کے خلاف تھیں اور بیشمار روایتیں باہم بھی مختلف تھیں۔ اسلئے لوگوں کو یہ پوچھنے کی ضرورت پڑی کہ تم نے کس سے سنا اور انہوں نے کس سے سنا۔

مگر فقہاء کا ذخیرہ تو نہایت محدود ذخیرہ تھا جس سے روایت پرستوں کی سیری نہیں ہوتی تھی۔ نہ ان کے مقاصد حل ہوتے تھے۔ راویانِ حدیث نے خوب خوب پروپیگنڈا کیا۔ اور چونکہ ان کے مسائل کی بنیاد تعامل اُمّت پر تھی، اور منسوب الی الرسول اور منسوب الی الصحابہ روایات پر نہیں تھی

جو مسئلہ فقہ انہوں نے لکھا، وہ بغیر عنعنہ کے لکھا اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم یا کسی صحابی کی طرف اس کو منسوب نہیں کیا۔ اس لئے وہ سارے مسائل ان کے مخترعہ قرار دے کر ان پر ان کے اپنی طرف سے اختراع و احداث کا الزام دَھر دیا گیا۔ اور اپنی موضوع اور من گھڑت روایات کو خاص رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل بنا کر عنعنہ کے ذریعہ مُستند ثابت کر کے عوام پر یہ ثابت کیا کہ دیکھو، ہم تو حدیث رسول پیش کرتے ہیں اور یہ فقہاء اپنی رائے اور اپنا قیاس و اجتہاد حدیث رسولؐ سے بہتر سمجھتے ہیں بغرض ان وجوہ کی بناء پر تمام کمزور فقہاء نے مجبورًا پھر دہی راہ اختیار کرلی، جو راویانِ حدیث کی اور اپنی فقہ کی عمارت پر بھی ان ہی کی خود ساختہ روایات کا پُشتہ لگا دیا۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ رح جیسے سچے اور خلفاءِ راشدین رض کے بالکل نقش قدم پر چلنے والے بزرگ کے بعض تلامذہ بھی ان کے بعد بھی روایات کے اس سیلاب میں بہہ گئے اور متاخرین تو بہت کافی بھکے' ور امام ابوحنیفہ رح کے صحیح اُصول پر قائم نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین کی کثیر جماعت امام ابوحنیفہ رح سے بیحد خفا رہی۔ یہاں تک کہ ان کو مرجئہ، گمراہ اور کیا کیا کچھ نہ کہا، صرف اسلئے کہ ان کے نزدیک اصل اہمیت تعامل

کی نفی روایتوں کی بہ زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔

قرآن پاک پر روایات کے حملے

قرآن کے اثر کو روک دینے کے لئے
ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا۔ (اکبر الٰہ آبادی)

ان منافقینِ ایران نے قرآن پر روایات کے ذریعے مختلف طرح کے حملے کئے، جن کی مجملاً تشریح حسبِ ذیل ہے:۔

۱۔ جمع و تدوین یعنی مشہور یہ کیا کہ یہ قرآن پاک جو موجودہ ترتیب اور موجودہ ہیئت میں ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس طرح نہیں تھا۔ بلکہ بقول ان راویوں کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جنگ یمامہ میں ستّر حفّاظ قرآن کی شہادت دیکھ کر حضرت امیر المومنین فاروق اعظم رضؓ نے بعہدِ خلافت صدیقی رضؓ تقریباً سنہ ۱۲ھ میں یہ ضرورت محسوس کی کہ قرآن پاک کو کتابی صورت میں مجتمع کر لیا جائے۔ کیونکہ اس وقت تک قرآن پاک صرف حفّاظ کے سینوں ہی میں محفوظ تھا۔ ستر حافظ تو ایک جنگ ہی مارے گئے۔ اسی طرح اگر موجودہ حفّاظ سب کے سب شہید ہو گئے۔ تو پھر کہاں قرآن اور کہاں یہ امت؟ غرض حضرت فاروق اعظم رضؓ نے جمع قرآن کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے حضرت امیر المؤمنین صدیق اکبر رضؓ کو اس طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے حضرت زید بن ثابت جو کاتبِ وحی بعہد نبوی آخر عہد میں تھے۔ ان کو آمادہ کیا اور پھر تمام صحابہ کرام سے ہڈی، تختی، ٹھیکری، لکڑی، چھال، پتے اور کاغذ کے ٹکڑے جن پر انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن پاک کی آیتیں لکھ لکھ کر رکھی تھیں۔ حاصل کئے۔ سب کو ملا ملا کر، حافظوں سے تصدیق کرا کر قرآن پاک کو جمع کیا۔ اس وقت آخر سورۂ توبہ، لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ الخ خزیمہ یا ابوخزیمہ انصاری کے پاس ملا۔ غرض یہ ایک نسخہ قرآن کریم

مرتب ہو کر حضرت صدیق اکبر رضؓ کے پاس محفوظ رہا۔ ان کے بعد حضرت فاروق اعظم رضؓ کے پاس رہا۔ ان کے بعد امّ المؤمنین حضرت حفصہ رضؓ کے پاس چلا گیا اور وہیں ان کی زندگی تک رہا۔

پھر حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں لوگوں نے قرآن پاک میں اختلافات ڈالنا شروع کیئے۔ حذیفہ ابن الیمان نے حضرت ذوالنّورین رضؓ کو پھر جمع قرآن کیطرف متوجہ کیا۔ انہوں نے حضرت حفصہ رضؓ کے ہاں سے مستعار وہ صحیفہ جمع کردہ حضرت صدّیق اکبر رضؓ منگوایا۔ اور اس کی متعدد نقلیں کرائیں اور حضرت امّ المؤمنین حفصہ رضؓ کے پاس ان کا مصحف واپس کر دیا۔ اسکے نقل کے وقت بھی حضرت زید بن ثابت کو سورۂ احزاب کی ایک یا دو آیتیں یاد آئیں، جو مصحف میں نہ تھیں۔ بڑی تلاش کے بعد ابو خزیمہ بن ثابت الانصاری کے پاس وہ آیت یعنی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ الخ جس کے بارے میں زید نے کہا کہ ہم یہ آیت اس جگہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم سے سنتے تھے۔ یہ نہیں کہا۔ میں پڑھتا تھا یا ہم لوگ پڑھتے تھے۔ غرض یہ کہ اب یہ آیت بھی اپنی جگہ پر لگا دی گئی

یہ دو روایتیں بیحد مشہور ہیں۔ اس لیئے ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ غیر صحاح میں تو عجیب و غریب روایتیں بہت ساری ہیں۔ جن میں جمع و تدوین کے واقعات عجیب و غریب درج ہیں۔ اور دیکھنے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں روایتیں صحاح میں حتیٰ کہ بخاری میں بھی ہیں۔

ان دونوں روایتوں سے آیتوں کی ترتیب، سورتوں کی ترتیب سب بعد کی ثابت ہوتی ہیں۔ ورنہ آیتوں کی تقدیم و تاخیر وغیرہ کا شبہ تو بہت آسانی سے پیدا کیا جا سکتا ہے اور پیدا کرنے والے پیدا کرتے ہیں۔ جن کی بناء پر صرف یہی روایتیں ہیں۔ میں نے جمع قرآن کے متعلق ساری روایتوں پر اور خصوصًا بخاری و ترمذی وغیرہ کی مذکورہ بالا دونوں روایتوں کی محدثانہ اصول ہی کے مطابق قابل دید تنقید کی ہے اللہ تعالےٰ توفیق دے کہ اسے چھپوا دوں۔ [1]

[1] جو نا تمام ہی تحقیق اللہ کے فضل و کرم سے جمع قرآن کے نام سے ہم بھی شائع کر چکے ہیں۔ (ناشر)

۲۔ اختلافِ قراءت ایسی سینکڑوں روایتیں گھڑی گئیں کہ قرآن کی فلاں آیت میں فلاں لفظ اس طرح بھی ہے اور اس طرح بھی ہے اور اُس طرح بھی۔ مثلاً مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ مَلَّاكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی ہے اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی۔ اور پھر ان اختلافات کو درست ثابت کرنے کے لئے یہ حدیث بھی وضع کرلی گئی کہ اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ یعنی قرآن سات لغتوں میں اتارا گیا۔ اور اس حدیث کو عجیب و غریب مضحکہ انگیز عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ ناسخ و منسوخ ایک بہت بڑا فتنہ یہ پیدا کیا کہ قرآن پاک کی بعض آیتیں بعض دوسری آیتوں کی ناسخ ہیں۔ جن کا صحیح علم بغیر روایات کی مدد کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلئے قرآن تابع ہے اور روایات متبوع۔ قرآن محکوم ہے اور روایات حاکم۔ معاذاللہ من ذالک۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ

اس موضوع پر بھی میرے متعدد مضامین رسالہ "اُصولِ خمسہ" میں (جو ایک مناظرہ کے سلسلہ میں "اخبار اتحاد" پٹنہ کے ساتھ بطور ضمیمہ کے شائع ہوا تھا) اور رسالہ "سادات" میں جو پھلواری ضلع پٹنہ سے شائع ہوتا تھا۔ چھپ چکے ہیں۔ مناظرہ اس پر ختم ہو گیا کہ میں نے مثبتین نسخ فی القرآن سے تین سوالات کئے۔ جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن پاک میں کتنی آیتیں قائلینِ نسخ کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ ان کی صحیح تعداد بتائیے۔

۲۔ کم سے کم پانچ آیتیں متفق منسوخ بطورِ مثال کے پیش کیجئے۔ جن کا نسخ آپ لوگوں کے نزدیک قطعی ہو۔

۳۔ منسوخ آیتوں پر عمل جائز ہوگا یا ناجائز؟

ان سوالات کے بعد ساری بحث ختم ہوگئی اور بڑے بڑے مناظرین دم بخود مبہوت رہ گئے اور پھر اس وقت تک کسی کا قلم نہ اٹھا۔

۴۔ شانِ نزول قرآن پاک کی اکثر آیتوں سے متعلق شانِ نزول کے نام سے

روایتیں گھڑ گھڑ کر اُن آیتوں کے صحیح مفہوم کو بدل دینے کی نامبارک کوششیں کی گئیں اور اس طرح تحریف معنوی کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا گیا۔ مثلاً سورۂ احزاب میں آیۃ تطہیر اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ کو جو صاف صاف ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے حضرت علی رضؓ، حضرت فاطمہ رضؓ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کی شان میں روایت کساء وضع کر کے بتا دیا۔ اور اس پر اس قدر اصرار ہے۔ اس صریح جھوٹی حدیث کو بعض سفہاء نے متواتر لکھ مارا۔ حالانکہ ان روایتوں کا ایک بھی سلسلۂ روایت ایسا نہیں، جو شیعوں یا کذّابوں کے وجود سے خالی ہو اور قرآن پاک کے سیاق و سباق کی مخالفت تو سب سے بالا ہے

اسی طرح اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ ۝ کے متعلق حضرت علی رضؓ کے رکوع کی حالت میں انگوٹھی ایک سائل کو دے دینے کی روایت وضع کر کے اس آیت سے حضرت علی رضؓ کی ولایت عامّہ و تامّہ ثابت کرنے کی گمراہ کن کوشش کی گئی

اور پھر انبیاء کرام علیہم السّلام پر متعدد ناپاک حملے بھی ان ہی شان نزول والی روایتوں کے ذریعے کیئے گئے۔ مثلاً حضرات ابوالبشر و اُمّ البشر آدم و حوا علیہما السّلام کا نعوذ باللہ ارتکاب شرک کر لینا اور توبہ کا بھی ذکر نہ کرنا۔ وغیرہا من الرّوایات الشّنیعہ

۵۔ تفسیری روایتیں

بعض آیتوں سے متعلق بطور تفسیر کے خود رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم سے یا بعض صحابہ سے روایتیں منسوب کر ڈالیں کہ آپ نے یہ تفسیر اس آیت کی بیان فرمائی۔ حالانکہ وہ تفسیر سیاق و سباق قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِہٖ مُفْتَرَیٰتٍ سے اس سے پہلے کی دس سورتیں مُراد ہیں۔ لِئَلَّا یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتَابِ سے مراد لکی یعلم ہے اور "لا" زائد ہے بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ۝ کِرَامٍ بَرَرَۃٍ ۝ میں سَفَرَۃٍ سے مراد فرشتے ہیں۔ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ اور کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ ایک تختہ ہے جو عرش کے دائیں جانب رکھا ہوا ہے اور تمام مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ سب اسی میں لکھا ہوا ہے۔ اسی کا نام لوح محفوظ ہے اور اسی کو

کِتَابٌ مکنون بھی کہا گیا ہے اور کِتَابٌ مَسْطُورٌ سے بھی وہی تختہ لوح محفوظ مراد ہے یا توریت مراد ہے۔ وغیرہا من الروایات الکثیرۃ الموضوعۃ

۶۔ واقعات موضوعہ

بعض روایتیں ایسی وضع کر دی گئیں جن کا کوئی ایسا واقعہ بیان کر کے کسی آیت کے ساتھ جوڑ ملا دیا گیا کہ وہ آیت اپنے صحیح مفہوم کی طرف سے ہٹ کر کسی نئی بات کی طرف اس واقعہ کے دیکھ لینے والے ذہن کو پھیر دے۔ جو اس روایت کے وضع کرنے والے کا مقصد ہے۔ یا کم سے کم اس آیت کی اہمیت کم ہو جائے یا ناجائز طور سے بڑھ جائے یا منشا ہی میں تبدیلی واقع ہو جائے۔ مثلاً ہاروت و ماروت اور چاہِ بابل و زہرہ وغیرہ کے واقعات پھر ایک ساحرہ عورت کا واقعہ جو ایک دوسری حاجت مند عورت کو چاہِ بابل پر لے جا کر اس کی تعلیمِ سحر کا باعث ہوئی تھی۔ اور وہ عورت جو پھر توبہ کے لئے اپنی آخری عمر میں آمادہ ہوئی۔ تو اسکے لئے کوئی راہ نہ نکلی۔ مدینہ طیبہ پہنچی تو جناب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم وفات فرما چکے تھے۔ حضرت عائشہ صدّیقہ رضؓ، حضرت صدیق اکبر رضؓ اور تمام صحابہ کبار رضؓ نے بہت سوچا۔ مگر اسکے دوبارہ مومنہ ہونے کی کوئی شکل نہ نکلی۔ (دیکھیئے مستدرک حاکم وغیرہ اور تفسیر عزیزی حضرت شاہ عبدالعزیز رحمؒ)

۷۔ مکیّت و مدنیّت

بعض سورتوں یا آیتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا قطعیت کے ساتھ ایسا غلط فیصلہ کیا۔ جس سے تاریخی طور سے مطلب سمجھنے میں دھوکا ہو جائے۔ مثلاً سورۃ کوثر کو مکیّہ لکھ دیا۔ اسی طرح بعض مکّی سورتوں کی چند یا ایک آیت کو مدنی لکھ دیا۔ جو محض ایک ظنّی اور قیاسی رائے ہے، مگر اس بناء پر قطعی احکام صادر کرنے لگے اور لگے قطعی آیات کو ظنّی قیاس کا پابند کرنے۔

۸۔ تقدیم و تاخیر نزولی

اسی طرح یہ روایتیں کہ فلاں سورۃ پہلے اترا۔ اور فلاں بعد کو اور پھر اسی بناء پر آیتوں کے صریح معانی میں تبدیلی و تغیر پیدا کرنے لگے۔ حالانکہ صریح معانی جو عبارت النص سے نکل رہے ہیں۔ قطعی ہیں۔ اور یہ تقدیم و تاخیر کی روایتیں ظنّی وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔

غرض اس قسم کے بہت سے اور بھی عنوانات قائم ہو سکتے ہیں۔ میں نے محض قلم برداشتہ سرسری طور سے یہ آٹھ عنوان بطور نمونہ کے پیش کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان روایاتِ موضوعہ کے ذریعے قرآن پاک پر طرح طرح کے حملے کئے گئے۔ اور ہر ممکن کوشش پورے اہتمام کے ساتھ کی گئی کہ کسی طرح یہ کتاب مسلمانوں سے چھوٹ جائے اور معطل رہ جائے اور از کارِ رفتہ ہو جائے۔ چنانچہ واقعی قرآن پاک عام طور سے مسلمانوں سے چھوٹ گیا۔ اور معطل ہو گیا۔ علمائے مقلدین کو ہدایہ اور شرح وقایہ کافی ٹھہری۔ غیر مقلدین کو صحاح ستّہ سے فرصت نہیں۔ صوفیوں کو مکتوبات اور ملفوظات سے بڑھ کر کسی کی بھی ضرورت نہیں۔ قرآن پاک صرف اس کام کے لئے ہے کہ اسے بے معنی ومطلب صرف رمضان میں یا روزانہ ہی یہی کچھ ورق پڑھ لیا جائے اور یہ بے سمجھے پڑھنے والے بھی مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ دو تین فیصد ہیں ورنہ عام لوگوں کے لئے تو اس کا مصرف، فقط یہی ہے کہ کبھی اسے بطور عملیات و تسخیر جنات کے پڑھ لیا جائے۔ یا کسی کے مرنے پر ایصال ثواب کے لئے یا اس کا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکانے کے لئے۔

وفائے وعدہ حفاظت قرآن

مگر حقیقت یہ ہے کہ اتنے شدید اور ایسے دیرپا حملوں اور ہر طرف سے حملوں کے باوجود قرآن پاک کا اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ ہر تغیر و تبدل سے قطعی طور سے محفوظ رہنا۔ اور معجز نما تواتر کے ساتھ ساری دنیا کے مسلمانوں میں بلا اختلاف ایک حیثیت سے ایک قراءت سے، ایک رسم خط سے موجود رہنا اور اس طرح خود قرآن پاک کا اور قرآن پاک کی ہدایتوں کا دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ جانا اور ان لوگوں کو جو اس سے دور پڑے ہوئے ہیں۔ پکار پکار کر اپنے قریب بلانا۔ وہ یہ باتیں ہیں۔ جو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ ○ کے وعدہ صادقہ کو بآوازِ بلند سارے عالم کو یاد دلا رہی ہیں۔ اور لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ کی شان

بلند کا چار دانگ عالم میں اعلان کر رہی ہیں۔ پھر کون ہے جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرّہ بھی ہو۔ اور ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ سن کر سرِ تسلیم خم نہ کرے۔ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتَابٍ۔

عام راویانِ حدیث

اسماءُ الرِّجال کی کتابوں کا مطالعہ بغور کیجئے تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ کم سے کم پچاس فیصدی راوی عجمی ہیں اور باقی پچاس فیصدی میں سے بھی اسّی فیصدی غیر حجازی یعنے کوفی، بصری، شامی، عراقی وغیرہ۔ جن میں روافض، خوارج، قدریے، جبریئے معتزلے۔ غرض ہر فرقے کے لوگ کثرت سے موجود نظر آئیں گے۔ جن میں اکثر ان ہی منافقین ان کے ذرّیات یا تلامذہ یا فیض یافتگانِ صحبت ہی ملیں گے۔

مخلص راویانِ حدیث

اسی جماعت میں بعض مخلص اور سچے راویانِ حدیث بھی ہیں۔ جن کو ان کاذبوں اور وضّاعوں کے جھٹلانے کے لئے یا تعاملِ عہدِ نبوی و عہدِ خلفاءِ راشدین کا صحیح حال بتانے کے لئے صحیح روایت کرنے کی ضرورت پڑی، کیونکہ اگر دنیا میں جھوٹی روایتوں ہی کا رواج چھوڑ دیا جاتا۔ اور ان کذّابوں اور وضاعوں کے ہاتھ میں عامۃ المسلمین کو رہنے دیا جاتا۔ تو پھر آگے چل کر امّتِ مسلمہ حق و باطل کا کوئی فیصلہ نہ کر سکتی۔ اس لئے یہ مخلصین خاموش نہ بیٹھ سکے۔ اور جتنا بھر جانتے تھے صحیح روایتیں بیان کرنے لگے اور جھوٹوں کو جھٹلانے لگے۔ پھر اسماء الرجال کا ذخیرہ جمع کرنے لگے جس میں ان کذابوں اور وضاعوں کا پوشیدہ حال تحقیق کر کے لکھنے لگے تاکہ ان کی روایتوں سے آگے چل کر مسلمان دھوکہ نہ کھائیں اور حق و باطل کی تمیز کر سکیں۔ تنقیدِ روایات کے اصول بنائے اور حتی الوسع خود بھی ان اُصول پر
عمل کیا اور تلامذہ کو بھی ان اصول پر عمل کرنے کی تاکید کی۔ فجزاہم اللّٰہ خیر الجزاء

فتنۂ روایات اور بعض راویانِ حدیث

امام شعبہ رح نے حضرت سفیان ثوری رح سے فرمایا تھا۔

کلما تقدمتم فی الحدیث	یعنی تم لوگ جس قدر حدیثوں کیطرف
تاخرتم عن القرآن	آگے بڑھتے جاؤ گے۔ قرآن پاک سے
وددت ان اکون وقاد	اسی قدر پیچھے دُور ہوتے جاؤ گے۔
الحمام ولما اعرف الحدیث	کاش میں حدیث نہ جانتا اور حمام
	کا ایندھن جلانے والا ہوتا۔

راویانِ حدیث پر امام شعبہ رح کی یہ پیشین گوئی اسقدر صحیح اُتری کہ پہلے تو اس جماعت کے بعض افراد میں قرآن پاک کیطرف سے بے اعتنائی ہونے لگی پھر رفتہ رفتہ بے خبری۔ یہاں تک کہ بعض میں تو بغض وعناد تک کا اثر ہو گیا۔

عام ناظرین عموماً اور طبقۂ پرستارانِ روایات خصوصاً بغض وعناد کے لفظ سے گھبرائیں گے۔ مگر فلسفۂ نفسیات سے باخبر حضرات الانسان حریصٌ علیٰ ما منع کے اصول سے خوب واقف ہیں۔ قرآن پاک کے ساتھ شغف رکھنے والوں نے جب روایات پرستوں کو روایات سے روک کر قرآن پاک کیطرف انہیں متوجہ رہنے پر اصرار کیا تو ان کی ضد نے انہیں روایات پر مصر ہونے اور قرآن پاک سے متوحش رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ جب جمع روایت کو اہل حق نے باعث ضلالت اور بدعت کہنا شروع کیا۔ تو صرف جمع روایات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اس مفہوم کی روایتیں بنا بنا کر مشہور کیں کہ قرآن پاک بھی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد عہدِ صدیقی وفاروقی وعثمانی میں جمع ہوا۔ اور جس طرح ہم لوگ روایات کی سند ڈھونڈھتے ہیں۔ اسی طرح جمع آیات وسُور میں بھی خلفاءِ راشدین رضہ نے سندیں طلب کی تھیں اور اگر روایات میں

شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ تو پھر بعض آیات کے متعلق بھی تو جمع قرآن کے وقت شکوک پیدا ہو گئے تھے جس کی فلاں فلاں روایتیں ہیں۔

غرض اسی طرح بیسیوں روایتیں جمع قرآن کے متعلق اپنے جی سے گھڑ گھڑ کر مشہور کیں اور اپنی تصنیفوں میں درج کر کے خوب شائع کیں۔ یہاں تک کہ دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی ایسی ایسی روایتیں داخل کر دیں۔ ہم نے اس مضمون کے پہلے نمبر میں فتنۂ روایات کا پس منظر مختصراً بتلانے کی کوشش کی تھی۔

اس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہو جائے گا۔ کہ روایات کی ابتداء محض دین کو تفریق و انتشار میں گم کر دینے کی نیت سے ایران کے منافقین نے کی اور روایات کو وحی اور قرآن پاک کے مدمقابل سب سے پہلے اسی جماعت نے بنا کر عام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ ان کا تو مقصود ہی یہی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں سے قرآن پاک کو چھوڑوا دیں اور قرآن پاک سے پھیر کر ان کا رُخ ان روایات کی طرف پھیر دیں۔ اسلئے انہوں نے قرآن پاک کو مشتبہ کر دینے والی روایتیں خوب خوب وضع کیں۔

ان کے بعد ان کے چیلے ان ہی کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ ان چیلوں میں سے بعض تو اپنے اساتذہ سے بھی بڑھ گئے اور بڑھنے کا موقع بھی تھا۔ کیونکہ اساتذہ کے وقت میں بعض صحابہ کرام موجود تھے۔ صحابہ کرام کے سامنے زیادہ جھوٹ بولنے کا موقع کم تھا اور تلامذہ کے عہد میں صحابہؓ باقی نہ رہے۔ اسلئے جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا رہا۔ ان کے ذریات کذب و افتراء میں تیز ہوتے گئے۔

ان منافق اساتذہ کے بعض ذریات تو اپنے اساتذہ ہی کی طرح واقعتاً منافق تھے۔ لیکن زیادہ تر سیدھے سادے مسلمان ہی تھے۔ جو اپنے اساتذہ کو تابعی و تبع تابعی سمجھ کر ان کے ساتھ حُسنِ عقیدت رکھتے تھے اور ان اساتذہ کے ہر کذب و افتراء پر ایمان بالغیب لے آتے رہے۔ کہیں کچھ شبہ پیدا بھی ہوا تو تاویلات کے ذریعہ اپنے دل کی تشفی کر لی۔

مُشتے نمونہ از خروارے

اب ہم مثال کے طور سے ایک ایسے راوی حدیث کا حال بیان کرتے ہیں جو روایت حدیث میں تو ایک معقول پایۂ رکھتے ہیں۔ مگر قرآن پاک کے ساتھ ان کا برتاؤ بالکل غیر مسلمانہ رہا۔ دیکھئے اور عبرت پکڑیئے۔

عثمان بن ابی شیبہ۔ ان کو عثمان بن محمد بن ابراہیم بن عثمان بن خوستی (یا خواستی واؤ معدولہ سے) العبسی ابوالحسن بن ابی شیبہ الکوفی کہتے ہیں۔ ان کی مسند (ذخیرۂ روایات) اور تفسیر مشہور ہے۔ ترمذی و نسائی کے سوا جماعت ائمۂ حدیث ان سے روایت کرتی ہے۔ بخاری میں ان سے ۵۳ روایتیں اور مسلم میں ۱۳۵ ہیں۔

امام محمد بن ادریس ابوحاتم الرازی فرماتے ہیں کہ کسی نے ان کے سامنے شیخ البخاری محمد بن عبداللہ بن نمیر سے عثمان بن شیبہ کے بارے میں پوچھا۔ تو انہوں نے فرمایا سُبحٰنَ اللهِ مِثلُهٗ یُسألُ عنهٗ یعنے: سبحان اللہ! ایسے شخص کے متعلق بھی کچھ پوچھا جاتا ہے؟ ابن ابی حاتم ان کے متعلق اپنے والد بزرگوار سے روایت کرتے ہیں کہ بہت سچے آدمی تھے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ محمد بن حمید الرازی اور عثمان بن ابی شیبہ دونوں ثقہ ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ ان میں سے کون زیادہ آپ کو محبوب ہیں۔ تو فرمایا کہ دونوں ثقہ ہیں، دونوں امین ہیں، دونوں مامون ہیں۔ ایک دوسرے شخص نے سے کہا کہ ابوبکر بن ابی شیبہ اور عثمان بن ابی شیبہ دونوں ثقہ ہیں۔ سچے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں۔

مگر امام دارقطنی اپنی کتاب التصحیف میں ابوالقاسم بن کاس سے اور وہ ابراہیم الخصاف سے روایت کرتے ہیں کہ عثمان بن ابی شیبہ نے اپنی تفسیر ہم لوگوں کے سامنے پڑھی، تو (سورۂ یوسف) پڑھا۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السَّفِينَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ [1] تو لوگوں نے کہا کہ قرآن میں جَعَلَ السِّقَايَةَ ہے تو عثمان بن

---

[1] آیت کے اصل معنی یہ ہیں۔ جب ان کا سامان تیار کرا دیا تو اپنے بھائی کے سامان میں گلاس رکھوا دیا۔ عثمان بن ابی شیبہ نے سقایہ (گلاس) کے بجائے سفینہ (جہاز) پڑھا۔ معنی یہ ہوئے کہ اپنے بھائی کے سامان میں

ابی شیبہ نے کہا کہ میں اور میرا بھائی (یعنی ابوبکر بن ابی شیبہ) عاصم کی قراءت نہیں پڑھتے۔ [1]

اسی کتاب میں امام دارقطنی احمد بن کامل سے اور وہ حسن بن حباب القری سے روایت کرتے ہیں کہ عثمان بن ابی شیبہ نے اپنی تفسیر میں ان کے سامنے پڑھا۔ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ٥ کو آلم ترٰ (یعنی الف، لام، میم، ت، ر) کو حروف مقطعات بنا دیا۔

اسی کتاب میں یہ بھی مروی ہے کہ سورہ بقرہ میں جو [2] وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ہے اس کو بن ابی شیبہ وَاتِّبَعُوْا بکسر الباء پڑھتے تھے یعنی بصیغۂ امر۔

اتنا تو علامہ ابن حجر عسقلانی رہ نے تہذیب التہذیب جلد ۷ صـ۱۵۱ میں لکھا ہے اور خلاصۃ التہذیب صـ۲۶۲ میں ابن عبد العزیز الخزرجی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ خ م د س ق یعنی ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایتیں لی ہیں اور لکھا ہے کہ یحییٰ ابن معین نے ان کو ثقہ و امین اور ابوحاتم نے انہیں صدوق کہا ہے مگر امام احمد بن حنبل رح نے ان کی کچھ روایتوں کو منکر قرار دیا ہے۔ پھر لکھتے ہیں وکان یصحّف فی القرآن یعنی: یہ قرآن پاک میں تصحیف کیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی لکھا ہے۔ وَقِیْلَ کَانَ لَا یَحْفَظُہٗ یعنی ان کی براءت کے لئے یہ تاویل بعضوں نے کی ہے کہ قرآن یہ یاد نہیں رکھتے تھے۔ اسلئے ایسی غلطی ہو جایا کرتی تھی۔

---

[1] اس سے شبہ ہوتا ہے کہ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ صرف عاصم کی قراءت میں ہے اور باقی قاریوں کی قراءت جعل السفینۃ ہے۔ حالانکہ جعل السفینۃ کسی کی بھی قراءت نہیں۔ ماہرین قراءت اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ تمنا۔ [2] بنی اسرائیل کی برائیاں گنواتے ہوئے قرآن مجید نے ان کی ایک برائی یہ گنوائی ہے کہ وَاتَّبَعُوْا اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے مگر یہ ابن ابی شیبہ کہتا تھا کہ آیت یوں نہیں بلکہ یوں ہے کہ واتبعو الخ یعنی نعوذ باللہ تم کو چاہیئے کہ تم ان چیزوں کی پیروی کرو۔ جو شیاطین، سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے۔

امام ذہبی رحمہ میزان الاعتدال ص۸۱ جلد۲ میں اُن کے متعلق لکھتے ہیں :-

لَمْ یحلك مِنْ اَحَدٍ من المحدّثین من التصحیف فی القرآنِ الکریمِ اکثر مِمَّا حُکِیَ عن عثمان بن ابی شیبۃ وقرأ : فضُرِبَ بَینھم بسنّور لَہٗ ناب ، وَاِذا قِیلَ فقال قراءۃ حمزۃ عندنا بدعۃ یعنی : قرآن پاک میں تصحیفات کی حکایتیں جتنی عثمان بن ابی شیبہ سے بیان کی گئی ہیں۔ ان سے زیادہ کسی محدث سے بھی نہیں بیان کی گئیں۔ (گویا بعض دوسرے بھی ہیں گو ان سے کم

ابن ابی شیبہ سورۃ الحدید کی اس آیت

فَضُرِبَ بَیْنھُم بِسُوْرٍ لَّہٗ بَابٌ ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی گئی جس میں ایک دروازہ تھا۔ کو بِسِنُّوْرٍ لَّہٗ نَابٌ پڑھا کرتے تھے جس کے معنے یہ ہیں کہ ان کے درمیان ایک بلی کھڑی کر دی گئی، جس کے ایک دُم تھی۔)

اور جب ٹوکا گیا تو بولے حمزہ کی قراءت ہمارے نزدیک بدعت ہے۔ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ حمزہ کے سوا باقی سارے قراء بسنّور لہٗ نابٌ پڑھتے تھے۔ حالانکہ دنیاءِ قراءت میں یہ کسی کی قراءت نہیں اور نہ کسی صاحبِ عقل و دین کی یہ قراءت ممکن ہے۔ عربی دان حضرات وَاتَّبَعُوا کی جگہ وَاتَّبِعُوا اور بسُورٍ لَّہٗ باب کے عوض بِسِنَّوْرٍ لَّہٗ نَابٌ کے معنی کو سمجھیں اور انصاف سے کہیں کہ یہ قرآن پاک کے ساتھ ٹھٹھا اور استہزاء ہے یا نہیں؟ کیا کسی مسلم سے ایسی توقع ممکن ہے۔

(فتنۂ روایات کے متعلق اس مختصر تمہید کے بعد اب آپ حدیث و سیرت کے مدوّن اوّل ابن شہاب زہری کے متعلق مضمون ملاحظہ فرمایئے۔ یہ مضمون جب پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا تو اس پر اہلِ حدیث حضرات کی طرف سے کچھ اعتراضات ہوئے تھے علامہ تمنا نے اس پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ پہلے وہ تبصرہ پھر اصل مضمون ملاحظہ ہو۔)

ابن شہاب زہری کا شجرۂ نسب

ابن شہاب زہری پر میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس سے مقصد صرف ان کی روایتی کمزوریاں دکھانی تھیں اور یہ ثابت کرنا تھا کہ ان کی روایتیں قابل اعتماد نہیں ہوسکتیں۔ جب تک کوئی دوسری دلیل ان کی کسی حدیث کو معتمد علیہ ثابت نہ کرے۔ چنانچہ ہم نے خود محدثین کے اقوال سے معہ سند و حوالۂ کتب ثابت کر دیا کہ یہ مُرسل حدیثیں بہت زیادہ روایت کیا کرتے تھے اور ایسے ایسے مجہول لوگوں سے روایت کرتے تھے جن کو ان کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور بعض ایسے لوگوں سے بھی روایت کرتے تھے۔ جن سے ان کا سماع حدیث ثابت نہیں۔ ان لوگوں سے بھی جو ان کے بچپن ہی میں بلکہ ان کی ولادت سے بھی پہلے وفات پا چکے تھے۔ اس لئے ان کی مُرسل حدیثیں بمنزلہ ریح سمجھی جاتی تھیں

اور یہ مدلس بھی تھے اور ان کی تدلیس بدترین قسم کی تدلیس ہوا کرتی تھی۔ اور تدلیس ایک طرح کا کذب ہے۔ اور یہ سب باتیں بعض اکابر محدثین ہی کے اقوال سے معہ حوالہ کتب وصفحات لکھی گئی ہیں۔

پھر ان کے تشیع کے بھی قرائن ہیں کہ از رُوئے تقیہ سنّیوں میں سنی بنے ہوئے تھے۔ اور شیعوں میں شیعہ ہی رہے۔

ان تمام باتوں میں سے جہاں تک مجھ کو علم ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اور دے بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ہم نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں لکھی ہے۔ محدثین ہی کے اقوال انہیں کی کتابوں کے حوالے سے پیش کر دیئے ہیں۔ ابن شہاب زہری، عبد الملک بن مروان اور ان کے بیٹوں خلفاءِ بنوامیّہ کے زمانے میں دربار کے حاضر باشوں میں رہ گئے اور پھر سرکاری قاضی

بھی رہے ہے۔ (مرآۃ الجنان ج۱ ص۲۶۲) میں نے ان باتوں کا ذکر اس مضمون میں نہیں کیا کیونکہ مقصود اُن کی توہین و تذلیل نہ تھی۔ بلکہ ان کی روایتی وثاقت و عدم وثاقت ظاہر کر دینے سے کام تھا۔

مگر چونکہ یہ "زہری" کہے جاتے ہیں اور محدثین و مؤرخین ان کو بنی زہرہ لکھتے ہیں۔ اسلئے میں نے اس کی بھی کرید کی۔ پھر بنی زہرہ قریشی قرار دیئے جانے کیوجہ سے لوگ ان کو مدنی بھی لکھتے ہیں۔ میں نے ان باتوں کی بھی تحقیق کی کہ یہ واقعی زہری قریشی اور مدنی ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ ان کے وطن کے متعلق جہاں تک پتہ ملا کہ یہ شامی تھے۔ آیلہ کے رہنے والے۔ ایلہ بستی تھی۔ شام کی سرحد اسی سے شروع ہوتی تھی۔ اسکے بعد حجاز کی سرحد ملتی تھی۔ وہاں یہ اپنا کاروبار کرتے تھے میں نے اس کا ثبوت کتاب کے حوالے سے دیا جس کی تردید ہو نہیں سکتی۔ درحقیقت یہی ان کا آبائی وطن تھا۔

مگر چونکہ عام روایت پرستوں کے خرمن عقیدت پر میرے اس مضمون سے بجلی گر گئی تھی۔ ان میں میرے خلاف غیظ و غضب کا ایک جوش تھا۔ رہا اور رہے لیکن کسی کے بس میں نہیں ہے کہ میری کسی بات کی بھی تردید کر سکے۔ کچھ لوگ لے دے کر زہری کے شجرۂ نسب کو محاذ جنگ بنا کر میدان میں آ دھمکے۔ میں نے بنی زہرہ کا نہایت وسیع شجرۂ نسب لکھ دیا ہے جس کی مثال ان رُوات پرستوں کو خواب میں بھی نظر نہ آئی ہوگی۔ پھر میرے پیش کئے ہوئے شجرۂ نسب کو وہ غلط بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسلئے ان لوگوں نے یہ صورت نکالی۔ کہ محدثین و مؤرخین نے جو لکھا ہے۔ اسی کو بار بار پیش کر کے مجھ کو کم علم یا کوتاہ نظر اور

لہ عام طور سے لوگ ثقاہت بولتے اور لکھتے ہیں۔ بعض اہل علم کی تحریروں میں بھی "ثقاہت" کا لفظ دیکھا ہے جو غلط ہے۔ ثقہ سے ثقاہت عوام نے مصدر بنا لیا۔ ثقہ کا صحیح مصدر "وثاقت" ہی ہے۔ تمنا عفرلہ

لوگوں کے سامنے غلط گو ثابت کریں اور صرف اسی ایک بات کو غلط ثابت کر کے عوام پر ثابت کریں کہ پورا مضمون اسی طرح غلط ہے۔

میں مدت سے سُن رہا تھا کہ اہل حدیث فرقے کے بعض پرچوں میں ابن شہاب زہری کے نسب پر مضامین نکلے ہیں۔ مجھ تک کوئی پرچہ نہیں پہنچا۔ میں نے کوئی کد نہیں کی کہ اچھا ابن شہاب موالی بنی زہرہ نہ سہی خالص زہری ہمہ تن قریشی اور سرا پا مدنی سہی۔ مگر مرسل روایت کے خوگر تھے۔ مدلس اور بدترین مدلس تھے۔ وغیرہ وغیرہ الزامات جو اُن پر ہیں اگر یہ سارے الزامات صحیح ہیں اور نہیں رفع ہو سکتے تو کیا صرف ان کا زہری، قریشی اور مدنی ہونا ان کو ثقہ و حجت و سند بنا دے گا۔ یہ لوگ اتنا نہیں سوچتے۔

ابھی میرے ایک عزیز دوست نے صحیفۂ اہلحدیث کراچی کا حدیث نمبر بابت ۱۳۷۱ھ بمطابق ۱۹۵۲ء میرے پاس بھیج کر مولانا عبداللہ صاحب لائل پوری کے مضمون "امام زہری کا شجرۂ نسب" کی طرف مجھ کو متوجہ کیا ہے۔ یہ مضمون شاید الاعتصام گوجرانوالہ میں بھی اس سے پہلے یا بعد کو چھپا ہے۔ میں اسکے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

صاحب مضمون نے زہری کے آباؤ واجداد کا شجرہ، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کا پدری شجرہ پھر مادری شجرہ لکھ کر بظاہر داد تحقیق دی ہے۔ اسکے بعد زہرہ کا شجرہ پیش کیا ہے۔ پہلے تینوں شجروں سے کوئی بحث نہیں۔ کیونکہ ان تینوں شجروں سے زہری کو کوئی سروکار نہیں۔ باقی رہا خاص زہرہ کا شجرہ جن کے دو بیٹے تھے عبد مناف اور حارث یہاں تک تو موصوف مجھ سے متفق ہیں۔

عبد مناف کا وہ صرف ایک ہی بیٹا وہب کو قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے جس کو میں نے بھی اپنے مقالے میں پیش کیا ہے۔ مگر بعد کو میں نے علماءِ انساب و محدثین کی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ عبد مناف کے دو بیٹے تھے۔ وہب اور اُہیب۔ وہب کی ایک بیٹی جناب آمنہ والدہ ماجدہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم تھیں۔ اور ایک بیٹے عبد یغوث تھے۔ عبد یغوث کے تین بیٹے

ارقم، اسود اور خلف تھے۔ ارقم کے بیٹے عبداللہ، اسود کے بیٹے عبدالرحمٰن اور خلف کے بیٹے کا نام بھی اسود ہی تھا۔

عبداللہ صاحب نے ابن خلدون کا اتباع کر کے عبد مناف کا ایک ہی بیٹا وہب کو قرار دے کر وہب ہی کے تین بیٹے مالک، نوفل اور عبد یغوث کو قرار دے دیئے۔ یہاں تک ہوتا تو سمجھا جاتا کہ انہوں نے استیعاب اور لسان المیزان وغیرہ کتابوں پر نظر نہیں ڈالی ہے۔ صرف ابن خلدون ہی تک ان کی نظر محدود تھی۔ اسلئے وہی غلطی یہ بھی کر گئے جو ابن خلدون سے ہوئی۔

مگر موصوف نے کمال یہ کیا کہ ابو وقاص کو مالک کا بیٹا قرار دیا اور دونوں کو دو شخصیتیں سمجھے۔ حالانکہ دونوں ایک تھے۔ مالک ہی کی کنیت ابو وقاص تھی۔ اور مالک ابو وقاص کے بیٹے وقاص کا نام ہی غائب کر دیا۔

پھر حارث کی شاخ میں بھی ایک نام چھوڑ دیا یعنی حارث کے بیٹے عبد۔ اور عبد کے بیٹے عبد عوف کا نام نکال پھینکا ہے۔ اور عبد ہی کا بیٹا عوف کو قرار دیا ہے۔ کم سے کم استیعاب ہی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کے حالات دیکھ لیئے ہوتے تو دونوں کے صحیح شجرۂ نسب ان کو معلوم ہو جاتے۔

اس کے بعد حارث کے منہ بولے بیٹے عبداللہ کا شجرۂ نسب نقل کیا ہے یہ کوئی نیا شجرۂ نسب نہیں ہے۔ یہ وہی شجرۂ مصنوعہ ہے جس کو میں نے خود اسی بڑے شجرے میں درج کر دیا ہے۔ مگر اس شجرے کو میں نے ایک فرضی، مصنوعی اور بوگس شجرہ قرار دیا ہے۔ اور شروع میں لکھ دیا ہے کہ محدثین و آئمۂ رجال زہری کا سلسلۂ نسب حسب تصریح ذیل لکھتے ہیں۔ محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبداللہ بن شہاب بن عبداللہ بن حارث بن زہرہ الخ

تو جب ہم خود مضمون کو شروع ہی مذکور بالا عبارت سے کر رہے ہیں اور اسکے بعد دلائل سے اس کی تردید کر رہے ہیں۔ پھر بھی ہمارے سامنے محدثین اور آئمۂ

رجال کے لکھے ہوئے اس شجرۂ نسب کا پیش کرنا کیسا کھلا مصادرہ علی المطلوب ہے۔ ہمارا تو اعتراض ہی انہیں محدثین وائمۂ رجال پر ہے۔ ہم تو اس شجرۂ نسب ہی کو مصنوعی اور جعلی قرار دے رہے ہیں اور اپنے اس دعوے کے دلائل پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے دلائل کا جواب تو دیا نہیں جاتا۔ اور جو لوگ ہمارے مدعا علیہ ہیں ان کے وہی اقوال پیش کئے جاتے ہیں۔ جن اقوال پر ہمارا اعتراض ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ بنی زہرہ کے دو شجرے صحیح ہیں۔ ایک حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ والا شجرہ اور دوسرا حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف والا شجرہ

ان دونوں کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ ان دونوں شجروں کے افراد کے درمیان باہمی مصاہرت ومناکحت کے رشتے برابر قائم ہوتے رہے۔ بلکہ دوسرے قریشیوں کے ساتھ بھی ان دونوں شجروں کی مصاہرت برابر رہی۔ اگر یہ عبداللہ بن حارث والا کوئی تیسرا شجرہ بھی ہوتا۔ تو ضرور اس تیسرے شجرے کے افراد کی مصاہرت ومناکحت بھی ان دونوں شجروں میں سے کسی شجرے کے افراد سے ہوتی یا قریش کے دوسرے خاندان سے ہوتی۔ مگر اس تیسرے جعلی شجرے کے کسی فرد کے ساتھ کسی دوسرے قریشی نے کسی طرح کی مصاہرت پیدا نہیں کی۔ یہ چھوٹا سا شجرہ جو ابن شہاب کو بنی زہرہ میں سے ثابت کرنے کے لئے بنالیا گیا ہے۔ اس میں زہری سے پہلے یا بعد کسی عورت کا نام تو ہے ہی نہیں لے دے کر زہری کی ماں کا پتہ ملتا ہے جو زہری کے چچیرے پردادا کی بیٹی تھیں۔ اور اخیر میں زہری کی صاحبزادی کے متعلق معلوم ہوتا ہے جو زہری کے بھتیجے سے بیاہی گئی تھی۔ اللہ اللہ، خیر سلا

رہ گئے مرد۔ تو عبیداللہ سے لے کر ابن شہاب یعنے محمد تک چھ نام ہیں۔ ان میں سے کس کی شادی کہاں ہوئی تھی۔ اس کا پتہ لگا یئے۔ تو صرف ابن شہاب کے باپ مسلم کا پتہ ملتا ہے کہ ان کی شادی ان کے باپ عبیداللہ کی چچیری بہن سے ہوئی۔ یعنی شہاب کے دو بیٹے تھے۔ عبداللہ اکبر اور عبداللہ اصغر۔

عبداللہ اکبر کے صرف ایک بیٹا تھا اور عبداللہ اصغر کے صرف ایک بیٹی مگر غالباً عبداللہ اکبر اپنے چھوٹے بھائی سے بہت بڑے تھے یا عبداللہ اکبر کے بیٹے عبیداللہ اپنے باپ کی جوانی کی اولاد تھے اور عبداللہ اصغر کو بڑھاپے میں صرف ایک بیٹی ہوئی تھی ۔ اسلئے عبیداللہ سے تو عبداللہ اصغر کی بیٹی کی شادی نہ ہوئی ۔ بلکہ عبیداللہ کے بیٹے مسلم سے ہوئی ۔ مگر عبیداللہ کی شادی کہاں ہوئی تھی ؟ عبداللہ اکبر اور عبداللہ اصغر کی شادیاں کہاں ہوئی تھیں ۔ کچھ معلوم نہیں ۔ ان کے اوپر کا حال نہ معلوم ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ حارث ، عبدمناف ، زہرہ وغیرہم کی شادیوں کا بھی پتا لگانا مشکل ہے اسلئے اگر شہاب کی شادی کا پتہ نہیں لگتا تو کیا محل اعتراض ہے ۔

خود ابن شہاب محمد بن مسلم کی شادی کہاں ہوئی تھی ؟ ان کے بھائی عبداللہ بن مسلم کی شادی کہاں ہوئی تھی ؟ عبداللہ بن مسلم کے بیٹے محمد ، جن کو ابن اخی الزہری (زہری کا بھتیجا) کہتے ہیں ۔ ان کی شادی کا تو پتہ ملتا ہے کہ خود ابن شہاب کی بیٹی ام الحجاج سے ہوئی تھی جس سے ایک نالائق بیٹا ہوا جس نے باپ کو محض میراث کے لالچ میں قتل کرا دیا ۔

لیکن ابن شہاب اور ان کے بھائی کی شادیاں کہاں ہوئی تھیں کچھ معلوم نہ ہو سکا ۔ غرض ابن شہاب کے خاندان میں صرف دو بیٹوں کا پتا ملتا ہے ایک تو ابن شہاب کی والدہ کا ۔ کہ وہ ان کے دادا کی اپنی چچیری بہن تھیں ۔ دوسری ان کی ایک بیٹی کا جو ان کے بھتیجے سے بیاہی گئی تھیں ۔ یعنی جو لڑکیاں اس خاندان میں تھیں ۔ وہ اپنے گھر سے باہر نہیں گئیں ۔ اور جو لڑکیاں باہر سے آئیں وہ خاندان قریش کی نہ تھیں ورنہ ضرور انساب کی کتابوں میں ان کا ذکر ہوتا ۔

تو ابن شہاب کے خاندان کا قریش کے کسی خاندان سے بھی رشتہ مصاہرت و مناکحت کا نہ ہونا اس کی صاف اور کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ان کو خاندانِ قریش سے کوئی نسبی تعلق نہ تھا اور یہ تو ہم اپنے مضمون میں ثبوت کے ساتھ لکھ چکے ہیں ۔ کہ ابن شہاب شامی تھے ۔ ایلہ کے رہنے والے تھے ۔ مدنی ہرگز نہ تھے ۔ ان کے بنی زہرہ

ہونے کے گمان پر محدثین و مؤرخین نے ان کو مدنی لکھ دیا ہے۔
یہ بھی کوئی نہیں بتاتا کہ ابن شہاب کے والد مسلم جب بنی زہرہ سے قریشی تھے تو پھر مہاجرین میں سے تھے یا مکہ میں ہی رہے۔ فتح مکہ سے پہلے ایمان لائے؟ یا بعد فتح مکہ کے؟ اور پھر کہاں رہے؟ کس شغل میں رہے؟ کب مرے؟ اور کس طرح مرے؟ اسی طرح مسلم کے باپ عبید اللہ کے متعلق بھی یہی سب سوالات ہیں جن کا کوئی جواب دینا ممکن ہی نہیں۔
اب ان کی قرابت کے لوگوں کو دیکھئے۔ جن کو ائمہ رجال نے ان کا قرابت مند بتایا ہے ان میں سے شرفاءِ بنی زہرہ کو جو ان کا قرابت مند لکھا ہے وہ تو قابلِ اعتناء نہیں کیونکہ ائمہ رجال نے ان کو بھی نسباً زہری مان لیا ہے۔ اسلئے ان کے ہر ہمعصر زہری کو وہ ان کے اقران میں لکھ دیا کرتے تھے۔ غیر زہری میں چند نام میری نظر سے گذرے ہیں جن کو ائمہ رجال نے ان کے اقران میں لکھا ہے مثلاً

۱۔ نافع بن مالک بن ابی عامر الاصبحی ابو سہیل التیمی المدنی۔ روی عنہ الزہری وہو من اقرانہ و ابن اخیہ انس بن مالک ابن انس بن ابی عامر۔ (تہذیب التہذیب جز ۱۰ صـ ۴۱۲، فذالک تیمی)

۲۔ یزید بن مروان الاسدی ابو روح المدنی مولیٰ آل زبیر روی ابنت عن ابن الزبیر و انس والزہری وہو من اقرانہ۔ (تہذیب التہذیب صـ ۳۲۵) وذالک اسدی۔ بل من موالی بنی اسد۔

۳۔ نافع بن عبد اللہ بن شیبہ بن عثمان بن ابی طلحۃ العبدری ابو سلیمان الحجبی المکی وقد ینسب الیٰ جدہٖ۔ روی عنہ .... والزہری وہو من اقرانہ (تہذیب التہذیب ج ۱ صـ ۱۰) و ذالک عبدری حُجبی)

۴۔ محمد بن عبد المنکدر بن عبد اللہ الهُدیر بن عبد العُزّیٰ بن عامر بن الحارث بن الحارثہ بن سعد بن تیم بن مرۃ التیمی ابو عبد اللہ روی عنہ یوسف و المنکدر و ابن اخیہ ابراہیم بن ابی بکر ابن المنکدر و ابن اخیہ عبد الرحمٰن۔ و زید بن اسلم

وعمرو بن دینار والزھری وھم من اقرانہ (ج ۹ ص۴۷۳ تہذیب التہذیب)
محمد بن المنکدر کان تیمیًا

۵۔ زید بن اسلم۔ کان من موالی عمر رضؓ

۶ عمرو بن دینار المکیؒ ابو محمد الاثرم الجمحی کان من مَوالِی الجمحیین الکعبی ابو المطرف الکوفی ویقال البصری۔

۷۔ طلحۃ بن عبدُ اللہ بن کریز بن ربیعہ بن بلال الخزاعی روٰی عن ابن عمر و ابی الدَّرداء وعائشۃ وحسین بن علی والزھری وھو من اقرانہ (تہذیبُ التہذیبُ ۵ ص۲۲) روٰی عنہُ الزّھری وھو من اقرانہٖ

اب دیکھیئے کہ ان کی قرابت میں متعدد موالی بھی ہیں اور خزاعی اور عبدری الہُدیری ہی نظر آتے ہیں۔ کوئی قریشی ان میں نہیں ہیں۔ یہی سات نام نہیں ہیں میری اصل کتاب یہاں نہیں ہے۔ یہ محض ایک نوٹ بک سے سات نام نقل کئے ہیں۔ جو بیس پچیس برس قبل کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد بھی کئی نام ملے۔ کئی اور موالی ملے۔ غالبًا بارہ، چودہ نام میری کتاب میں ہیں۔ مگر کسی قریشی خاندان سے ان کی کوئی قرابت نہیں۔ البتہ بنی زہرہ میں سے کسی کا نام ہوتا ہے جیسے سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف تو ان کے نام کے ساتھ بھی لکھ دیا ہے۔ روٰی عنہُ الزہری وہو من اقرانہٖ صرف اسلئے کہ یہ بھی اپنے کو زہری نسبًا ثابت کرتے رہے یہاں تک کہ انساب قریش پر ایک کتاب ہی لکھ ڈالی۔ اور حارث بن زہری کا ایک تیسرا بیٹا عبداللہ تصنیف کرکے اپنا نسب اس سے جوڑ دیا۔ تو متأخرین ان کے دعوے پر اعتماد کرکے ان کو نسبًا زہری سمجھنے لگے۔ اسلئے ان کو سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف کے اقران میں لکھ دیا۔ ورنہ قریش کے کسی خاندان میں ان کی رشتہ داری ثابت نہیں کی جاسکتی۔ انکے قرابتداروں میں موالی، خزاعی و عبدری وغیرہ تو نظر آتے ہیں۔ قریشی کوئی نظر نہیں آتا جو صراحتًا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ قریشی نہ تھے

صحیفۂ اہلحدیث کے حدیث نمبر ۱۹۵۲ء کے اس مضمون پر میری ان گذارشات اور تبصرے کے بعد اب آپ میرا اصل مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

حدیث و سیرت کے مدوّنِ اوّل

محمد بن شہاب زہری کا نسب نامہ

محدثین و ائمۂ رجال زہری کا سلسلۂ نسب حسب تصریح ذیل لکھتے ہیں۔ محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب بن عبد اللہ بن الحارث بن زہرہ بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر۔ یہی نضر ہیں جن کو "قریش" کہا جاتا ہے۔

مگر ائمۂ "تاریخ و نسب" حارث بن زہرہ "کے کسی بیٹے کا نام" عبد اللہ "نہیں لکھتے ان کے نزدیک حارث کے صرف ایک ہی بیٹے تھے۔ "عبد" اور ان کے بیٹے "عبد عوف" چنانچہ تاریخ ابن خلدون جلد دوم سنہ اول مطبوعہ مصر ص ۲۲۴ سے آخر جلد یعنی ص ۲۳۸ تک خاندان قریش ہی کا ذکر ہے۔ مگر ان چودہ صفحات میں جہاں محمد بن اسحٰق صاحب المغازی امام شافعی اور ابن ابی معیط [1] (عبد اللہ) جو چوتھی صدی کے آدمی ہیں۔ ان تک کا ذکر ہے وہاں زہری یعنے محمد ابن مسلم سے لے کر عبد اللہ بن الحارث تک چھ پشتوں میں سے کسی ایک کا بھی تذکرہ نہیں۔ چنانچہ ابن خلدون بنی زہرہ کا شجرۂ نسب یوں لکھتے ہیں۔

زہرہ
- حارث
  - عبد
    - عبد عوف
      - عوف
        - عبد الرحمٰن بن عوف
          - ابو سلمہ
- عبد مناف
  - وہب
    - آمنہ والدہ ماجدہ رسول اللہ صلعم
    - عبد یغوث
      - ارقم
        - عبد اللہ
    - ابو وقاص مالک
      - سعد بن ابی وقاص
        - محمد
        - عمرو
      - عتبہ
        - ہاشم
    - نوفل
      - مخرمہ
        - مسور
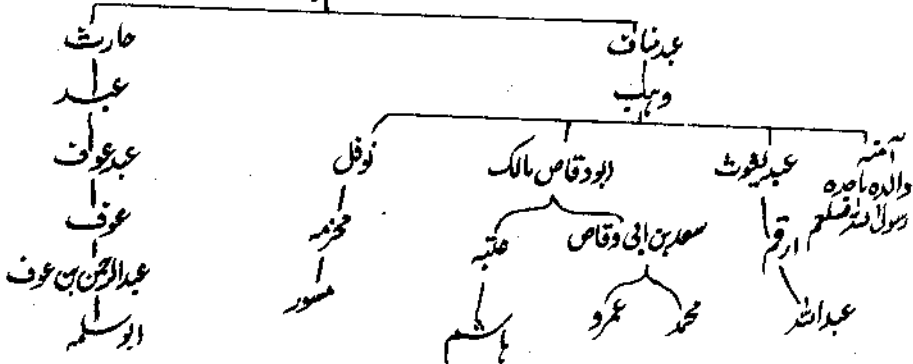
[1] عبد اللہ بن ابی معیط کا سلسلۂ نسب ابن خلدون جلد ۲ حصہ اول ص ۳۲۸ میں یوں ہے۔ عبد اللہ بن عبد اللہ بن عبید اللہ بن الولید بن محمد بن یوسف بن عبد اللہ بن عبد العزیز بن خالد بن عثمان بن عبد اللہ بن عبد العزیز بن خالد بن عتبہ بن ابی معیط اور ابو معیط کا نام آبان بن عمرو بن امیہ لکھا ہے اور لکھا ہے کہ اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں خود اپنے دست مبارک سے قتل فرمایا تھا۔ اسی کے بیٹے تھے ولید جو صحابی تھے مگر ابن عبد البر

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ابن عبدالبر استیعاب کے اواخر جلد اول ص۲۸۶ میں عبداللہ بن شہاب کا ترجمہ لکھتے ہوئے ان کو محمد بن مسلم الزہری کا جد بتاتے ہیں۔ اور ان کو دو بھائی عبداللہ الاکبر اور عبداللہ الاصغر تحریر کرتے ہوئے ان کا نسب نامہ یوں بیان کرتے ہیں۔ عبداللہ بن شہاب بن عبداللہ بن الحارث بن زہرہ بن کلاب۔ اور لکھتے ہیں کہ شہاب کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام عبدالجان اور چھوٹے کا نام عبداللہ تھا۔ عبدالجان سابقون الاولون میں تھے۔ جب وہ ایمان لائے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدل دیا۔ اور عبداللہ ان کا بھی نام رکھ دیا تو یہ عبداللہ الاکبر کہے جانے لگے اور چھوٹے بھائی عبداللہ اصغر۔ عبداللہ اکبر ہی کو ابن شہاب زہری کا جد کہا ہے۔ یہ ہجرت کرکے حبشہ گئے تھے۔ پھر وہاں سے مکہ مکرمہ واپس آ گئے اور ہجرتِ مدینہ سے پہلے وفات پا گئے اور چھوٹے صاحب مشرکین کے ساتھ جنگ احد میں شریک تھے اور بروایت ابن اسحٰق انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کو کچھ ایذا بھی اس جنگ میں پہنچائی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابن شہاب زہری سے کسی نے کہا کہ تمہارے جد جنگ بدر میں شریک تھے تو زہری نے کہا کہ ہاں مگر اس طرف سے۔ یعنی مشرکین کے طرفدار بن کر۔ لیکن ابن خلدون جلد ۲ حصہ ۲ ص۲۰ میں لکھتے ہیں :-

"کہ غزوہ بدر میں کوئی قریشی، عدوی یا زہری شریک نہ تھا۔ اخنس بن شریق تمام بنی زہرہ کو میدانِ جنگ سے واپس لے گئے تھے۔ کیونکہ یہ ان کے حلیف تھے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ میدان کی تھوڑی دیر کی شرکت مقصود تھی۔ جنگ کی شرکت مقصودِ بیان نہ تھی۔ یا یہ کہ "اُحد" کو غلطی کتابت

(بقیہ صفحہ گذشتہ) استیعاب میں ولید بن عقبہ بن ابی معیط کا ترجمہ جو لکھتے ہیں تو ابو معیط آبان کے والد کا نام عمرو نہیں لکھتے بلکہ کنیت ابو عمرو لکھتے ہیں اور نام ذکوان کہتے ہیں اور ابو عمرو ذکوان بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف لکھتے ہیں۔ غرض ابن خلدون اور ابن عبدالبر میں صرف اتنا اختلاف ہے کہ وہ آبان کے والد کا نام عمرو لکھتے ہیں۔ بغیر کسی کنیت کے اور یہ ان کے والد کا نام ذکوان بتاتے ہیں اور ابو عمرو کنیت لکھتے ہیں اور بس۔ یہ اختلاف کوئی اہم اختلاف نہیں۔

یا روایت کی وجہ سے "بدر" کا لقب مل گیا ہو" واللہ اعلم بالصواب

بہر حال یہ عبداللہ اصغر جو تھے ان کو استیعاب میں ابن شہاب زہری کا جد ماں کی جانب سے قرار دیا ہے یعنے نانا۔ اور لکھا ہے کہ آخر میں مشرف باسلام ہو گئے تھے اسی لئے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ان کا ذکر کیا گیا۔

اب مرحلہ یہ رہ جاتا ہے کہ ابن شہاب زہری یعنے محمد بن مسلم کے اپنے دادا کا نام تو بالاتفاق تمام محدثین عبید اللہ بن عبداللہ لکھتے ہیں۔ اس لئے عبداللہ اکبر جو حارث کے بیٹے تھے وہ حسب بیانِ محدثین زہری کے پڑدادا ہی ہوں گے نہ کہ دادا۔ باقی رہے عبداللہ اصغر، تو ممکن ہے کہ یہ بھائی سے بہت چھوٹے ہوں اور ان کی لڑکی کی شادی ان کے بھتیجے عبیداللہ کے بیٹے مسلم سے ہوئی ہو، اسطرح عبداللہ اصغر، ابن شہاب زہری کے حقیقی نانا ہوں یہ کوئی بعید از عقل بات نہیں۔

استیعاب کی مذکورہ تصریح سے صرف اتنا پتہ ملا کہ ابن شہاب زہری کے پڑدادا اور نانا کون تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں باہم حقیقی بھائی تھے۔ مگر ابن شہاب کے حقیقی دادا عبیداللہ اور باپ مسلم اور خود شہاب اور شہاب کے باپ عبداللہ کا پتہ خود محدثین کے یہاں بھی نہیں ملتا۔

مسلم بن عبیدُ اللہ القریشی

تہذیب التہذیب میں اور نیز استیعاب میں "مسلم بن عبید اللہ القریشی" کا نام آتا ہے مگر تعجب ہے کہ کوئی بھی ان کو والد ابن شہاب زہری نہیں قرار دیتا۔ باوجود اس کے کہ باعتبار زمانے کے یہ ابن شہاب کے والد ہو سکتے ہیں، اور محدثین ان کو "قریشی" بھی لکھتے ہیں۔ ابن عبدالبر استیعاب میں ان کے بعض حالات سے عدم واقفیت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ وَلَا اَدْرِی اَیضًا مِن اَیِّ قُرَیشٍ ھُوَ یعنی میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ قریش کے کس خاندان سے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نام ہی میں محدثین کا اختلاف ہو گیا ہے۔ کوئی عبداللہ بن مسلم کہتا ہے۔ کوئی مسلم بن عبیداللہ۔ اور ان کا نام صرف ایک ہی روایت میں آتا ہے۔ جو ہارون بن سلیمان الفرّاء سے مروی ہے۔

اگر کئی روایتیں ہوتیں تو دیکھا جاتا کہ اکثریت عبداللہ بن مسلم والی روایتوں کی ہے۔ یا مسلم بن عبیداللہ والی روایتوں کی۔ اور اس اکثریت کے مطابق نام کی تصحیح کر لی جاتی۔ مگر یہاں تو بس ایک ہی روایت ہے جس میں کوئی مسلم بن عبیداللہ کہتا ہے کوئی عبداللہ بن مسلم۔ مگر بغوی اور متعدد اہلِ تحقیق مسلم بن عبیداللہ ہی کو قول مرجح قرار دیتے ہیں اور بعضوں نے عبداللہ اور عبیداللہ کے فرق کو روایت یا کتابت کی غلطی سمجھ کر مسلم بن عبداللہ لکھ دیا جو بالکل غلط ہے۔ یا غالباً ایسا اس لئے کہا کہ کسی کا ذہن مسلم بن عبیداللہ والد ابن شہاب زہری کیطرف نہ چلا جائے۔ مگر بہر حال اس کا تعجب ضرور ہے کہ مسلم بن عبیداللہ کہنے والے بھی باوجود اس راوی کو قریشی ماننے کے اس کا شبہ نہیں کرتے کہ شاید یہ ابن شہاب زہری کے والد بزرگوار ہی ہوں۔ آخر یہ کیوں؟ غالباً اسلئے کہ زہری بلا واسطہ یا بالواسطہ یا بالوسائط اپنے باپ دادا، پڑدادا، یا نانا، کسی سے بھی کوئی روایت نہیں کرتے۔ پھر ان لوگوں کا گمنام ہی رہنا بہتر ہے۔

قولِ محقق یہ ہے کہ یہ روایت دو طریقے سے مروی ہے اور دونوں طریقوں کے راوی ہارون بن سلیمان الفرّاء ہی ہیں۔ ایک طریق عن عَبدِ اللّٰہِ عن مسلم عن عبید اللّٰہ عن النبیّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ دوسرا طریق ہے عن مُسلم عَن عبید اللّٰہِ عن النبی صلّی اللّٰہُ علیہ وسلّم

پہلے طریق سے "عن عبیداللہ" کا لفظ غلطی روایت سے یا غلطی کتابت سے چھوٹ گیا۔ اور عن عبد اللّٰہ عن مسلم عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم رہ گیا۔ اس لئے دوسرے طریق سے پہلا طریق مشتبہ ہوگیا۔ اور پھر بعضوں کو عبداللہ اور عبیداللہ میں بھی اشتباہ پیدا ہوگیا۔ نیز یہ مسلم اور عبیداللہ دونوں ہی باپ بیٹے دنیائے روایت میں گمنام صرف اس ایک روایت کے سوا اور کہیں ان کا نام آتا ہی نہ تھا، اس کیطرف کسی کا گمان نہ گیا کہ پہلا طریق عبداللہ بن مسلم اخو الزہری سے مروی ہے۔ جس کو وہ اپنے باپ مسلم اور وہ اپنے باپ عبیداللہ سے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت

کر رہے ہیں۔ اور دوسرا طریق وہ ہے جس کو ہارون بن سلیمان الفراء زہری کے والد مسلم بن عبید اللہ سے بلا واسطہ روایت کر رہے ہیں اور مسلم اپنے باپ عبید اللہ سے اور وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے۔ اگر مسلم اور عبید اللہ غیر معروف اشخاص نہ ہوتے تو یہ اختلاف نہ پیدا ہوتا۔ اس روایت سے اس کا بھی پتہ مل سکتا ہے۔ کہ مسلم بن عبید اللہ کی وفات تقریباً ۸۰ھ میں ہوئی ہے۔ کیونکہ ہارون ابن سلیمان الفراء موالی میں تھے۔ عمرو بن الحارث المخزومی الکوفی کے اور عمرو بن الحارث کی وفات ۹۸ھ میں ہے اور زہری کی ولادت ۵۲ھ کی ہے اور زہری کے بھائی عبداللہ بن مسلم زہری سے بڑے تھے۔ اس لئے عبداللہ کی پیدائش یقیناً ۵۰ھ یا اس سے بھی پہلے ہی ہوئی تھی۔ اور انہوں نے وفات بھی زہری سے پہلے پائی۔ ممکن ہے کہ ۱۲۳ھ میں انہی کی وفات ہو۔ ہارون بن سلیمان الفراء سے روایت کرنے والوں میں عبداللہ بن داؤد الخریبی الکوفی بھی تھے۔ جن کی وفات ۲۱۳ھ میں ہوئی۔ اگر خریبی نے ہارون سے عنفوان شباب میں بھی حدیث سنی تو ہارون کی وفات یقیناً زہری کے بہت بعد ہوئی ہوگی اس لئے ہارون، زہری کے ہم عصر ہی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ قرینہ غالب ہے کہ زہری سے عمر میں کچھ چھوٹے ہوں۔ البتہ اگر سو یا سو سے زیادہ عمر پائی ہو تو ممکن ہے کہ زہری سے بڑے ہوں۔ بہرحال ہارون بن سلیمان مسلم سے روایت کر رہے ہیں تو مسلم بن عبید اللہ کی وفات ۸۰ھ یا اس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس لئے زہری اپنے والد کی وفات کے وقت ۲۴ سال کے ہو سکتے ہیں۔ تو اگر آغاز شباب سے یہ جمع احادیث کا مشغلہ رکھتے تو اپنے والد سے بھی کچھ حدیثیں ضرور روایت کرتے۔

غرض حسب اصطلاح اہل کچہری "تردد و تلاش قرار واقعی" کرنے کے بعد ابن شہاب زہری کے بھائی عبداللہ اور باپ مسلم اور دادا عبید اللہ اور پڑدادا عبداللہ الاکبر اور نانا عبداللہ الاصغر تک کا تو کسی قدر پتہ مل گیا۔ پڑدادا اور نانا کے کچھ حالات بھی معلوم ہو گئے۔ اگرچہ باپ اور دادا کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ اگر ان کے بعد والوں کو ڈھونڈھئے تو صرف محمد بن عبداللہ بن مسلم کا پتہ ملتا ہے اور بس، جو زہری کے بھتیجے تھے

اور ابن اخی الزہری کے لقب سے متعارف ہیں۔ لاولد مرے۔ مگر شہاب جوان کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کا نام صرف محدّثین کی کتب رجال میں بذیل سلسلہ نسب زہری یا اخو الزہری یا ابوالزہری یا جد الزُہری ہی کے ذکر میں آ جاتا ہے۔ ورنہ بذات خود ان کا تذکرہ علمائے نسب و تاریخ تو کرتے ہی نہیں، ان کا کیا، کہ اس سلسلۂ نسب کے کسی فرد کا بھی ذکر نہیں کرتے۔ مگر محدّثین بھی ذکر نہیں کرتے۔ اور واقعی محدّثین کیوں کرنے لگے۔ یہ تو بہت متقدم ہیں۔ ممکن ہے کہ بعثت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے قبل ہی مر چکے ہوں۔ کیونکہ یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے والد کے چچا بتائے جاتے ہیں اس لئے محدثین کو ان سے کیا کام؟ تو محدّثین اُن کا ذکر کرنے سے رہے۔ علماءِ تاریخ ان کا ذکر کہیں کرتے نہیں۔ انساب کی کتابوں میں ان کا نام کہیں ملتا نہیں، تو پھر اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ زہری کے سلسلۂ نسب میں محدثین کے یہاں جوان کا نام آ گیا ہے اور جس طرح آ گیا ہے۔ اسی پر ایمان لے آیئے۔

شہاب نام حقیقت یہ ہے کہ "شہاب" نہ فقط خاندان قریش بلکہ ان کے اوپر کے شجروں میں بھی دیکھیئے تو کسی ایک فرد کا بھی یہ نام آپ کو نظر نہ آئے گا۔ خاص خاندان قریش میں یہ نام ایک اجنبی سا معلوم ہوتا ہے جو اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ یہ کوئی باہر کے آدمی تھے۔ یہ بخوبی ممکن ہے کہ بنی زہرہ کے موالی میں سے ہوں اور مولیٰ بنی زہرہ ہونے کی وجہ سے زہری قریشی کہے جانے لگے۔

جس طرح دوسرے مَوالی بنی زُہرہ کو لوگ زہری کہتے تھے

قرینہ غالب یہ ہے کہ شہاب خود اپنے آخر وقت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہوں اور اوائلِ اسلام ہی میں وفات پا گئے ہوں۔ یا عبداللہ الاکبر بن شہاب جو صحابی تھے یعنی زہری کے پڑدادا۔ وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھ پر ایمان لائے ہوں۔ یا عبید اللہ بن عبداللہ

بن شہاب، جو زہری کے دادا تھے۔ وہ اپنے باپ کے انتقال کے وقت کم عمر ہوں اور باپ کے بعد عبداللہ الاصغر بن شہاب اپنے چچا کے زیر تربیت رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ بوقت بلوغ حالت کفر میں ہوں۔ مگر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی تبلیغ کی وجہ سے مسلمان ہوئے ہوں۔ غرض قرینہ غالب یہی ہے کہ مذکورہ وجوہ کی بنا پہ خود شہاب۔ یا عبداللہ بن شہاب، یا عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب بسبب ولایت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ زہری کہلانے لگے۔ جس طرح سعد بن عبیدالزہری کہ عبدالرحمٰن بن ازہرالزہری کے موالی میں ہونے کی وجہ سے زہری کہے جانے لگے۔ اور بعضوں نے ان کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے موالی میں لکھا ہے۔ اسی طرح سلیمان بن موسیٰ الزہری اور محمد بن عبدالرحمٰن الزہری بھی موالی بنی زہرہ میں سے ہونے کی وجہ سے زہری کہے گئے۔ صفوان بن سُلیم الزہری اور صفوان بن عیسیٰ الزہری اور ابو الحارث الفقیہ جو مشہور محدث تھے۔ یہ سب موالی بنی زہرہ میں سے تھے۔ مُصعب بن سلیم الاسدی جو آلِ زُبیر کے موالی میں سے تھے۔ صرف غزلیف بنی زہرہ (کارندہ) ہونے کی وجہ سے زہری کہے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ امام ابو عبیداللہ محمد بن یحییٰ بن خالد الذہلی امام نیساپور نے چونکہ ابن شہاب زہری کی روایتوں کو تمام سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یکجا کرکے اس کا نام الزُّھریات رکھا تھا۔ اس لئے یہ بھی "زہری" کے ممتاز لقب سے یاد کئے جانے لگے۔ غرض اسی طرح موالی بنی زہرہ ہونے کی وجہ سے ابن شہاب زہری کے آباء و اجداد بھی زہری کہے جانے لگے تھے۔

امام ذہبی رہ تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صہ ۱۰۶ میں بضمن ترجمہ زہری لکھتے ہیں۔ قرۃ بنی حیوییل ؒ نے کہا ہے کہ ان (زہری) کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ (جس میں انہوں نے اپنی حدیثیں لکھ رکھی ہوں) بجز ایک کتاب کے جس میں انہوں نے اپنی قوم کا نسب نامہ جمع کیا تھا۔ افسوس کہ آئمۂ نسب نے زہری کی اسی کتاب کو محفوظ نہ رکھا۔ عجب کیا ہے کہ وہ کتاب اسی لئے ضائع کر دی گئی ہو کہ اس میں ابن شہاب نے اپنا صحیح نسب نامہ درج کیا ہو، ورنہ آخر وہ کتاب ہوئی کیا؟ وہ تو ان کی خاص تحریر تھی۔ اس سے ان کے نسب کا صحیح پتہ ضرور

مل جاتا۔

زہری کی سکونت

ابن شہاب زہری کے متعلق مشہور یہ ہے کہ یہ مدنی تھے اور یہ صرف اس گمان پر مشہور ہو گیا کہ ان کو قریشی اور بنی زہرہ کا ایک فرد سمجھ لیا گیا۔ اور تقریباً تمام مسلمین قریش، بنو ہاشم، بنو اُمیہ اور بنو زُہرہ وغیرہم ہجرت کے بعد جو مدینہ طیبہ آئے۔ تو پھر مدنی ہی ہو گئے اور ان کی اولاد تقریباً سب کی سب مدنی ہی رہی تو چونکہ زہری بھی زہری و قریشی نسباً سمجھ لیئے گئے اس لئے یہی خیال کیا گیا کہ پھر یہ بھی مَدنی ہی تھے۔ اور مدینہ ہی میں رہے ہے۔ حالانکہ یہ در اصل مقام "ایلہ" کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۵۷ ترجمہ عقیل بن خالد بن عقیل الایلی تلمیذ زہری میں لکھتے ہیں کہ کان الزھری یکون بایلۃ وللزھری ھناک ضیعۃ وکان یکتب عنہ ھناک الماجشون یعنی زہری ایلہ میں رہتے تھے اور وہاں زہری کی جائیداد تھی۔ اور وہیں ان سے عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابی سلمۃ الماجشون حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ یہ ماجشون صاحب مدنی تھے مگر ایلہ پہنچ کر وہاں رہ کر زہری سے حدیثیں لے لے کر لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح دوسرے طلبۂ حدیث بھی ایلہ پہنچ پہنچ کر ہی ان سے حدیثیں لیتے رہتے ہوں گے۔ اپنی طلب حدیث کے زمانے میں جو یقیناً ۱۰۱ھ کے بعد کا زمانہ تھا۔ یعنی جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہٗ اللہ نے جمع احادیث کا حکم والیٔ مدینہ ابو بکر بن حزم رضؓ کے پاس مدینہ میں بھیجا اور والیٔ مدینہ ابو بکر بن حزمؒ ابھی جمع حدیث کی اسکیم ہی بنا رہے تھے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ انتقال فرما گئے اور پھر فوراً ہی والیٔ مدینہ ابو بکر بن حزمؓ نئے خلیفہ یزید بن عبدالملک کے حکم سے معزول کر دیے گئے اور منافقینِ عجم نے اب اپنے مقاصد کے ماتحت جمع احادیث کا کام شروع کرنا چاہا تو انہیں منافقین عجم کے آمادہ کرنے سے اس وقت خود ابنِ شہاب کو خیال ہوا کہ ہم حدیثیں جمع کرنا شروع کر دیں تو یہ مدینہ بھی پہنچے اور کوفہ بھی۔ اور مختلف مقامات سے حدیثیں حاصل کیں تو پھر بیسوں راویوں کے ساتھ رہے۔ مگر اس سے پہلے اپنے والد کی زندگی میں میلان تشیع کی وجہ سے

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی صحبت میں بھی رہے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد پھر گھر چلے آئے اور اپنا کاروبار دیکھنے لگے۔ ان کا کاروبار بڑا تھا اور کافی مالدار تھے لیکن اس طرح کے چند روزہ مدت قیام کی وجہ سے اگر یہ مدنی ہو سکتے تو پھر کوفی بھی ہو سکتے ہیں اور بصری بھی اور مصری بھی اور شامی بھی

زہری کی وفات اور قبر

زہری کی وفات حسب روایت سمعانی روز سہ شنبہ ۱۷ رمضان ۱۲۴ھ کو نواحی شام قریہ بیل میں ہوئی۔ اُن کی قبر مقام زار میں ہے۔ معجم البلدان میں ہے کہ "بیل" بالکسر واللام ملک رَے کے قریوں میں سے ہے۔ بعضوں نے سَرخس کے قریوں میں لکھا ہے اور زار کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک قریہ ہے۔ نواحی سمرقند میں۔ اشتخن کے قریوں میں سے جہاں لوگ عموماً دفن کئے جاتے ہیں۔ (معجم ج ۴ ص ۲۶۷) غرض نہ مدینہ طیبہ کبھی ان کا یا ان کے آباؤ و اجداد کا وطن رہا نہ انہوں نے وہاں وفات پائی اور نہ ہی وہاں دفن ہوئے۔

بنی زُہرہ کا شجرۂ نسب

اب ہم بنی زہرہ کا شجرہ نسب ذرا تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس کے دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہو جائے گا کہ زہرہ بن کلاب کے دو بیٹے تھے۔ عبدمناف اور حارث عبدمناف کی نسل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ننھیال تھی اور پھر حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کے بھائیوں کی شاخیں چلتی ہیں اور حارث کی نسل سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ اور ان کے بھائی بہن کی نسل چلی ہے۔ حارث اور عبدمناف کی مذکورہ بالا شاخوں میں باہمی رشتۂ مناکحت بھی رہا ہے۔ مثلاً عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی بہن "شفا" دوسری بہن عاتکہ دونوں کی شادی محمد بن مخرمہ بن نوفل سے ہوئی تھی۔ اور نوفل عبدمناف بن زہرہ کے پوتے تھے۔ ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے داماد تھے۔ اسی طرح ایک ہی شاخ کی نسلوں میں باہمی رشتۂ ازدواج بھی تھا۔ مثلاً محمد بن اسود ابن خلف بن عبدیغوث جو عبدمناف کے پوتے کے پڑپوتے تھے۔ حضرت سعد بن

ابی وقاص رضؓ کے داماد تھے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کی ایک بہن کی شادی سمرہ بن جندب بن حجیر بن رباب بن حبیب بن سواہ بن عامر بن صعصعہ سے ہوئی تھی۔ اور عمران بن عبد العزیز بن عمر بن عبد الرحمٰن بن عوف رضؓ کی شادی امۃ الرحمٰن بنت حفص بن عمر بن عبد الرحمٰن بن عوفؓ سے ہوئی تھی۔ اور دوسرے قریشی خاندان کے افراد سے بھی ان دونوں شاخوں کے افراد کی شادیاں ہوئی تھیں۔ مثلاً آمنہ جو عبد مناف بن زہرہ کی پوتی تھیں۔ ان کی شادی عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم سے ہوئی تھی اور سہل بن عبد الرحمٰن بن عوف، عبد اللہ بن حارث بن امیۃ الاصغر ابن عبد شمس کے داماد تھے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کی والدہ، حکیم بن طلیق بن سفیان بن امیہ کی بیٹی تھیں۔ وغیر ذالک

مگر حارث بن زہرہ بن کلاب کی ایک سب سے الگ تھلگ شاخ شہاب بن عبد اللہ بن حارث کی ایسی نکالی گئی ہے جس کا کوئی رشتہ اپنی اغل بغل والی شاخوں سے کبھی قائم ہی نہیں ہوا۔ بلکہ دوسرے قریشیوں سے بھی ان کا کوئی ناتا نہیں۔ عبد اللہ اور شہاب اور پھر شہاب کے دونوں بیٹے عبد اللہ الاکبر اور عبد اللہ اصغر ان چاروں میں سے کسی ایک شخص کا بھی رشتۂ مصاہرت کسی قریشی گھر سے نہیں ہوا۔ ورنہ ضرور اس کا ذکر تاریخ وسیر اور انساب کی کتابوں میں ہوتا۔ عبید اللہ جو ابن شہاب زہری کے دادا تھے۔ یہ بھی خاندانِ قریش سے باہر ہی بیاہے گئے۔ مسلم اپنے ہی گھر بیں رہے۔ یعنے اپنے باپ کی حقیقی چچیری بہن سے بیاہے گئے۔ خود ابن شہاب زہری، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے کہاں کہاں بیاہے گئے۔ کچھ معلوم نہیں۔ غرض یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حارث کی یہ شاخ جو عبد اللہ، شہاب .... الخ کی ہے۔ یہ صرف ابن شہاب زہری کو نسبًا زہری بنانے ہی کے لئے بنائی گئی ہے۔ شہاب سے آخر تک کا سلسلہ تو ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے مگر شہاب سے اُوپر کا سلسلہ صحیح نہیں۔ زہری کو زہری کہنا بھی صحیح ہو سکتا ہے مگر ان کے دادا یا پڑدادا کے یا دونوں کے موالی بنی زہرہ ہونے کی وجہ سے نہ کہ نسبًا۔ واللہ اعلم بالصواب

اب بنی زہرہ کا مفصّل شجرۂ نسب سامنے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے مگر واضح رہے کہ

اس شجرہ میں متعارف ہی افراد کا ذکر ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی نام چھوٹا ہی نہیں ہے۔ ان میں اکثر وہی ہیں جن سے محدثین نے روایتیں لی ہیں۔ اب نقشہ شجرۂ نسب ملاحظہ فرمایئے

عہ جن لوگوں نے ابوطالب کو کہا تھا کہ اپنے بھتیجے کو منع کرو کہ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں وغیرذلک من الاقوال۔ اس جماعت میں یہ اسود صاحب بھی تھے۔ (ابن خلدون)

عسہ ابن خلدون نے عبدمناف کا ایک ہی بیٹا وہیب قرار دیا ہے اور وہیب کے تین بیٹے عبدیغوث، نوفل، مالک۔ اہیب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اہل انساب وہب اور اہیب دونوں کا ذکر کرتے ہیں اور محدثین بھی۔

سہ حارث کے بیٹے کا نام عبدالحارث تھا۔ محدثین نے صرف عبد لکھا ہے۔ ابن خلدون نے حارث کا نام اُڑا کر عبدالحارث بن زہرہ بن کلاب لکھ دیا ہے۔ غالباً غلطی طباعت سے حارث کا نام درمیان سے غائب ہو گیا۔ صحیح یوں سمجھنا چاہیئے۔ عوف بن عبدعوف بن عبدالحارث بن حارث بن زہرہ بن کلاب بن مرہ

للعہ جابر بن الاسود الزہری۔ کان امیر العبداللہ بن الزبیرؓ کتاب اسماء الرجال اورنٹیل لائبریری پٹنہ کتاب کا سلسلہ وار نمبر ۱۴۰۱ ۲

ـہ مخرمہ کی شادی عوف کی دونوں بیٹیوں عاتکہ و شفا سے ہوئی۔ یکے بعد دیگرے ہو یا اس وقت جمع بین الاختین ممنوع نہ ہو مسور کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ عاتکہ کے بطن سے تھے یا شفا کے بطن سے۔ مگر تحقیق یہی ہے کہ مسور شفا کے بطن سے تھے اور صفوان کے متعلق قرینہ ہے کہ وہ عاتکہ کے بطن سے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

لہ عبدالرحمٰن بن عوف کے بیٹے عمر کے دو بیٹے حفص اور ابوثابت عبدالعزیز۔ حفص کی بیٹی امۃ الرحمٰن جو بیوی تھیں عبدالعزیز ابو ثابت کے بیٹے عبدالعزیز بن ابی ثابت کی۔ انہی ابوثابت کے بیٹے امۃ الرحمٰن کے بطن سے سلیمان تھے۔ اس لئے سلیمان کے نام کا تعلق امۃ الرحمٰن سے بھی دکھایا گیا ہے اور عبدالعزیز بن ابی ثابت سے بھی۔ شجرہ میں یہ تعلق نمایاں نہیں ہے اس لئے اس کو سمجھ لینا چاہیئے۔

زہری کی کنیت اور عمر

ان کی کنیت ابو بکر تھی حسب اختلاف اقوال ۵۰ یا ۵۱ یا ۵۶ یا ۵۸ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۱۲۳ یا ۱۲۴ یا ۱۲۵ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ مگر ان کی عمر جس نے بتائی ہے ۷۲ سال بتاتی ہے۔ اس لئے ۵۲ھ میں ان کی ولادت اور ۱۲۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کے بھائی عبد اللہ کی ولادت ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں اور وفات ۱۲۳ھ میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ عبد اللہ، زہری سے بڑے تھے۔ اور زہری سے پہلے ان کی وفات بھی متفق علیہ ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۹ ترجمہ عبد اللہ بن مسلم اخو الزہری۔

سب سے پہلے جامع احادیث وروایات

اکثر علماء کے نزدیک سب سے پہلے احادیث وروایات کے جامع ومدوّن یہی ہیں۔ اور یہی قول صحیح ہے۔ جن لوگوں نے قاضی ابو بکر[1] بن حزم کو پہلا جامع کہا ہے وہ درحقیقت صحیح نہیں۔ ابنِ حزم مدینہ طیبہ کے قاضی تھے۔ انہوں نے اپنے ادائے فرضِ منصبی کی سہولت کے لئے کچھ مسائلِ قضا غیر مرتب طور سے اپنے آغازِ کار کے وقت نوٹ کر لئے تھے۔ ان کی نیت جمع احادیث وروایات کی نہ تھی، اسی لئے انہوں نے اپنے اس نوٹ کی کوئی حفاظت نہ کی اور ان کے وقت ہی میں وہ سب ضائع ہو گئے۔

---

[1] ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم الانصاری الخزرجی ثم النجاری (نون وجیم سے) المدنی سلیمان بن عبد الملک کے حکم سے مدینہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے ۹۶ھ کے رمضان میں۔ امام مالکؒ فرماتے تھے کہ مدینہ میں علم القضا ان سے زیادہ کسی کے پاس نہ تھا۔ ان کی وفات باختلاف اقوال ۱۱۰ یا ۱۱۷ یا ۱۲۰ یا ۱۲۶ھ میں ہے مگر آخری قول کو ابن حجرؒ غلط قرار دیتے ہیں۔ تاریخ ابن خلدون ج ۳ ص ۸۶ میں ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی وفات کے بعد جیسے ہی یزید بن عبد الملک نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ ابو بکر بن حزم کو ولایت مدینہ سے معزول کر کے ان کی جگہ عبد الرحمٰن بن الضحاک بن قیس الفہری کو والیٔ مدینہ مقرر کر دیا۔ غرض ابو بکر بن حزم ولایت مدینہ سے ۱۰۱ھ میں معزول ہو چکے تھے اور ان کے بعد اسی ۱۰۱ھ میں عبد الرحمٰن بن الضحاک والیٔ مدینہ مقرر ہوئے۔ ان کے بعد قاضی مدینہ سعد بن ابراہیم بن عبد الرحمٰن بن عوفؓ مقرر ہوئے۔

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ امام مالک رح نے ان کے بیٹے عبداللہ سے [1] جو ان کی کتابوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ سب ضائع ہوگئیں۔

غرض ابوبکر بن حزم رح نے جب ان مسائلِ قضا کو نہ روایت و تحدیث کی نیت سے جمع کیا تھا، نہ ان کی کوئی حفاظت کی، نہ اپنے صاحبزادے کو اس کی اجازت دی، نہ ان کے صاحبزادے جو ان کی وفات کے وقت کم سے کم ۴۵ سال کے تھے اور اپنے والد ہی کے وقت میں اکابر علماءِ مدینہ میں شمار کئے جاتے تھے انہوں نے اس کی پروا کی۔ تو پھر یہ کہنا کہ سب سے پہلے ابوبکر بن حزم رح نے حدیثیں جمع کیں۔ کس قدر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ روایت و جمع احادیث کے دور کے آدمی ہی نہ تھے۔ جس عنوان سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نے ان کو حکومت کے اقتدار کے ماتحت جمع حدیث کا حکم دیا تھا۔ اقتدارِ حکومت ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے وہ اس طرح جیسا کہ چاہتے تھے۔ اور جس عنوان سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نے ان کو حکم دیا تھا۔ وہ حدیثیں جمع نہ کر سکے۔ اسی لئے معزولی کے بعد جمع احادیث کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کے حکم سے پہلے تو جمع احادیث کا خطرہ بھی کبھی ان کے دل میں نہ گذرا ہوگا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جن کی وفات بروایت صحیحہ ۱۲۵ھ میں ہے اور ان کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم بن سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف مدینے کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کی وفات ۱۸۴ھ میں ہوئی (تہذیب ج ۱۲ ص ۳۹۰) ابوبکر بن حزم، عمرہ بنت عبدالرحمٰن کے بھتیجے ہوتے تھے۔ (ترجمہ عمرہ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۸)

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۶۴) (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] عبداللہ بن ابی بکر بن حزم رض بہت جلیل القدر عالم تھے اور امام مالک رح کے شیوخ میں تھے۔ امام مالک رح کہتے ہیں کہ ابن شہاب زہری کہتے تھے کہ مدینہ میں عبداللہ جیسا کوئی بھی نہ تھا مگر وہ اپنے والد کے سامنے اپنے نام کو اونچا ہونے سے روکتے تھے۔ یہ ابن شہاب زہری کے شیوخ میں تھے اور خود بھی زہری سے روایت کرتے تھے۔ ان کے والد ابوبکر بن حزم نے مسائل قضاء کے جو نوٹ کتابی صورت میں جمع کئے تھے۔ ان کی کوئی اہمیت نہ خود ابن حزم کے ذہن میں تھی کہ اس کی حفاظت کرتے اور نہ عبداللہ ان کے بیٹے کے ذہن میں تھی کہ یہ اس کو محفوظ رکھتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عبداللہ کے بچپن ہی میں وہ کتابیں ضائع ہو چکی تھیں تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ ابن حزم نے اپنی وفات سے

باعث جمع احادیث

منافقینِ عجم جو فتح ایران کے بعد عہد فاروقی میں بارادۂ انتقام مدینہ طیبہ میں آکر منافقانہ اِسلام لانے اور مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے جو سب سے پہلے حضرت فاروق اعظم رض کی شہادت کے باعث ہوئے ۔ پھر کچھ دنوں مسلمانوں میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر کے کوفہ و بصرہ و شام و مصر وغیرہ ممالک اسلامیہ میں پھیل کر اور کچھ مدینہ منورہ میں رہ کر طرح طرح کی پوشیدہ ریشہ دوانیاں کرتے رہے اور آخر تقریباً بارہ سال کی پوشیدہ سازشوں کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ برپا کر کے ان کو بھوکا پیاسا شہید کر ڈالنے میں کامیاب ہوئے اور پھر کچھ افراد حضرت علی رض کے ساتھ، کچھ افراد حضرت عائشہ رض کے ساتھ، کچھ افراد حضرت معاویہ رض کے ساتھ منافقانہ طرف دار بن کر جنگ جمل و صفین کی صورت میں مسلمانوں کو باہم لڑا کر اپنی آتش انتقام ٹھنڈی کرتے رہے ۔ پھر بھی ان کا شیطانی ضمیر جو انتقامی دوزخ بنا ہوا تھا۔ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کی رٹ لگاتا ہی رہا ۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ فقط سیاسی فتنے برپا کرنے سے پوری کامیابی نہیں ہوتی تو ان کے کچھ افراد تو آئے دن نت نئے سیاسی فتنے برپا کر کے خلفائے وقت داعیانِ حکومت کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور اُن کے خلاف پروپیگنڈے کر ہی رہے تھے ۔ کچھ افراد علماء و فقہاء کے زمرے میں داخل ہو کر ہر جگہ قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کہہ کر جھوٹی جھوٹی باہم متضاد و متخالف حدیثیں بنا بنا کر رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اجلّہ صحابہ کرام رض اور امّہات المؤمنین رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی طرف منسوب کرنے میں مصروف ہو گئے ۔ خود تابعی بنے ہوئے تھے ہی اور اپنے منافقانہ ظاہری تقویٰ و عبادت کے اثر سے عام مسلمانوں میں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کم و بیش تیس سال پہلے اپنی کتابوں کو ضائع کر ڈالا ۔ یعنی ضائع ہونے دیا اور پھر دوبارہ ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی ۔ اس لئے کہ عبداللہ بن ابی بکر بن حزم رض کی ولادت ۶۵ھ یا ۶۰ھ کی ہے ۔ ابن حزم عبداللہ کی پیدائش کے بعد سے کم سے کم ۴۵ اور زیادہ سے زیادہ ۵۵ سال تک زندہ رہے ۔ عبداللہ کی وفات ۱۳۰ھ یا ۱۳۵ھ میں ہوئی ۔ دوسرا قول قوی کہا جاتا ہے

(تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۶۵ - ۱۶۴)

کافی رسوخ و اعتماد حاصل ہی کر چکے تھے۔ بس صرف کسی ایک صحابی کا نام لے لینا کافی تھا کہ ہم نے فلاں صحابی سے ایسا سنا۔ پھر ان کو کون جھٹلا سکتا تھا۔ اس وقت بعض صحابۂ کرام جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کے وقت میں کم سن تھے۔ رہ گئے تھے۔ تو ان لوگوں کے نقار خانے میں ان کی طوطی جیسی آواز کیا سنائی دیتی۔ دوسری جگہ جا کر تو ان کی طرف بھی جھوٹی روایتیں منسوب کر کے بیان کیا کرتے ہی تھے کہ خراسان و نیساپور سے یہاں آکر ان سے تصدیق کون کرتا ہے۔ دلیری یہ تھی کہ خود ان کے سامنے بھی دوسرے صحابیوں کیطرف منسوب کر کر کے جھوٹی روایتیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام مسلمؒ لکھتے ہیں کہ مجاہد روایت کرتے ہیں کہ بُشیر ابن کعب العدوی، ابن عباس رضؓ کے پاس آئے اور قال رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم، قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کہہ کہہ کر حدیثیں بیان کرنے لگے۔ مگر ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کیطرف دھیان دیتا تو کجا۔ نظر تک نہیں کرتے تھے تو اس نے کہا اے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ! کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی حدیثیں بیان کر رہا ہوں اور آپ متوجہ نہیں ہوتے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پہلے جب کبھی کوئی قال رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کہتا تھا تو میری نگاہیں اور میرے کان سب اس کیطرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ مگر جب دیکھا کہ لوگ ہر بُرے بھلے پر اُتر آئے ہیں۔ تو ہم اب دوسرے لوگوں سے نہیں لیتے اور جتنا بھر خود جانتے ہیں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اسی قدر نہیں۔ بلکہ آخر تنگ آکر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے روایت کرنا ہی ترک کر دی تھی۔ چنانچہ اسی حدیث سے دو حدیث قبل محمد بن عباد و سعید بن عمرو الاشعثی دونوں اپنے شیُوخ سے ایک طویل حدیث روایت کرتے ہیں۔ جس کے آخر میں یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے کہا کہ ہم لوگ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی احادیث مبارکہ بیان کیا کرتے تھے۔ مگر جب دیکھا کہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم پر جھوٹ لگانے لگے اور ہر بُرے بھلے پر اُتر آئے تو ہم لوگوں نے آپؐ کی حدیثیں بیان کرنا ترک کر دیں۔

(باب النهي عن الروايات عن الضعفاء والاحتياط في تحملها)

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے متعلق بھی روایت ہے کہ انہوں نے بعض لوگوں کو بلا کر ڈانٹا تھا کہ تم لوگ ایسی ایسی باتیں رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف منسوب کرتے ہو، جن کو ہم لوگ مدتوں صحبت نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) میں رہنے کے باوجود نہیں جانتے۔

اور یہ درحقیقت ایسی بات تھی جس کی پیشین گوئی خود رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے اور اپنی امت کو اس فتنے سے ڈرا گئے تھے۔ جیسا کہ مقدمہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یکون

في اٰخر الزمان دجالون كذابون ياتونكم من الاحاديث بمالم تسمعوا انتم ولا اٰباؤكم فاياكم واياهم لا يضلونكم ولا يفتنونكم (اوكما قال صلى الله عليه وسلم)

یعنی اس زمانے کے آخر میں ایسے ایسے دجّال وکذاب لوگ ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی ایسی حدیثیں پیش کریں گے جن کو نہ تم نے سنا اور نہ تمہارے[1] آباء نے سنا تو اپنے

---

[1] كان محمد بن جبير بن مطعم يحدث انه بلغ معاوية رض وهم عنده من وفد من قريش ان عبد الله بن عمرو يحدث انه سيكون ملك من قحطان فغضب وقام واثنى على الله بما هو اهله ثم قال اما بعد بلغني ان رجالا منكم يحدثون احاديث ليست في كتاب الله ولا يؤثر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم واولئك جهالكم فاياكم والاماني التي تضل اهلها (بخاری پ ۲۸ ص ۵۵ کتاب الاحکام رواہ ابوالیمان عن شعیب عن الزہری۔ وایضاً کتاب المناقب باب مناقب قریش پ ۱۴ ص ۴۹) [2] فی اٰخر الزمان میں الف لام عہد خارجی کا ہے اسی لئے میں نے ترجمہ "اس زمانے کے آخر میں" کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک حدیث ہے جس میں فی آخر امتی آیا ہے۔ وہاں بھی امت موجودہ یعنے صحابہ رضہ ہی مراد ہیں۔ جس کی دلیل ایسی پیشین گوئی کا ظہور ہے کہ صحابہ کے آخر عہد ہی میں جھوٹی حدیثوں کی روایت شروع ہو گئی۔ ان حدیثوں سے زمانہ قرب قیامت مُراد لینا صحیح نہیں۔ اس لئے کہ جتنی حدیثیں بننا تھیں وہ بن چکیں۔ اب تو انہیں کی روایت باقی رہ گئی ہے وہ بھی اشخاص سے سن کر نہیں بلکہ کتابوں میں دیکھ کر۔ اس لئے اب تو موجودہ راوی جبھی مورد الزام ہو سکتا ہے کہ کسی حدیث کو موضوع جانتے ہوئے اس کو رسول ص کی طرف منسوب کرے۔ درحقیقت بہرحال دروغ برگردن راوی اول ہی ہے اسلئے یقیناً یہاں صحابہ کا ہی آخری دور مراد ہے۔

کو ان سے بالکل بچائے رکھنا، کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کر دیں اور تمہیں فتنے میں نہ ڈالیں۔

ان اور ان جیسی متعدد صحاح کی حدیثوں کی روشنی میں فتح ایران کے جذبۂ انتقام کے تحت بہ نیت تخریب دین و تفریق بین المسلمین منافقین عجم کی احادیث بافیوں اور روایات سازیوں کے فتنۂ عظیم کے رفتہ رفتہ تمام ممالک اسلامیہ پر چھا جانے اور تنے چند لقبیۃ السّلف جو اکابر مسلمین اس فتنے کو واقعی فتنہ سمجھ رہے تھے۔ ان کے اس عہد میں ہراساں رہنے کا سارا منظر ہر صاحب نظر دین دار کی نگاہوں کے سامنے آج بھی پھرنے لگتا ہے۔ لسان العصر اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے کیا خوب رُباعی تحریر کی ہے۔

شیرازۂ اتحاد ہم سے چھوٹا　　آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا
قرآن کے اثر کو روک دینے کے لئے　　ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

چونکہ ایک طرف خلیفۂ وقت و عمال کے خلاف طرح طرح کے ناپاک سے ناپاک جھوٹے جھوٹے پروپیگنڈے جاری تھے جن کی وجہ سے عامۃ المسلمین اور علماء و صلحاء کے دلوں میں ان کی طرف سے نفرت کے جذبات رہ رہ کے اُبھرتے رہتے تھے اور دوسری طرف تخریب دین کے لئے طرح طرح کی متضاد و متخالف جھوٹی حدیثیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم اور اجلّہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی طرف منسوب کر کے عامۂ مسلمین کو وحدتِ دینی کے شیرازے سے الگ کر کے فرقہ بندیوں میں مبتلا کر دینے کی کوشش جاری تھی۔

خلفاء و اُمراء ضرور اس کے خواہاں تھے کہ علماء و صلحا کے طبقے سے ان کا تعاون ہو۔ مگر علماءِ حق ہی آہُو نے رم خوردہ کی طرح ان سے دُور بھاگتے رہے۔ ان کے سامنے محکمۂ قضا جو خاص ان کی چیز تھا۔ جب پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کوڑے کھائے مگر قاضی بننا گوارا نہ کیا کہ حکومت کے منشاء کے مطابق فتویٰ دینا پڑیں گے۔ حالانکہ ان کو محکمۂ قضا قبول کر لینا تھا اور وہی فتویٰ دینا تھا جو حق تھا۔ اگر حکومت کبھی اپنے باطل منشاء کے مطابق فتوے دینے پر زور ڈالتی تو نہ مانتے اور اس کے لئے یہ کوڑے کھاتے تو ہر وہ کوڑا جوان پر اس زور وقت پڑ تا اسلام کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو کر کچھ ہی دنوں

کے بعد انہیں خلفاء و اُمراء کے لئے تازیانۂ عبرت ثابت ہوتا۔ مگران کے محکمۂ قضا قبول نہ کرنے کی وجہ سے زیادہ تر وہ لوگ جو علم و دیانت میں ان سے پست تھے۔ اس جگہ پر آگئے اور وہی ہوا جس سے یہ ڈرتے تھے۔ انہوں نے تخریب دین سے اپنے ہاتھوں کو تو بچایا۔ مگر دوسروں کو تخریب کا پورا موقع دے دیا۔ یہ ایسی فاحش خطائے اجتہادی ہمارے اکابر کی تھی جس کا خمیازہ آج تک ہم مسلمان بھگت رہے ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون

ان منافقینِ عجم نے ہر چند حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اہل بیت کی حمایت کا دامِ تزویر عامۂ مسلمین کے سامنے بچھا رکھا تھا اور بظاہر یہ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حمایت میں سرگرم رہتے تھے۔ مگر جس قدر جھوٹی حدیثیں انہوں نے حضرت علی رضؓ کی طرف منسوب کیں کسی کی طرف بھی کسی دوسرے نے یا خود ان منافقین نے نہیں منسوب کی ہوں گی۔ تذکرۃ الحفاظ جلد اول صـ ۷۷ ترجمہ عامر بن شراحیل الشعبی میں ہے کہ خالد بن عبد اللہ روایت کرتے ہیں حصین سے اور وہ عامر شعبی سے کہ انہوں نے فرمایا۔ ماکذب علیٰ احدٍ فی ھٰذہ الامۃ ماکذب علیٰ علیؓ رضؓ یعنے نہیں جھوٹ لگایا گیا اس امت میں کسی پر جتنا جھوٹ لگایا گیا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر۔

آخر باخبر لوگ ان لوگوں کی روایتوں سے سخت احتیاط کرنے لگے۔ مقدمہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے لائے گئے تو انہوں نے بقدر ایک ہاتھ کے اس لمبے طومار سے رکھ لیا اور باقی سب کو محو کر دیا۔ پھر آگے ہے کہ ابو ہشام مغیرہ بن مقسم کہتے تھے۔ کہ اصحاب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا اور جو شخص بھی کوئی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کرتا تھا تو اس کی تصدیق نہیں کی جاتی تھی۔ غرض پہلی صدی ہجری ہی کے اواخر میں فتنۂ روایات کا ایک زبردست سیلاب تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں نہایت بُری طرح جاری تھا اور اس کے روک تھام کی نہ کوئی صورت تھی اور نہ کوئی اس کیطرف متوجہ ہوا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحہ کا حکم جمع احادیث

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۹۹ھ میں زمام

خلافت سنبھالی اور اس کے بعد انہوں نے عالم اسلامی کا جائزہ لیا تو سارے عالم پر فتنۂ روایات کا ایک خطرناک دامِ تزویر پھیلا دیکھ کر اسکے انسداد کو اپنا فریضۂ اوّلین محسوس کیا اور بتقاضائے مصلحت یہ تو ظاہر نہ کیاکہ ہم اس فتنے سے آگاہ ہو گئے۔ مگر ایک حکمنامہ مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکر بن حزم کے پاس بھیجا کہ علماء کے گذر جانے سے علم بھی دنیا سے گذر جائے گا۔ مجھے اس کا ڈر ہے، اس لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں جو کچھ ملیں ان کو لکھ لو، اور بجز احادیث نبویہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے اور کچھ نہ لکھا جائے۔

(صحیح بخاری باب کیف یقبض العلم کتاب العلم)

میں شروع ہی میں لکھ چکا ہوں کہ ابوبکر بن حزم مدینہ طیّبہ کے قاضی تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ اتنا بڑا کام انجام دے سکتے اور پھر اس حکم کے کچھ ہی دنوں بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ انتقال فرما گئے اور فوراً ہی ابوبکر بن حزم اپنے عہدے سے معزول ہو گئے۔ اسلئے ابوبکر بن حزم اس مہم کو سَر نہ کر سکے اور یہ کام رہا ہی چاہتا تھا کہ انہیں منافقین عجم کی ایک جماعت نے اپنا رسوخ فی الدّین اور ظاہری زہد وتقویٰ دکھا کر ابن شہاب زہری کو جمع احادیث پر آمادہ کیا۔ یہ اپنے تجارتی و زراعتی کاروبار کی وجہ سے اپنے وطن ایلہ میں رہا کرتے تھے۔ مگر ایک بہت بڑی دینی خدمت سمجھ کر اس مہم پر آمادہ ہو گئے۔ اور ۱۰۱ھ کے بعد مدینہ آکر یہاں کے لوگوں سے حدیثیں لیں اور پھر کوفہ بصرہ مصر وغیرہ مقامات سے بھی روایتیں حاصل کیں اور ہر راہ چلتے سے جو حدیث بھی مل جاتی۔ لکھ لیتے اور یاد کر لیتے اور وہی منافقین خود بھی پھر ان کے پاس آ آکر حدیثیں لکھوانے لگے اور دوسرے وضاعین اور کذابین کو ان کے پاس بھیج بھیج کر ان سے بھی حدیثیں ان کے پاس جمع کرانے لگے۔

ابن شہاب زُہری کا انتخاب

قرینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ابن شہاب زہری کے والد مسلم بن عبید اللہ زندہ رہے۔ وہ اپنے وطن ایلہ میں اپنے کاروبار کے نگران رہے اور یہ حضرت علی بن الحسین (زین العابدین رح) کی صحبت میں رہے۔ جب ان کے والد کی وفات ہو

گئی۔ (سنہ ۸۰ھ کے لگ بھگ) تو ان کو پھر قبل وفات [1] حضرت علی بن الحسین رضی اللہ عنہ مقام ایلہ میں اپنے کاروبار کی وجہ سے اقامت کرنا پڑی۔ بہر حال یہ حضرت زین العابدین علی بن الحسین رضؓ کے خاص اصحاب اور ان کے معتمدین میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس لئے شیعوں میں بھی ان کی ایک امتیازی حیثیت تھی۔ یہاں تک کہ متقدمین شیعہ ان کو اپنی ہی جماعت کا ایک فرد فرید سمجھتے تھے۔ مگر اپنے کو یہ شیعہ نہیں کہتے تھے اس لئے اہلِ سنت ان کو اپنی جماعت میں داخل سمجھتے تھے۔ شیعوں میں تو ایسا شخص جو اپنے کو سُنّی ظاہر کرتا ہوا سُنّیوں میں سنّی ہی جیسی باتیں کیا کرے مگر ساتھ ہی عوام اور کم علم اہلِ سنّت میں شیعیت کی تخم ریزی کا فرض انجام دیتا ہے۔ دراصل ان کی جماعت کا مجاہد اکبر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے علماءِ متاخرین کبھی ایسے شخص کو علانیہ عام طور سے اپنی جماعت کا آدمی نہیں کہتے کہ کہیں اہلِ سُنّت اس سے بھڑک نہ جائیں۔ البتہ اپنے ناواقف افراد کی اطلاع کے لئے اپنی بعض بعض کتابوں میں ایسے لوگوں کا مختصر سا ذکر کر دیتے ہیں اور کہیں اسکے نام کے بعد تقیہ کی علامت "ق" یا ممدوح" وغیرہ قسم کے الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ بہر حال یہ تو کئی صدی بعد کی باتیں ہیں۔ اُس دور میں تو شیعہ و سنّی کا کوئی ظاہری تفرقہ بھی نہ تھا اس لئے اگر اس وقت ابن شہاب زہری دونوں جماعتوں میں ممدوح و معتمد ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے جماعتِ منافقین نے اس کام کے لئے انہیں کو منتخب کیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ذہانت و فطانت اور غیر معمولی قوت حافظہ کی وجہ سے ان کا انتخاب ایک کامیاب انتخاب ہوا۔

ایک غلط اِدّعا

بعض متأخرین [2] نے اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے کہ ابن شہاب زہری نے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہُ اللہ

---

[1] حضرت زین العابدین علی ابن الحسین رحؒ کی وفات سنہ ۹۵ھ یا سنہ ۹۶ھ میں ہوئی لیکن امام بخاریؒ اوسط میں سنہ ۹۲ھ لکھتے ہیں۔ دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۴۔ [2] جیسا کہ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب الرسائل فی معرفۃ الاوائل میں لکھ دیا ہے کہ اول من دون الحدیث ابن شہاب زہری فی خلافۃ عمر بن عبد العزیز بامرہ یعنے سب سے پہلے حدیث جس نے مدون کی وہ ابن شہاب زہری ہیں جنہوں نے عمر بن عبد العزیز رحؒ کے حکم سے حدیث جمع کی۔ اسی کو ابن حجر نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے اور یہ عبارت مولانا عبد الحی نے التعلیق المجد

کے حکم سے حدیثیں جمع کرنا شروع کی تھیں۔ یعنے حضرت عمر بن عبد العزیز رحنے بذات خود ان کو جمع احادیث کا حکم دیا تھا۔ یہ بالکل غلط اور ایک دعوٰی بلا دلیل ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جب لوگ ان کو جمع احادیث سے منع کرتے ہوں گے۔ تو یہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحہ کے حکم جمع حدیث جو انہوں نے ابوبکر بن حزم کو دیا تھا۔ اس کو سندِ جواز میں پیش کرتے ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرحال یہ لکھنا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحہ کے حکم سے زہری نے حدیثیں جمع کرنا شروع کی تھیں۔ ہرگز صحیح نہیں

ابن شہاب زہری سے پہلے کتابت روایات واحادیث

مؤرخین کتابت حدیث کے ثبوت میں حدیث ہی کی بعض آحاد روایتیں پیش کر دیا کرتے ہیں۔ جو لوگ حدیثوں کی روایات کو مستقل دینی حجت سمجھتے ہیں۔ وہ ضرور ایسی روایاتِ کتابت پر ایمان لے آسکتے ہیں۔ مگر جو لوگ کسی قول یا کسی روایت کے فقط منسوب بہ رسول ہو جانے کی وجہ سے اس کو بلا ثبوت محض رجماً بالغیب حجت و سند نہیں سمجھتے۔ اس پر اس طرح کا "مصادرہ علی المطلوب" کیا اثر انداز ہو سکتا ہے۔

عہدِ نبوی میں ماسوٰی قرآن کی کتابت

کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رضہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کے پاس قرآن کریم کے ماسوا بھی کچھ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس قرآن کریم کے سوا کچھ نہیں، بجز اس فہم سلیم کے جو قرآن کریم کے متعلق مجھ کو ملا ہے اور اس صحیفے کے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چند اوراق تھے یا ایک ورق تھا جس کو حضرت علیؓ اپنی تلوار

لہ مصادرہ علی المطلوب یہ علم منطق و استدلال و مناظرہ کی ایک مشہور اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دعوے یا دعوے کے بعض حصوں کو دلیل قرار دیدیا جائے۔ حدیثوں کو حجت قرار دینے کے ثبوت میں حدیثیں ہی پیش کرنا اسی قسم کا استدلال ہے۔ جو شخص سرے سے حدیثوں کو حجت مانتا ہی نہیں، وہ ان حدیثوں کو جو حجیت یا کتابت حدیث کے ثبوت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ کب حجت تسلیم کریگا۔

کی کاٹھی میں رکھتے تھے جس میں بعض سیاسی و معاشرتی ہدایتیں تھیں۔ یہ روایت خاص کوفے کے ٹکسال میں گھڑی گئی۔ امام بخاری رح کے شیخ کے سوا اور تقریباً سب کے سب اس کے راوی کوفی ہیں۔ خود ابن حجر فتح الباری میں اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رواتہ کلّھم کوفیون سوٰی شیخ البخاری اور کوفے کے ٹکسال کا حال معلوم کرنا ہو تو میرے دوسرے مضامین دیکھ جائیے۔ یہ روایت صرف اس لئے بنائی گئی ہے تاکہ اس کا ثبوت ہو سکے۔ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وصی تھے۔ اور آپ سمجھتے تھے کہ میرے بعد میری وصیت کے مطابق صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی میرا خلیفہ بنائیں گے۔ اسی لئے آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ وصیّت نامہ صرف حضرت علی رضہ کو دیا اور کسی کو نہیں دیا۔ بلکہ کسی دوسرے کو اس کے مضامین کی اطلاح تک نہ دی۔

حدیث قرطاس

اسی طرح قرطاس والا واقعہ ہے جو اگرچہ آحاد در آحاد ہے اور زہری ہی کی روایت ہے۔ وہ بھی مرسل [۱] جس کو ابن حجر نے بمنزلۃ الرّیح قرار دیا ہے۔ مگر شیعہ و سنّی کے مناظرات تحریری و تقریری کی وجہ سے چند صدیوں سے اس کی کافی شہرت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم نے اپنی وفات سے چار پانچ یوم بیشتر حاضرین سے کہا کہ کاغذ دوات لاؤ کہ ہم تم کو ایسی چیز لکھوا دیں کہ تم لوگ میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو۔ اس پر حضرت عمر رضہ نے کہا کہ رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم پر درد (مرض) غالب آگیا ہے اور ہم لوگوں کے لئے کتابُ اللہ کافی ہے۔ اس کہنے کی وجہ سے حاضرین کی آپس میں اختلاف رائے اور قیل و قال کی آوازیں بلند ہو گئیں جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رنجیدہ ہو کر فرمایا کہ نکلو یہاں سے۔ میرے پاس جھگڑنا سزاوار نہیں ہے۔ پھر ابن عباس رضہ یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ مصیبت اور پوری مصیبت ہے۔ رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے اس ہدایت نامے کے درمیان جو آپ

[۱] اس حیثیت سے کہ یہ روایت زہری عروہ بن الزبیر سے کرتے ہیں اور عروہ سے زہری کی لقا ثابت نہیں اس پر سیر حاصل بحث شیوخ زہری کے ضمن میں آئی ہے۔

لکھوانا چاہتے تھے کون سی چیز حائل ہوگئی۔ یہ روایت صرف ابن عباس رضؓ سے مروی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے وقت بروایت صحیحہ صرف تیرہ برس کے بچے تھے[1] ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ غندر نے کہا کہ ابن عباس رضؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی زبان مبارک سے نو حدیثوں سے زیادہ نہیں سنیں اور یحییٰ بن القطان فرماتے ہیں کہ دس سے زیادہ نہیں سُنیں۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ مستصفی میں لکھتے ہیں کہ چار حدیثوں سے زیادہ نہیں سنیں اور تمام قولی وفعلی حدیثیں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جناب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم سے بلا واسطہ روایت کرتے ہیں۔ وہ سب اسی تعداد میں شامل ہیں۔ اس کے بعد ابن حجر رحؒ لکھتے ہیں کہ صحیحین میں دس سے زیادہ حدیثیں ہیں۔ جن میں سماع کی تصریح موجود ہے اور غیر صحیحین میں تو اور زیادہ ملیں گی۔ اس لئے ان لوگوں کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ غندر یعنے محمد بن جعفر الہذلی البصری رحمۃ اللہ بڑے پایہ کے محدّثین میں ہیں۔ بیس برس تک امام شعبہ رحؒ کے زیر تربیت رہے۔ امام احمد بن حنبل رحؒ، یحییٰ بن معین اور علی بن المدینی جیسے اکابر محدّثین وائمۂ رجال کے شیوخ میں تھے۔ ان کی وفات ۱۹۲ھ میں حسب روایات امام بخاری رحؒ، امام بخاری رحمۃ اللہ کی پیدائش سے دو برس پہلے ہوئی۔ اسی طرح یحییٰ بن سعید القطان مشہور ومعروف امام حدیث ورجال ہیں۔ یحییٰ بن معین وعلی

---

[1] استیعاب میں حافظ ابن حجر رحؒ لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ شعب ابی طالب میں پیدا ہوئے۔ بنی ہاشم کے شعب کے نکلنے سے پیشتر اور یہ واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے کا ہے۔ پھر ابن عباس رضؓ نے اپنی عمر بوقت وفات نبوی دس سال بتائی اور بعض روایتوں میں ہے کہ تیرہ سال بتائی اور بعض میں ہے کہ پندرہ سال بتائی۔ امام احمد رحمۃ اللہ آخری قول کو صحیح بتاتے ہیں مگر ولادت کے حساب سے تیرہ سال والا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی عمر ستر سال اور بروایتے بہتر سال تھی۔ وفات ۶۸ھ اور بروایتے ۶۹ھ میں ہوئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ابن عباس رضؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی وفات جب ہوئی تو میرا ختنہ ہو چکا تھا۔ غرض یہ وفات نبوی صلے اللہ علیہ وسلّم کے وقت تیرہ سال سے زیادہ کے نہ تھے۔

بن المدینی جیسے اکابر علمائے حدیث و رجال کے شیوخ میں ہیں۔ امام شعبہ و سفیان ثوری رح جوان کے شیوخ میں تھے، وہ بھی ان سے روایت کرتے تھے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ کے خاص شاگردوں میں تھے ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے وقت امام بخاری رحمۃ اللہ چار برس کے تھے۔ غرض غندر رح اور یحیی القطان دونوں ہی امام بخاری رح اور امام مسلم رح دونوں ہی سے کافی متقدم اور دونوں کے شیوخ یعنے بعض شیوخ کے شیوخ میں ہیں۔ اور تحقیق احادیث و رجال میں بخاری و مسلم سے بلند پایہ ہیں۔ وہ دونوں کتنے تابعین اور اکابر تابعین کے فیض یافتہ صحبت تھے۔ اور ابن عباس رض اور ان روایتوں کے حال سے وہ دونوں امام بخاری رح و مسلم سے زیادہ واقف تھے۔ اس لئے بخاری و مسلم میں بلا واسطہ خاص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جو ان کی روایتیں ہیں بخوبی ممکن ہے کہ مرسل ہوں یا راویوں نے ان روایتوں کو مرفوع بنا دیا ہو۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ امام بخاری و مسلم متأخر ہیں۔ اس لئے ان کو تحقیق کا زیادہ موقع ملا۔ اپنے اسلاف کی تحقیقات سے بھی متمتع ہوئے اور پھر خود بھی مزید تحقیق کی اس لئے متاخرین اپنے متقدمین سے تحقیق میں بڑھ گئے۔ تو پھر امام غزالی تو بخاری و مسلم دونوں سے متأخر اور بہت متاخر ہیں۔ امام بخاری رح کی پیدائش ۱۹۴ھ مادہ تاریخ "صدق" ہے اور وفات ۲۵۶ھ میں مادہ تاریخ "نور" ہے اور امام مسلم کی ولادت ۲۰۴ھ مادہ تاریخ "دُرّ" ہے اور وفات ۲۶۱ھ اور مادہ تاریخ رأس ہے اور امام ابو محمد الغزالی رحمۃ اللہ کی ولادت ۴۵۰ھ مادہ تاریخ "نقش" اور وفات ۵۰۵ھ مادہ تاریخ "ارشد" ہے۔ اس لئے انہوں نے پوری طرح متقدمین کی تحقیقوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کافی غور و خوض کے بعد یہ رائے قائم کی، نہ دس حدیثیں نہ نو۔ بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالے عنہ نے بلا واسطہ خاص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے صرف چار ہی حدیثیں سُنیں۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ امام غزالی علیہ الرحمہ نے صرف قولی حدیثوں کو شمار کیا اور غندر رض نے قولی و

وفعلی دونوں کو، اور یحییٰ بن سعید القطان ؒ نے قولی وفعلی تقریری سب حدیثوں کو۔
واللہ اعلم بالصّواب

غرض معلوم نہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت قرطاس کس قسم کی ہے۔ واقعی ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کی یا ان پر اتہام ہے یا کسی دوسرے سے سن کر انہوں نے بیان کر دی۔ مگر زیادہ قرینہ یہی ہے کہ یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ پر محض بہتان ہے۔ اگر ایسا واقعہ ہوا ہوتا۔ تو یقیناً ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرے صحابہ رضؓ سے بھی اس کی روایت ہوتی۔ ؎

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے زیادہ کثیر الحدیث کوئی صحابی نہیں ہے۔ بجز حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ مگر واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے پانچ ہزار تین سو حدیثیں مروی ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضؓ سے کل سات سو حدیثیں۔ حافظ ابن حجر رحؒ نے اس کی متعدد تاویلیں کی ہیں مگر سب رکیک بخصوصاً جب اس کا خود وہ اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی کتابیں تھیں جن میں ان کی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں۔ تو ان کی ساری تاویلیں لایعنی ثابت ہو جاتی ہیں۔

جمع احادیث یا کتابت حدیث کی روایتیں خاص عہد نبوی میں اور بھی پیش کی جاتی ہیں مگر خود محدثین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ روایتیں ضعیف ہیں۔ اس لئے ان کی تنقید کی ضرورت نہیں۔ البتہ منع کتابت کی وہ حدیث جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے کہ مجھ سے سُن کر قرآن کریم کے سوا کچھ نہ لکھو۔ اور جس نے لکھا ہو وہ اس کو محو کر دے، ضرور صحیح ہے مگر اس کے مخاطب صرف کاتبین وحی تھے کیونکہ کاتبین وحی اگر وحی کے علاوہ آپؐ کی اور باتیں بھی لکھتے۔ تو اس کا سخت خطرہ تھا کہ کسی وقت خود

؎ حدیث قرطاس کے متعلق یہی تحقیق علامہ شبلی رحؒ نے بھی اپنی کتاب الفاروق میں بیان کی ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ (طاہر)

ان کو شبہ ہو جاتا کہ یہ جو میں نے لکھا ہے۔ یہ وحی میں داخل ہے یا وحی سے خارج۔ اس لئے کاتبینِ وحی کو قرآن کے سوا آپؐ کی اور باتوں کے لکھنے کی ممانعت بالکل قرین عقل و مبنی بر مصلحت تھی۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ حضرت معاویہ رضؓ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث پوچھی۔ جب انہوں نے بیان کی تو حضرت معاویہؓ نے ایک شخص سے لکھ لینے کو کہا۔ زید رضؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو حدیث لکھنے سے منع کیا تھا۔ تو حضرت معاویہ رضؓ نے جو لکھوایا تھا اس کو محو کرا دیا۔ حضرت زید بن ثابت رضؓ کاتب وحی تھے۔ اس لئے ان کو منع فرمایا تھا مگر زید رضؓ فقیہ نہ تھے اس لئے اس کو عام ممانعت سمجھے اور حضرت معاویہ رضؓ کی فراست اور ان کا تفقّہ ہر چند مشہور ہے مگر حکم اللہ اور رسول کے آگے سر جھکا دینے کی خو تھی اس لئے محو کرا دیا۔ وہ یہ سمجھے کہ ہم اس کے لکھ لینے اور محفوظ رکھنے پر مامور نہیں ہیں۔ اگر نہ لکھ رکھا تو کوئی بازپرس نہ ہوگی۔ اور اگر زید ہی کا تفقّہ صحیح ہے تو لکھ رکھنے پر ضرور بازپرس ہوگی۔

اگر صحابہ کرام رضؓ نے کچھ حدیثیں جمع کی تھیں تو یا تو اس خیال سے کہ کہیں یہ صحیفہ آگے چل کر باعث فتنہ نہ ہو، انہوں نے خود اپنے ہی وقت میں ان کو ضائع کر دیا۔ جیسا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے پانچ سو حدیثیں جمع کی تھیں مگر ان کو خود ہی جلا ڈالا کہ مبادا اس کے بعد کوئی فتنہ ہو، اور عنداللہ اس کا ذمّہ دار میں ٹھہروں۔ [1] یا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں تمام صحابہ کرام رضؓ سے ان کے لکھے ہوئے مجموعاتِ احادیث کو لے کر ضائع کر دیا۔ اور کہا کہ حسبنا کتابُ اللہ، ہم مسلمانوں کے لئے کتابُ اللہ کافی ہے۔ ان صحیفوں کی اگر ضرورت ہوتی تو ان کے لکھنے اور احادیث کے مدوّن کرنے کا حکم ہوتا۔ جب اس کا حکم نہیں ہوا تو ان کے نہ رکھنے کا کوئی الزام نہیں اور رکھنے کا الزام ہو سکتا ہے اس لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد کسی صحابی کا کوئی مجموعۂ احادیث دنیا میں باقی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج اول ص ۵

نہ رہا۔ (طبقات ابن سعد مصنف عبد الرزاق)

میرے دوست ڈاکٹر زبیر صدیقی اپنے مقالہ القول الحثیث میں بعض صحابۂ کرام رضہ کے صحف احادیث کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ تابعین و تبع تابعین کے عہد تک باقی رہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص والے صحیفے کا ذکر فرماتے ہوئے بحوالہ المطالعات الاسلامیہ لکھتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کا وہ صحیفہ ان کے پوتے عمرو بن شعیب نے پایا۔ اس میں شک نہیں کہ عمرو بن شعیب کے پاس ایک صحیفہ ضرور تھا مگر یہ وہی صحیفہ اگر ہوتا تو تمام محدّثین کا سرمایۂ استناد ہوتا۔ حالانکہ یہی صحیفہ ان کی تضعیف کا باعث ہوا اور محدثین میں عمرو بن شعیب اسی صحیفہ کی وجہ سے بدنام اور متہم رہے۔ تفصیل تہذیب التہذیب لہ ترجمہ عمرو بن شعیب میں مذکور ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

ڈاکٹر زبیر لکھتے ہیں کہ جابر بن عبد اللہ رضہ کے پاس ایک صحیفہ تھا اور یہ وہی تھا۔ جس سے مجاہد و قتادہ رضہ روایت کیا کرتے تھے۔ اور جس کو قتادہ رضہ نے حفظ کر لیا تھا۔ اور اپنے اس دعویٰ کی سند کے لئے طبقات ابن سعد جلد ۷ صہ ۳ اور تذکرۃ الحفّاظ جلد اول صہ ۱۱۰ کا حوالہ دیا ہے۔ تذکرۃ الحفاظ کے صفحۂ مذکورہ میں تو کچھ نہیں ہے۔ البتہ صفحہ ۱۱۶ میں بضمن ترجمہ قتادہ بن دعامہ اتنا ہے کہ "ان کے سامنے صحیفۂ جابر ایک بار پڑھا گیا تو انہوں نے اس کو حفظ کر لیا" اور بس نہ یہ مذکور ہے کہ صحیفۂ جابر میں قرآن کریم کی سورتیں تھیں یا حدیثیں۔ نہ یہ مذکور ہے کہ قتادہ اس صحیفے سے روایت کیا کرتے تھے۔ اور طبقات ابن سعد جلد ۷ صفحہ ۲۰۱ ترجمہ قتادہ میں ہے کہ معمر رضہ نے کہا کہ قتادہ رضہ نے سعید بن عروبہ سے کہا کہ مصحف ہاتھ میں لو اور سورۂ بقرہ حضرت قتادہ رضہ نے زبانی پڑھا تو ایک حرف کی بھی غلطی نہیں کی۔ حضرت قتادہ رضہ نے سعید بن عروبہ رضہ سے پوچھا کہ میں نے صحیح یاد کیا ہے تو سعید رضہ نے کہا کہ ہاں۔ حضرت قتادہ رضہ نے کہا کہ صحیفہ دیکھ کر یہ نہیں (یعنے قرآن دیکھ کر میں نے یاد نہیں کیا ہے) بلکہ سورہ بقرہ قتادہ رضہ کے سامنے پڑھا گیا تھا۔ (یعنے صرف سُن کر یاد کر لیا تھا) قتادہ رضہ نے درمیان میں بطور جملہ معترضہ کے یہ بھی کہا کہ) جابر بن عبد اللہ رضہ

سورہ بقرہ کے مجھ سے زیادہ حافظ تھے۔ طبقات کی اصل عبارت یہ ہے۔ قال معمر وقال قتادۃ رضہ لسعید بن ابی عروبۃ یا اما النضر (سعیدؓ کی یہ کنیت تھی) خذ المصحف قال (ای المعمر) فعرض علیہ سورۃ البقرۃ فلم یخطأ فیہا حرفًا واحدًا قال (ای المعمر) فقال (ای قتادہ) یا ابا النضر احکمت؟ قال نعم۔ قال (ای قتادۃؓ) لا بالصحیفۃ "جابر بن عبد اللہ احفظ منی لسورۃ البقرۃ (یہ جملہ معترضہ تھا) قال (ای المعمر) وکانت قرئت علیہ [1] (ای سورۃ البقرۃ یہی طبقات کی عبارت ہے جس سے ذہبی نے قتادہ کے ترجمہ میں لکھ دیا۔ کہ قرئت علیہ صحیفۃ جابر رضہ مرۃ فحفظھا (تذکرۃ الحفاظ جز اول ص۱۱۲) اور میرے دوست ڈاکٹر صدیقی نے لکھ دیا کہ وایضًا کانت صحیفۃ عند جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ وھی التی کان یروی منھا مجاھد و قتادۃ رضہ و کان حفظہ (القول الحثیث ص۹) بس الصحیفۃ کا لفظ اور جابر بن عبداللہ کا نام ساتھ ساتھ آگیا۔ چاہے الصحیفۃ معرّف باللام ہی ہی مگر دونوں میں ترکیب اضافی قائم کرلی گئی۔ یہ قصور ہمارے ڈاکٹر صاحب کا نہیں ہے بلکہ ذہبی رح کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ "اسی صحیفہ سے مجاہد و قتادہ رضہ روایت کیا کرتے تھے۔" ابن سعد سے کئی صدی صدی متاخر ذہبی رح تھے۔ انہوں نے ابن سعد رح پہ ایک حاشیہ چڑھا دیا تو ذہبیؒ سے کئی صدی متاخر ڈاکٹر صدیقی ہیں۔ یہ کیوں پیچھے رہ جاتے۔

یہ تو قتادہ رضہ کا معاملہ ہوا۔ اب مجاہدؒ کا حال بھی سُن لیجیئے۔

مجاہد رح کے ترجمے میں ذہبی رح نے نہ کسی صحیفے کا ذکر کیا ہے نہ جابرؓ کا البتہ ابن سعدؒ ج ۵ ص ۳۴۴ میں لکھتے ہیں کہ اخبرنا ابوبکر بن عیاش قال قلت للاعمش مالھم یتقون تفسیر مجاھد؟ قال کانوا یرون انہ یسأل اھل الکتاب۔ قال و قال غیر ابی بکر کانوا یرون ان مجاھد ا یحدث عن صحیفۃ جابرؓ۔ ترجمہ: ہمیں ابوبکر بن عیاش رضہ نے خبر دی کہ میں نے اعمش سے پوچھا کہ لوگ مجاہدؒ کی تفسیر سے احتیاط کیوں

---

[1] کانت قرئت کی ضمیر اگر سورہ بقرہ کے عوض کسی صحیفہ ہی کی طرف خواہ مخواہ پھیری جائے تو وہ صحیفہ قرآن ہی کا کوئی نسخہ ہوگا جس میں سے سورہ بقرہ کسی نے قتادہ رضہ کے سامنے پڑھا ہوگا نہ کہ صحیفہ احادیث

کرتے ہیں۔ تو اعمش نے کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اہلِ کتاب سے پوچھا کرتے تھے اور ابو بکر کے سوا دوسروں نے کہا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ صحیفۂ جابر رضؓ سے حدیثیں لایا کرتے تھے۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ یہاں جابر" سے کون جابر مراد ہیں۔ جابر بن عبدُاللہ صحابی یا کوئی اور جابر؟ اول تو جابر بن عبداللہ صحابی رضؓ کا کوئی صحیفۂ احادیث تھا ہی نہیں ذہبی رحؒ نے ابن سعد کی عبارت سے غلط فہمی میں آکر خواہ مخواہ ایک صحیفۂ جابر بنا لیا۔ اور بالفرض اگر کوئی صحیفہ ہو بھی تو اس میں قرآن لکھا ہوا تھا نہ کہ حدیثیں۔ جیسا کہ قتادہ رضؓ کے مذکورۂ بالا جزء، ترجمہ سے معلوم ہوا کہ قتادہ رضؓ نے سورہ بقرہ کے حفظ کے سلسلے میں لا با لصّحیفۃ اور جابر بن عبد اللہ احفظ مِنّی بسُورۃ البقرۃ کہا تھا۔ تو اگر اس کو بصحیفۂ جابر بن عبد اللہِ کا مرکب اضافی بنایئے تو وہ صحیفۂ قرآن ہوگا نہ کہ صحیفۂ احادیث

دوسرے یہ کہ اگر واقعی جابر بن عبداللہ کا کوئی صحیفۂ احادیث تھا اور اس صحیفہ سے مجاہد رحؒ اپنی تفسیر میں حدیثیں لا رہے تھے تو ایسی تفسیر تو بہت زیادہ مقبول ہونی چاہیئے تھی اور مستند سمجھی جانی چاہیئے نہ کہ اس کی وجہ سے لوگ مجاہد رحؒ کی تفسیر سے احتیاط کرنے لگیں۔ اس لئے یقیناً یہ "جابر" وہ جابر بن عبداللہ صحابی نہیں ہیں۔ بلکہ جابر ابن یزید الجعفی ہے جو مشہور محدّث مگر اول درجہ کا کذّاب اور مفتری تھا اور مجاہد رحؒ کا ہم عصر تھا۔ مجاہد رحؒ نے اس کی روایت کردہ حدیثیں اپنی تفسیر میں داخل کر دی تھیں۔ اسی لئے لوگوں نے ان کی تفسیر سے احتیاط برتی۔

جعفر بن جعفی کا انتقال اگرچہ مجاہد کے انتقال کے تقریباً ۲۴ سال بعد ہوا ہے۔ مگر دونوں ہم عصر ضرور تھے اور جابر کی روایتیں ہی ایسی ہوا کرتی تھیں۔ کہ اسکے ہمعصر باوجود اس کو کذّاب جاننے کے اس کی حدیثیں لکھ ہی لیا کرتے تھے۔ مزید تفصیل تہذیبُ التہذیبؔ[1] میں ترجمہ جابر بن یزید الجعفی دیکھ لیجیئے

میرے دوست ڈاکٹر صدیقی نے صحیفۂ ہمام بن منبہّ کا بھی ذکر اسی صفحہ میں کیا ہے کہ وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے صحیفے سے ماخوذ تھا اور تہذیب التہذیب

---

[1] جلد ۲ صفحہ ۴۶ اور اگر واقعی حضرت جابر بن عبداللہ کا کوئی صحیفہ ہوتا تو پھر ان کے ترجمے میں ائمہ رجال اس کا ذکر کیوں کرتے

جلد ۱۱ ص۲۷ کا حوالہ دیا ہے مگر میں نے تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۷ ہی نہیں، بلکہ ترجمہ ہمام بن منبہ کو بھی دیکھا۔ اس مفہوم کا کہیں پتہ نہ ملا۔

البتہ صحیفہ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رض اور صحیفہ ابو ہریرہ رض و صحیفۂ سعد بن عبادہ رض و صحیفۂ سمرہ بن جندب رض، و صحیفہ عبد اللہ بن اوفیٰ اور کتب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جو ایک اونٹ کے برابر تھیں۔ ان کا ذکر مختلف کتابوں میں ضرور ہے جن کا ذکر ہمارے دوست ڈاکٹر صاحب نے بھی فرمایا ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صحیفے دنیا سے آخر اس طرح کیوں ناپید ہو گئے کہ ان کا ایک ورق بھی کہیں موجود نہیں آج ہی نہیں، بلکہ امام بخاری و امام مسلم رحمہم اللہ بلکہ ان سے پہلے امام مالک رحمۃ اللہ کو بھی ان کا ایک ورق تک نہیں ملا۔ حد یہ ہے کہ سب سے پہلے جامع احادیث ابن شہاب زہری کو بھی ان صحائف و کتب کے کسی ایک ورق کے بھی دیکھنے کا شرف حاصل نہ ہوا۔ آج عہد صحابہ کا لکھا ہوا قرآن مجید چودھویں صدی ہجری میں موجود ہے۔ مگر دوسری صدی کے اوائل ہی میں حدیثوں کے ان تمام ذخائر کا ایک ایک ورق ایسا ضائع ہو گیا کہ جامعین احادیث میں سے کسی ایک کو بھی ان میں سے ایک پرزے کی بھی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ آخر یہ کیوں؟

حقیقتِ حال

حقیقت یہ ہے کہ اکثر اقوال تو ان صحائف کے متعلق سِرے سے غلط ہیں اور بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ نے جو کچھ جمع کیا تھا۔ اس کو بخوفِ فتنہ یا تو خود انھوں نے جلا دیا۔ یا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جلوا دیا۔ اس لئے ان میں کا ایک ورق بھی باقی نہ رہا۔ خلافت فاروقی کے بعد ان صحائف میں سے کسی ایک کے وجود کا بھی ذکر صحیح نہیں ورنہ پھر یہ بتانا ہوگا کہ ایسی مغتنم چیزوں کی حفاظت بعد والوں نے کیوں نہ کی؟ اور ان کی نقل در نقل ہو کر ان کی اشاعت کیوں نہ ہوئی؟ اور ان جامعینِ احادیث یعنی زہری اور ان کے معاصرین و تبعین نے ان کو کیوں نہ دیکھا؟ اور اگر دیکھا تو ان کی نقل کیوں نہ کی اور ان کا ذکر کیوں نہ کیا اور ان کو محفوظ کیوں نہ رکھا؟

بات یہ ہے کہ کتابت احادیث کو مستند و مسنون قرار دینے کے لئے یہ سب روایتیں بنائی گئیں کہ فلاں کے پاس فلاں کا صحیفہ تھا اور فلاں کے پاس فلاں کا۔ اگر تھا تو فلاں کے بعد ناپید کیوں ہو گیا؟

ابن شہاب زہری کے شیوخ

زہری کے شیوخ کی صحیح تعداد بتانا بہت مشکل ہے۔ انکی تمام روایتوں کا تتبع کیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ مشکل حل ہو سکے۔ پھر بھی یہ پتہ لگانا تقریباً محال ہے کہ یہ کس سے واقعی سُن کر روایت کر رہے ہیں اور کس سے ارسال کر رہے ہیں یعنی درمیانی واسطہ چھوڑ کر اپنی سماعتِ حدیث کو اپنے شیخ کے شیخ کی طرف کہاں منسوب کر رہے ہیں۔

پہلی صدی کے بعد یعنی ۱۰۱ھ میں یا اسکے بھی کچھ بعد انہوں نے جمع و تدوینِ احادیث کا کام شروع کیا۔ اس لئے جو لوگ ۱۰۱ھ سے پہلے وفات پا چکے۔ ان سے احادیث لینے کا ان کو تقریباً بالکل موقع نہیں ملا۔ البتہ برسبیل تذکرہ اگر کوئی حدیث ان لوگوں میں سے کسی نے اتفاقاً ان سے کبھی بیان کی ہو اور بلفظہٖ پورے سلسلہ اسناد کے ساتھ ان کو وہ یاد بھی رہ گئی ہو تو ممکن ہے کہ ایسی دس پندرہ یا کچھ زیادہ حدیثیں ایسے لوگوں سے ان کے پاس امکانِ صحت کے ساتھ ہوں۔ مگر ان کی حدیثیں نصف سے زیادہ ایسے ہی بزرگوں سے ہیں۔ جو ۱۰۱ھ سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ اس لئے یقیناً ایسی حدیثوں میں سے فی ہزار نو سو ننانوے حدیثیں یقیناً مرسل ہیں۔ یعنی ان حدیثوں کو زہری نے کسی واسطے سے سنا۔ اور وہ واسطہ حذف کر کے ان حدیثوں کو ان بزرگوں کی طرف حدثنا فلان کہہ کر منسوب کر دیا۔ کیونکہ ۱۰۱ھ سے پہلے تحصیل احادیث کے لئے تگ و دو شہر شہر اور قریہ قریہ کی دوڑ کا دستور نہ تھا۔ نہ کسی کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ منافقین عجم کے قال رسول اللہ، قال رسول اللہ کے مفسدانہ شور سے اہل حق کے کان بھر گئے تھے۔ اور کتنوں نے برسبیلِ تذکرہ بھی روایتِ حدیث ترک کر دی تھی۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہوا۔ غرض جب ۱۰۱ھ سے پہلے نہ تحصیل احادیث کا دستور تھا نہ منافقین عجم کے سوا عام طور سے روایتِ احادیث

کسی کا مشغلہ تھا تو اگر ابن شہاب نے ۱۰۱ھ سے پہلے حدیثیں لوگوں سے سنیں تو ان میں زیادہ تر وہی حدیثیں ہوں گی۔ جن کو انہوں نے منافقین عجم ہی سے سنا ہوگا۔ چاہے وہ ان کا نام لیں یا نہ لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب سنی شیعہ (دونوں) جماعتوں میں مذہبی بٹوارہ نہیں ہوا تھا اور دونوں جماعتوں کے افراد باہم ملے جلے تھے۔ شیعوں کے پاس کوئی سیاسی طاقت نہ تھی اس لئے وہ اپنے ائمہ کی ہدایت کے مطابق اپنے مخصوص عقائد کو نہایت سختی کے ساتھ دوسروں ہی سے نہیں بلکہ اپنے غیر معتمد علیہ افراد[1] سے بھی چھپاتے تھے۔ منافقین عجم میں اکثریت شیعوں ہی کی تھی۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے محبت خاندانِ رسول اور ان کی ظاہری حمایت ہی کو اپنا حیلہ بنایا تھا اور چونکہ کثرت روایت حدیث اسی جماعت کے افراد اس وقت تابعی کا خرقہ پہن کر ہر جگہ روایت احادیث کرتے پھرتے تھے۔ اور ہر دس سچی بات میں دو چار جھوٹی حدیثیں بھی ضرور رکھ دیتے تھے۔ سچی حدیثوں کو بھی ایسے عنوان سے بیان کرتے تھے کہ ان سے کوئی لالعینے پہلو یا بعض مفہوم باطل بھی نکل سکے۔ یا ایسی باتیں بیان کرتے تھے کہ جو کلمۃ[2] حق اُرِیدُ بِہِ الباطل کی مصداق ہوں۔ غرض اس وجہ سے زہری کو ہر طرح کے راوی کی حدیثیں ملتی رہیں۔ اور ہر فرقے میں ان کا رسوخ رہا۔ روایتیں ان کو زیادہ تر انہیں سے ملتی تھیں جو محبت خاندانِ نبوی کے مدعی تھے۔ اور غالباً ارسال کا ڈھنگ بھی ان کو انہیں لوگوں نے بتایا کہ روایت میں ہمیں لوگوں کا نام کیوں لیتے ہو۔ جن لوگوں سے خود تمہاری ملاقات رہی ہے ان کی روایتیں انہیں کے نام سے لکھو۔ تمہارے اور ان کے درمیان تو ہمیں ہیں تمہاری ملاقات ہم سے بھی ہے اور ان سے بھی تھی۔ اگر ہمارا نام بیچ میں نہ رہا تو کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان لوگوں کے نام حذف کرکے ان لوگوں کی طرف اپنی سماعت منسوب

---

[1] قال ابو عبد اللہ علیہ السلام نحن علیٰ دین من کتمہ اعزہُ اللہ ومن اذاعہٗ اذلّہُ اللہ امام ابوعبداللہ (جعفر) کا قول ہے کہ ہم لوگ ایک ایسے دین پر ہیں کہ جس نے اس کو چھپایا اللہ اس کو عزت دیگا اور جو اس کو شائع کریگا اللہ اس کو ذلیل کریگا۔ (اصول کافی ص۴۸۵ نولکشور) [2] یعنی الفاظ تو سچے ہیں۔ بات بظاہر سچی ہے مگر مراد باطل ہے۔

کر دی ۔ جن سے ان لوگوں نے اپنی سماعت بیان کی تھی ۔ اور اس طرح یہ ارسال کے خوگر ہو گئے اور ایسا خوگر ہوئے کہ پھر جن لوگوں سے ان کی ملاقات تک نہ تھی ۔ بلکہ وہ لوگ جو ان کے بچپن ہی میں مر چکے تھے یا ان کی ولادت سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے ان سے بھی حدثنا فلاں کہہ کر روایت کرنے لگے ۔ ان حالات میں ان کے ان شیوخ کا پتہ لگانا جن سے واقعی خود انہوں نے سنا ہو، کس قدر مشکل ہے ۔

مُرسل متّصل نما

بعض حدیثیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو ایسے شیوخ کیطرف منسوب ہوں جن سے اُن کی لقاء اور ان حدیثوں کے سوا دوسری حدیثوں کا سماع بھی ثابت اور صحیح ہو مگر یہ حدیثیں ان سے بلا واسطہ نہ سنی ہوں اور یہ درمیانی واسطے کو حذف کر کے ان سے ان حدیثوں کو بھی بلا واسطہ روایت کر رہے ہوں تو ایسی متصل نما مرسل روایتوں کا پتہ کس طرح لگایا جا سکتا ہے ۔

بعض شیوخ زُہری

حافظ ابن حجر رح نے تہذیب التہذیب جلد ۹ صہ ۴۴۵ میں بضمن ترجمۂ زہری ان کے ستّر شیوخ کے نام نقل کئے ہیں ۔ یہ ان کے منتخب شیوُخ ہیں ۔ مگر ان میں بھی کتنے ایسے ہیں جو سنہ ۱۰۱ھ سے پہلے ہی راہیٔ جنت ہو چکے تھے ۔ اس لئے ان سے زہری کی روایتیں زیادہ تر مُرسل ہی ہوں گی ۔ اور بعض ان میں کے کسی قدر مجروح بھی ہیں ۔ ہم ان میں سے چند کا ذکر یہاں کر دینا مناسب سمجھتے ہیں ۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کا نام ان ستّر میں تو نہیں ہے مگر دوسری جگہ یا خود ان کے ترجموں میں یہ مذکور ہے کہ ان سے زہری روایت کرتے ہیں ۔

عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود

یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھتیجے کے بیٹے ہیں اور ان سے روایت بھی کرتے ہیں مگر مرسل کیونکہ ان کا وقت نہیں پایا ۔ اسی طرح زید بن ثابت سے بھی انہوں نے کچھ نہیں سُنا ۔ بلکہ ان کو دیکھا تک نہیں اس لئے ان سے بھی ان کی روایت مرسل ہی ہے [1] بہت بڑے فقیہ بھی تھے اور شاعر بھی ۔ علی بن المدینی

[1] زیادہ قرینہ یہی ہے کہ یہ ارسال خود انہوں نے نہیں کیا بلکہ یہ فعل ان سے روایت کرنیوالوں کا ہے ۔ واللہ اعلم اور یہی حال ان سب اکابر تابعین کا ہے جن پر ارسال کا الزام عائد ہے یقیناً انہوں نے ارسال نہیں کیا ہے بلکہ ان سے روایت کرنے والوں کا یہ فعل ہے ۔

نے ان کا سال وفات ۹۹ھ بتایا ہے۔ مگر اکثر محدثین کے نزدیک ان کی وفات حضرت علی بن الحسین بن علیؓ بن ابی طالب سے پہلے ہوئی ہے۔ اور حضرت علی بن الحسین رضؓ کی وفات امام بخاری رحمہ اللہ نے تاریخ صغیر میں ۹۲ھ لکھی ہے اور ان کے پوتے علی بن جعفر بن علی بن الحسینؓ کی روایت ہے کہ ۹۴ھ میں علی بن الحسین رضؓ کی وفات ہوئی ہے اور عبیداللہ بن عبداللہ کے متعلق ابن حجر رح امام بخاری رحمہ اللہ کا قول لکھتے ہیں کہ حضرت علی بن الحسین رضؓ سے پہلے ۹۴ھ یا ۹۵ھ میں وفات پائی۔ بخاری کے قول میں یہ تخالف کیوں ہوا خدا کو معلوم۔ غالب قرینہ یہ ہے کہ ۹۴ھ میں دونوں کی وفات کچھ مہینے آگے پیچھے ہوئی۔ بغرض زہری کی جمع و تدوین حدیث سے بہر حال دونوں پہلے ہی رہ گرائے فردوس ہو چکے تھے۔ اس لئے ان دونوں سے جو سُنی سنائی حدیثیں یاد ہوں۔ ان کے سوا زیادہ حدیثیں زہری کی مرسل ہی ہوں گی۔

خارجہ بن زید بن ثابت

یہ اپنے والد زید بن ثابت اور چچا یزید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں۔ مگر اس پر تو سارے محدثین متفق ہیں کہ یزید بن ثابت کا انہوں نے وقت نہیں پایا اس لئے ان سے ان کی روایت مُرسل ہے مگر یہ جو اپنے والد زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں۔ اس کو محدثین متصل کہتے ہیں۔ چونکہ بخاری وغیرہ میں جمع قرآن کی روایت اُن سے ہے اور بلا واسطہ ہے۔ زید بن ثابت کی وفات کے متعلق مختلف اقوال ہیں ۴۵ھ اور ۵۱ھ والی روایت کو خود ابن حجر رح نے ضعیف ٹھہرایا ہے [1] اور ۴۵ھ کی روایت صحیح قرار دی ہے۔ حافظ ذہبی رح بھی تذکرۃ الحفاظ جلد اول صہ ۲۹ میں ۴۵ھ ہی کی روایت کو صحیح ٹھہراتے ہیں۔ خارجہ بن زید کے سال ولادت کو کوئی نہیں لکھتا۔ ذہبی رح نے تو ان کو حفاظ حدیث میں شمار ہی نہیں کیا۔ اس لئے نام لکھ کر چھوڑ دیا کہ چونکہ یہ قلیل الروایت ہیں۔ اس لئے حفاظ میں ہم ان کا ذکر نہیں کرتے۔ البتہ ابن حجر رح نے مختصراً ذکر کیا ہے اور ان کا سال وفات ۹۹ھ یا ۱۰۰ھ اختلاف کے ساتھ تہذیب التہذیب [2] میں نقل کیا

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۳۹۹ ان دونوں قولوں کو قیل لکھا ہے جو ضعف پر دلالت کرتا ہے۔ [2] تہذیب التہذیب جلد ۳ صہ ۷۵

ہے۔ تاریخ اوسط میں امام بخاری رح ان کی عمر باسٹھ برس لکھتے ہیں [1] تو اپنے والد کی وفات کے وقت صرف سات برس ہی کے تھے۔ اس لئے اپنے چچا کی طرح یہ اپنے والد سے بھی یقیناً مرسل ہی روایت کرتے ہیں یعنے درمیان کے ایک راوی کا نام چھوڑ کر۔

عبداللہ بن محمد بن حنفیہ رح

یہ حضرت علی رضہ کے پوتے ہیں۔ کٹر قسم کے شیعہ تھے۔ ابن سبا کی جماعت کے آلۂ کار تھے۔ سبائیوں کی بنائی ہوئی حدیثوں کا اتباع کرتے تھے۔ اور چپکے چپکے جمع کرتے تھے ۹۸ھ یا ۹۹ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ محمد بن حنفیہ کے دو بیٹے تھے۔ عبداللہ اور حسن۔ عبداللہ شیعہ ہو گئے اور حسن مَرجیہ (تہذیب التہذیب جلد ۶ صـ۱۶) بہرحال ان دونوں سے بھی زہری کی روایت زیادہ تر مرسل ہی ہو گی۔ کیونکہ زمانۂ آغاز تدوینِ احادیث سے پہلے ان کی وفات ہو چکی ہے۔ چونکہ ابن شہاب زہری شیعوں میں شیعہ تھے۔ اس وجہ سے ان سے بھی حدیثیں روایت کرتے رہے

بطور نمونہ ان تین اشخاص کے ایسے نام میں نے پیش کئے ہیں۔ جو آغاز جمع احادیث سے بالاتفاق یا بقول صحیح پہلے گذر چکے ہیں۔ اور ایسے بھتیرے ہیں۔ اب چند مثالیں ایسوں کی پیش کرتا ہوں۔ جن کی تاریخ وفات میں اختلاف پیدا کرکے کوشش کی گئی ہے کہ کسی طرح زمانۂ آغاز جمع احادیث تک ان کو زندہ ثابت کیا جائے۔ تاکہ کم سے کم ان کی روایتیں تو متصل سمجھی جا سکیں۔ اسی لئے دو ایک سال نہیں۔ بلکہ دس دس سال کا اختلاف پیدا کر دیا گیا۔

ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف رضہ

یہ عشرہ مبشرہ میں کے ایک مشہور جلیل القدر صحابی کے صاحبزادے ہیں اسلئے بڑے باوثوق تابعی ہیں۔ مگر ان کو عبداللہ بن عباس رضہ سے فی الجملہ چشمک تھی۔ اس لئے ان کی حدیثوں کی مخالفت اکثر کیا کرتے تھے۔ اور اس وجہ سے بقول ابن حجر رح ان کے علم سے محروم رہے۔ پھر ارسال بھی بہت کیا کرتے تھے۔ اپنے والد ماجد کا وقت نہیں پایا۔ مگر ان سے روایت کرتے تھے۔ نضر بن شیبان [2] نے جو ان کے والد سے سننے کی روایت

[1] مولانا شمس الحق محدث درشرح سنن ابی داؤد [2] نضر بن شیبان کو خود ابن حجر تہذیب التہذیب میں ضعیف اور

کی ہے۔ اس کو یعقوب ابن شیبہ، ابن معین، علی بن المدینی، ابو داؤد اور امام احمد بن حنبلؒ صحیح قرار نہیں دیتے ہیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما سے بھی ان کی روایت مرسل ہی کہی جاتی ہے۔ امّ المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضؓ، ابو موسیٰ اشعری سلمہ بن الصّخر البیاضی رضؓ، عمرو بن امیہ، ابو الدّرداء رضؓ، حضرت ذوالنورینؓ، حضرت فاروق اعظم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہم اجمعین سب سے یہ مُرسل روایت کرتے ہیں۔ درمیانی راوی کا نام حذف کر کے ۹۴ھ میں اور بروایتے ۱۰۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ بخوبی ممکن ہے کہ ان ارسالوں کا الزام ان پر صحیح نہ ہو بلکہ ان سے روایت کرنے والوں پر ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

عمرہ بنت عبدالرحمٰن الانصاریہ رضؓ

جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی گود میں پلیں ۹۸ھ میں ستتر (۷۷) سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ مگر ان کا سال وفات ۱۰۶ھ بھی بتایا گیا تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صـ ۴۳۸ میں ان کو ابو بکر بن حزم قاضیٔ مدینہ کی پھوپھی لکھا ہے۔

حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ

ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سابق الذکر کے بھائی ہیں۔ ان کی روایت بھی حضرت صدّیق اکبر، حضرت فاروق اعظم، حضرت ذوالنورین اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین اور خود اپنے والد ماجد رضؓ سے مُرسل ہی ہے۔ ۷۳ سال کی عمر میں ۹۵ھ یا ۱۰۵ھ میں راہیٔ جنت ہوئے۔

سلیمان بن یسار الہلالی رحؒ

اکابر تابعین میں ہیں۔ بعض لوگوں سے ان کی روایتیں بھی مرسل ہیں۔ مثلاً سلمہ بن صخر و ابو رافع وغیرہما سے ان کی وفات بروایتے ۹۴ھ یا ۱۰۰ھ کی ہے اور پھر ۱۰۳ھ و ۱۰۷ھ و ۱۰۹ھ کی روایتیں بھی ہیں۔

الانتباہ

یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ منافقین عجم یا جو موالی قسم کے سبایا (جنگ کے قیدی) یا اولادُ السّبایا (ان جنگی قیدیوں کی اولاد) یا بعض

نوجوانان بنی ہاشم مثلاً عبداللہ بن محمد بن حنفیہ یا کچھ اور سیدھے سادھے لوگ جو منافقین عجم کے دام فریب میں آ گئے تھے۔ ان کے سوا اکابر تابعین جن کی تعداد تو درحقیقت بہت زیادہ تھی مگر چونکہ وہ فتنۂ روایات سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لئے اپنی خاموشی کی وجہ سے طبقۂ محدثین میں ان کے کثیر افراد گمنام رہے اور کتنوں کے نام تو آتے ہیں مگر درحقیقت وہ خود نہیں ہیں بلکہ صرف ان کے اسمائے گرامی استعمال کر کے ان کو نخواہ مخواہ کھینچ لایا گیا ہے تو جو الزام ارسال و تدلیس وغیرہ کا از روئے روایت اُن پر آتا ہے۔ وہ درحقیقت اُن پر نہیں ہے بلکہ ان کے نام استعمال کرنے والوں پر ہے۔ نہ ان غریبوں نے روایت کی نہ ارسال کیا۔ مگر مرسل روایتیں بنا بنا کر ان بے گناہوں کے سر منڈھی گئیں۔ اور ان کا نام استعمال کیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ آغاز جمع روایت میں جامعین کو کیا خبر تھی کہ یہ فن حدیث اس حد تک ایک صدی کے بعد ترقی کر جائے گا۔ کہ ایک ایک راوی کا حتی الوسع سال ولادت اور سال وفات اور امکان ملاقات درمیان راوی و مروی عنہ ان سب کی چھان بین کر کے لوگ قلمبند کر لیں گے؟ وہ تو سمجھتے تھے کہ جو ہم نے لکھ دیا ہے وہی بعد والوں کے لئے سند و حجت ہو جائے گا۔ بعد والوں میں سے کس کو معلوم ہو گا کہ سو برس پہلے کون پیدا ہوا تھا۔ اور کب مرا۔ فلاں سے فلاں کی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں، فلاں نے فلاں سے کچھ سنا تھا یا نہیں۔ اس کا پتہ سو ڈیڑھ سو برس بعد کے لوگ کس طرح لگا لیں گے۔ میری روایتیں ہی اس کی دلیل ہو جائیں گی کہ جب فلاں شخص فلاں سے روایت کر رہا ہے تو یقیناً ایک نے دوسرے کا وقت پایا اور یقیناً دونوں میں ملاقات بھی ہوئی اور راوی نے مروی عنہ سے یہ حدیث بھی سُنی۔ اس لئے بلا تامل ایسے لوگوں سے بھی روایت حدثنا کہہ کر کیا کرتے تھے۔ جن کی وفات کے وقت یہ بہت ہی کمسن تھے۔ بلکہ بعض ایسوں سے بھی جن کی وفات کے بعد یہ پیدا ہوئے۔

مسور بن مخرمہ ابو عبدالرحمٰن الزہری | یہ مشہور محدث ہیں اور محدثین کے کہنے کے مطابق ابن شہاب زہری

کے ہم جد ہیں۔ متقدمین تابعین میں ان کا شمار ہے۔ ان کی وفات ۶۴ھ میں بالاتفاق ہے۔ ابن شہاب کی پیدائش ۵۱ھ کی ہے۔ اس لئے یہ تیرہ برس کے ان کی وفات کے وقت تھے۔ وہ زمانہ عام طور سے درسِ احادیث کا تو تھا نہیں کہ جس طرح ۱۰۱ھ کے بعد لینے اکابر کو جمع و تدوین یا روایتِ احادیث میں مصروف دیکھ کر بچوں کو بھی حدیثوں کے سننے کا شوق پیدا ہوا اور لگے سُن سُن کر یاد کرنے۔ جب ۹۰ھ اور ۹۵ھ بلکہ ۹۹ھ میں وفات پانے والوں سے اس کی توقع نہیں (اگر وہ منافقین عجم یا اُن کے فریب خوردوں میں نہ تھے) کہ حدیثیں روایت کرتے پھرتے ہوں تو ۶۴ھ میں وفات پانے والوں سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک بارہ تیرہ برس کے بچے سے حدیثیں روایت کرنے بیٹھے ہوں اور سنیئے۔

عبادہ بن صامت رضؓ

یہ مشہور صحابی ہیں ۳۴ھ میں ان کی وفات ہے یعنے ابن شہاب زہری کی ولادت سے سترہ سال پہلے۔ مگر بغیر کسی درمیانی راوی کا نام لئے بلاواسطہ ابن شہاب ان سے بھی روایت کرتے ہیں۔

اسی طرح بعض غیر معروف بالکل مجہول لوگوں سے روایت لینے میں یہ کوئی باک نہیں محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ ان کو آغاز کار کے زمانے میں کیا خبر تھی کہ پچاس ساٹھ ہی برس کے بعد اسماءِ رجال کی تدوین کی ضرورت بھی لوگوں کو محسوس ہوگی۔ اور ایک ایک راوی کے حالات لوگ قلمبند کرلیں گے۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ ہم تو گھوم گھوم کر شہر شہر اور قریہ قریہ یہاں تک کہ راہ کے راہبوں سے بھی حدیثیں پوچھ پوچھ کر لکھ رہے ہیں۔
ان راویوں کے نام جو ہم لکھ دیں گے وہی بعد والوں کے لئے سند ہوگا۔ اس نام کا کوئی شخص تھا بھی یا نہیں؟ دس برس بعد والوں کو اس کا پتہ لگنا مشکل ہے۔ زیادہ مدت کے بعد اس کو کوئی کیا سمجھ سکتا ہے اور یہاں تو احادیث و روایت کا ایک طوفان اُمڈا ہوا ہے۔ ابن شہاب کو دیکھ کر ابو الزناد عبداللہ بن ذکوان جو آلِ عثمان کے غلام آزاد کردہ ابو لؤلؤ فیروز قاتل حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خاص بھتیجے تھے۔ ان کے ساتھ

لگ گئے تھے اور خود بھی حدیثیں جمع کرتے چلتے تھے۔ پھر مکحول وغیرہ متعدد لوگوں کو شوق پیدا ہو گیا تھا اور ہر شخص کو یہی فکر تھی کہ ہم زیادہ سے زیادہ حدیثیں جمع کریں۔ جرح و تعدیلِ رُواۃ کا تو اس وقت نام بھی نہ تھا۔ اور نہ اس کا موقع کا تھا کیونکہ یہ لوگ خود تابعی تھے اور سنہ ۱۰۰ھ میں یا اس کے بعد تو آغاز جمع احادیث کا کام شروع ہی ہوا تھا۔ اس لئے صرف تابعین ہی سے تو روایتیں لے رہے تھے۔ البتہ خود ان جامعین کو کسی صحابی کی سُنی سنائی کوئی حدیث اگر واقعی یاد تھی تو البتہ بلا واسطہ وہ اس کو کسی صحابی سے روایت کرتے تھے۔ مگر صحابیوں کیطرف منسوب کر دینے کا امکان تو ان تابعین کے لئے ہر وقت تھا۔ چاہے درمیانی راوی کو حذف کر کے، چاہے کوئی حدیث اپنی طرف سے بنا کر۔ یہ خود تابعی تھے ہی اس لئے اب پوچھنے والا کون ہے کہ تم نے کب سنا اور کس سے سُنا؟ اور ابھی تو یہ جامعین خود پوچھ پوچھ کر جمع ہی کر رہے ہیں۔ اس وقت تو کسی سے خود روایت کرتے نہیں کہ کوئی ان سے ان کے شیخ کا حال پوچھے جب ان کی روایت کا وقت آئے گا تو اگر کوئی روایت کسی اسم مسمّٰی سے یا کسی مجہول الحال شخص سے کی ہے تو اس کی کچھ تعریف و توثیق کر کے بتا دیں گے کہ تم نہیں جانتے ہو۔ یہ شخص نہایت معتبر تھا فلاں جگہ کا رہنے والا تھا اور ایسا تھا ویسا تھا مثلاً:-

ابُوالاحوص

ان کا نام کسی کو معلوم نہیں، نہ ابن شہاب نے بتایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلۂ بنی اللیث یا بنی غفار کے موالی میں سے تھے۔ ابوداؤد الاعمیٰ نقیع کے خاص شاگرد رشید تھے۔ صرف ابن شہاب ہی ان سے روایت کرتے ہیں اور کوئی نہیں۔ سعد ابن ابراہیم جو زہری کے شیوخ ہیں اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کے پوتے تھے۔ زہری سے ابُوالاحوص کا نام سن کر بہت بگڑے کہ تم یہ کس سے روایت کر رہے ہو۔ زہری نے ابوالاحوص کو پہچنوانا چاہا اور بہت صفائی پیش کی مگر سعد بن ابراہیم کی مطلق تشفی نہ ہوئی۔

لہ یہ ایک مشہور و معروف رافضی و کذاب تھا جھوٹی حدیثیں بنانے میں بڑا ماہر۔ اس کا ترجمہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ہے۔ نقیع نام ابوداؤد کنیت ابن الحارث ولدیت کے ساتھ دیکھ لیجئے ذہبی نے میزان میں بھی اس کا ترجمہ لکھا ہے۔ تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صہ ۴۷۰

(تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صہ ۵)

عثمان بن اسحاق

حافظ ذہبی میزان الاعتدال جلد ۲ صہ ۱۷۸ میں ان کو غیر معروف لکھتے ہیں۔ مگر ابن حجر رح نے تہذیب التہذیب جلد ۷ صہ ۱۰۶ میں ان کا نسب نامہ جوڑ کر بتلا دیا ہے کہ یہ مجہول شخص نہیں ہیں۔ لیکن اس کا اعتراف دونوں کو ہے کہ یہ صرف قبیصہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ابن شہاب زہری

محمد بن عبداللہ بن الحارث بن نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب

ان سے بھی صرف زہری ہی روایۃ کرتے ہیں اور لوگ ان کو صرف زہری کی روایتوں کی وجہ سے جانتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ صہ ۲۵۱)

عبیداللہ بن عبداللہ بن ثعلبہ

ان کا ذکر نہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے نہ ابن ابی حاتم نے بلکہ صرف زہری تنہا ان سے روایت کرتے ہیں۔ ائمہ رجال ان کے متعلق سخت اُدھیڑ بن میں ہیں۔ (میزان جلد ۳ صہ ۲۱)

سنین ابو جمیلۃ السلمی

ان کو کوئی ضمری کہتا ہے کوئی سلیطی بتاتا ہے ابن سعد کہتے ہیں کہ یہ بنی سلیم کے ایک فرد ہیں ان کے والد کا نام کوئی فرقد لکھتا ہے کوئی واقد۔ بغوی نے آسانی سے محدثانہ[1] فیصلہ کر لیا کہ دونوں

---

[1] محدثین کا یہ دستور ہے کہ متضاد حدیثیں یا روایتیں جب مل گئیں اور کسی طرح دونوں کو ایک موقع پر صحیح طور سے منطبق نہیں کر سکتے تو فوراً اس کو دو واقعہ یا کئی واقعے قرار دے دیا اگر شخص کا اختلاف ہے تو دونوں شخصیتیں یا کئی اشخاص کہہ کر ان تمام متضاد روایتوں کو اپنی اپنی جگہ پر صحیح ثابت کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے دین کی بہت بڑی خدمت انجام دیدی کہ احادیث نبوی میں جو مضمون کا تضاد تھا اس کو رفع کر کے معترض کا منہ بند کر دیا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر وہ روایتیں جھوٹی ہیں اور دروغ گو را حافظہ نباشد کی بنا پر بیانات میں تضاد پیدا ہو رہا ہے اور ہم نے اس دروغ کو اپنی اس تاویل سے جو فروغ دیدیا تو اسطرح

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

دو شخص تھے۔ سنین بن واقد الظفری ایک شخص ہی الگ مستقل طور سے ہے۔ واللہ اعلم
کہا جاتا ہے کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ فتح مکّہ میں شریک
تھے مگر افسوس کہ ان کا یہ دعویٰ کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن ان کو کوئی بھی جھوٹا نہیں کہتا۔
اس لئے کہ تابعی تھے اور زہری کے شیخ تھے۔ امام بخاری رحمہٗ اللہ نے بواسطہ اپنے شیخ کے
زہری ہی سے ان کی حدیث لی ہے مگر یہ کسی کو نہیں معلوم کہ یہ کب پیدا ہوئے تھے اور
کب دنیا سے سدھارے۔ بخاری میں ان کی روایت چونکہ زہری ہی سے ہے۔ اس لئے
بخاری و زہری کا احترام کرتے ہوئے ائمۂ رجال ان کو تابعی ثقہ لکھ دیتے ہیں۔ (تہذیب
التہذیب جلد۴ ص ۲۴۵ میں ان کا ذکر ہے۔)

سلیمان الاغر ابو عبداللہ المدنی

اصفہانی الاصل ہیں۔ قبیلہ جُہینہ کے موالی میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت
عمر رضی اللہ عنہ سے ان کی لقاء ثابت ہے۔ اس نام کے تین آدمی بتائے جاتے ہیں جو
نام لقب اور کنیت سب میں متّحد ہیں اور تینوں موالی ہی میں سے تھے۔ ایک زہری کے
شیخ جو قبیلہ جہینہ کے موالی میں سے تھے۔ دوسرے شعبیؒ کے شیخ جو حضرت ابو ہریرہؓ
اور حضرت ابُوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے مشترک موالی میں سے تھے۔ تیسرے اہلِ کوفہ
کے شیخ جن کے متعلق کچھ نہیں معلوم کہ کس کے موالی میں سے تھے۔ ائمۂ رجال کا ان کے
متعلق سخت اختلاف ہے۔ اس لئے کہ زہری ہوں یا شعبی۔ دو میں کسی کے شیخ سے
محدّثین مستغنی نہیں ہو سکتے کہ مجہول کہہ کر چھوڑ دیں۔ وہ بذات خود ہزار مجہول ہوں۔ مگر
ان کا فرض ہے کہ اس مجہول کو معروف بنا کر رہیں۔ چنانچہ زہری اور شعبیؒ کے شیخ کو تو ثقہ
لکھا مگر کوفیوں کے شیخ کو ان دونوں سے پست قرار دیا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کذب اور کذب علی الرسول کی زبردست حمایت کے مرتکب ہو گئے۔ حج بدل وغیرہ کی روایتیں
جو زیادہ تر بلکہ تقریبًا سب کی سب حجۃ الوداع ہی کے موقع سے متعلق ہیں۔ ان سب میں جتنے اختلافات
و اضطرابات ہیں۔ وہ ان روایتوں کے کذب اور مسئلہ حج بدل کے غلط ہونے پر شاہد ہیں مگر محدّثین نے
سب کو متعدد واقعے اور متعدد اشخاص سے متعلق قرار دے کر اس بدعت کو سنّت قرار دے ہی دیا۔

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ان لوگوں میں تھے جو ایران سے شروع شروع میں آ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں منافقانہ مشرف باسلام ہوئے تھے اور حضرت ابوہریرہ رضؓ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے زیر تعلیم رہے اسی لئے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے مشترک موالی میں شمار کئے گئے۔ باہر کے کفار کسی مسلمان کے ہاتھ پر اگر مشرف باسلام ہوتے تھے۔ تو وہ اس مسلمان کے موالی میں شمار کئے جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ رہنا سہنا ان کا قبیلہ جہینیہ میں ہو۔ اس لئے بعضوں نے ان کو قبیلہ جہینیہ کے موالی میں شمار کر لیا۔ چونکہ یہ لوگ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے مدینے سے باہر بھی دوڑا کرتے تھے۔ اور کوفہ کو اپنے پروپیگنڈے کا مرکز بنا لیا تھا۔ اس لئے یہ کوفہ والوں سے بھی اپنی من گھڑت حدیثیں روایت کرتے ہوں گے تو درحقیقت یہ تین شخص ایک نام ایک کنیت اور ایک لقب کے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی شخص ہے جو زہری کے بھی شیخ ہیں اور شعبی رحہ کے بھی اور اہل کوفہ کے تو تھے ہی۔

عامرؒ بن شراجیل الشعبی کی ولادت خود ان کے اپنے بیان کے مطابق ۱۹ھ میں ہوئی اور وفات کے متعلق کافی اختلاف ہے ۱۰۳ھ، ۱۰۴ھ، ۱۰۵ھ، ۱۰۶ھ، ۱۰۷ھ، ۱۱۰ھ لوگوں نے لکھے ہیں۔ بیچ میں آٹھ، نو کو خدا جانے کیوں چھوڑ دیا۔ بہرحال یہ ابن شہاب سے بہت بڑے تھے۔ یعنی بتیس ۳۲ سال بڑے تھے۔ اور ابن شہاب سے چودہ پندرہ برس پہلے وفات پائی۔ ان سے تو ابن شہاب کو حدیثیں روایت کرنا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کچھ معاصرانہ چشمک تھی۔ کہ ایک دوسرے سے بچتے رہے حتی کہ حتی الوسع ایک شخص سے دونوں روایت بھی

لہ یہ اگرچہ ابن شہاب سے بڑے تھے مگر جمع احادیث و روایات کے کام میں ابن شہاب کے دیکھا دیکھی لگے تھے۔ اس لئے جامعین حدیث میں ان کا نام ابن شہاب کے بعد آتا ہے۔ یہ ہی ایک وجہ باہمی چشمک کی ہو سکتی ہے کہ ابن شہاب محدثانہ فضل تقدم کے مدعی ہوں اور یہ عمر میں بڑے ہونے کی وجہ سے مدعی فضیلت ہوں۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

نہیں کرتے ۔ اِلاّ ماشاءَ اللہ ۔ اس سلیمانؒ الاعزمیں جو دونوں ملے تھے تو لوگوں نے دونوں کے اس ایک شخص کو بھی دو شخص بنا کر دونوں کے اس اتحاد ناگہانی کو بھی باقی نہیں رہنے دیا۔

سلیمان بن ارقم ابوسوار البصری

یہ بالاتفاق متروک الحدیث ہیں ایک شخص نے بھی ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی ہے ۔ چونکہ یہ زہری کے صرف شیخ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے شاگرد بھی ہیں اور زہری نے ان سے کم روایت کی ہے ۔ زیادہ تر یہی زہری سے روایت کرتے ہیں ۔ اس لئے ان کے ساتھ وہ رعایت جو زہری کے عام شیوخ کے ساتھ ملحوظ تھی نہیں ملحوظ رکھی گئی کہ آخر کہاں تک رعائت کی بھی کوئی حد ضرور ہونی چاہیئے ۔

اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں زہری کے بعض اور شیوخ کے حالات بھی پیش کرتا ۔ مگر اس طوالت کلام سے چونکہ اصل مقصود فوت ہوتا نظر آرہا ہے ۔ اس لئے اتنے ہی لوگوں کے تراجم پر اکتفا کرتا ہوں ۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ قابل ذکر بس اتنے ہی اشخاص تھے ۔ میں نے عیینہ بن سعید، عباد بن زیاد اور عبدالرحمٰن بن مالک وغیرہم کا ذکر محض اختصاراً نہیں کیا ہے ۔ ورنہ مضمون کی کمی نہیں ہے ۔

زہری اور شیعے

اہل سُنّت کے یہاں تو ابن شہاب زہریؒ امیر المؤمنین فی الحدیث کہے ہی جاتے ہیں مگر شیعوں کے نزدیک پہلے بھی غایت درجہ کے معتمد علیہ تھے ۔ اور جب تک شیعوں نے سیاسی طاقت حاصل ہو جانے کے بعد اپنا مذہبی بٹوارہ نہیں کر لیا تھا ۔ اس وقت تک برابر اسی طرح ان کے یہاں بھی یہ معتمد علیہ رہے ۔ جس طرح سنّیوں کے یہاں تھے البتہ جب شیعوں نے اپنا مذہبی بٹوارہ کر لیا ۔ اور سنّیوں سے علیحدہ اپنے مذہب کی تدوین و تہذیب کر لی تو انہوں نے اس وقت سے اپنے محدّثین بھی الگ کر لئے ۔ اور راویانِ احادیث بھی ۔ صحابہ کرام رضؓ سے تو گنتے چند کے سوا تقریباً سب سے ان کو قلبی عداوت تھی ہی ۔ اس لئے وہ گنتے چند صحابہ کرام رضؓ جو ان کے یہاں معتمد علیہ تھے

مثلاً حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سلمان فارسی وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وہ تو دونوں جماعتوں میں مشترک رہے اور باقی تمام صحابہ کرام رضہ سے انہوں نے مکمل بائیکاٹ کر لیا۔ ان کے بعد تابعین کی جماعت میں سے انہوں نے اپنے لوگوں کو الگ چن لیا اور اس کی بڑی کوشش کی کہ حتی الوسع اشتراک سے بچیں۔ جہاں مجبوراً اشتراک ہو ہی جاتا تھا۔ وہاں نام میں، ولدیت میں، کنیت میں، لقب میں، سکونت میں کسی نہ کسی طرح کی تصحیف و تحریف کر کے اس کی کوشش کی کہ ان کا راوی سنیوں کے راوی سے متغائر کوئی دوسرا شخص سمجھا جائے۔ مثلاً عنزی جو "ن ز" سے ہے۔ اس کو عتری "ت ر" سے بنا دیا۔ حبان جو "ب" سے ہے اس کو "حیان" "ی" سے کر دیا۔ مندل جو "ن" سے ہے اس کو مبدل "ب" سے قرار دیدیا۔

ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری کو ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری بنا کر دو نام قرار دے کر دونوں کو دو شخص مشہور کر دیا۔ یزید بن معاویۃ ابوشیبہ العجلی الکوفی، کو بُرید بن معاویۃ بنا دیا۔ وغیر ذالک۔ مگر اہل سنت کے بعض محدثین ہمنام و ہم ولدیت اپنے یہاں بعض گمناموں کو قرار دینے کی بھی کوشش کی۔ اگرچہ اس طرح کی ان کی یہ کوششیں عموماً ناکام رہی ہیں۔ مثلاً مالک بن انس رضہ جو امام مالک رحہ کا نام ساری دنیا میں مشہور ہے۔ انہیں کا ہمعصر مالک بن انس کوفہ میں بھی ایک شخص ٹھہرایا گیا۔ مگر امام مالک رحہ کے آفتاب شہرت کے سامنے یہ کوفی شپرہ ٹھہر نہ سکا۔ اور لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر صرف اسی قدر کر سکا کہ تدلیس و تلبیس کی تاریکیوں میں اُڑ اُڑ امام مالک رحہ کے نام سے بہتیری حدیثیں اِدھر اُدھر پھیلانے میں ایک حد تک کامیاب ہوا جس میں حبیب بن ابی حبیب کاتب مالک جو ایک زبردست منافق و کذاب تھا۔ اس سے اس کو کافی مدد ملی اور اس طرح کی مثالیں متعدد ہیں۔

ابن شہاب زہری سب سے پہلے جامع حدیث تھے۔ شیعے نہ ان سے بالکل مستغنی ہوتے تھے۔ اور نہ ان کو حضرت ابن عباس رضہ کی طرح مشترک ہی سہی، مگر اپنا بھی بنا لے سکتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اپنا بنا لینے سے

متعدد اکابر شیعہ کو پچھتانا پڑا۔ اسلئے کہ ان کی بھتیری روایتیں شیعوں کے خلاف پڑتی ہیں۔ چنانچہ علاّمہ کشی نے ان پر متعدد جرحیں کی ہیں اور چڑھ چڑھ کر ان پر حملے کئے ہیں اور ان کی قدح میں جو روایتیں ان کے آئمہ سے منقول ہیں۔ ان کو نقل کیا ہے۔ مگر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دامن شیعے چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے علاّمہ حلّی کو ان قدحی روایتوں کی تاویلیں کرنا پڑیں اور اپنی کتاب الرجال الکبیر میں علامہ کشی کے اعتراضوں کے جوابات ان کو دینا پڑے چنانچہ خود علامہ حلی اپنی کتاب خلاصۃ الاقوال صہ ۵۱ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے ترجمہ میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

قد ذکر الکشی احادیث تتضمّن قدحًا فیہ وھو اجلُّ من ذٰلك وقد ذکرتھا فی کتاب الکبیر واجبنا عنھا رضی اللہ تعالٰی عنہ : یعنی کشی نے حدیثیں نقل کی ہیں جو ان کے متعلق قدح کو شامل ہیں۔ حالانکہ ان کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ میں نے ان کو کتاب کبیر میں ذکر کیا ہے اور ان کا جواب دیا ہے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے۔"

سیاسی طاقت پیدا ہونے سے پہلے یعنی پانچویں صدی ہجری تک شیعے اپنے آئمہ کی طرف منسوب حدیثوں کی ہدایت کے مطابق اپنے عقائدِ مخصوصہ اور اپنی مخصوص حدیثوں کو سنیوں ہی سے نہیں بلکہ عوام شیعوں سے بھی پوشیدہ رکھتے تھے اور جن معتمد علیہ لوگوں کو اپنا ہمراز بنانے بھی تھے۔ تو ان سے اخفاء و کتمان کا عہد لے کر۔ چنانچہ ان کی سب سے زیادہ مستند اور سب سے پہلی حدیث کی کتاب اُصول کافی میں ان کے ائمہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ نحنُ علیٰ دین مَن کتمہٗ اَعزّہُ اللہُ ومَن اَذاعہٗ اَذلّہُ اللہُ یعنے ہم لوگ ایسے دین پر ہیں کہ جس نے اس کو پوشیدہ رکھا اللہ اُس کو عزّت دے گا اور جس نے اُس کو شائع کیا اللہ اس کو رسوا کرے گا۔ (صہ ۴۸۵) اور ایسی کئی متعدّد حدیثیں ہیں۔

غرض ان کا مذہب جس طرح ایک عجیب بھول بھلیاں ہے۔ اسی طرح ان کی تفسیریں اور ان کی حدیثیں بھی ہیں اور پھر ان کے رجالِ حدیث بھی۔ ابن شہاب کے متعلق ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ وہ حضرت علی بن الحسین کے خاص لوگوں میں تھے

اس لئے شیعوں کی ان کے ساتھ وابستگی اوران کا ان پر اعتماد لامحالہ ہونا ہی چاہیئے مگر چونکہ اہل سنت نے ان کو اپنا امام الحدیث مان لیا ہے اور شیعے اہل سنت سے حتی الوسع کسی بات میں بھی اشتراک پسند نہیں کرتے ۔ اس لئے ابن شہاب سے کترانے لگے اور ان کو پوری طرح اپنا آدمی کہتے نہ بالکل غیر۔

علامہ شیخ حلی شیعوں کے قدیم دستور کے مطابق اپنی کتاب خلاصۃ الاقوال میں لکھتے ہیں محمد بن شہابَ الزُّھری من اصحاب علی بن الحُسین علیھما السّلام عَدُوٌّ (انتہٰی بلفظہٖ) یعنی: محمد بن شہاب الزہری، ان کو لوگوں نے حضرت (زین العابدین) علی بن الحسین کے اصحاب میں شمار کیا ہے۔ مگر عدوّہ کو اگر عدْوّہٗ پڑھیئے تو یہ معنے ہوجائیں گے کہ زہری ان کے اصحاب میں تو تھے، لیکن ان کے دشمن تھے۔ اس طرز تحریر کی غرض یہ ہے کہ جب جیسا مناسب سمجھیں گے۔ سنّیوں کے مقابل زہری کو ویسا ہی قرار دے لیں گے۔

مگر شیخ تفریسی منتہی المقال میں اس قسم کی تقیہ بازی تو نہیں دکھلاتے مگر جرح وتعدیل کچھ نہیں کرتے ہیں، لکھتے ہیں۔ محمد بن شہاب الزّہری ولد ۵۱ھ ومات ۱۲۴ھ ولہٗ اثنان وسبعون سنہ، یعنے محمد بن شہاب الزہری ۵۱ھ میں پیدا ہوئے اور بہتر سال کی عمر پاکر ۱۲۴ھ میں وفات پائی اور بس، لیکن اسکے بعد اپنے اساتذہ پیشین میں سے ایک شخص کی عبارت یوں نقل فرماتے ہیں۔ واشرنا ھُنالِکَ الی کَونہٖ مِنَ الشیعۃ یعنے ہم نے وہاں زہری کے شیعوں میں سے ہونے کی طرف ایک اشارہ کیا ہے۔ اتنا لکھ کر تفریسی گھبرا کر لکھتے ہیں کہ ہم نے وہیں پر اس کا انکار کردیا ہے۔ کہ وہ ہرگز شیعوں میں سے نہ تھے۔ تفریسی اپنے استاذ الاستاذ کی خلاف مصلحت شیعیت راست گوئی سے گھبرا گئے۔ کہ کبھی کسی سنی محدّث کو یہ دیکھ کر ان کی طرف سے بدگمانی نہ پیدا ہوجائے اور وہ ان کی روایتوں پر نگاہِ تنقید نہ ڈالنے لگے۔ اس لئے اس حقیقت پر انکار کا پردہ ڈالنے لگے۔ مگر اب تو یہ راز فاش ہوچکا۔ علامہ تفریسی کے انکار سے کیا ہوتا ہے۔

ائمۂ رجال وحدیث کی بعض کمزوریاں

حافظ ابن حجر رح تہذیب التہذیب شعبۃ بن الحجاج کے ترجمہ جلد ۴ ص ۳۴۵ میں لکھتے ہیں کہ راویانِ حدیث کی جرح و تعدیل میں جس نے سب سے پہلے زبان کھولی۔ وہ شعبہ بن الحجاج ہیں۔ ان کا اتباع یحییٰ بن سعید القطان نے کیا پھر امام احمد بن حنبل رح کی زبان کھلی۔ اور یحییٰ بن سعید الانصاری بھی بولنے لگے۔ شعبہ کی ولادت ۸۲ھ میں ہوئی اور وفات ۱۶۰ھ میں ہستر سال کی عمر میں۔ غرض ابن شہاب زہری کی وفات کے بعد روایانِ حدیث کی جرح و تعدیل کا آغاز ہوا اور یہ آغاز بھی محض سرسری تھا۔ اس وقت تک جرح و تعدیل کے قواعد و ضوابط کچھ بھی منضبط نہیں ہوئے تھے اسلئے باوجود اسکے کہ شعبہ کو اوّل من تکلّم فی الرّجال (اسمائے رجال کے متعلق سب سے پہلا بولنے والا) کہتے ہیں، یہ بھی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ کَانَ شعبۃ یخطئُ فی اسماءِ الرِّجَال کثیرًا۔ یعنے شعبہ اسماء رجال میں بہت غلطی کیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ جب راویوں کے نام ہی صحیح طور سے یاد نہ ہوں گے۔ یا بیان نہ کئے جائیں گے تو ان کی جرح و تعدیل کیا کی جائے گی۔ شعبہ واسط کے رہنے والے تھے۔ بصرہ میں آبسے تھے اور سفیان ثوری رح خاص کوفہ کے رہنے والے تھے۔ اس لئے اہل کوفہ کے حالات سے سفیان، شعبہ سے ضرور زیادہ واقف تھے۔

پھر تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۵۰ اور جلد ۷ ص ۲۶ میں ہے کہ سفیان ثوری رح کا مسلک یہ تھا کہ وہ ضعفاء سے بھی روایتِ حدیث کیا کرتے تھے اور کسی سے بھی حدیث لینے میں احتیاط نہیں کرتے تھے۔ باوجود اس کے خاص کوفہ کے تیس ایسے راویوں سے شعبہ روایت کرتے ہیں جن سے سفیان ثوری رح نے بھی روایت نہیں کی اس سے صاف ظاہر ہے کہ شعبہ سے قبل تو کسی راوی کے متعلق کبھی کوئی کچھ بولتا ہی نہ تھا، جس نے جو حدیث روایت کی، فوراً لکھ لی، جیسا کہ خود ابن حجر رح نے زہری کے ترجمے میں لکھا ہے۔ ھٰؤلاءِ قومٌ حُفّاظٌ کَانُوْا اذا سمعُوا الشیءَ علقُوْہُ یہ جماعت حافظینِ احادیث کی ہے جب کسی سے کچھ سنا۔ بس اس کو ٹانک لیا۔

(تہذیب التہذیب جلد ۹ صہ ۴۵۱)

شعبہ نے جو بعض راویوں کے متعلق کچھ کلمات جرح زبان سے نکالے تو وہ محض اتفاقیہ تھے۔ غایت سے غایت اس کو جرح و تعدیل کا آغاز ہی کہا جا سکتا ہے اس لئے شعبہ کے متعلق ابن حجر رح نے جو تہذیب التہذیب جلد ۴ صہ ۳۴۵ میں ابو بکر بن منجویہ کا قول نقل کیا ہے کہ وَھُوَ اَوّلُ مَن فَتَّشَ بالعراق عن امر المحدِّثین وجانب الضّعفاءِ وَالمَترُوکین یعنے شعبہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عراق میں محدثین کے حالات کی تفتیش کی۔ اور ضعفاء و متروکین سے احتیاط برتی۔ اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں شعبہ کا مفصّل ترجمہ لکھا ہے اور ان کے تقریباً ڈیڑھ سو شیوخ ضعفاء و متروکین گن کر دکھا دیئے ہیں جن سے شعبہ روایت کرتے ہیں تو جب " اول المفتشین عن امر المحدِّثین " کا یہ حال تھا تو غریب ابن شہاب زہری کا کیا عالم ہوگا جن کو تفتیش کا خیال بھی کبھی پیدا نہ ہوا۔ اور سعدی رح کے قول پر جن کا عمل تھا کہ ؎

ہر کرا جامہ پارسا بینی ۔۔۔ پارسا داں و نیک مرد انگار

تابعین سے چشم پوشی

سب سے بڑی غلطی جو ائمۂ رجال سے ہوئی۔ وہ یہ کہ خیر القرون کی مدت کو ربڑ کیطرح کھینچ کر یہ لوگ زمانۂ تابعین بلکہ اتباع تابعین تک لے آئے اور خصوصیت کے ساتھ اکثر تابعین کے متعلق کسی قسم کی جرح سے غیر ضروری احتیاط برتتے رہے۔ صرف وہیں کسی تابعی پر جرح کرتے، جہاں اسکے حالات سے مجبور ہو جاتے۔ پھر بھی جہاں اکثریت جرح کرنیوالوں ہی کی ہے۔ وہاں دو ایک اس کو " تابعی ثقہ " کہنے والے بھی ضرور ہوں گے۔ کتنے ایسے تابعی ہیں جن کو پوری طرح یہ ائمۂ رجال جانتے بھی نہیں۔ مگر چونکہ زہری یا شعبی یا شعبہ یا امام مالک رح وغیرہم ان سے روایت کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق تابعی ثقہ لکھ دینا ان کا فریضہ رہا۔ حالانکہ منافقین عجم میں کا ہر فرد تابعی ہی بنا ہوا تھا اور سارا فساد وضع احادیث و کذب علی الرسول کا انہیں عجمی تابعیوں ہی کا پیدا کردہ ہے جس میں ان کے

ذرّیات نے تبع تابعین بن کران کا ہاتھ بٹایا۔ اسلئے اگر اس جماعت کو جرح سے محفوظ رکھا گیا اور ان پر جرح کرنا خلافِ ادب قرار دے دیا گیا۔ تو پھر بعد والے توانہیں کے ذخائر کی توسیع و اشاعت کرتے رہے۔ ان کے بنائے ہوئے مکذوبات و مفتریات توضیح و مستند ہو کر رہے۔ اسمیں شک نہیں کہ بعد والوں میں بھی وضاعین و کذابین بہت کافی ہوئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اکابر تابعین جو اولادِ صحابہ رض اور دوسرے حجازی تھے ان میں سے ننانوے فیصدی تو روایات سے احتیاط برتتے تھے اور عام طور سے حدیثیں روایت کرتے ہی نہ تھے اور یہی جماعت اہلِ حق کی تھی۔ روایت کرنے والے تابعین میں کے ننانوے فیصدی ایسے تھے جو یا تو خود انہیں منافقین عجم میں کے افراد تھے یا ان کے تیار کردہ ملاحدہ اور زنادقہ کے افراد، یا ان کے فریب خوردہ کچھ سیدھے سادھے مسلمان، اسی طرح اتباعِ تابعین یا اصاغر تابعین کے تین طبقے تھے۔ محتاط اہلِ حق کا طبقہ جو روایت سے بچتا ہی رہا۔ دوسرا طبقہ ان اہلِ حق کا تھا جو اپنی سادگی کی وجہ سے نادانستہ فتنۂ روایات میں شریک ہو گیا تھا۔ تیسرا طبقہ خاص ان منافقین عجم اور ان کے ہم عقیدہ وہم عمل ملاحدہ کا تھا۔ جن کا مقصد ہی تخریب اسلام و تفریق بین المسلمین تھا۔ لیکن یہ اعتراف کرنا پڑے گا۔ کہ دوسرا اور تیسرا طبقہ دونوں ہی اس ناپاک مقصد میں عملاً یکساں رہا۔ عقیدہ و نیت کا فرق جو کچھ بھی ہو بلکہ دوسرے طبقے سے اس سے زیادہ نقصان پہنچا۔ جتنا کہ تیسرے طبقے سے پہنچا کیونکہ عامۂ مسلمین میں دوسرا طبقہ تیسرے طبقے سے زیادہ معتمد علیہ تھا۔

محدّثین کی سب سے بڑی غلطی

محدّثین یعنے جامعین احادیث کی سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ضعفا کے بعض افراد کے متعلق یہ اصول اختیار کیا کہ یکتُبُ حدیثہ ولا یحتج بہ یعنے: اس شخص کی حدیثیں لکھ لی جائیں گو ان پر اعتبار نہ کیا جائے (تاکہ بعد میں تنقید و تحقیق کے بعد ان روایات کی اصلیت پر غور کیا جا سکے) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد والوں نے ان کی تالیفوں میں ان ضعفاء کی حدیثیں دیکھ کر یہ سمجھتے ہوئے کہ فلاں محدّث اور فلاں امام کی کتاب میں یہ حدیث

ہے۔ صرف اس مؤلف کی شخصی اہمیت کے زیر اثر ان حدیثوں کو بھی حجت وسند قرار دے لیا کیونکہ اس حدیث کے بعد تو لایصح یہ اس کتاب میں لکھا ہوا نہ تھا۔ بلکہ رجال کی کتاب میں اس راوی کے نام کے ساتھ یہ لکھ دیا گیا۔ اور حدیث پڑھنے والے کے سامنے عموماً کتب رجال کبھی نہیں ہوتیں۔ اس طرح اس راوی کی جس کو لوگوں نے کتب حدیثہ "لایصح" یہ لکھا ہے۔ اس کی حدیثیں بھی جو محدثین کی کتابوں میں ہیں حجت وسند سمجھی جانے لگیں۔

محدثین کی ایک اور سخت غلطی

فضائل اعمال ومناقب صحابہ رضؓ میں حدیثیں بھی ان کو ملیں۔ چاہے وہ کیسی ہی ہوں بلا تامل ان کو لکھ لیا۔ اور سمجھے کہ ان حدیثوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے کسی قسم کا خطرہ ہو۔ حالانکہ ان میں سب سے بڑا خطرہ کذب علی الرسول کا موجود اور نمایاں تھا۔ اور اس کے علاوہ بھتیرے پوشیدہ زہر ان حدیثوں کے شہد میں ملے ہوئے تھے۔ چنانچہ آج تفضیلیوں کا مذہب انہیں موضوعات فضائل ومناقب کی کھوکھلی بنیاد پر قائم ہے۔ مثلاً: النظرُ الی وجہِ علی رضؓ عبادۃٌ (حضرت علی رضؓ کے چہرے کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔) اس کا راوی مشہور منکر الحدیث شیعہ ہارون بن حاتم الکوفی ہے جس نے قراءت کی بھی بہت سی روایتیں بنا بنا کر شائع کیں۔ اسی طرح من کنتُ مولاہُ فعلیٌّ مولاہُ جس کا میں مولا ہوں اس کے علیؓ مولا ہیں، کہ اس کو سب سے پہلے حبہ بن جوین بن علی العرنی البجلی الکوفی نے وضع کیا۔ جو تشیع میں بہت غلو رکھتا تھا۔ اور ابن معین، دوری، جوزجانی، ابن خراش اور نسائی نے اس کو غیر ثقہ اور ضعیف قرار دیا ہے۔ صرف احمد بن عبداللہ العجلی نے تابعی ثقہ فرمایا ہے اور بعض اہلِ کوفہ نے اس کو صحابی ثابت کرنے کی کوشش ناکام بھی کی ہے مگر چلی نہیں۔ پھر دوسرے کوفیوں اور شیعوں نے اس روایت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا اور اس موضوع حدیث کو متواتر ثابت کرنے کی کوشش کی چنانچہ ابن عقدہ مشہور شیعہ محدث نے اس پر ایک مختصر سا رسالہ بھی لکھ ڈالا اور اس کے جملہ طرق

کو یکجا کر دیا جس سے حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی علیہ الرحمۃ بھی دھوکا کھا گئے۔ اور اس حدیث موضوع کو ازالۃ الخفا میں متواتر کہہ گئے۔ اسی طرح وہ روایت کہ جناب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم نے اپنے آخری وقت میں حکم دیا کہ مسجد نبوی کے سب دروازے بند کر دیئے جائیں بجز بابِ علیؓ کے۔ کہ یہ روایت خاص کوفے کے ٹکسال میں گھڑی گئی۔

حافظ ابن حجرؒ نے القول المسدد میں مسند احمد کی حمایت کرتے ہوئے اس روایت کی تائید میں ایڑی سے لے کر چوٹی تک کا زور لگایا ہے جس کا جواب میں نے ایک مستقل رسالے میں جو تاریخ مسند احمد کا ضمیمہ ہے۔ ابن حجرؒ ہی کی تصریحات سے دیا ہے۔ پھر آیۃ تطہیر کی شانِ نزول میں روایت کساء اور آیت ولایت کی شان نزول میں بحالت رکوع انگوٹھی خیرات کرنے کی روایت۔ غرض یہ سب روایتیں شیعیانِ کوفہ و بصرہ نے گھڑیں اور ان کی کافی تشہیر کی۔ ناواقفوں نے اس تشہیر کو شہرت سمجھ کر دھوکہ کھایا اور انھیں جیسی روایاتِ موضوعہ کی بنیاد پر آج کی تفضیلیوں کی ایک جماعت اہلِ سنّت میں موجود ہے۔

زہری کی خوگری ارسال

ابن شہاب زہری ارسال کے بہت خوگر تھے یعنے درمیان سے اپنے اصل شیخ کا نام چھوڑ کر اپنے شیخ کے شیخ سے بلا واسطہ اس طرح روایت کرتے تھے۔ کہ سننے والا یہ سمجھے کہ انہوں نے خود فلاں شخص سے سنا ہے۔ اور اس میں اس قدر مشّاق تھے کہ جس سے ملاقات تک نہیں۔ اس سے بھی اس طرح روایت کرتے تھے کہ معلوم ہو کہ خود اس سے انہوں نے سنا ہے۔ یہاں تک کہ جس کی وفات کے وقت یہ کمسن تھے۔ اس سے بھی اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ بلکہ جس کی وفات کے برسوں بعد پیدا ہوئے اس سے بھی حدثنا فلاں کہہ کر حدیث بیان کر دیتے ہیں۔

حقیقت میں تو یہ سینکڑوں سے مرسل ہی روایت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ میں لکھ چکا ہوں کہ جو لوگ ۷۰ھ سے پہلے یعنی آغازِ جمع حدیث کے قبل وفات پا چکے۔ ان سے ان کی سچانوے فیصدی روایتیں مرسل ہی ہیں۔ الّا یہ کہ وہ راوی منافقین عجم میں کا کوئی

فرد ہو یا ان کا اسیر دامِ تزویر ہو، کیونکہ حضرات صحابۂ کرام و اکابر تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین تو اس دَورِ فتنہ میں روایتِ احادیث سے سخت احتیاط کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہم نے مقدمہ صحیح مسلم سے نقل کیا ہے جو اوپر گذرا۔ مگر خود حافظ ابن حجر رحمہ نے جو تہذیب التہذیب میں ان کا مختصر سا ترجمہ لکھا ہے۔ اس مختصر ترجمے میں بھی تیرہ بزرگوں کے نام لکھے ہیں جن سے ان کے نزدیک بھی زہری ارسال کرتے ہیں۔

وہ تیرہ حضرات حسب ذیل ہیں۔

(۱) عبد الرحمٰن بن ازہر (۲) عبد الرحمٰن بن کعب بن مالک (۳) آبان بن عثمان رضہ بن عفان رضہ (۴) مسعود بن الحکم (۵) حصین بن محمد السالمیؒ (۶) عبد اللہ بن عمر بن الخطاب (۷) عبد اللہ بن جعفر الطیار رضہ (۸) عبادہ بن صامت رضہ (۹) رافع بن خدیج رضہ (۱۰) ام عبد اللہ الدوسیہ (۱۱) ابو ہریرہ رضہ (۱۲) ابو رہم[1] (۱۴) عروۃ بن الزبیر رضہ

آخر الذکر یعنی عروہ بن الزبیر رضہ سے زہری کی روایتیں بہت ہیں اور تقریباً سب ملا و سطہ اور ان میں کی اکثر حدیثیں صحاح میں ہیں۔ بخاری و مسلم میں سو سے زیادہ ہی ایسی روایتیں ہوں گی۔ اس لئے بخاری و مسلم کے شیدائیوں کو بڑی دشواری پیش آئی۔ کیونکہ امام بخاری رحہ کی شرائط[2] میں یہ بھی مشہور ہے کہ راوی اور مروی عنہ میں لقا ثابت ہو، امام مسلم رحہ صرف معاصرت ہے اور روایت کر رہے ہیں۔ تو یہی روایت ثبوت لقاء کے لئے ان کے نزدیک کافی ہے۔ مگر باوجود معاصرت کے ابن حجر رحہ کو اس کا اعتراف ہے کہ زہری اور عروہ میں لقاء ثابت نہیں ہے۔ جس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ ابن شہاب کا اصل وطن اور ان کا تجارتی کاروبار مقام ایلہ میں تھا اور

---

[1] ابو رہم بضم راء مہملہ دو ہیں ایک تو متفق علیہ صحابی ہیں اور بہت متقدم ہیں جن کا نام کلثوم بن الحصین الغفاری ہے جنگ اُحد میں شریک تھے ان سے روایت کرنے کی تو زہری نے ہمت نہ کی ہو گی۔ البتہ دوسرے جن کا نام احزاب بن اسید (بالفتح یا بالضم) السمعی ہے یہ اگرچہ تابعی ہیں مگر یہ بھی بہت متقدم۔ زمانہ جاہلیت پائے ہوئے تھے۔ آنحضرت م کی وفات کے بعد اسلام لائے اس لئے تابعی رہے ورنہ صحابی ہی ہوتے بعضوں نے ان کو صحابی لکھ بھی دیا ہے مگر غلط ہے بہرحال ابن شہاب کی پیدائش کے قبل ہی دونوں ابو رہم کی وفات ہے۔ [2] امام بخاری یا امام مسلم نے خود اپنی کسی کتاب میں اپنی شرطوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے مگر

یہ وہیں رہتے تھے۔ ان کے شاگرد عقیل بن خالد بن عقیل الایلی کے ترجمہ میں ابن حجر لکھتے ہیں

کان الزھری یکون بایلۃ وللزھری ھناك ضیعۃ وکان یکتب ھناك الماجشون یعنی زہری ایلہ میں رہتے تھے۔ وہاں زہری کا کاروبار تھا۔ وہیں ماجشون (عبدالعزیز بن عبداللہ بن ابی سلمۃ الماجشون) زہری سے حدیثیں لکھتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص۲۵۲)

غرض ایلہ زہری کا آبائی وطن تھا۔ ان کے جدّ اعلیٰ کا نام "شہاب" بھی بتا رہا ہے کہ ان کا تعلق مصر یا شام کے اطراف سے تھا اور یہی بعد مکانی سبب تھا جس کی وجہ سے عروہ سے ان کی راہ و رسم نہ ہو سکی۔ خود ابن حجر نے ترجمہ زہری میں لکھا ہے کہ:۔

ولکن لا یثبت لہ السماع من عروۃ وان کان قد سمع من ھو اکبر منہ غیر ان اھل الحدیث اتفقوا علی ذالك واتفاقھم علی الشئ یکون حجۃ[2] یعنی: زہری کا عروہ سے حدیثیں سننا ثابت نہیں ہے۔ اگرچہ زہری نے ایسے لوگوں سے حدیثیں سنی ہیں جو عروہ سے عمر میں بڑے تھے۔ بلا ثبوت مان لینے کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ محدثین نے اس پر اتفاق کر لیا ہے اور ان لوگوں کا اتفاق کسی بات پر حجت یعنی سند ہے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۴۵۱)

اسی لئے ابن حجر رح عروہ کے ترجمہ میں متاخرین محدثین کی ایسی ایسی روایتیں پیش کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا بہت ساتھ رہا ہے۔ اگرچہ بعض روایت کا کذب ادنیٰ تامل سے ثابت ہو جاتا ہے۔ مثلاً عروہ کے ترجمہ میں ہے کہ زہری نے کہا ہے

---

[1] قاموس میں ہے کہ ایلہ مصر و ینبع کے درمیان ایک شہر ہے مگر معجم البلدان جلد اول ص۳۹۱ میں ہے کہ ایلہ شام کے قریب بحر قلزم کے ساحل پر واقع ہے۔ ایک قول ضعیف یہ بھی لکھا ہے کہ ایلہ حجاز و شام کی سرحد پر آخر حجاز اوّل شام میں واقع ہے یہ شہر ایلہ بنت مدین بن حضرت ابراہیم کے نام پر آباد ہوا۔ [2] اگر کوئی جماعت اپنی مصلحت غلط کے ماتحت محض ضرورۃً کسی بات پر اتفاق کر لے تو ایسا اتفاق کس طرح سند و حجت ہو سکتا ہے۔ یہاں محدثین نے بلا ثبوت محض اپنے شیوخ کی مرسل روایتوں کو متصل ثابت کرنے کے لئے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کہ عروہ کہتے تھے کہ میں لڑکا تھا اور میرے پاس دو پرتلے تھے تو میں عصر کی نماز کے بعد دو رکعت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو مجھ کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے دیکھا اور ان کے ساتھ درّہ تھا تو جب میں نے ان کو دیکھا تو ان سے بھاگ چلا۔ تو انہوں نے لپک کر میرے پرتلے پکڑ لئے اور مجھ کو منع کیا۔ میں نے کہا کہ اے امیرالمؤمنین! اب اس کا اعادہ نہ کروں گا۔ حالانکہ عروہ کے بھائی مصعب بن زبیر رض کی روایت ہے کہ عروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چھٹے سال پیدا ہوئے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رض سے بیس برس چھوٹے تھے۔ یہ حساب بھی صحیح نہیں بیٹھتا۔ حضرت عثمان رض کی خلافت ۲۳ھ سے شروع ہوئی، چھ سال اور ملا لیجئے تو ۲۹ھ میں عروہ کی ولادت ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رض ہجرت کے پہلے سال یعنی ۱ھ میں پیدا ہوئے اس لئے عروہ کو ان سے اٹھائیس سال چھوٹا ہونا چاہیئے۔ مگر خود عروہ کا بیان ہے۔ کہ میں جنگ جمل کے وقت ۱۳ برس کا تھا۔ اور جنگ جمل ۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے ان کی ولادت ۲۳ھ میں ہوتی ہے۔ اور خلیفہ نے بھی ان کا سال ولادت ۲۳ھ ہی لکھا ہے اور یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے، اس حساب سے یہ حضرت عبداللہ بن زبیر رض سے بائیس برس چھوٹے ہوتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ مصعب نے مہینے کے عوض غلطی سے برس کہہ دیئے ہوں۔ یہی قرین عقل معلوم ہوتا ہے یعنی ۲۳ھ میں حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے زمام خلافت سنبھال لی۔ اور اس کے چھ ماہ بعد عروہ پیدا ہوئے ہوں۔ بہرحال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چھ ماہ بعد پیدا ہوئے ہوں یا چھ برس بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کا واقعہ جو زہری ان کے متعلق بیان کرتے ہیں وہ تو ضرور غلط ہے۔

غرض متاخرین کی یہ کوشش ضرور رہی کہ کسی طرح عروہ سے زہری کا سماع ثابت کیا جائے تاکہ بخاری و مسلم وغیرہما کی روایتیں صحیح ثابت ہو سکیں۔ اسلئے یہ خوب سمجھ لینا

(بقیہ صفحہ گذشتہ) دونوں کی لقاء خواہ مخواہ تسلیم کر لی ہے اور اس پر اتفاق کر لیا ہے۔ اسلئے ایک ایسی بات جس کا غلط ہونا معلوم ہو چکا اس پہ لاکھ آدمی بھی بالاتفاق کسی ناجائز غرض کے ماتحت شہادت دیں تو کیا ایسی شہادت کے زور سے علم الیقین مٹ جائیگا ؟ ہرگز نہیں۔

چاہیئے کہ متقدمین زُہری و عروہ سے قریبُ العہد تھے، ان کو ان دونوں کی لقاء و سماع کا جب کوئی ثبوت نہ مل سکا تو پھر متاخرین کو کہاں سے مل گیا؟ اور اگر کوئی ثبوت مل گیا تھا تو پیش کیا جاتا۔ بخاری و مسلم کو ان دونوں کے عدم لقاء یا عدم سماع کا حال معلوم نہ ہوا ہوگا۔ اور چونکہ دونوں معاصر تھے ہی۔ راویوں کے کہنے سے دونوں کی لقاء تسلیم کرلی اور راویوں کے کہنے پر اعتماد کرلیا۔ اپنے وقت کے اکابر محدثین سے اس کو دریافت ہی نہ کیا ہوگا۔ کیونکہ دریافت تو وہ بات کی جاتی ہے جس میں شک و شبہ ہو۔ معاصرت ثابت تھی۔ امکان لقاء کی شہادت خود عقل دے رہی تھی کیونکہ زہری کو بھی لوگوں نے مدنی ہی مشہور کر رکھا تھا۔ اسلئے ہم وطنی سے بھی لقاء و سماع کی توقع تھی۔ سماع کی شہادت وہ شیخ دے رہے تھے جس سے روایت کر رہے تھے اب پھر مزید تفتیش کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ بخاری جیسے سخت شرائط کے پابند (اگر واقعی وہ ان کے پابند تھے کیونکہ خود انہوں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ میری یہ شرائط ہیں جن کی میں نے اپنی کتاب میں پابندی کی ہے۔) انہوں نے بھی دھوکا کھا کر زہری کی بلا واسطہ روایت عروہ سے قبول کرلی۔ اور بیسیوں حدیثیں اپنی کتاب الصحیح میں لکھ دیں۔ اور مسلم وغیرہ نے بھی اس میں بخاری کا اتباع کیا مسلم کو کیا تھا۔ یہ تو صرف معاصرت ہی دیکھتے تھے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے اور معاصرت موجود تھی امام مالک رحمہ نے بھی ممکن ہے کہ بخاری و مسلم کی طرح دھوکہ کھایا ہو یا مرسل سمجھ کر حدیثیں لکھ لی ہوں یا یہ بھی کاتب مالک کی کارستانی ہو۔

امام ذہبی رحمہ نے تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابن شہاب میں بضمن شیوخ انس بن مالک، محمود بن الربیع، سعید بن المسیّب اور ابوامامہ ابن سہل کے نام لکھ کر وطبقتہم و من صغار الصحابۃ وکبار التابعین لکھ دیا ہے۔ عروہ بن الزبیر کا نام نہیں لکھا۔ البتہ عروہ ابن الزبیر کے ترجمے میں جہاں ان سے روایت کرنے والوں کے نام لکھے ہیں۔ وہاں زہری کا نام بھی ضرور لکھا ہے تو اس سے کس کو انکار ہے۔ زہری تو عروہ سے روایت کرتے ہی ہیں۔ اور نہ فقط عروہ سے بلکہ ابورہم اور عبادہ بن صامت سے بھی روایت

کرتے ہیں جو ان کی ولادت سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ اختلاف تو صرف یہ ہے کہ محققین کے نزدیک وہ روایت مرسل ہے اور امام بخاری رح و مسلم وغیرہما کے نزدیک متّصل۔ البتہ حافظ ابن حجر رح نے جہاں ان لوگوں کے نام لکھے ہیں، جن سے زہری روایت کرتے ہیں۔ وہاں عروہ بن الزبیر کا بھی نام لکھ دیا ہے اور عروہ کے ترجمہ میں جہاں ان سے روایت کرنے والوں کے نام لکھے ہیں۔ وہاں زہری کا نام بھی ہے۔ مگر باوجود اس کے خود حافظ ابن حجر رح ہی لکھتے ہیں اور یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ زہری کا سماع احادیث عروہ سے ثابت نہیں ہے۔

ابن شہاب عروہ سے تقریباً ۳۲ سال چھوٹے تھے۔ عروہ کی وفات کے وقت ابن شہاب کی عمر پینتالیس سال ہو سکتی ہے۔ ابن شہاب اپنے والد مسلم بن عبیدُاللہ کی وفات سے پہلے اپنے وطن ایلہ سے آ کر کچھ دنوں مدینہ میں مقیم رہ کر حضرت علی بن الحسین رض کی صحبت میں رہے تھے۔ حضرت علی بن الحسین رض کی وفات اگرچہ بقول صحیح ۹۵ھ میں ہے مگر چونکہ زہری کے والد کی وفات تقریباً ۸۰ھ میں ہے۔ اس لئے ضرور یہ ۸۰ھ یا اس سے کچھ پہلے یا بعد مدینہ آئے ہوں گے۔ اور عروہ بن الزبیر رض سے بھی راہ میں ملاقات ہو جاتی ہوگی۔ مگر وہ لقا جو محدثین کے یہاں معتبر ہے۔ یعنی لقاء بغرض سماع حدیث، اس کا اس وقت رواج ہی کہاں تھا کہ اس کا موقع نکالتے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین نے لقاء و سماع حدیث کے نہ ہونے پر اپنا یقین ظاہر کیا۔ مگر متاخرین نے محض لقاء کے امکان کے ساتھ فقط امکان سماع کی بناء پر سماع کا یقین کر لیا۔ حالانکہ یہ سمجھنا چاہیئے تھا۔ کہ وہ زمانہ عام طور سے اخذ احادیث کا تھا ہی نہیں۔ اس وقت تک خود ابن شہاب اولُ الجامعین کے دماغ میں جمع حدیث کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس لئے باوجود امکان لقاء کے اگر انہوں نے عروہ سے کوئی حدیث نہیں سنی، تو اس پر تحاشا کیوں ہے؟ بلکہ حضرت علی بن الحسین رض کی صحبت میں بھی جو یہ رہتے تھے تو ان کی غرض ان سے حدیثیں لینا نہ تھی بلکہ محض فیض صحبت اور ان کے پند و نصائح سے تمتع مقصود تھا۔ حدیثیں جمع کرنے کا اس وقت رواج ہوتا یا اسی زمانے میں اس کا خیال ان کو پیدا ہوا ہوتا تو یہ ضرور حضرت

علی بن الحسین و عروہ بن الزبیر رہ ہی نہیں۔ نہ معلوم کتنے اہلِ مدینہ سے اس وقت حدیثیں لے لے کر جمع کرتے پھرتے اور ایک جگہ بیٹھ کر صرف حضرت علی بن الحسین رہ ہی کے فیضِ صحبت پر اکتفا نہ کرتے۔

زہری کے مُرسلات بمنزلہ ریح ہیں

ابن حجر رح نے تہذیب التہذیب ترجمہ زہری میں لکھا ہے کہ یحییٰ بن سعید جو مشہور محدّث اور امام فن رجال تھے۔ کہا کرتے تھے کہ مرسلاتہٗ بمنزلۃ الریح یعنے زہری کی مرسل روایتیں "بمنزلہ ریح" ہیں اور آپ کو یہ معلوم ہو چکا کہ زہری ارسال کے ایسے خوگر تھے کہ ان کی متصل حدیثوں پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مرسل ہی ہوں۔ الّا ماشاء اللہ

زہری کا ارسال سخت خطرناک ارسال تھا۔

امام ذہبی تذکرۃ الحفّاظ جلد ۲ ص۱۰۸ ترجمہ زہری میں لکھتے ہیں کہ ابو قدامہ سرخسی، یحییٰ بن سعید سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے کہ زہری کے مرسلات تمامی مرسلات سے بدتر ہیں۔ کیونکہ وہ حافظ احادیث تھے۔ ان کو اس کی قدرت تھی کہ ہر راوی کا نام بتا دیتے۔ وہ وہیں پر کسی راوی کا نام بیان نہیں کرتے۔ جہاں وہ اس کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یعنے یہ سمجھ کر اس راوی کا نام کھا جاتے تھے کہ یہ ہے غیر معتبر لوگ اس کی حقیقت سے واقف ہیں، اگر اس کا نام ظاہر کر دیں گے تو پھر یہ روایت قابلِ تسلیم نہ ٹھہر سکے گی۔ اس لئے درمیانِ سلسلۂ اسناد سے وہ اس مجروح راوی کا کا نام چھوڑ کر روایت کرتے تھے۔

ان سے مُرسل[1] حدیثیں کتنی ہیں

یہ تو میں تفصیل لکھ چکا کہ ان کی مسند متصل روایتوں کے اسناد و اتصال پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ جس سے ان کی لقاء وسماع ثابت ہے یہ

[1] علماءِ اصولِ حدیث نے مرسل اور مرسل خفی اور منقطع میں کیا فرق ہے اور خود ان علماء میں ان کی تعریفوں کے متعلق اختلافات ہیں، یہ اس کا موقع نہیں کہ اس موضوع پر بحث کی جائے۔ اس لئے یوں سمجھنا چاہیئے

اس سے بھی مرسل روایت کر سکتے تھے جبکہ ارسال کے خوگر تھے مگر محدثین جو ان کی مُسند حدیثوں کو مُسند مانتے ہیں، وہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی جتنی حدیثیں ہیں۔ ان میں صرف آدھی ہی حدیثیں مسند ہیں، باقی سب مرسل ہیں۔ چنانچہ امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ صہ ۱۰۶ میں لکھتے ہیں کہ ابو داؤد نے کہا کہ زہری کی حدیثیں بائیس سو (۲۲۰۰) ہیں، جن میں نصف مُسند ہیں باقی سب مرسل۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاید ہی بیس فیصدی متصل ہوں۔

زہری اور ادراج

زہری کی عادت ادراج کی بھی تھی۔ ادراج کہتے ہیں۔ حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے الفاظ کے ساتھ اپنے الفاظ ملا دینے کو۔ یعنے حدیث میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ درج کر دینا۔ کتاب المعتصر من المختصر صہ ۱۲۵ میں ۔ زہری کے متعلق لکھتے ہیں۔ کان یخلطُ کلامَہٗ بالحدیث ولذٰلکَ قال موسٰی بن عقبۃ افصل کلامَ رسول اللہ من کلامِکَ یعنے زہری حدیث میں اپنی بات ملا دیا کرتے تھے، اسی لئے موسٰی بن عقبہ نے ایک بار زہری کو ڈانٹا تھا کہ تم رسولؐ اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے کلام کو اپنے کلام سے الگ رکھا کرو۔" غالباً اس واقعہ کے بعد موسٰی بن عقبہ نے جو کتاب زہری سے لکھی تھی جس کی صحت کا اعتراف یحیٰی بن معین نے کیا تھا۔ اس کو ضائع کر دیا۔ اور اسی لئے اسمٰعیل نے کہا کہ موسٰی بن عقبہ نے زہری سے کچھ بھی نہیں سنا یعنے جو سنا تھا اس کو باقی نہیں رکھا۔ دیکھو تہذیبُ التہذیب ترجمہ موسٰی بن عقبہ جلد ۲۰ صہ ۳۶۲)

زہری اور تدلیس

حافظ ابن حجر رحؔ عسقلانی اپنی کتاب طبقات المدلسین صہ ۱۵ مطبوعہ مصر میں زہری کا بھی ذکر فرماتے ہیں:۔

وصفہ الشافعی والدارقطنی وغیر واحد بالتدلیس۔ یعنے: امام شافعیؒ دارقطنی اور متعدّد لوگوں نے زہری کو "تدلیس" کی صفت سے متصف کیا ہے۔

تدلیس کیا ہے؟

راوی اپنے شیخ یا سلسلۂ روایت کے کسی نام میں ایسی کوئی صُورت قصداً اختیار کرے جس سے اس کی اصلی

وصحیح شخصیت جو متعارف تھی۔ اس پہ پردہ پڑ جائے اور سننے والے کا گمان کسی اور طرف چلا جائے، یہ تدلیس تو اسناد میں ہوئی اور متن حدیث میں بھی تدلیس ہوتی ہے کہ مفہوم ایسے دو پہلو طرز بیان یا ذومعنیین الفاظ میں ادا کئے جائیں۔ جن سے حدیث کے صحیح مفہوم کے عوض کسی غیر مقصود معنے کی طرف سامع کا ذہن چلا جائے یا صحیح مفہوم کے ساتھ کوئی غلط پہلو بھی پیدا ہو جائے۔ اسناد کی تدلیس سے متنِ حدیث کی تدلیس زیادہ بُری ہے جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

تدلیس میں "قصد" کی شرط ہے یعنی مُدلّس (تدلیس کرنیوالا) جان بوجھ کر تدلیس کرتا ہے۔ اگر بھول چوک کی وجہ سے ایسا ہو جائے تو اس کو سہو و خطا یا نسیان کہا جائیگا۔ اور یہ راوی کے ضعف حافظہ کی دلیل ہے۔ اس لئے ایک ضعیف الحافظہ راوی بذات خود ثقہ ہو سکتا ہے مگر ایک مُدلّس کبھی ثقہ نہیں ہو سکتا۔

تدلیس کذب ہے

تدلیس کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لینے کے بعد ہر صاحب عقل و دیانت "تدلیس" کو بلا تامل کذب کہہ دے گا۔ مگر یہ ایک قیاس ہی نہیں ہے۔ اس کی ایک زبردست سند بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ حافظ بن یزید بن زریع جو بہت بڑے محدّث اور عبداللہ بن مبارک وعبدالرحمٰن بن مہدی جیسے اکابر محدثین کے شیوخ میں تھے اور جن پر کسی شخص کی خفیف سے خفیف جرح بھی نہیں ہے۔ نہایت ثقہ اور مسلم الثبوت شیخ المحدثین تھے۔ ان کے ترجمہ میں حافظ ابن حجر رح تہذیبُ التہذیب جلد ۱۱ ص ۳۲۷ میں لکھتے ہیں۔ وَحکیٰ ابن ابی خیثمۃ ان یزید بن زریع سئل عن التدلیس فقال التدلیسُ الکذب یعنے ابن ابی خیثمہ نے بیان کیا کہ یزید بن زریع سے پوچھا گیا۔ تدلیس کے بارے میں تو انہوں نے فرمایا کہ تدلیس کذب ہے

ارسال بھی ایک طرح کی تدلیس ہی ہے

ارسال کا حال ہم اُوپر لکھ چکے ہیں۔ فرق اسی قدر ہے۔ کہ ارسال سہو و خطا کی وجہ سے بھی ممکن ہے۔ جیسا کہ محدثین کے عنوانِ بیان سے نکلتا ہے

اگرچہ میرے نزدیک سہو وخطا ونسیان کی وجہ سے جو ارسال کی صورت پیدا ہو، اس کو انقطاع
کہنا چاہیئے اور بالقصد ایسی صورت جان بوجھ کر اختیار کی جائے۔ جیسا کہ زہری کرتے تھے جس
کی شہادت بروایت ابن ابی خیثمہ یحیٰی بن سعید کے قول سے میں نے پیش کی۔ اس کو ضرور
ارسال کہنا چاہیئے۔ غرض بالقصد جب ارسال کیا جائے تو یقیناً یہ بھی اسنادی تدلیس کی ایک
قسم ہے اور یقیناً یہ بھی ایک طرح کا کذب و دجل ہے۔ بس سے چشم پوشی کھلی ہوئی مداہنت
فی الدین ہے۔

ائمۂ رجال کی حد سے زیادہ چشم پوشی

ایسا نہ تھا کہ متقدمین ائمۂ حدیث
اور رجال زہری کی ان تمام
باتوں سے ناواقف تھے وہ خوب جانتے تھے کہ ان کا نسباً" زہری ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں
اور ان کا نسب نامہ جو بیان کیا جاتا ہے، قابل اعتبار نہیں، اسی لئے صرف ان کے اور ان کے
بھائی بھتیجے تک کے نام کے ساتھ تو ان کی طرف منسوب کردہ سلسلۂ نسب لکھ دیتے ہیں
مگر جہاں قریش یا بنی زہرہ کا شجرۂ نسب لکھتے ہیں وہاں ان کی بو بھی پہنچنے نہیں دیتے۔ وہ ان
کے فتنۂ ارسال سے بھی خوب آگاہ تھے۔ مگر زیادہ حضرات تو خاموش ہی رہے۔ صرف یحیٰی بن
سعید نے جرأت کرکے مرسلات "بمنزلۃ الریح کہہ دیا اور غنیمت ہے کہ ان کے ہمعصروں
نے اس کو سُن لیا اور کچھ برافروختہ نہ ہوئے۔ ان کی تدلیس سے بھی سب کے سب باخبر
تھے۔ مگر صرف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے علی الاعلان مدلس کہا اور پھر بعض دوسرے محدثین
نے بھی اس کا اعتراف کرلیا۔ یعنی دبی زبان سے ان کو مدلس بھی تسلیم کرلیا۔ اور مرسل روایت
کرنے والا تو علی الاعلان سب تسلیم کرہی رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے تھے سب
کے سب تو ان کے تلامذہ ہی میں تھے۔ یا تلامذہ کے تلامذہ ہیں۔ سب سے پہلے جامع حدیث
بھی تھے۔ حدیثوں کا سب سے بڑا ذخیرہ محدثین کو انہیں سے ملا۔ اگر ان کو سرے سے
ناقابل اعتبار کہہ دیتے تو پھر حدیثوں کے ان ذخیروں سے جو ان کے ذریعہ سے ملا، ہاتھ دھو
بیٹھنا پڑتا۔ اتنی باتیں جو عام طور سے بہ خاص و عام میں مشہور تھیں۔ ان کا اعتراف بھی
مجبوراً کیا۔ اور پھر ان کے فضائل و مناقب کے گیت گانے لگے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ابن شہاب کہتے تھے کہ میں نے کبھی کسی عالم سے کچھ دریافت نہیں کیا۔ (تہذیبُ التّہذیب ترجمہ زہری جلد ۹ صہ ۴۴۸ اور جلد ۴ صہ ۲۲۵ ترجمہ اعمش میں لکھا ہے کہ یحیٰی بن معین کے سامنے کسی نے کہا کہ ابن شہاب زہری، اعمش کیطرح ہیں۔ تو ابن معین نے کہا کہ کیا واسطہ! زہری ایک دنیادار تھے، دنیاوی عزت و وجاہت کے طالب، خلفاء کی خدمت گذاری میں رہا کرتے تھے بخلاف اعمش کے کہ یہ ایک فقیر آدمی تھے۔ سلاطین و اُمراء کے درباروں سے کنارہ کش پرہیزگار اور عالم قرآن حکیم تھے۔

تہذیبُ التّہذیب جلد ۹ صہ ۴۰۹ میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ یہ فرماتے ہیں:۔

"علم حدیث جتنا ہم نے پھیلایا ہے کسی نے بھی نہیں پھیلایا اور جس قدر ہم نے خرچ کیا کسی نے بھی نہیں خرچ کیا"

ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ ہشام بن عبدالملک نے اپنے ایک لڑکے کے لئے کچھ حدیثیں لکھ دینے کے لئے ان سے فرمائش کی۔ تو انہوں نے زبانی چار سو حدیثیں اسی مجلس میں لکھوا دیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہشام نے کہا کہ وہ جو تم نے لکھوا دیا تھا، کھو گیا پھر لکھوا دو، تو انہوں نے پھر لکھوایا۔ پہلے مسوّدے سے ملایا گیا۔ تو ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا۔ صالح بن کیسان نے کہا کہ ہم اور زہری ساتھ ساتھ حدیثیں لکھتے تھے تو جو کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے سنن ملے۔ ان کو تو ہم دونوں نے لکھا مگر جب آثار صحابہ ملے تو زہری نے لکھا اور ہم نے نہیں لکھا۔ بعد کو غور کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اچھا کیا اور ہم نے مواقع کو ضائع کیا۔

واضح رہے کہ ابن شہاب زہری کی دیانت پر حملہ نہیں کر رہا۔ ممکن ہے انہوں نے نیک نیتی سے حدیثیں جمع کرنا شروع کیں۔ مگر آغاز کار کے وقت ایسے کاموں میں بے احتیاطی ضرور ہوا کرتی ہے۔ حدیثوں کے لکھنے کی ممانعت کا غلغلہ اس زمانے میں عام تھا۔ اس لئے انہوں نے جس سے جو حدیث سنی یاد کرلی۔ لکھا بھی تو یاد کرنے کے لئے لکھا اور پھر اسی مسودے کو ضائع کر دیا۔ راویوں کی جرح و تعدیل کا اس وقت نام و نشان بھی نہ تھا اور نہ چند

اس کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ اسلئے کہ تابعین ہی سے تو حدیثیں سنتے تھے۔ پہلے ہی راوی کے بعد کسی صحابی کا نام آتا تھا۔ تابعین کے ساتھ حسنِ ظن سے کام لینا منصب تابعیت کے احترام کے پیش نظر ضروری تھا اس لئے جو روایت بھی ملی، کسی پس و پیش کے بغیر اس کو قبول کر لیا اور یاد کر لیا۔

ان کے تلامذہ میں اکابر محدثین ہوئے مثلاً امام مالکؒ، خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز عمرو بن دینار رحمۃ اللہ، صالح بن کیسان، یحییٰ بن سعید الانصاری، ایوب السختیانی، امام اوزاعی، محمد بن المنکدر، ہشام بن عروہ اور سفیان بن عیینہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ ان جیسے اکابر محدثین نے ان کی مسامحتوں اور کمزوریوں سے واقفیت کے باوجود ان سے حدیثیں لیں۔ کیونکہ اگر ان کو چھوڑ دیتے تو پھر کہاں جاتے اور کس سے حدیثیں لیتے۔ سب سے پہلے حدیثیں جمع کرنے والے تو یہی تھے۔ البتہ ان کی حدیثوں میں سے جو حدیثیں جس کو قریب الی الصحت اسکے ذہنی معیار کے مطابق نظر آئی۔ وہی حدیثیں اس نے لیں اور باقی کو اس نے چھوڑ دیا۔ مگر جس نے جن حدیثوں کو قبول کیا یہی سمجھتے ہوئے قبول کیا کہ یہ حدیثیں غالباً صحیح ہوں گی نہ کہ قطعی طور سے ان کو صحیح سمجھ کر۔

ابنِ شہاب منافقین عجم کی ریشہ دوانیوں سے واقف نہ تھے۔ اس لئے ان کو تابعین کی جماعت سمجھ کر ان کی من گھڑت حدیثیں اطمینان سے لیتے رہے اور نادانستہ اُن کے کذب و افتراء میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے اور ان کا مقصد پورا کرتے رہے۔ جیسا کہ وہ حدیثیں جو صرف انہی کی روایت سے محدثین کو ملی ہیں۔ ان پر غور کرنے سے صاف پتہ مل جاتا ہے۔ اللّٰھُمَّ اغفر لنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمانِ ولا تجعل فی قلوبنا غِلاً للذین آمنوا۔ ربنا انک رؤف رحیم

زہری کی بعض روایات کا تجزیہ

امام زہری کے سوانحی حالات علامہ تمنا کے مضمون میں بیان ہو چکے ۔ اب امام زہری کی روایت کردہ کچھ احادیث ملاحظہ کر لی جائیں ، جن کی بنا پر دشمنان اسلام ، اسلام کی انتہائی اہم بنیادوں پر کاری ضربیں لگانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں ۔

سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے آغاز والی روایت زہری پر علامہ تمنا کے قلم سے تبصرہ پیش کیا جاتا ہے ۔ پھر اسی روایت زہری پر ایک دوسرے انداز میں مولانا جعفر شاہ پھلواری کی توضیحات ہوں گی ۔

○ اسکے بعد جمع قرآن سے متعلق امام زہری کی روایات کا آپریشن کر کے حضرت مفتی عبداللطیف رحمانی نے ان کا زہر نکالنے کی کوشش کی ہے ۔

○ ان کے بعد مولانا حکیم نیاز احمد فاضل دیوبند نے امام زہری کے حالات کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ یہ وہ حیرت انگیز شخص ہیں جو اپنے تشیع کے باوجود اور درباری اکھاڑ پچھاڑ کے علی الرغم بنوامیہ کے کئی حکمرانوں کے مسلسل درباری رہے بلکہ خلفاء بنو امیہ کی نئی نسلوں کے اتالیق رہے ظاہر ہے اپنے [illegible] اصول سے سمجھوتہ کر کے اس پر اثر انداز ہوتے رہنے کے لئے کس قدر گہری اور رنگا رنگ صلاحیتوں کی ضرورت رہی ہو گی جن سے امام زہری جیسا جینئس ہی عہدہ برآ ہو سکتا تھا ۔ اسکے ساتھ وہ اپنے مسلکی مشن کے لئے عوامی سطح پر کام کرتے رہے جسکی دو مثالیں اوپر پیش کی جا چکی ہیں یعنی رسول اللہؐ کی نبوت ہی کو مشکوک قرار دینے کے لئے آغاز وحی والی روایت اور قرآن کریم کو مشکوک قرار دینے کے لئے جمع قرآن کی روایات ۔ اس مضمون میں حکیم صاحب نے امام زہری کے تجزیئے کے ساتھ امام زہری کی اس روایت کا تجزیہ بھی کیا ہے جسمیں ام المومنین عائشہؓ صدیقہ کی عصمت کو لیکن دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

○ چوتھے نمبر پر مولانا احمد شاہ بخاری کے شاگرد مولانا محمد نافع صاحب کی کتاب رحماء بینہم سے سنی شیعہ مباحث پر امام زہری کی روایات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس سے اصل حقائق کے ساتھ امام زہری کا مسلکی نقطہ نظر بھی ابھر آتا ہے ۔

انشاء اللہ ان مضامین کے مطالعہ سے امام زہری کا وہ رخ عام قارئین کرام کے سامنے بھی بے نقاب ہو جائے گا جس پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے (طاہر)

ورقہ بن نوفل اور آغاز وحی

(زہری کی روایت کی روشنی میں)

از علامہ تمنا عمادی

صحیح بخاری کا سب سے پہلا باب کیف کان بدءالوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء کس طرح ہوئی؟ اس باب کی تیسری حدیث کو ملاحظہ فرمائیے۔ جس کو امام بخاری۔ یحییٰ ابن بکیر سے وہ لیث بن سعد سے اور لیث عقیل ایلی سے اور وہ ابن شہاب ابن زہری سے، اور وہ عروہ بن زبیر سے اور وہ حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ یحییٰ بن بکیر اور لیث بن سعد دونوں تو مصری ہیں۔ لیث تو دراصل اصفہانی تھے۔ قریش کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۸ صفحہ ۴۵۹)۔ اسی طرح یحیٰ ابن بکیر بھی قریش کے آزاد کردہ غلام تھے باوجودیکہ بخاری و مسلم دونوں ان سے روایت کرتے ہیں۔ مگر ابن حجر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ابو حاتم کا قول ہے کہ ان کی حدیثیں لکھ لی جائیں۔ مگر وہ سند و حجت نہیں ہیں امام نسائی نے ان کو ضعیف اور غیر ثقہ کہا ہے امام مالک کے کاتب حبیب بن ابی حبیب جو مشہور وضاع و کذاب اور مفتری تھا۔ اس کے یہ شاگرد تھے اور اسی کے ذریعے سے موطا کی روایت کیا کرتے تھے، اور امام مالک کی طرف منسوب کر کے ایسی ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، جن کو ان کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا تھا۔ امام بخاری نے خود تاریخ صغیر میں لکھا ہے کہ ابن بکیر جو تاریخی باتیں اہل حجاز سے روایت کرتے ہیں میں ان کی نفی کرتا ہوں، (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۸)۔ اور ابن حجر عقیل بن خالد بن عقیل کو حضرت عثمان رضی عنہ کا آزاد کردہ غلام لکھتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ان کے باپ خالد بن عقیل آزاد کردہ غلام ہوں گے۔ یہ ابن شہاب زہری کے ہموطن یعنی مقام ایلہ کے رہنے والے تھے اور زہری کے خاص شاگردوں میں تھے اور زہری سے ایسی ایسی حدیثیں روایت کرتے تھے جنھیں ان کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا تھا۔ اور یہی حدیث کو ابن شہاب زہری سے روایت کر رہے ہیں۔

ابن شہاب زہری والے مضمون میں تہذیب التہذیب کی عبارت بحوالہ جلد و صفحہ

نقل کر کے اور دوسرے دلائل سے بھی ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ابن شہاب زہری کا عروہ بن الزبیر سے حدیثیں سننا باجماع محدثین ثابت نہیں ہے، اور نہ قرین قیاس ہے۔ اس لئے یہ حدیث بھی سرساات محمد بن مسلم ابن شہاب زہری میں سے ہے۔ اور ہم ان کے حالات میں لکھ چکے ہیں کہ آئمہ حدیث کے نزدیک ابن شہاب زہری کی مرسل حدیثیں بمنزلہ الریح ہیں۔

یہی حدیث بخاری کے باب التعبیر کی ابتداء میں بھی انہیں اسناد سے مروی ہے۔ مگر ایک تحویل کے ساتھ جس سے معلوم ہوا کہ امام بخاری نے اس حدیث کو عبداللہ بن محمد المسندی البخاری سے بھی سنا۔ اور انھوں نے عبدالرزاق بن ہمام سے، انھوں نے معمر سے، انھوں نے زہری سے۔ عبدالرازاق بن ہمام بھی ایک غلام آزاد کردہ تھے حمیریوں کے اور شیعہ تھے۔ جن کو عباس عنبری نے کذاب کہا ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ صفحہ ۳۱۴)

اب چاہے یہ حدیث واقعی ابن شہاب زہری ہی کو منافقین عجم نے تلقین کی ہو، یا ان کے بعد والے عجمی اویبوں کی شکم زاد ہو اور انھوں نے اس کو زہری کے سر تھوپ دیا ہو۔ بہر حال اس حدیث میں بعض خطرناک من گھڑت اضافے ضرور ہیں، جن کی خطرناکی روایت پرستی کے جذبات سے الگ ہو کر اگر تھوڑا تامل کیا جائے تو صاف طور سے معلوم ہو سکتی ہے، اور پھر درایت قرآنیہ کی مخالفت، عقل سلیم کی مخالفت علاوہ براں ہے۔

پوری حدیث کی عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ طوالت طلب ہے، اس لئے میں صرف ترجمے پر اکتفا کرتا ہوں۔ امام بخاری لکھتے ہیں:۔

ابن شہاب زہری عروہ بن الزبیر سے اور وہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتے ہیں اور حضرت صدیقہؓ نے فرمایا کہ پہلے پہل جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء ہوئی تو رویائے صالحہ (صحیح خواب سے) نیند میں۔ تو آپ جو خواب بھی دیکھتے تھے۔ وہ نمود سحر کی طرح ظاہر ہو جاتا تھا (یعنی اسکی تعبیر) پھر آپؐ کو تخلیہ پسند ہوا تو آپ غار حرا میں تخلیہ رکھنے لگے اور اس میں تحنث (یکسوئی کے ساتھ غور و فکر) کرنے لگے کئی کئی راتیں، پھر پلٹتے تھے اپنی بیوی (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) کے پاس اور کھانے پینے کا سامان لے جاتے تھے پھر (جب وہ خرچ ہو جاتا تھا تو) حضرت خدیجہ رضی

اللہ عنہا کے پاس واپس آتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے جاتے تھے ۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس حق اچانک آگیا (یعنی وحی آگئی) اور آپؐ غار حرا میں تھے ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتہ پہنچا ۔ اور اس نے کہا کہ پڑھو ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں ۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو پکڑ لیا اس فرشتے نے اور بھینچا ۔ (۱) جہاں تک میں اپنے آپ کو سنبھال سکتا تھا ۔ پھر مجھکو چھوڑ دیا پھر کہا کہ پڑھو ، تو میں نے پھر کہا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں ۔ پھر اس (فرشتے) نے مجھ کو پکڑا اور بھینچا جہاں تک میں اپنے آپ کو سنبھال سکتا تھا ۔ پھر مجھ کو چھوڑ دیا ۔ اور پھر کہا کہ پڑھو ۔ پھر اس نے مجھکو پکڑا اور بھینچا ۔ تیسری بار پھر مجھ کو چھوڑ دیا ۔ پھر کہا کہ **اقراء باسم ربک الذی خلق ٭ خلق الانسان من علق ٭ اقراء وربک الاکرم** تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے واپس آئے ، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اور حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس پہونچے اور کہا کہ مجھ کو کمبل اڑھاؤ کمبل اڑھاؤ ۔ تو انھوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا ۔ یہاں تک کہ آپ کی گھبراہٹ دور ہو گئی تو (حضرت) خدیجہ سے آپ نے پورا واقعہ بیان فرماتے ہوئے کہا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے تو خدیجہ نے کہا ہرگز نہیں اللہ کی قسم اللہ آپ کو کبھی غمگین نہیں کرے گا (یا کبھی رسوا نہیں کرے گا) آپ صلہ رحم کرتے ہیں ، بیکسوں کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں ، پھر خدیجہ ان کو اپنے ساتھ لے چلیں ۔ یہاں تک کہ پہنچیں ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ اپنے چچیرے بھائی کے پاس ۔ اور وہ ایک ایسے شخص تھے جو زمانہ جاہلیت میں نصاریٰ ہو گئے تھے ۔ اور عبرانی زبان میں کتاب (انجیل) کا ترجمہ کرتے تھے (کیونکہ انجیل سریانی زبان میں تھی) ۔ (۲) جب تک اللہ نے چاہا کہ وہ لکھیں اور وہ تھے بہت بوڑھے ، اندھے ہو گئے تھے تو حضرت خدیجہؓ نے ورقہ سے کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے ! تم اپنے بھتیجے سے (ان کا حال) سنو تو ورقہ نے آپؐ سے کہا کہ اے میرے بھتیجے ! وہ کیا ہے جو تم دیکھتے ہو ؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا ۔ ان سے بیان کیا ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ورقہؓ نے کہا کہ یہی وہ ناموس ہے ۔ جس کو اللہ نے موسیٰ پر اتارا تھا ۔ کاش کہ میں اس (زمانے) میں جوان رہتا ۔ اے کاش کہ میں اس وقت زندہ رہتا ۔ جب کہ تمہاری قوم تم کو نکالے گی ۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حیرت سے) پوچھا کہ کیا وہ لوگ مجھ کو نکالنے والے ہوں گے ؟ ورقہ نے کہا کہ ہاں

کوئی شخص ایسی چیز لے کر نہیں آیا۔ جیسی کہ تم لائے ہو۔ مگر وہ عداوت کیا گیا۔ اور اگر تمہارے زمانے نے مجھ کو پا لیا تو میں تمہاری مدد کروں گا زبردست مدد۔ پھر ورقہ نے کچھ ہی دنوں بعد انتقال کیا۔ اور وحی رک گئی۔ (۱)

ایسی ہی حدیث ابن جریر طبری۔ احمد بن عثمان معروف بابی الجوزاء سے وہ وہب بن جریر سے وہ اپنے باپ جریر بن حازم سے وہ نعمان بن راشد سے اور وہ زہری سے انھیں اسناد کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ وہب بن جریر اور ان کے باپ جریر بن حازم اور نعمان بن راشد یہ سب بصری ہیں اور نعمان بنی امیہ میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے اور یہ سب کے سب منکر الحدیث ضعیف الحدیث تھے۔ غرض ابن جریر کی اس متابعت سے کوئی تقویت اس حدیث کو نہیں پہنچی خصوصاً جب وہ متابعت ضعیف الحدیث منکر الحدیث راویوں سے مروی ہو۔ پھر خصوصاً جب کہ سب ابن شہاب زہری ہی تک پہنچتے ہوں۔

ابن جریر نے ایک روایت اور بہم پہنچائی ہے۔ جس کو وہ محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب سے، وہ عبدالواحد بن زیاد سے۔ وہ سلیمان الشیبانی سے اور وہ عبداللہ بن شداد سے روایت کرتے ہیں۔ اور ابن شداد بلا واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر رہے ہیں۔ عبدالواحد بن زیاد بصری تھے مگر کوفے میں بھی رہا کرتے تھے۔ اعمش جو مشہور شیعہ محدث تھے اور اہل سنت میں بھی بڑے محدث مانے جاتے تھے مگر محدثین نے ان کو "مفسد حدیث اہل الکوفہ" کہا ہے۔ ان کے یہ خاص شاگرد تھے۔ اور جن حدیثوں کو حضرت اعمش اپنے اکابر تلامذہ یعنی اہل سنت محدثین کے سامنے پیش نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو عبدالواحد بن زیاد جیسے خاص شاگردوں کے ذریعہ عوام میں پھیلایا کرتے تھے۔ اور حضرت اعمش کے اس کام میں رفیق کار ان کے ہم خیال وہم مذہب وہم مشرب اور پھر ہمعصر بھی ابواسحق السبیعی تھے۔ اسی لئے ان لوگوں کے ایسے ایسے خاص تلامذہ ان دونوں کے مشترک اور غیر مشترک رہتے تھے۔ جن کا کچھ ذکر میں نے اپنے رسالہ **المکتہ فی ذکر الاصحاب الستۃ** میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

ابن جریر کی پہلی حدیث جس کو وہ احمد بن عثمان النوفلی البصری سے روایت کرتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ یہ نوفل بن عبدمناف کی اولاد میں سے اور ورقہ بن نوفل یا ان کے بھائیوں میں سے کسی سے نسبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ بنی

نوفل میں سے کسی کے آزاد کردہ غلام تھے ۔ اسی لئے ان کے آباؤ اجداد میں سے کسی کا تعلق بھی مکہ مکرمہ سے کبھی نہیں رہا سن ۲۴۶ میں انھوں نے وفات پائی ۔ ان کے اجداد میں جو عبد اللہ بن سنان کا نام آتا ہے ۔ وہ عبداللہ بن سنان صحابی نہیں کیونکہ صحابی جو تھے وہ نوفلی نہیں تھے ۔ بلکہ وہ مزنی تھے البتہ احمد بن عثمان النوفلی کے اجداد میں جو عبداللہ بن سنان تھے ممکن ہے کہ یہ وہ عبداللہ بن سنان ہوں جو شیعہ تھے اور اصول کافی (حدیث شیعہ میں) حضرت ابو عبداللہ جعفر صادق سے روایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ غالباً انہیں کا ذکر ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۹۷ میں کیا ہے ۔ مگر ان کو نوفلی نہیں بلکہ زہری لکھا ہے ۔ یعنی وہ لکھتے ہیں عبداللہ بن سنان الزہری الکوفی نزیل بغداد جو ہشام بن عروہ بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں انھیں ضعیف الحدیث لکھا ہے ۔ ممکن ہے کہ تفرقہ پیدا کرنے کے لئے شیعہ ائمہ رجال نے ان کو نوفلی قرار دیدیا ہو ۔ بہر حال یہ احمد بن عثمان النوفلی معروف بابی الجوزا محض تھرڈ کلاس کے راوی ہیں ۔ مگر مسلم ، ترمذی اور نسائی میں ان کی دو ایک حدیث مروی ہے ، اس لئے صرف ابوحاتم نے ان کو "ثقہ" لکھدیا ہے اور نسائی نے "لاباس بہ" کہا ہے اور "لا باس بہ" کا مفہوم ائمہ فن کے نزدیک یہ ہے کہ "غیرہ خیرمنہ" ۔ یعنی اس کے سوا ہر دوسرا راوی اس سے اچھا ہے ۔ اور باقی تمام ائمہ رجال نے ان کے متعلق خموشی اختیار کی ہے ۔ احمد بن عثمان روایت کرتے ہیں وہب بن جریر بن حازم سے ۔ یہ بھی "لیس بہ باس" ہیں ۔ بلکہ بعضوں نے ان کے متعلق کچھ کلام بھی کیا ہے ۔ شعبہ سے چار ہزار حدیثیں روایت کرتے تھے ۔ مگر امام احمد فرماتے ہیں کہ انھوں نے شعبہ سے کچھ بھی نہیں سنا ۔ ابن حبان نے ان کو حدیثوں میں خطا کا مرتکب بھی لکھا ہے ۔ یہاں تک تو تہذیب التہذیب میں ہے ۔ اور امام ذہبی میزان الاعتدال جلد ۳ صفحہ ۲۱ ترجمہ محمد بن اسحاق میں لکھتے ہیں کہ امام یحییٰ بن سعید القطان نے عبداللہ القواریری سے پوچھا کہ تم کہاں جارہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ وہب بن جریر کے پاس میرت لکھنے کے لئے ، یحییٰ القطان نے فرمایا کہ **تکتب کذ باکثیراً** تم بہت ساری جھوٹی باتیں لکھ لاؤ گے ۔

وہب بن جریر ، اس حدیث کو اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں ۔ ان کا بھی حال سن لیجئے ۔ جریر بن حازم اور بھی مجروح ہیں ۔ ان پر خطاء و وہم کے علاوہ منکر حدیثیں روایت کرنے کا بھی الزام ہے ۔ اور الٹ پلٹ حدیثیں روایت کرنے کا بھی اور تدلیس کا

بھی۔

جریر صاحب اس حدیث کی روایت نعمان بن راشد سے کرتے ہیں۔ جن کو امام بخاری نے ضعفاء میں شمار کیا ہے یحییٰ بن معین " ضعیف لیس بشئی " کہتے ہیں نسائی نے ضعیف کثیر الخطاء لکھا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی حدیثیں الٹ پلٹ ہیں، اور متعدد لوگوں نے **ضعیف لیس بالقوی مضطرب الحدیث منکر الحدیث** وغیرہ کہا ہے

یہی نعمان بن راشد اس حدیث کو حسب روایت ابن جریر الطبری زہری سے اور وہ عروہ بن الزبیر سے اور وہ حضرت ام المومنین صدیقہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اور میں لکھ چکا ہوں تہذیب التہذیب کے حوالے کے ساتھ کہ زہری کا عروہ بن الزبیر سے حدیثوں کا سننا باجماع محدثین ثابت نہیں۔ اس لئے بخاری کی روایت کی طرح یہ بھی بمنزلہ الریح ہے۔

پھر یہی روایت ابن جریر یونس بن عبدالاعلیٰ سے وہ ابن وہب سے وہ یونس سے اور وہ ابن شہاب زہری سے کرتے ہیں۔ مگر جب ابن شہاب زہری ہی تک یہ سلسلہ بھی پہنچا ہے۔ تو پھر ادھر کے راویوں کی تنقید میں وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

ابن جریر نے ایک دوسری روایت محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب سے، انھوں نے عبدالواحد بن زیاد سے انھوں نے سلیمان الشیبانی سے انھوں نے عبداللہ بن شداد سے پیش کی ہے۔ جس کو عبداللہ بن شداد نے بلا واسطہ کسی کے بیان کیا ہے۔ جس میں مذکور نہیں ہے کہ حضرت خدیجہؓ رسول اللہؐ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئی تھیں بلکہ صاف طور سے یہ مذکور ہے کہ حضرت خدیجہؓ (خود تنہا) ورقہ کے پاس گئیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا واقعہ ان سے بیان کیا۔ ورقہ نے حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ اگر تو اس قول میں سچی ہے تو تیرا شوہر ضرور نبی ہے اور اپنی امت کی طرف سے سختی پہونچے گی اگر مجھ کو اس کا وقت ملا تو میں اس پر ایمان لے آؤں گا۔

اس روایت کا سلسلہ ہی منقطع ہے۔ عبداللہ بن شداد نے کس سے سن کر بیان کیا۔ یہ روایت میں مذکور نہیں۔ یہ اگرچہ کوفہ میں نہیں رہتے تھے۔ مگر ابن حجر لکھتے ہیں " کان یاتی الکوفہ " یہ کوفے میں برابر آیا کرتے تھے۔ شیعہ تھے۔ کبھی تقیہ کرکے اپنے کو عثمانی بھی ظاہر کر دیتے تھے۔ غالباً حجاج بن یوسف کو خوش کرنے کے لئے عثمانی بن گئے

ہوں گے ۔ اسی لئے ابن سعد نے لکھدیا کہ " کان عثمانیا " یہ عثمانی تھے ۔ مگر ابن حجر نے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے اور دو جگہ ان کے شیعہ ہونے کا ذکر کیا ہے ۔ حجاج کے ہی زمانہ میں یہ قتل کئے گئے ۔ شاید ان کا تقیہ ظاہر ہو گیا ، بقول ابن حجر ان کی وفات ، سن ۸۱ یا سن ۸۲ میں ہوئی ۔

ابن جریر نے ایک اور لمبی چوڑی حدیث حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کی ہے ۔ جس کو وہ اب ابن حمید سے وہ سلمہ سے وہ محمد بن اسحاق سے ، وہ وہب بن کیسان سے وہ عبد اللہ بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں ۔ اس حدیث میں اور بھی تفصیلات ہیں جو دوسری حدیثوں میں نہیں ہیں ۔ اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سویا ہوا تھا کہ فرشتہ میرے پاس ایک ریشمی رومال لے کر آیا ۔ (۱) جس میں ایک کتاب تھی ۔ اس کو پیش کر کے اس نے کہا کہ پڑھو ۔ میں نے کہا کہ میں پڑھتا نہیں ہوں تو انہوں نے مجھ کو بھینچا ۔ یہاں تک کہ میں یہ سمجھا کہ بس اب یہ موت ہی ہے پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا پھر کہا کہ پڑھو میں نے کہا کون سی چیز میں پڑھوں ۔ اور میں یہ نہیں کہتا تھا مگر اس توقع پر کہ وہ پھر میرے ساتھ ایسا ہی کرے ۔ تو اس نے کہا

اقراء باسم ربک الذی خلق .... علم الانسان مالم یعلم

تک تو میں نے اس کو پڑھ دیا ۔ پھر وہ رک گیا ۔ اور میرے پاس سے چلا گیا ۔ پھر میں اپنی نیند (۲) سے بیدار ہوا ۔ اور گویا اس نے میرے دل میں ایک کتاب لکھدی ۔ اور اللہ کی مخلوق میں سے کوئی چیز ایسی جس سے مجھ کو بغض ہو نہیں تھی شاعر (۳) اور مجنوں سے زیادہ ۔ میں ان دونوں کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا ۔ آپ نے فرمایا کہ بربادی ہے شاعر اور مجنوں کے لئے اور اس سے مراد لیا اپنے نفس کو ایسا نہ ہو کہ قریش میرے بارے میں ایسے الفاظ بولنے لگیں ۔ میں پہاڑ کی کسی چوٹی پر پہنچ کر اپنے آپ کو گرادوں گا ۔ اور اپنے کو قتل کر کے راحت حاصل کروں گا ۔ (یہ سوچ کر) میں چلا جب بیچ پہاڑ پر پہنچا تو ایک آواز سنی جو آسمانی آواز تھی کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ اے محمدؐ تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرئیل ہوں ۔ تو میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو مجھ کو جبرئیل ایک انسانی صورت میں نظر آئے ۔ ان کے دونوں قدم آسمان کے کنارے پر تھے کہہ رہے تھے کہ اے محمد تم رسول اللہ ہو اور میں جبرئیل ہوں تو میں ٹھہر کر ان کی طرف دیکھنے لگا اور جو کچھ سوچ کر چلا تھا ۔ اس کی طرف سے غافل ہو گیا ۔ تو پھر نہ آگے بڑھ سکا ۔ اور نہ

پیچھے ہٹ سکا ۔ پھر میں ادھر ادھر آسمان کے کناروں پر نظر دوڑانے لگا ۔ تو جس طرف نظر لے جاتا تھا ۔ ان کو اسی طرح اس طرف دیکھتا تھا ۔ اسی طرح میں کھڑا دیکھتا رہا ۔ نہ آگے بڑھتا نہ پیچھے ہٹتا ۔ یہاں تک کہ خدیجہ نے کچھ لوگوں کو میری تلاش میں بھیجا آخر وہ لوگ ناکام واپس گئے خدیجہ کے پاس اور میں یہاں اپنی جگہ پر کھڑا تھا ۔ پھر جبرئیل میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں خدیجہ کے پاس چلا آیا اور خدیجہ کے پہلو میں بیٹھ گیا ۔ انھوں نے پوچھا کہ اے ابوالقاسم ! تم کہاں تھے ؟ میں نے تمہاری کھوج میں آدمی دوڑائے تھے ، آخر وہ ناکام میرے پاس واپس آئے میں نے کہا کہ بربادی ہے شاعر یا مجنوں کے لئے ، خدیجہ نے کہا کہ میں ان چیزوں سے تمہارے لئے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اے ابوالقاسم ! اللہ تمہارے ساتھ ایسا کبھی نہیں کرے گا باوجود اس کے جو میں جانتی ہوں تم میں باتوں کی سچائی اور امانت داری کی عظمت اور حسن اخلاق اور صلہ رحم ۔ تو کیا ہے اب میرے چچا کے بیٹے ! شاید تم نے کچھ دیکھ لیا ہے تو میں نے کہا ہاں ! تو میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو ان سے بیان کیا ۔ انھوں نے کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے ! تمہیں خوشخبری ہو ۔ تم مطمئین رہو ۔ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں خدیجہ کی جان ہے ۔ مجھ کو امید ہے کہ تم اس امت کے نبی ہوجاؤ ۔ پھر کھڑی ہو گئیں اور اپنے لباس درست کئے ۔ پھر وہ گئیں ۔ ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس ۔ اور وہ ان کا چچیرا بھائی تھا ، اور وہ عیسائی ہو گیا تھا اور پڑھی تھی کتاب اور سنا تھا تورات و انجیل والوں سے تو خدیجہ نے ان باتوں سے ورقہ کو باخبر کیا جو باتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہی تھیں کہ انھوں نے یہ دیکھا اور سنا تو ورقہ نے کہا کہ قدوسٌ قدوسٌ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ورقہ کی جان ہے اگر تو نے اے خدیجہ مجھ سے سچ کہا ہے تو اس کے پاس ناموس اکبر آیا ۔ ناموس سے ان کی مراد جبرئیل علیہ السلام تھے جو موسیٰ کے پاس آتے تھے اور بلاشبہ اس امت کے نبی ہیں ۔ ان سے جاکر کہہ دو مطمئن رہیں ۔ تو خدیجہ آئیں اور رسول اللہؐ سے ورقہ کی باتیں دہرائیں ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تردد تھا اس کا کچھ حصہ دور ہو گیا تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا اعتکاف پورا کر چکے ۔ اور مقام اعتکاف سے واپس آئے اور حسب معمول پہلے طواف کعبہ کیا تو وہاں ورقہ بن نوفل سے بھی ملاقات ہو گئی کہ وہ بھی طواف کر رہے تھے تو ورقہ نے کہا کہ اے بھتیجے جو کچھ تم نے دیکھا اور سنا ہے مجھ سے بیان کرو ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا تو ورقہ نے کہا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں

میری جان ہے تم بے شک اس امت کے نبی ہو ۔ اور تمہارے پاس وہی ناموس اکبر آیا جو موسیٰ کے پاس آتا تھا ۔ (اس کے بعد کہا) **ولتکذبنہ ولتوذینہ ولتخرجنہ لتقاتلنہ** (پھر کہا) اور اگر میں نے اس (وقت) کو پا لیا تو اللہ کی ایسی مدد کروں گا، جس کو وہ جانتا ہے ۔ پھر آپ کے سر کو جھکا کر انھوں نے آپ کی پیشانی کا بوسہ لیا ۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی منزل میں چلے آئے ۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ گھبراہٹ وغیرہ دور ہو گئی ۔

اس حدیث کے بعد بھی ایک مہمل سی بلکہ مکروہ حدیث ابن جریر نے نقل کی ہے ۔ مگر مجھ کو تو سب سے معتبر کتاب جو کہی جاتی ہے صحیح بخاری دراصل اسی کی روایت کو اس وقت اپنا مرکز بحث بنانا ہے اسلئے دوسری کتابوں میں اس مفہوم کی جو جو حدیثیں ہیں ان کو نظر انداز کر کے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ منافقین عجم نے تابعین و اتباع تابعین کے لبادے اوڑھ اوڑھ کر کس کس طرح قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر پوشیدہ حملے کئے ہیں ۔

مذکورہ بالا روایات کو سامنے رکھیئے تو بادنیٰ تامل متعدد سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں ۔ (اس سے قطع نظر کہ کیا واقعی نبوت سے پہلے رسول اللہؐ نے غار حرا میں تحنث کرنا شروع کر دیا تھا ۔)

۱۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر اور نزول وحی سے اس قدر متوحش اور خوفزدہ ہو جانا ۔ اور منصب نبوت و رسالت کو آپ کا کچھ نہ سمجھنا، بلکہ خلعت نبوت و تشریف رسالت سے سرفراز ہونے کے بعد اپنی جان کو خطرے میں سمجھنا، بلکہ اپنے کو شاعر یا مجنوں سمجھنا، اور دوسروں کی طعنہ زنی کی وجہ سے اپنے کو ہلاک کر ڈالنے کا ارادہ کرنا، ایک ایسی عجیب و غریب بات ہے، جس کو بادۂ روایت پرستی کی سرشاری ہی میں لوگ قبول کر سکتے ہیں ۔ ورنہ کسی انسان کی عقل سلیم ان باتوں کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ چالیس سال ایک افصح العرب والعجم جو منصب نبوت و رسالت کے لئے منجانب اللہ منتخب ہو رہا ہو ۔ وہ اتنا بھولا بھالا ہو کہ جن باتوں کو سن کر ایک عورت ذات سمجھ لیتی ہے ۔ ان باتوں کو سمجھانے کے بعد بھی وہ نہیں سمجھتا ۔ اور اتنے بڑے جلیل القدر منصب کو وہ اپنے لئے ایک مصیبت سمجھ لیتا ہے ۔ یہاں تک کہ اپنے کو شاعر یا مجنوں سمجھ کر خیال کرتا ہے کہ اگر دوسرے لوگ میرے ان حالات کو سن لیں گے تو مجھ کو شاعر یا مجنوں کہنے لگیں

گے تو قبل اس کے کہ لوگوں کو میرے حالات کا علم ہو ۔ اور لوگ مجھکو شاعر یا مجنوں کہیں بہتر ہے کہ میں اپنے کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا کر ہلاک کر دوں ۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ جب خود نبی مرسل کو منصب نبوت و رسالت پانے کے بعد اپنے پر شاعر یا مجنوں ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے ۔ تو اگر اس کی باتیں سن کر دوسروں نے اس کو شاعر اور مجنوں کہا، تو وہ کس طرح قابل الزام ہو سکتے ہیں ۔

(۲) بخاری کی روایت اور ابن جریر کی پہلی اور دوسری روایت میں تو یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئی تھیں ۔ اور آپ نے ورقہ کے پوچھنے پر سارا ماجرا اپنی زبان سے فرما کر ورقہ کو مطلع کیا تھا ۔ اور ورقہ نے جو کہا وہ آپ ہی کو مخاطب کر کے کہا ۔ مگر ابن جریر کی دوسری روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ تنہا ورقہ کے پاس گئیں ۔ اور خود آپ کا حال اپنی زبان سے ورقہ کے سامنے بیان کیا ۔ پھر جو کچھ ورقہ نے کہا ۔ اس کو گھر آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی و تشفی کی ۔

یہ تو حدیثوں کا باہمی اختلاف باعتبار مضمون واقعہ کے ہے ۔ مگر ایک پہلو اس میں اس کا بھی نمایاں ہے کہ حضرت خدیجہ کے چچیرے بھائی عیسائی تھے ۔ تورات و انجیل کے ماہر تھے ۔ سریانی زبان سے عبرانی زبان میں انجیل کا ترجمہ انہوں نے کیا تھا اور انبیاء بنی اسرائیل کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور تھے قریشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم جد اس لئے ایک کہنے والا کہہ سکتا اور سمجھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ قرآن میں انبیاء بنی اسرائیل اور ان کی امتوں کے جو حالات مذکور ہیں ۔ وہ ورقہ ہی سے سن سن کر حاصل کئے گئے ہوں ۔ اور ان کو اپنی زبان میں ادا کیا گیا ہو ۔ (نعوذ باللہ من تلک الشبہات)

حالانکہ سورۃ ہود کے دوسرے رکوع کے آخر میں حضرت نوح اور ان کی امت کی سرگذشت بیان فرما کر ارشاد فرمایا گیا ہے ۔ **تلک من انباء الغیب نوحیھا الیک ما کنت تعلمھا انت ولا قومک من قبل ھذا** یہ محض غیب کی خبریں ہیں جن کو نہ تم جانتے تھے نہ تمہاری قوم اس سے پہلے جانتی تھی ۔ اگر واقعی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ جو حضرت خدیجہ کے چچیرے بھائی تھے، تورات و انجیل کے ماہر تھے ۔ انجیل کا ترجمہ عبرانی زبان میں کرتے تھے ۔ تو کن لوگوں کے لئے کیا کرتے تھے؟

کیا عرب خصوصاً مکے والے عبرانی جانتے تھے جن کے لئے وہ عبرانی میں ترجمہ کر رہے تھے لوگ اس روایت سے کھٹک محسوس نہ کریں۔ اس لئے عربی میں ترجمہ کرنے کا ذکر نہ کیا عبرانی لکھدیا۔ مگر جس کی مادری زبان عربی ہو۔ وہ اگر بضرورت عبرانی میں کسی کتاب کا ترجمہ کرے گا بھی تو کیا اپنی مادری زبان عربی میں دوسروں سے زبانی بیان بھی نہیں کرے گا؟

اس لئے کہ اگر ورقہ ابن نوفل تورات و انجیل کے ماہر تھے تو یقیناً حضرت نوح اور ان کی امت کی پوری داستان سے بھی باخبر تھے۔ اور ان کی وجہ سے مکے والوں میں سے متعدد لوگ ان سے ملتے رہنے والے بھی، ان کی صحبتوں میں بیٹھنے والے بھی، ان ترجموں سے فائدہ اٹھانے والے بھی واقف ہوں گے قرآن مجید تو صاف طور سے کہہ رہا ہے کہ نہ تم اس وحی سے پہلے حضرت نوح اور ان کی امت کے واقعات سے واقف تھے۔ نہ تمہاری قوم واقف تھی۔ مگر یہ روایتیں ارشاد فرما رہی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان ہی کا ایک شخص یہ واقعہ اور اس قسم کے متعدد واقعے اگلی امتوں کے جو اگلی کتابوں میں مذکور ہیں ان سے اچھی طرح باخبر موجود تھا۔ اور اس کی وجہ سے متعدد لوگ ان واقعات سے اس وحی قرآنی کے نزول کے قبل سے کم و بیش مطلع تھے۔ کیا ایسی خطرناک روایتیں منافقین عجم کی من گھڑت قرآن و رسول دونوں کی تکذیب و توہین کے لئے مخالفین کی آلہ کار نہیں بن سکتی ہیں؟ اور کیا نہیں بنی ہیں؟ یورپ کے مورخین نے کیا اسی قسم کی روایتوں سے گمراہ کن اور غلط نتائج نہیں نکالے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ان روایتوں میں ورقہ بن نوفل کا واقعہ اور رسول اللہؐ کا "زملونی زملونی" کہتے ہوئے غار حرا سے حضرت خدیجہؓ کے پاس آنے کا واقعہ اور حضرت خدیجہؓ کا آپ کی تسلی و تسکین کرنے کی داستان اور آپ کا اپنے کو پہاڑ کی چوٹی پر سے گرانے کا ارادہ یا اپنے کو شاعر یا مجنوں سمجھنے کا بہتان یہ ساری باتیں محض منافقین عجم کی ساختہ و پرداختہ ہیں۔ جس کی غرض عام لوگوں کو منصب نبوت و رسالت کے متعلق شبہات و شکوک میں مبتلا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو روایت پرستی کے فتنے سے بچائے اور حق و باطل کے پرکھنے کی توفیق دے۔ **واللہ یحق الحق بکلمتہ ولو کرہ المجرمون۔** (ص ۱۲۵ سے متعلق حواشی)

---

(۱) حدیث کی عبارت یوں ہے حتی بلغ منی الجھد جس کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا، یہاں تک کہ اس کا

بھیجنا میرے تحمل و برداشت کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ میں نے متن میں مفہوم ادا کر دیا ہے۔ (تمنا)

(۲) عینی شرح بخاری میں مذکور ہے کہ انجیل سریانی میں ہے۔ اور ورقہ اس کو سریانی سے عبرانی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ مگر اس زمانہ میں سریانی زبان کے جاننے والے پردہ دنیا پر کہیں تھے بھی یا نہیں۔ یہی محل تامل ہے، اس وقت تو بڑے احبار و رہبان بھی سریانی زبان سے بالکل نابلد تھے۔ جیسا کہ اکثر محققین نے لکھا ہے۔

(۱) حدیث بخاری کی اصل عبارت یوں ہے۔ ثم لم ینشب ورقہ ان توفی وفتر الوحی۔ لم ینشب بمعنی لم یلبث یعنی اس واقعہ کے بعد ورقہ زندہ نہ رہے یا کسی اور کام میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ وفات پائی اور وحی کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

(۲) یعنی وہ چھ آئمہ حدیث (صحاح ستہ والے نہیں بلکہ ان سے پہلے کے) جن کے اوپر صحاح کی تقریباً تمام حدیثیں منتہی ہوتی ہیں بلکہ صحاح سے باہر کی حدیثیں بھی زیادہ تر انہیں میں سے کسی نہ کسی تک منتہی ہوتی ہیں۔

(۱) معلوم نہیں ان چاروں فعلوں میں غائب کی ضمیر مفعول کدھر پھرے گی جب مقتضائے مقام ان کو یوں ہونا چاہئیے ولیکذبنک ولیوذنک و یخرجنک و لیقاتلنک یعنی لوگ ضرور تمہیں جھٹلائیں گے اور تمہیں ضرور ایذا دیں گے اور تمہیں ضرور نکال دیں گے اور تم سے ضرور قتال کریں گے۔

(ص ۱۲۹ سے متعلق حواشی)

سلمہ اور محمد بن اسحاق:۔ (۱) بغیر کسی کتاب پیش کئے اقراء اور ما انا بقاری کا مکالمہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کو ابن جریر نے محسوس کیا۔ اس حدیث کو ابن جریر سلعہ سے اور وہ محمد بن اسحاق صاحب المغازی سے اور وہ وہب بن کیسان سے اور وہ عبداللہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر نے عبید بن عمیر بن قتادہ اللیثی سے کہا کہ اے عبید! مجھ سے بیان کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ابتداء کس طرح ہوئی؟ تو انھوں نے بیان کیا الخ اس سلسلہ اسناد میں سب سے پہلی بات یہ جان لینا ضروری ہے کہ سلعہ نام کا کوئی راوی حدیث روایت کی دنیا میں نہیں گذرا۔ یہ طباعت کی غلطی ہے کہ سلمہ کو سلعہ بنا دیا گیا۔ سلمہ بن الفضل محمد اسحاق صاحب مغازی کے شاگرد رشید تھے اور ان کی کتاب المغازی کے یہی اصل راوی ہیں۔ انھیں سے یہ کتاب پھیلی مگر یہ شیعہ تھے۔ منکر الحدیث تھے لایحتج بہ تھے اور ابوزرعہ نے ان کے متعلق کذب کا اشارہ کیا تھا (تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۱۵۳) جبھی تو یہ ابو جعفر بن جریر الطبری کے استاد تھے۔ اگرچہ ابن حجر نے ان کے تلامذہ میں ابن جریر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مگر ابن جریر تو دوسرے کے اساتذہ سے بھی بغیر ان سے کچھ سنے ہوئے روایت کر دیتے تھے۔ اگر ان سے بھی روایت کر دی تو کیا حرج ہے ان سلمہ بن الفضل کی وفات ابن حجر سن ۱۹۱ھ میں

لکھتے ہیں ۔ محمد بن اسحٰق صاحب المغازی چونکہ سب سے پہلے جامع مغازی تھے ۔ اس لئے مورخین نے ان کی اتنی اہمیت بڑھا دی کہ آخر محدثین کو بھی ان کو ثقہ ماننا پڑا ۔ مگر امام مالک ان کو دجالوں سے میں سے ایک دجال کہتے تھے ۔ ابن حجر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان پر قدریہ ہونے کا الزام تھا ۔ اور اس کے علاوہ بھی بعض بدعات سے متہم تھے ان پر یہ بھی الزام ہے کہ یہ مجہول و غیر معروف لوگوں سے حدیثیں روایت کرتے تھے ۔ ان کی ایک ہزار حدیثیں ایسی ہیں جن کو ان کے سوا کوئی بھی روایت نہیں کرتا ۔ امام احمد بن حنبل نے ان پر یہ بھی الزام دیا ہے کہ دوسروں کی حدیثیں دیکھ کر ان کی حدیثیں اپنی کتاب میں نقل کر لیتے تھے اور امام احمد نے ان پر تدلیس کا بھی الزام دیا ہے اور پھر سدی و کلبی جیسے مشہور کذابوں سے بھی روایت کرنے سے باز نہیں آتے تھے ۔ امام احمد اور یحییٰ بن معین ، وغیرہما ان کو لیس بحجۃ لکھتے ہیں ۔ ہشام بن عروہ سلیمان التیمی یحییٰ بن سعید القطان اور وہب بن خارجہ نے ان کو جھوٹا کہا ہے یہودیوں کی اولاد سے جا جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کا حال پوچھ کر اپنی کتاب المغازی میں لکھتے تھے مگر محدثین کی ایک جماعت خصوصاً متاخرین ان کی پالائش میں اگلوں کی جرحوں کی تاویلیں بھی کرتی رہی ہے تو پھر متقدمین و متاخرین کے درمیان دار قطنی نے یہ فیصلہ کیا کہ بہر حال ان کی حدیثیں سند و حجت نہیں ہیں ۔ یہ سب تو تہذیب التہذیب میں ہے میزان الاعتدال میں ہے کہ دار قطنی نے کہا کہ سیرت نبوی میں انہوں نے بہت سی قابل انکار حدیثیں روایت کی ہیں اور جھوٹے اشعار نقل کئے ہیں ۔ ابن اسحاق کی صفائی میں ابن عیینہ کا قول پیش کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں ابن اسحاق کے ساتھ ستر برس سے کچھ زیادہ بیٹھا ہوں کبھی بھی اہل مدینہ کو ان کے متعلق کچھ کہتے نہیں سنا ابن عیینہ کی ولادت سن ۱۰۷ میں کوفہ میں ہوئی سن ۱۶۳ میں وہ کوفہ سے مکہ مکرمہ چلے گئے اور مرتے دم تک وہیں رہے (تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۱۲۲) جس سے معلوم ہو گیا کہ ابن عیینہ کی عمر کوفہ چھوڑ کر مکہ آنے کے وقت ۵۶ برس کی تھی اور سن ۱۹۸ میں ۹۱ برس کی عمر میں ان کی وفات ہے تو یہ ۵۶ برس کوفہ میں رہے اور باقی ۳۵ برس مکے میں رہے اور ابن اسحٰق مدنی تھے مگر مدینے سے اپنی عمر کے ابتدائی ہی حصے میں باہر نکل گئے تھے ۔ اور اسکندریہ و مصر و بغداد ہوتے ہوئے کوفہ پہنچ تھے ۔ اور وہیں رہ گئے کیونکہ یہ جگہ ان کی طبیعت کے بالکل موافق تھی تو پھر ابن عیینہ کو کب موقع ملا کہ ستر برس سے کچھ زیادہ مدت تک ابن اسحٰق کے

ساتھ بیٹھیں ؟ یہ ابن عیینہ پر صریحاً تہمت ہے ۔ بہر حال اس کو خوب یاد رکھنا چاہئیے کہ ابن اسحٰق کی کتاب المغازی کے اصل راوی بھی ایک شیعہ ہی ہیں یعنی سلمہ بن الفضل اور وہ ابن جریر کے استاد تھے اور وہ منکر الحدیث لایحتج بہ اور متہم بکذب بھی تھے ۔ اس روایت میں کہا گیا ہے کہ عبداللہ بن الزبیر نے عنید بن عمیر بن قتادہ اللیثی سے آغاز بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حال پوچھا یہ عجیب و غریب بات ہے عبداللہ بن الزبیر ہجرت کے پہلے یا دوسرے سال میں پیدا ہوئے تھے اور وہ مہاجرین میں پہلی اولاد ہیں جو مدینے میں پیدا ہوئے وفات نبوی کے وقت نو دس برس یا کم سے کم آٹھ برس کے ضرور تھے ۔ اسی لئے صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور عبید بن عمیر بن قتادہ اللیثی کی ولادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی تھی ۔ انھوں نے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا ۔ اس لئے استیعاب ج ۲ صفحہ ۴۰۸ میں ان کو کبار تابعین میں لکھا ہے یقیناً یہ حضرت عبداللہ بن الزبیر سے چھوٹے تھے اور مکہ میں قصہ خوانی کیا کرتے تھے ۔ عبداللہ بن الزبیر کو اگر فقط ایک قصہ سننا تھا تو کوئی اور قصہ ان سے کہنے کی فرمائش کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تو ان سے زیادہ یہ خود جانتے تھے اور اگر پوچھنا ہی تھا تو ابوسعید خذری ، سلمہ بن الاکوع رافع بن خدیج اور عبداللہ بن عمیر وغیرہم اجلہ صحابہ ان کے وقت میں موجود تھے کیا ان لوگوں سے زیادہ سیرت نبویہ کے جاننے والے عبید تھے ؟ غرض ان تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت بھی بالکل من گھڑت ہے ۔ چاہے ابن جریر کی طبعزاد ہو چاہے ان کے استاد سلمہ بن الفضل کی چاہے ان کے استاد الاستاد. محمد بن اسحٰق کی واللہ عالم (تمنا عمادی)

(۲) اس روایت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ آمد جبرئیل و آغاز نزول وحی کا سارا واقعہ عالم خواب کا تھا ۔

(۳) مجنوں تو خیر مجنوں ہے شاعر سے اس قدر بغض کی کون سی وجہ ہو سکتی ہے ۔ شعراء تو زمانہ جاہلیت میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ شاعر و مجنوں دونوں کو ایک سی حیثیت کیوں دے دی گئی ؟ مجنوں سے نفرت تو عقل میں آتی ہے شاعر سے اسی قسم کی نفرت کیوں تھی ؟ عقل اس کی توجیہہ صحیح سے عاجز ہے قرآن نے یہ تو فرمایا ہے کہ شاعری ایک پیغمبر کے شایان شان نہیں لیکن ایک عام آدمی کی شان کے خلاف تو نہیں جب کہ جنوں تو ہر شخص کی شان کے خلاف ہے ۔

آغاز وحی کی روایت

از مولانا جعفر شاہ پھلواری

تمام سیرت نگاروں نے حتیٰ کہ مولانا شبلی نعمانیؒ نے بھی ابتدائے وحی کے واقعات لکھنے میں صحیح بخاری ہی کی روایات کو اولیت کا مقام دیا ہے بلکہ اسی پر دارومدار رکھا ہے۔ اسناد روایت کے لحاظ سے ہونا بھی یہی چاہیئے۔ نیز اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ حدیث کے طالب علم کے سامنے سب سے پہلے یہی کتاب کھلتی ہے اور پہلے ہی دوسرے دن کے سبق میں آغاز وحی کی مندرجہ روایت پر نظر پڑتی ہے۔ لہذا اسی کا لوح دل پر منقوش ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔ پھر جب ذہن میں یہ زاویۂ نظر ابتدا ہی سے پیوست ہو کر یہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے تو حدیث کا طالب علم اس وقت تو اس اہم روایت کو اظہار شکوک سے بالا ہی تصور کرے گا۔ میں بھی اس دور سے گزر چکا ہوں۔ لیکن اب تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ وغیرہ ہر ایک کے بعض مقامات دل میں کچھ کھٹک پیدا کرتے ہیں اور ذہن میں اس کا حل تلاش کرنے کی ایک بے چینی سی ہوتی ہے۔

ہماری گذارشیں سننے ... سے پہلے صحیح بخاری کی آغاز وحی والی روایت سنئے :

اول ما بدیٔ بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم وکان لا یری رؤیا الا جاءت	پہلی چیز جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا آغاز ہوا وہ صالح خواب تھے۔ اس وقت حضورؐ جو خواب دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی طرح ظاہر ہو جاتا۔ اس کے

مثل فلق الصبح ثم حبب اليه الخلاء و
كان يخلو بغار حراء فيتحنث فيه وهو
التعبد الليالي ذوات العدد قبل ان ينزع
الى اهله و يتزود لذلك ثم يرجع الى
خديجة فيتزود لمثلها حتى فجئه الحق و
هو فى غار حراء فجاءه الملك فقال اقرأ
قال ما انا بقارئ قال فاخذنى فغطنى
حتى بلغ منى الجهد ثم ارسلنى فقال اقرأ
فقلت ما انا بقارئ فاخذنى فغطنى الثانية
حتى بلغ منى الجهد ثم ارسلنى فقال اقرأ
فقلت ما انا بقارئ فاخذنى فغطنى الثالثة
حتى بلغ منى الجهد ثم ارسلنى فقال اقرأ
باسم ربك الذى خلق خلق الانسان
من علق اقرأ وربك الاكرم الذى علم
بالقلم حتى بلغ ما لم يعلم فرجع بها
رسول الله صلى الله عليه وسلم يرجف
فؤاده فدخل على خديجة فقال زملونى
زملونى فزملوه حتى ذهب عنه الروع
فقال لخديجة واخبرها الخبر لقد خشيت على
نفسى فقالت له كلا ابشر فو الله ما
يخزيك الله ابدا انك لتصل الرحم و
تصدق الحديث وتحمل الكل وتكسب
المعدوم وتقرى الضيف وتعين

بعد حضورؐ کو خلوت گزینی کی طرف رغبت ہوئی اور
آپ غار حرا میں تنہا جا کر تحنث فرمانے لگے۔ تحنث
کا مطلب یہ ہے کہ متعدد روز و شب عبادت میں
گزارتے پھر اپنے گھر تشریف لاتے اور توشۂ راہ لے
جاتے پھر خدیجہؓ کے پاس واپس آتے اور اسی طرح توشہ
لے جاتے۔ آخر ایک دن دفعتہً پیغام حق غار حرا کے اندر
آ پہنچا۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ فرشتہ
(جبریل) آیا اور کہنے لگا۔ پڑھیے۔ حضورؐ نے جواب دیا:
میں پڑھا ہوا نہیں۔ اس کے بعد حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس نے مجھے
اس زور سے بھینچا کہ مجھے بھی مدافعت کے لیے پورا زور
لگانا پڑا۔ پھر مجھے چھوڑ دیا۔ پھر وہی سوال و جواب ہوا
اور اسی طرح بھینچا اور چھوڑ دیا۔ پھر وہی سوال و جواب
ہوا اور اسی طرح بھینچا اور چھوڑ دیا۔ تیسری بار پھر یہی
ہوا۔ پھر "اقراء باسم ربک" سے "ما لم یعلم" تک کے الفاظ
کہے۔ حضورؐ واپس گئے تو آپ کا دل دھڑک رہا تھا۔
حضورؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے اور فرمایا کہ: مجھے
کپڑا اڑھادو، کپڑا اڑھادو، کپڑا اڑھا دیا گیا اور
رفتہ رفتہ دہشت جاتی رہی۔ حضرت خدیجہؓ سے تمام
واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ مجھے تو اپنی جان کا خوف
دامنگیر ہے۔ خدیجہؓ بولیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا، آپ کو تو خوش
رہنا چاہیے۔ بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے
گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، راست گفتار ہیں، دوسروں
کا بار اپنے سر پر لیتے ہیں، ناداروں کے کام بھی کرتے ہیں

هل نوائب الحق فانطلقت به خديجة
حتى أتت به ورقة بن نوفل بن اسد
بن عبد العزى بن قصي وهو ابن
عم خديجة اخي ابيها وكان امرأ تنصر
في الجاهلية وكان يكتب الكتاب العبراني
فكتب من الانجيل بالعربية ماشاء
الله ان يكتب وكان شيخا كبيرا
قد عمي فقالت له خديجة يا ابن عم
اسمع من ابن اخيك فقال له ورقة
يا ابن اخي ماذا ترى؟ فاخبره صلى
الله عليه وسلم خبر ما رأى فقال
له ورقة هذا الناموس الذي نزل
الله على موسى يا ليتني
فيها جذعا ليتني اكون
حيا اذ يخرجك قومك فقال
صلى الله عليه وسلم او مخرجي هم؟
قال نعم لم يأت رجل قط بمثل
ما جئت به الا عودي وان يدركني
يومك انصرك نصرا مؤزرا ثم لم
ينشب ورقة ان توفي وفتر الوحي۔
(شیخین)

مہمان نوازی فرماتے ہیں اور پیش آنے والے حوادث میں
حق کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کے بعد خدیجہؓ آپ کو ساتھ
لے کر اپنے عمزاد بھائی ورقہ بن نوفل (بن اسد بن عبد العزی
بن قصی) کے پاس گئیں۔ یہ ورقہ قبل از اسلام نصرانی ہو
گئے تھے اور عبرانی تحریریں لکھا کرتے تھے چنانچہ انجیل کا
کچھ حصہ بھی انہوں نے عربی زبان میں لکھا تھا اس وقت
یہ خاصے بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ (حضرت) خدیجہؓ
نے ان سے کہا اے ابن عم ذرا اپنے برادرزادے کی
زبان سے کچھ حال سنئے۔ ورقہ نے کہا: برادرزادے
کیا معاملہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب واقعہ
بیان فرمائے تو ورقہ نے کہا کہ: یہ وہی ناموس (پیغام
وحی) ہے جو (حضرت) موسیٰؑ پر نازل ہوا تھا۔ اے کاش
میں اس وقت جوان ہوتا اور اے کاش! میں اس وقت
زندہ ہوتا جب تمہاری قوم تمہیں شہر بدر کر رہی ہوگی
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ: کیا یہ لوگ مجھے
شہر سے نکال باہر کریں گے؟ ورقہ نے جواب دیا کہ: ہاں ہاں
تمہاری جیسی چیز جو بھی لایا ہے اس کے ساتھ دشمنی ہی
کی گئی ہے۔ اگر میرے سامنے یہ وقت آیا تو میں تمہاری
زبردست مدد کروں گا۔ اس کے بعد ورقہ زیادہ دن
زندہ نہ رہ سکے اور ان کی وفات ہو گئی۔ اور وحی کا
سلسلہ (کچھ عرصے کے لئے) منقطع ہو گیا:

اس پوری روایتِ وحی کو پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ حضورؐ کو
جبریلؑ کے آنے، بار بار معانقہ کرنے اور کلامِ وحی القا کرنے کے باوجود اپنے مقامِ نبوت

اور منصب رسالت کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ اس منصب عالی کا علم یا یقین حضورؐ کو اس وقت ہوا جب انجیل کی ورق گردانی کرنے والے ورقہ نے حضورؐ کو بتایا ــــ بعض عیسائی بُحیرہ راہب کی داستان لکھ کر یہ دعوے کیا کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے تمام کارناموں کا سرچشمہ بُحیرا راہب کی چند منٹ کی تعلیم تھی۔ تقریباً وہی انداز وہ اس روایت کی بنیاد پر اختیار کر سکتے ہیں کہ نعوذ باللہ حضورؐ کو تو کوئی خبر بھی نہ تھی کہ میں کیا ہوں۔ یہ تو ایک نصرانی (ورقہ) کا کمال یا احسان تھا کہ اس کی رہنمائی سے حضورؐ کو نبوت کی اطلاع ہو گئی اور آگے معاملہ چل پڑا۔

ہم نے جہاں تک غور کیا ہے بات یوں ہے کہ یہ صحیح بخاری کی روایت تو درست ہے لیکن اس خاص مقام پر سلسلۂ اسناد کے کسی راوی نے اجمال سے کام لیا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ ہم آپ بھی جب کوئی واقعہ دیکھ کر یا سن کر دہراتے ہیں تو موقع محل کے مطابق کہیں اجمال سے کام لیتے اور کہیں تفصیل سے۔ لیکن بعض اوقات اجمال یا تفصیل کی ذرا سی لغزش آگے چل کر بڑے عجیب نتائج پیدا کرتی ہے جو اس وقت ذہن میں نہیں آتے۔

اس روایت کی یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ حضورؐ اس پہلی وحی کے بارِ عظیم کو محسوس کر کے کانپ گئے ہوں اور لرزاں و ترساں گھر واپس آئے ہوں (یرجف فوادہ) یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس ذمے داری کے بوجھ کو بجا طور پر حضورؐ جان کی بازی لگانا تصور فرماتے ہوں (لقد خشیت علی نفسی) لیکن یہ ہمارے تصور میں بھی نہیں آتا کہ اپنی صحیح پوزیشن کو حضورؐ نہ سمجھیں اور سمجھیں تو ایک نصرانی کے بتانے سے سمجھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک صدرِ مملکت کی طرف سے کسی کو گورنری کا پروانہ بھیجا جائے اور ساتھ ہی کچھ مملکت کی پالیسی بھی تحریر کر دی جائے مگر وہ خود نہ سمجھ سکے کہ مجھے گورنر بنایا گیا ہے اور اگر سمجھے تو کسی کلرک کے سمجھانے سے سمجھے۔ ہمارے خیال میں تو یہ بھی بعید از فہم نہیں کہ حضورؐ کو ورقہ کے کہنے پر تعجب ہوا ہو کہ "آپؐ کی قوم آپ کو وطن بدر کر دے گی"۔ حضورؐ کو اپنی ہر دلعزیزی کے یقینی احساس کے بعد اپنی ہی قوم

کے ہاتھوں وطن بدر ہونے پر تعجب ہو سکتا تھا اور ورقہ جو بائبل کے مطالعہ سے تمام انبیاء کی تاریخ اور انجام سے واقف تھے اس نتیجے پر پہنچ سکتے تھے۔ یہ سب باتیں دیکھ شکوک کے بعد ہی سہی، سمجھ میں آسکتی ہیں لیکن جسے منصب رسالت و نبوت سونپا گیا ہے اس کا خود اپنی حیثیت و مقام سے ایک منٹ کے لئے بھی بے خبر رہنا اور دوسروں کے سمجھانے کے بعد اس سے باخبر ہونا بہت ہی بعید از فہم معلوم ہوتا ہے۔

محمد بن اسحاق، عبید[1] بن عمرو کی زبانی جو روایت بیان کرتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

پہلی وحی (اقراء الخ) کے بعد جب حضورؐ گھر کی طرف چلے تو راستے میں آسمانی آواز سنی کہ: یا محمد انت رسول اللہ و انا جبریل۔ یعنی آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں ہوں جبریل۔ ہر طرف دیکھ کر حضورؐ نے جب اوپر دیکھا تو جبریل نظر آئے اور انہوں نے پھر اپنے یہی الفاظ دہرائے کہ: یا محمد انت رسول اللہ و انا جبریل۔ حضورؐ نے گھر آکر یہ پورا واقعہ جناب خدیجہؓ سے بیان فرمایا جناب خدیجہؓ نے کہا: انی لارجوان تکون نبی ھذہ الامۃ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس امت کے نبی ہوں گے۔ اس کے بعد جناب خدیجہؓ نے ورقہ کے پاس جا کر یہ سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس کے بعد حضورؐ حسب معمول طواف کے لئے تشریف لے گئے اور وہیں ورقہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے حضورؐ سے تمام واقعات بیان کرنے کی خواہش کی۔ حضورؐ نے جب پورا واقعہ بیان فرمایا تو ورقہ نے بھی نبوت کی تصدیق کی۔

حافظ ابن عساکر ورقہ کے حالات میں سلیمان بن طرخان تیمی کی روایت بیان کرتے ہوئے آغاز وحی کے حالات یوں لکھتے ہیں:

... اذ نزل جبریل فدنامنہ فخافہ	(غار حرا میں) جبریل نازل ہوئے اور حضورؐ سے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	قریب ہو گئے تو حضورؐ کو سخت خوف لاحق ہوا
مخافۃ شدیدۃ فوضع جبریل	اس وقت جبریل نے ایک ہاتھ حضورؐ کے سینے

---

[1] یہاں یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ عبید نے یہ بیان ایک جماعت کے سامنے دیا جس میں عبداللہ بن زبیر بھی موجود تھے۔

بیدہ علی صدرہ ومن خلفہ بین کتفیہ فقال: اللھم احطط وزرہ واشرح صدرہ وطھر قلبہ یا محمد! ابشر فانک نبی ھذہ الامة	پہ اور دوسرا پشت پر رکھا اور دعا کی کہ: اے اللہ ان کے بوجھ کو اتار دے اور ان کے سینے کو کھول دے اور ان کے دل کو پاک و صاف کر دے۔ (پھر کہا) اے محمدؐ آپ کو مژدہ ہو کہ آپ اس امت کے نبی ہیں۔

پھر سورۂ علق کی آیات پڑھانے کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد پھر جبریل نے کہا:

لا تخف یا محمد! انک رسول اللہ... حضورؐ گھبرائیں نہیں۔ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

اس کے بعد پھر کچھ اور گفتگو ہوئی اور جبریل نے تیسری بار کہا:

لا تخف یا محمد! جبریل رسول اللہ جبریل رسول اللہ الی انبیائہ ورسلہ فایقن بکرامة اللہ فانک رسول اللہ	حضورؐ گھبرائیں نہیں، میں ہوں جبریل، فرستادۂ خدا، میں ہوں جبریل جو اللہ کے نبیوں اور رسولوں کے پاس بھیجا جاتا ہوں، اللہ کی اس نوازش پر یقین رکھئے کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

اس کے بعد جب حضورؐ جناب خدیجہؓ کے پاس واپس تشریف لائے تو یوں فرمایا:

یا خدیجة! ارایت الذی کنت اری فی المنام والصوت الذی کنت اسمع فی الیقظة واحال منہ فانہ جبریل قد استعلن واقرأنی کلاماً فزعت منہ ثم عاد الی فاخبرنی انی نبی ھذہ الامة	خدیجہ! تم سمجھیں کہ میں جو رؤیائے صادقہ دیکھا کرتا اور جو غیبی آوازیں بیداری کی حالت میں سن کر خوف کیا کرتا تھا اسکی حقیقت کیا ہے؟ وہ دراصل جبریل ہے جو بے حجاب ہو کر میرے سامنے آگیا مجھ سے باتیں کیں اور مجھے ایسا کلام پڑھا دیا جس سے میں دہشت زدہ ہو گیا پھر میری طرف دوبارہ متوجہ ہو کر مجھے بتایا کہ میں اس امت کا نبی ہوں۔

اس کے بعد جناب خدیجہؓ اسی وقت ایمان لے آئیں۔ اس کے بعد ورقہ کے پاس گئیں اور انہوں نے بھی تصدیقِ نبوت کی۔

ہم نے یہ تمام اقتباسات حافظ ابن کثیر کی "البدایہ والنہایہ" جلد ۳ صفحہ ۱۲ تا صفحہ ۱۷ سے لئے ہیں۔ ہم نے صرف ضروری حصے لئے ہیں۔ ان اوراق میں کہیں کہیں "رنگ داستان" بھی موجود ہے لیکن بعض وہ نئی باتیں بھی ہیں جو صحیح بخاری والی روایت میں نہیں اور ہمارے نزدیک انہیں قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غارِ حرا کا یہ واقعہ بحالتِ خواب پیش آیا۔ عبداللہ بن زبیر کی روایت میں حضورؐ کی زبان سے یہ الفاظ منقول ہیں:

فجاءنی وانا نائم بنمط من دیباج فیہ کتاب فقال اقرا ..... الخ	میں سویا ہوا تھا کہ جبریل میرے پاس حریری رومال میں لپٹی ہوئی ایک کتاب (یا ایک تحریر) لائے اور مجھ سے کہا کہ پڑھئے ..... الخ

پھر آگے چل کر جبریل کے واپس جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضورؐ نے یوں فرمایا:

فقراتھا ثم انتھی و انصرف عنی و ھببت من نومی فکانما کتب فی قلبی کتابا۔	میں نے سورۃ اقرأ کی پانچوں آیات پڑھیں۔ پھر وہ رک گئے اور واپس ہو گئے۔ اور میں اپنے خواب سے چونک کر بیدار ہو گیا تو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے یہ کتاب (یا تحریر) میرے سینے میں لکھ دی۔

لفظ نوم (نیند) دراصل ایک ایسی کیفیت سے تعبیر ہے جو حسی اور فزیکل قسم کی بیداری سے ماوراء ہے۔ یہ ایک VISION ہے جس کے لئے فزیکل نیند ہی ضروری نہیں۔ یہ کیفیت بیداری میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس عالمِ وحی کی کیفیات ہمارے ادراک و قیاس سے بالاتر ہیں۔ اسے ایک پیغمبر ہی جان سکتا ہے۔ البتہ اس کے اظہار کے لئے نیند وغیرہ کے لفظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب خدیجہؓ ہی سب سے پہلے ایمان لائی تھیں اور ورقہ بن نوفل نے بعد میں تصدیق نبوت کی ہے۔

ایک اور چیز بھی ان روایات میں ایسی ہے جو صحیح بخاری کی اس روایت میں موجود نہیں ــــ یعنی شے مقروء (پڑھی جانے والی چیز) کا کوئی ذکر صحیح بخاری میں نہیں اور ہماری نقل کردہ روایات میں اس کا ذکر موجود ہے۔ یعنی مثلاً دیباج فیہ کتاب۔ (ریشمی رومال میں لپٹی ہوئی ایک کتاب یا تحریر)۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ صحیح ہو کیونکہ مقروء کے بغیر اقرأ کی فرمائش کچھ بے محل سی معلوم ہوتی ہے۔

غرض آغاز وحی کے سلسلے میں اس طرح کی کئی نئی باتیں ان روایات سے معلوم ہوتی ہیں جو صحیح بخاری کی زیر بحث روایت میں موجود نہیں ہیں اور جہاں ہم ان روایات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضور کو اپنے مقام نبوت اور منصب رسالت کا علم اسی آن ہو چکا تھا نہ کہ ورقہ کے بتانے کے بعد وہاں اگر ہم ان روایات کی دوسری (مندرجہ بالا) نئی باتوں کو بھی تسلیم کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اگرچہ وہ باتیں صحیح بخاری کی زیر بحث روایت میں موجود نہیں۔

ہم دوسری روایات کو قبول کر کے اس غبار کو دور کر سکیں تو اسے قبول کرنے میں محقق اس لئے کیوں تامل ہو کہ یہ صحیح بخاری کی روایات میں موجود نہیں؟ ہمیں پھر کہنے دیجئے کہ حضور کو اپنی رسالت کا مکمل صحیح علم اسی آن حاصل ہو چکا تھا جب پہلی وحی نازل ہوئی تھی اور یہ درست نہیں ــــ جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے گمان ہو سکتا ہے ــــ کہ ورقہ بن نوفل کی تصدیق نبوت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صحیح پوزیشن کا علم نہ تھا۔ کاش ہمارے سیرت نگار صرف روایت بخاری پر اعتماد نہ کرتے۔ اور اس حقیقت کی بھی پردہ کشائی کر دیتے تو اچھا ہوتا۔

جمع قرآن کے متعلق زہری کی روایات

از: مفتی عبد اللطیف رحمانی

(حضرت مفتی صاحب کی دو کتابیں اردو میں ہیں ایک امام اعظم ابو حنیفہ کے حالات میں تذکرۂ اعظم کے نام سے ۔ دوسری تاریخ القرآن ۔ اور دو کتابیں عربی میں ہیں ایک ترمذی کی شرح الشرح اللطیف کے نام سے، دوسری تراجم بخاری کی شرح لطف الباری کے نام سے ۔

علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد اور داماد مولانا سید احمد رضا بجنوری اپنی کتاب "انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری" قسط سوم ص ۲۰۳ پر لکھتے ہیں۔

"مخدوم و محترم حضرت مولانا مفتی محمد فضل اللہ صاحب [illegible] ناد ب المفرد للبخاری) نے نہایت عظیم الشان اعانت یہ فرمائی کہ حضرت المحدث العلام مولانا مفتی عبد اللطیف رحمانی صاحب مصنف تذکرۂ اعظم وغیرہ کی شرح ترمذی شریف قلمی استفادہ کے لئے عنایت فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب نے ترمذی شریف پر نہایت جامع و مختصر تعلیقات' محدثانہ و محققانہ طرز سے تحریر فرمادی ہیں جو درس ترمذی شریف کے لئے نہایت مفید ہیں۔ دار العلوم دیو بند جیسے علمی اداروں کا فرض ہے کہ ایسی گراں قدر تصانیف کی اشاعت کریں۔"

مفتی صاحب اور زہری میں چاہتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب کی تاریخ القرآن کا وہ حصہ یہاں درج کر دوں جس میں انھوں نے خلافت صدیقی و عثمانی میں جمع قرآن کے متعلق زہری کی اس روایت پر تنقید کی ہے جسے بخاری و مسلم نے اپنے ہاں درج کیا ہے ۔ اس مجمل بحث کو پڑھ کر بات سمجھنے میں سہولت بھی ہوگی، علامہ تمنا کی تفصیلی محنت کا اندازہ بھی ہوگا ۔ اور علامہ تمنا کو منکر حدیث کہنے کی قلعی بھی کھل جائیگی کیونکہ اگر اس روایت پر تنقید کرنیکی وجہ سے وہ منکر حدیث کہلانے کے مستحق ہیں تو پھر تاریخ

القرآن کے مولف حضرت مفتی عبداللطیف رحمانی اس کتاب کی اولین اشاعت کرنے والے مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء اس کی تعریف کرنے والے امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور دوبارہ اشاعت کرنے والے حضرت ابوالحسن زید شاہ وغیرہ سب ہی منکر حدیث کہلائیں گے۔ اور اگر عظمت قرآن کو داغدار کرنے والی جعلی روایتوں کا انکار کرنے والوں کو ہی منکر حدیث موضوع کہا جاتا ہے تو پھر یہ قابل شرم نہیں بلکہ قابل فخر بات ہے اور ہر عقلمند مسلمان کو منکر حدیث موضوع ہونا چاہئے۔

اس تمہید کے بعد اب حضرت مفتی صاحب کی زہری کی اس روایت پر بحث ملاحظہ ہو۔)

"اب میں اس حدیث زہری پر دو طرح سے غور کرتا ہوں۔ اول اس حدیث کی سند میں دوسرے اس کے مضمون اور معانی پر"

زہری کی حدیث کی سند

اس میں شک نہیں کہ محدثین نے باالاتفاق اس حدیث کو صحیح مانا ہے اور اسی وجہ سے بخاری ترمذی وغیرہ حدیث کی کتابوں میں یہ حدیث ہے۔ اس روایت کا راوی تنہا زہری ہے۔ زہری کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا البتہ زہری سے چند نے اسے روایت کیا ہے اس لئے یہ روایت محدثین کے یہاں خبر آحاد سے ہے یعنی وہ روایت جس کا راوی کسی مرتبہ میں محض ایک ہی ہو۔ زہری اگرچہ محدثین کے یہاں نہایت معتبر قابل وثوق اور راستباز اور امین ہے اور تمام کتب صحاح میں اس کی روایت ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ مُدرج تھا[1] یعنی اپنے کلام کو حدیث میں

زہری کے متعلق امام لیث کا فیصلہ

[1] امام ابوالحارث لیث بن سعد کی وفات ۱۷۵ھ میں ہوئی ہے یہ مصر کے امام اور امام دارالہجرہ مالک بن انس کے ہم سبق اور رفیق و صدیق تھے۔ انھوں نے امام مالک کو ایک مکتوب ارسال کیا ہے۔ مکتوب کیا ہے ایک بیش قیمت علمی وثیقہ ہے علماء اعلام نے اپنی تالیفات میں اس کو محفوظ کیا ہے۔ علامہ ابن قیم نے کتاب اِعْلَامُ الْمُوَقِّعِیْنَ عَنْ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میں (حصہ سوم کے صفحہ ۷۲ سے ۷۷ اور علامہ محمد بک الخضری نے تاریخ التشریع الاسلامی میں (صفحہ ۱۸۹ سے ۱۹۲ تک) نقل کیا ہے۔ اس مکتوب میں امام لیث نے اپنے استاد امام زہری کے متعلق جو انکشاف کیا ہے اسی کے

اس طرح ملاکر بیان کر دیتا تھا کہ سننے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی حدیث ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اصول حدیث کی کتابوں میں زہری کے متعلق اس کو لکھتے ہیں المعتصر من المختصر ص۱۵۲ میں ہے وَيَحْتَمِلُ أَنْ يَكُوْنَ مِنْ كَلَامِ الزُّهْرِيِّ فَإِنَّهُ كَانَ يَخْلِطُ كَلَامَهُ بِالْحَدِيْثِ وَلِذٰلِكَ قَالَ لَهُ مُوْسَى بْنُ عُقْبَةَ افْصِلْ كَلَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ كَلَامِكَ اور شاید یہ زہری کا اپنا کلام ہو نہ حدیث کیونکہ زہری کی یہ عادت تھی کہ وہ حدیث میں اپنا کلام بھی ملا دیتے تھے۔ اسی واسطے موسیٰ نے زہری سے کہا کہ حدیث سے اپنے کلام کو علیحدہ رکھو ملایا نہ کرو تو ایسی حالت میں یہ فیصلہ مشکل ہے کہ اصل واقعہ کس قدر ہے اور امام زہری نے اپنی طرف سے بھی کوئی تشریح کی ہے یا نہیں اس کے سوا بھی چونکہ یہ ایک شخص تنہا زہری کا بیان ہے اور ایک ایسے امر کے خلاف ہے جو تواتر سے ثابت ہے۔ اور تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے تو اس لئے یہ اُن کثیر شہادتوں کے مقابلہ میں نہیں مانا جا سکتا۔ جیسا مسلمانوں کا عام اصول ہے کہ خبر احاد امر یقینی کے مقابلہ میں ہرگز لائق وثوق نہیں ہے اور ممکن ہے کہ یہاں کسی راوی سے بیان میں غلطی ہوئی ہو۔ بہرحال تنہا زہری کی روایت سے ہم ان روایات کو نہیں

الفاظ یہ نقل کرتا ہوں؟ لکھا ہے:-

وَكَانَ يَكُوْنُ مِنِ ابْنِ شِهَابٍ اخْتِلَافٌ كَثِيْرٌ إِذَا لَقِيْنَاهُ وَإِذَا كَاتَبَهُ بَعْضُنَا، فَرُبَّمَا كَتَبَ إِلَيْهِ فِي الشَّيْءِ الْوَاحِدِ عَلَى فَضْلِ رَأْيِهِ وَعِلْمِهِ بِثَلَاثَةِ أَنْوَاعٍ يَنْقُضُ بَعْضُهَا بَعْضًا وَلَا يَشْعُرُ بِالَّذِي مَضَى مِنْ رَأْيِهِ فِي ذٰلِكَ، فَهٰذَا الَّذِي يَدْعُوْنِي إِلَى تَرْكِ مَا أَنْكَرْتَ تَرْكِي إِيَّاهُ الخ

ابن شہاب زہری کا مسائل میں بہت اختلاف ہوا کرتا تھا۔ جب ہم ان سے زبانی پوچھتے یا ہم میں سے کوئی لکھ کر ان سے دریافت کرتا تو۔ باوجود فضیلت رائے اور علم کے ایک ہی شئے کے متعلق ان کا جواب تین قسم کا ہوا کرتا تھا اور ایک دوسرے کا رد۔ ان کو اس کا احساس نہیں ہوا کرتا تھا کہ پہلے کیا لکھ چکے ہیں اور ان کی کیا رائے تھی بس ایسے ہی منکر اقوال کی وجہ سے ان کو چھوڑا تھا جس کو تم نے پسند نہ کیا تھا۔

مکتوب از اول تا آخر شایانِ مطالعہ ہے۔ ابوالحسن زید عفی اللہ عنہ

چھوڑ سکتے جن سے ثابت ہے کہ بہت سے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا۔

زہری کے بیان میں اختلاف

زہری کی اس روایت میں اضطراب یعنی اختلاف ہے۔ میں یہاں زہری کی انہیں روایتوں کا اختلاف رکھتا ہوں جو بخاری میں زہری سے ہے۔ اس حدیث کی زہری سے جس قدر روائیتیں ہیں چونکہ ان میں صحیح اور معتبر بخاری کی سندیں ہیں اس لئے ان سندوں کے اختلاف سے ناظرین خود فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ حدیث کہاں تک وثوق کے قابل ہے۔ بخاری کی کتاب الاحکام میں ابن شہاب زہری سے ابراہیم بن سعد نے روایت کی ہے۔

بخاری میں سورۃ براۃ کی تفسیر میں اسی روایت کے زہری سے شعیب راوی ہے لیکن زہری کے ان دونوں شاگردوں کی روایت میں یہ اختلاف ہے۔

شعیب کی زہری سے روایت	ابراہیم کی زہری سے روایت
(۱) قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِالنَّاسِ معرکہ یمامہ میں بہت لوگ کام آئے۔	قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِقُرَّاءِ الْقُرْآنِ معرکہ یمامہ میں بہت قاری قرآن شہید ہوئے۔
(۲) مِنَ الرِّقَاعِ وَالْأَكْتَافِ وَالْعُسُبِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ	مِنَ الْعُسُبِ وَالرِّقَاعِ وَاللِّخَافِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ۔

ابراہیم کی روایت میں بجائے اکتاف کے لخاف ہے۔

شعیب کی زہری سے روایت	ابراہیم کی زہری سے روایت
(۳) حَتّٰى وَجَدْتُ مِنْ سُورَةِ التَّوْبَةِ آيَتَيْنِ	وَجَدْتُ آخِرَ سُورَةِ التَّوْبَةِ۔
(۴) مَعَ خُزَيْمَةَ الْأَنْصَارِيِّ	مَعَ خُزَيْمَةَ أَوْ أَبِي خُزَيْمَةَ
(۵) لَمْ أَجِدْهُمَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ	اس کی روایت میں یہ لفظ نہیں
(۶) فَأَلْحَقْتُهَا فِي سُورَتِهَا	اس کی روایت میں یہ نہیں۔

زہری کی روایت کا واقعات اور دوسری صحیح روایتوں کے خلاف ہونا

(۱) تاریخ اور صحیح

روایات بلکہ خود بخاری کی روایت سے ثابت ہے کہ زید نے آنحضرتؐ کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا معارف ابن قتیبہ میں ہے۔ زید نے تمام قرآن لکھا تھا اور اس قرآن کو اخیر میں آنحضرتؐ کو تمام و کمال سُنایا تھا۔ اس قرآن کی ترتیب وہی تھی جو آج بھی قرآن کی ہے۔ ترمذی میں زید سے ہے کہ ہم نے آنحضرتؐ کے روبرو ہی قرآن کو جمع کیا تھا اور نیز تمام محدثین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ زید قرآن کے حافظ تھے اور پورا قرآن آپ کو یاد تھا۔ خلیفۂ اول نے جب زید کو جمع قرآن کا حکم دیا اور یہ فرمایا کہ اسے تلاش کر کے لکھو تو اس وقت زید کا جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ قرآن جمع شدہ ہمارے پاس موجود ہے اور مجھے یاد ہے اُس کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ باوجود زید کے حافظ اور جامع قرآن ہونے کے جو متعدد روایات سے ثابت ہے اور تمام مورخین اس پر متفق ہیں۔ تمام کتب رجال اس کی شاہد ہیں جس کے خلاف میں ضعیف سی بھی روایت اور قول نہیں۔ پھر زید کا قرآن کو تلاش سے لکھنا جیسا اس روایت سے ثابت ہوتا ہے ایک ایسا امر ہے جس کے باور کرنے کے لئے کوئی ضعیف سی ایسی وجہ بھی نہیں کہی جا سکتی جس کو کوئی فہمیدہ انسان صحیح مان سکے۔ چنانچہ علامہ ابن عبدالبر نے بھی استیعاب میں زہری کی روایت کی اس مخالفت کو بیان کیا ہے۔ میں یہاں اس مخالفت کو انھیں کے الفاظ میں لکھتا ہوں۔

وَاَمَّا حَدِيْثُ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ اَحَدُ الَّذِيْنَ جَمَعُوا الْقُرْاٰنَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَحِيْحٌ وَ قَدْ عَارَضَهٗ قَوْمٌ بِحَدِيْثِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ بْنِ السَّبَّاقِ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ اَبَا بَكْرٍؓ اَمَرَهٗ فِىْ حِيْنِ مَقْتَلِ الْقُرَّاءِ بِالْيَمَامَةِ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ قَالَ فَجَمَعْتُ الْقُرْاٰنَ مِنَ الرِّقَاعِ وَالْعُسُبِ وَصُدُوْرِ الرِّجَالِ حَتّٰى وَجَدْتُ اٰخِرَ اٰيَةٍ مِنْ تَوْبَةٍ مَعَ رَجُلٍ يُقَالُ لَهٗ خُزَيْمَةُ قَالُوْا فَلَوْ كَانَ زَيْدٌ جَمَعَ الْقُرْاٰنَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَمْلَاهُ مِنْ صَدْرِهٖ وَمَا احْتَاجَ اِلٰى مَا ذَكَرَهٗ (استیعاب جلد اول ص ۱۹۴)

مجھے صرف یہاں اس قدر کہنا ہے کہ زید کا حافظ ہونا اور تمام قرآن کا آنحضرتؐ کی حیات میں لکھنا صحیح روایتوں سے معلوم ہے۔ چنانچہ ابن عبدالبر کو بھی اس کا اقرار ہے تو زید اگر خلیفۂ اول کے عہد میں جمع قرآن کی خدمت پر مامور ہوتے تو اپنی یاد اور اپنے قرآن سے لکھتے نہ کہ دوسری اشیاء سے۔ اور نہ زید وہ عذر کرتے جو اس حدیث میں زید کی طرف نسبت کیا گیا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ روایت یا تو بے اصل ہے، یا درمیان کے راویوں کے بیان کی غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ زید کے پاس چونکہ ایسا لکھا ہوا قرآن تھا جس کو آخر میں انھوں نے آں حضرتؐ کو سنایا تھا۔ اس لئے خلیفۂ اول نے اس کی کوئی نقل اپنے لئے کرائی ہو اور زید نے اُسے حضرت ابوبکرؓ کے لئے نقل کیا ہو جیسا کنز العمال کی ایک حدیث سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے لیکن رواۃ نے اپنی غلطی سے اس واقعہ کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ اور راوی حدیث چونکہ انسان تھے اور انسان بھی وہ جو نبی نہ تھے۔ اس لئے اُن سے وہم و خطا کا ہونا بعید نہیں۔ جیسا علامہ ابن حزم کتاب الفصل میں لکھتے ہیں۔

وَ اَمَّا قَوْلُهُمْ اَنَّهُ قَدْ رُوِیَ بِاَسَانِیْدِ صِحَاحٍ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ مِنَ التَّابِعِیْنَ الَّذِیْ نُعَظِّمُهُمْ وَنَاْخُذُ دِیْنَنَا عَنْهُمْ اَنَّهُمْ قَرَأُوْا فِی الْقُرْاٰنِ قِرَاآتٍ لَا نَسْتَحِلُّ نَحْنُ الْقِرَاءَةَ بِهَا فَهٰذَا حَقٌّ وَ نَحْنُ وَاِنْ بَلَغْنَا الْغَایَةَ فِیْ تَعْظِیْمِ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَیْهِمْ وَتَقَرَّبْنَا اِلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بِمَحَبَّتِهِمْ فَلَسْنَا نُبْعِدُ عَنْهُمُ الْوَهْمَ وَالْخَطَاءَ وَلَا نُقَلِّدُهُمْ فِیْ شَیْءٍ مِمَّا قَالُوْهُ۔ (ج ۲ ص ۷۶)

ترجمہ:۔ اور لوگوں کا یہ خیال کہ نہایت صحیح سندوں سے صحابہ اور تابعین سے ایسی قرأۃ قرآن میں مروی ہیں جن کا پڑھنا درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خیال صحیح ہے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی تمام مسلمان بے انتہا عزت و تعظیم کرتے ہیں اور ان کی محبت کو باعث نجات سمجھتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم انھیں وہم؛

نسیان، خطا سے معصوم نہیں جانتے۔ اُن سے اس قسم کے امور ممکن ہیں۔

(۲) بخاری اور نیز دیگر روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ کی حیات مبارک میں بہت سے صحابہ نے قرآن جمع کیا تھا۔ چنانچہ ان میں چار کے نام تو بخاری ہی نے انس کی روایت سے نقل کئے ہیں۔ اور ایک طویل فہرست پہلے میں بھی ان کے ناموں کی دے چکا ہوں۔ علامہ ابن سعد نے بھی طبقات قسم ثانی ج ۲ ص۱۱۲ میں بعض ایسے صحابہ کے نام شمار کئے جنھوں نے آنحضرتؐ کی زندگی میں پورا قرآن جمع کیا تھا چنانچہ میں یہاں ان کی عبارت لکھتا ہوں۔

عَنْ عَامِرِ الشَّعْبِي قَالَ جَمَعَ الْقُرْآنَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةٌ رَهْطٍ مِنَ الْاَنْصَارِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَ اَبُو الدَّرْدَاءِ وَ اَبُوْ زَيْدٍ وَ سَعْدُ بْنُ عُبَيْدٍ قَالَ قَدْ كَانَ بَقِيَ عَلَى الْمُجَمِّعِ بْنِ جَارِيَةَ سُوْرَةٌ اَوْ سُوْرَتَانِ حِيْنَ قُبِضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ترجمہ:۔ حافظ ابن سعد طبقات میں علامہ شعبی اور محمد بن سیرین اور محمد بن کعب کی روایت سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں انصار میں سے چھ افراد معاذ بن جبل، ابیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت، ابوالدرداءؓ، ابوزیدؓ، سعدؓ بن عبید نے پورا قرآن جمع کیا تھا۔ البتہ مجمع بن جاریہؓ کو دو سورت یا ایک سورۃ جمع کرنے کو باقی تھی جو آنحضرتؐ کا انتقال ہو گیا۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ جَمَعَ الْقُرْآنَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ وَتَمِيْمُ الدَّارِيُّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبِ الْقُرَظِيِّ قَالَ جَمَعَ الْقُرْآنَ فِيْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسَةٌ مِنَ الْاَنْصَارِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ اَبُوْ اَيُّوْبَ ابُو الدَّرْدَاءِ۔

اب جبکہ یہ امر ثابت ہے کہ آنحضرت کے عہد ہی میں قرآن جمع ہو گیا تھا اور بہت سے صحابہؓ نے اسے جمع کیا تھا۔ تو پھر حضرت عمرؓ کا حضرت ابوبکرؓ سے یہ کہنا اِنّی اَرٰی

اَنْ تَاْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ یعنی میری رائے ہے کہ آپ قرآن کے جمع کرنے کو فرمایئے اور اس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ کا یوں فرمانا کَیْفَ تَفْعَلُ شَیْئًا لَّمْ یَفْعَلْہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جو کام آنحضرتؐ نے نہیں کیا وہ تو کیونکر کرے گا، کیونکر صحیح ہوگا۔ اور یہ بات غلط ہے یا نہیں۔

(۳) سالم مولی ابوحذیفہ کے سوا مشہور قراء سے کوئی قاری اس جنگ میں شہید نہیں ہوا۔ اور عام ان مسلمانوں کی تعداد جو اس جنگ میں شہید ہوئے۔ چودہ سو[۱۴۰۰] تک بیان کی جاتی ہے جن میں چھ سو مہاجرین اور انصار ہیں۔ یہ تعداد اس وقت کے مسلمانوں کے لحاظ سے کچھ بھی زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حجۃ الوداع میں جبکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان تھے تو اگر یہی مان لیا جائے کہ اس وقت تمام مسلمان اسی قدر تھے۔ گویا کہ یہ امر کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ مگر اس پر بھی چودہ سو مسلمان اس تعداد کے مقابلہ میں کسی شمار میں نہیں آسکتے اور اس واقعہ میں جو ستر قرار کی شہادت بیان کی جاتی ہے ان کے متعلق محدثین اور مورخین کا یہ بھی بیان ہے کہ ان میں سے ہر ایک پورے قرآن کا حافظ نہ تھا بلکہ قرآن کے کچھ اجزاء ان کو یاد تھے۔

قاری قرآن کے اگر یہی معنی ہوں تو پھر مہاجر اور انصار سے جو اس میں شہید ہوئے وہ سب قاری تھے۔ کیونکہ مسلمانوں میں خصوصاً اس عہد میں کوئی بدقسمت مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جسے قرآن کچھ بھی یاد نہ ہو تو اب زید بن ثابت کا اس روایت میں یہ کہنا کہ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ یَوْمَ الْیَمَامَۃِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ ہر اعتبار سے غلط ہوگا کیونکہ قاری قرآن کے اگر یہ معنی ہوں کہ جسے پورا قرآن یاد تھا تو وہ بھی اس لڑائی میں سالم مولی ابی حذیفہ کے سوا کوئی شہید نہیں ہوا۔ اور اگر قاری قرآن کے یہ معنی ہوں جسے قرآن کا کچھ حصہ یاد ہو خواہ وہ ایک دو سورت ہی ہوں تو اس معنی کی رو سے تمام مسلمان قاری قرآن تھے۔ اور جزیرہ عرب میں جس قدر مسلمان تھے وہ تمام ہی قاری تھے۔ پھر ان کی تعداد کے اعتبار سے بھی چودہ سو مسلمان کچھ زیادہ نہ تھے۔ اور اگر کہا جائے

کہ مشہور قراء سے تو سالم ہی شہید ہوئے لیکن کے سوا اور بھی پورے قرآن کے حافظ اس لڑائی میں ایسے شہید ہوئے جو مشہور نہ تھے۔ تو اس صورت میں اصل واقعہ روشنی میں آجائیگا یعنی صحابہ میں بہت سے صحابی قرآن کے حافظ تھے۔ مگر اس پر بھی اس تعداد کا زیادہ ہونا مشکل ہے۔ بہر حال یہ بیان واقعات کے بالکل خلاف ہے۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اُمی تھے اس لئے آپ کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ قرآن لکھا کر اپنے پاس رکھتے۔ البتہ صحابہؓ کو پورا قرآن حرف بحرف لکھایا اور اس لکھانے کا نہایت اہتمام کیا اور اکثر صحابہؓ نے آپ کے عہد میں آپ سے پورا قرآن لکھ کر جمع کیا۔ تو اب خلیفہ دوم کا جمع کے لئے مشورہ دینا ایسا امر نہ تھا جس میں خلیفہ اول اور زید کو تامل ہوا اور مباحثہ کی نوبت آئی۔ حضرت عمرؓ سے یہ فرمایا كَيْفَ نَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کیا آنحضرتؐ نے قرآن لکھنے کا حکم نہیں دیا۔ کیا آپ کے عہد میں لکھ کر قرآن نہیں پڑھایا جاتا تھا؟ کیا خلیفہ اول اور زید اس سے ناواقف تھے؟ کیا اس کا صاف اور صحیح جواب صرف یہی نہ تھا کہ بلا شبہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن جمع کرایا۔ اور آپ کے امر سے صحابہ نے لکھا۔ اس کے علاوہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن جمع نہیں کرایا۔ تو کیا حفاظت کے لئے جمع کرانا ایسا امر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے خلاف ہو۔ کیا خود آنحضرتؐ ایسے امور کو نہیں لکھاتے تھے جن کا استحفاظ اور اہتمام مقصود ہوتا تھا۔ ابوشاہ صحابی نے فتح مکہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سُن کر جب آپ کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ اسے لکھا دیجئے تو کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا اُكْتُبُوْا لِاَبِيْ شَاهٍ یعنی ابوشاہ کو لکھ دو۔ قَالَ اَبُوْ دَاوُدَ فَكَتَبُوْا لِيْ يَعْنِيْ خُطْبَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی ابوشاہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ لکھانے کی درخواست کی (ابوداؤد کتاب الدیات)۔ اور کیا حضرت ابوبکرؓ خود اپنے عمال کو ہدایت نہیں لکھا دیتے تھے اور کیا آنحضرتؐ نے قرآن کے لکھنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور کیا حضرت عبداللہ

بن عمرو نے جب حدیثوں کے ضائع ہونے اور اپنے بھول جانے کی شکایت کی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں لکھنے کا حکم نہیں دیا۔ پھر کیا ابو بکرؓ ان تمام واقعات سے ناواقف تھے۔ یَا لَلْعَجَبُ۔

یہ سوال وجواب بجائے خود اس واقعہ کے بے اصل ہونے کے لئے قومی شہادت ہے۔ اور جو امر کہ عام اتفاق سے ثابت ہے۔ اور آفتاب سے زیادہ روشن ہے اس پر غُبار ڈالنا اور چھپانا ناممکن ہے۔

(۵) خلیفۂ اول نے یہ قرآن اگر لکھایا ہوگا تو بیت المال کے روپے سے لکھایا ہوگا۔ کیونکہ خلافت سے چھ مہینے بعد خلیفہ کے مصارف کا مکتفل بیت المال کیا گیا تھا اور بیت المال سے وہ اپنے ضروری مصارف خورد ونوش کے مطابق لیتے تھے۔ جیساکہ خلیفۂ اول کے حالات میں مورخین لکھتے ہیں۔ اور نیز اس واقعہ سے بھی اس کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ آپ کی بی بی نے ایک روز جب شیرینی کی فرمائش کی تو جواب دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ بی بی نے کہا۔ اجازت ہو تو روزمرہ کے صرف سے کچھ بچا کر جمع کر لوں۔ فرمایا بہتر۔ کچھ روز میں چند پیسے جمع کر کے دیئے۔ اور کہا مٹھائی لادو۔ خلیفہ نے پیسے لے کر فرمایا کہ یہ خرچ ضروری سے زیادہ ہیں لہذا بیت المال کے ہیں اور بیت المال میں جمع کر کے اپنے وظیفہ سے اسی قدر کم کر دیا۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ کے پاس اپنا ذاتی سامان کیا تھا اور بیت المال میں انھیں کس قدر احتیاط تھی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس قرآن کے مصارف بیت المال سے ادا کئے گئے ہوں گے۔ اور یہ قرآن چونکہ بیت المال کا حق تھا اِسی لئے یہ ان کی وفات کے بعد خلیفۂ اول کے ورثا کو نہیں دیا گیا بلکہ بیت المال میں رہا۔ اور خلیفۂ دوم کے پاس پہنچا۔ اگر خلیفۂ اول کا اپنا ہوتا تو ضرور ان کے ورثا کو ملتا۔ لیکن یہاں دو باتیں اس واقعہ کو غلط ٹھیراتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خلیفۂ اول نے بیت المال کی جو اشیاء چھوڑیں اور وہ خلیفۂ دوم کو سپرد کی گئیں۔ ان کی فہرست میں اس قرآن کا نام نہیں ہے اور خلیفۂ اول

نے جن چیزوں کے سپرد کرنے کو فرمایا تھا اس میں اس کا نام نہیں لیا۔ تاریخ الخلفاء میں ہے۔

قال ابو بکر لما احتضر لعائشة یا بنیة انا ولینا امر المسلمین فلم ناخذ لنا دینارا ولا درهما ولکن اکلنا من جریش طعامهم فی بطوننا او لبسنا من خشن ثیابهم علی ظهورنا وانه لم یبق لنا عندنا من فیء المسلمین قلیل ولا کثیر الا هذا العبد الحبشی وهذا البعیر الناضح وجردی هذه القطیفة فاذا مت فابعثی بهن الی عمر۔

ترجمہ:۔ حضرت ابوبکرؓ نے نزع کے وقت فرمایا کہ اے بیٹی میں خلیفہ بنایا گیا میں نے بیت المال سے روپیہ نہیں لیا مگر بقدر موٹا کھانے اور موٹا پہننے کے اور اب میرے پاس بیت المال کا سوا اس غلام حبشی اور پانی لانے کی اونٹنی اور اس پرانی چادر کے کچھ نہیں میرے مرے بعد اس کو عمر کے پاس بھیجدینا۔

اگر واقعی کوئی قرآن بیت المال کے صرف سے اس اہتمام سے لکھایا گیا تھا تو بیت المال کی فہرست میں اس کا نام ضروری ہوتا۔ اور خلیفۂ اول اس کے سپرد کرنے کو اہتمام سے فرماتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خلیفۂ دوم کے بعد یہ قرآن خلیفہ سوم کی تحویل میں ہونا چاہئے تھا نہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس۔ کیونکہ یہ خلیفہ کی اپنی ذاتی ملک نہ تھی۔ اب بعید نہیں بلکہ یہ امر نہایت قریب تر ہے کہ احتمالات اور امکانات کے ورطہ میں غوطہ لگانے والے جدت آفرینی کی یوں داد دیں کہ یہ قرآن خلیفۂ اول کا ذاتی تھا۔ اپنے خاص روپے سے لکھایا تھا۔ اور خلیفۂ دوم کو آخر وقت میں انھوں نے ہبہ کر دیا تھا اور بیت المال کا نہ تھا تاکہ خلیفہ دوم کی وفات کے بعد خلیفہ سوم کی نگرانی میں پہنچتا۔ ان کی اس جدت اور نکتہ آفرینی کی میں بھی دل سے قدر کرنے کو اور داد دینے کو تیار ہوں۔ مگر وہ ہبہ نامہ جس کی رو سے یہ ہبہ ثابت کیا جائے اگر کسی سند سے دکھائیں اور خلیفہ اول کی آمدنی میں اس قدر قوت اور زور دکھائیں جو اس بار کی متحمل ہو سکے تو البتہ قابلِ تسلیم ہے اور بلا اس کے

یہ خیال آفرینی واقعیت کی سطح پر رونما نہیں ہوسکتی بلکہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہے کہ نہ خلیفہ اول کے پاس اپنا ذاتی اس قدر مال تھا جس سے قرآن لکھاتے اور بیت المال سے اپنے مصارف کے لئے جو کچھ وہ لیتے تھے اس میں نہ اِس کی گنجائش تھی۔ الغرض اس قرآن کے لکھانے کی دو ہی صورت ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس صحیفہ وغیرہ کی قیمت خلیفۂ اول اپنے پاس سے صَرف کریں۔ دوسرے یہ کہ بیت المال سے دیں۔ اور واقعات ان دونوں صورتوں کے مخالف ہیں۔

(۵) اس روایت میں یہ کہنا کہ سورہ براۃ کا آخر ابو خزیمہ انصاری کے سوا کسی دوسرے کے پاس نہ تھا ایک ایسی پہیلی اور چیستان ہے جس کی گرہ کشائی ناممکن ہے۔ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ سورہ براءۃ پوری ایک وقت میں کامل آخر زمانہ میں نازل ہوئی۔ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع میں پڑھا۔ حضرت علیؓ نے نویں سال حج میں تین مقامات میں یعنی عرفہ منیٰ یا مکہ میں لوگوں کو تمام وکمال سنایا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے یاد کرنے کا خاص حکم دیا زید کو تمام قرآن یاد تھا اور لکھا ہوا تھا۔ ابی بن کعب کے پاس بھی تمام قرآن لکھا ہوا اور یاد تھا۔ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہ کو سورۂ براۃ یاد تھی۔ چنانچہ انھوں نے مکہ میں جا کر سنائی اور زید کے قرآن لکھنے کے وقت یہ لوگ مدینہ میں موجود تھے۔ پھر اب زید کا یہ کہنا کہ ابو خزیمہ کے سوا کسی کے پاس یہ آیت نہ تھی وہ بات ہے جس کے ماننے کے لئے کسی طرح کوئی مسلمان تیار نہیں ہوسکتا۔

الحاصل زہری کے اس روایت میں چھ امر تو ایسے ہیں جو واقعات کی رو سے سچائی کے معیار میں صحیح نہیں اُترتے اور وہ بالکل غلط ہیں۔

(۱) جنگ یمامہ میں بہت سے قرآن کے قاری شہید ہوئے۔

(۲) زید نے آنحضرتؐ کی حیات میں قرآن جمع نہیں کیا تھا۔

(۳) زید پورے قرآن کے حافظ نہ تھے۔

(۴) آنحضرتؐ نے پورا قرآن جمع نہیں کرایا تھا۔

(۵) حضرت عثمانؓ نے آنحضرتؐ کے عہد میں قرآن جمع نہیں کیا تھا۔
(۶) ابو خزیمہ انصاری کے سوا کسی کے پاس سورۂ براءۃ کا آخر لکھا ہوا نہ تھا۔
اور سات باتیں ایسی ہیں جو شب و روز کے تجربہ اور صحابہ اور مسلمانوں کے حالات کے اعتبار سے بعید نہیں۔ اور یہ دونوں اِن کی اجازت نہیں دیتے۔
(۱) ڈیڑھ سال میں زید کا تمام و کمال قرآن کو تلاش کر کے لکھ دینا۔
(۲) حضرت عمرؓ کا یہ خیال کرنا کہ قرآن ضائع ہو جائے گا۔
(۳) قرآن جمع کرنے کے پہلے قاریانِ قرآن کو لڑائی میں بھیجنا۔
(۴) قرآن کے جمع کرنے کو محض زید کے متعلق کرنا۔ باوجودیکہ خود مدینہ میں ان سے بہتر قاری بھی موجود تھے۔
(۵) اس قرآن جمع شدہ کا حضرت حفصہ کے پاس رہنا نہ خلیفہ سوم کے۔
(۶) خلیفہ اول اور دوم کا اپنے عہد میں اس قرآن کی نقلیں ملک میں شائع نہ کرنا۔
(۷) مسلمانوں میں سے ایک مسلمان کا بھی اس قرآن کی نقل نہ لینا۔

اس کے علاوہ زہری کی روایت کا اختلاف اور نیز زہری کی یہ تنہا روایت بہت سی اُن روایات کے مخالف ہے جو اپنی کثرت کی وجہ سے تواتر کے مرتبہ میں پہنچ گئے ہیں۔
یہ عجیب بات ہے کہ جو واقعہ نہایت ہی بے اصل اور سراسر غلط اور جس قدر بے بنیاد ہوتا ہے اُسی قدر مشہور اور زبان زد عوام و خواص ہو جاتا ہے۔ خلیفہ اول کے جمع قرآن کے واقعہ نے شہرت کا یہ درجہ پایا ہے کہ آج محدثین اور مورخین اور ہر مسلمان کی زبان اور قلم پر ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ بخاری جیسے ناقد اور محقق کی تحقیق کی روشنی بھی اس شہرت کے آگے ماند پڑ گئی۔ مگر پھر بھی حق حق ہے اور باطل باطل جھوٹ اور فریب گو مشہور ہو جائے۔ قبول کر لیا جائے لیکن انجام کار سچائی کی روشنی غالب آکر اُسے محو کر دیتی ہے اور وہ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔
یہ بھی مشہور ہے کہ خلیفۂ سوم نے اپنے عہد میں خلیفۂ اول کی جمع کردہ قرآن کی چند نقلیں کرا کے مختلف بلاد میں بھیجیں اور یہ حکم دیا کہ اس کے سوا جو لکھے ہوئے قرآن

ہیں وہ ضائع کر دیئے جائیں۔ اور اب سے اس قرآن کے موافق پڑھا پڑھایا جائے چنانچہ کتب حدیث اور تواریخ میں یہ واقعہ مذکور ہے اور یہاں میں بھی ترمذی سے اسے نقل کرتا ہوں۔

عَنْ اَنَسٍ اِنَّ حُذَيْفَةَ قَدِمَ عَلٰى عُثْمَانَ وَكَانَ يُغَازِيْ اَهْلَ الشَّامِ فِيْ فَتْحِ اَرْمِيْنِيَّةَ وَاَذْرَبِيْجَانَ مَعَ اَهْلِ الْعِرَاقِ فَرَاٰى حُذَيْفَةُ اخْتِلَافَهُمْ فِي الْقُرْاٰنِ فَقَالَ لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَدْرِكْ هٰذِهِ الْاُمَّةَ قَبْلَ اَنْ يَّخْتَلِفُوْا فِي الْكِتَابِ كَمَا اخْتَلَفَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى فَاَرْسَلَ اِلٰى حَفْصَةَ اَنْ اَرْسِلِيْ اِلَيْنَا بِالصُّحُفِ نَنْسَخُهَا فِي الْمَصَاحِفِ ثُمَّ نَرُدُّهَا اِلَيْكِ فَاَرْسَلَتْ حَفْصَةُ اِلٰى عُثْمَانَ بِالصُّحُفِ فَاَرْسَلَ عُثْمَانُ اِلٰى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ وَسَعِيْدِ بْنِ الْعَاصِ وَعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنِ انْسَخُوا الصُّحُفَ فِي الْمَصَاحِفِ وَقَالَ لِلرَّهْطِ الْقُرَشِيِّيْنَ الثَّلَاثَةِ مَا اخْتَلَفْتُمْ اَنْتُمْ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فَاكْتُبُوْهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ فَاِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِهِمْ حَتّٰى نَسَخُوا الصُّحُفَ فِي الْمَصَاحِفِ وَبَعَثَ عُثْمَانُ اِلٰى كُلِّ اُفُقٍ بِمُصْحَفٍ مِّنْ تِلْكَ الْمَصَاحِفِ الَّتِيْ نَسَخُوْا قَالَ الزُّهْرِيُّ وَحَدَّثَنِيْ خَارِجَةُ بْنُ زَيْدٍ اَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ قَالَ فَقَدْتُ اٰيَةً مِّنْ سُوْرَةِ الْاَحْزَابِ كُنْتُ اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَاُهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ فَالْتَمَسْتُهَا فَوَجَدْتُهَا مَعَ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ اَوْ اَبِيْ خُزَيْمَةَ فَاَلْحَقْتُهَا فِيْ سُوْرَتِهَا هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ وَهُوَ حَدِيْثُ الزُّهْرِيِّ وَلَا نَعْرِفُهٗ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِهٖ۔ ج ۲ ص ۱۳۶

ترجمہ:۔ انس کا بیان ہے کہ حذیفہ آرمینہ اور آذربیجان کے غزوہ سے واپس ہو کر حضرت عثمان کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں میں قرآن کی قرارت میں بہت

اختلاف ہے۔ قبل اس کے کہ لوگ یہود اور نصاریٰ کی طرح گمراہ ہوں آپ اس کی تلافی اور انتظام کر دیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس کہلا بھیجا کہ وہ صحیفے میرے پاس بھیجدو تاکہ میں اس کی نقلیں کراؤں پھر میں اسے تمھیں واپس دوں گا۔ چنانچہ حضرت حفصہ نے وہ صحیفے بھیجدیئے۔ حضرت عثمان نے زیدؓ سعیدؓ عبد الرحمٰن، عبد اللہؓ کو اس پر مامور کیا کہ وہ نقل کریں۔ اور فرمایا کہ اگر باہم اختلاف ہو تو قریش کے لغت میں لکھواور اسے ترجیح دو اس لئے کہ انھیں کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے۔ ان لوگوں نے نقلیں کیں اور حضرت عثمانؓ نے ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک طرف بھیجدیا۔ زہری کہتے ہیں کہ زید کے بیٹے خارجہ کا بیان ہے کہ مجھ سے میرے باپ زید نے کہا کہ سورۂ احزاب میں اُس آیت کو جسے میں نے آنحضرتؐ کو پڑھتے سنا تھا نہیں پایا اور وہ آیت یہ ہے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ فَمِنْھُمْ مَنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْھُمْ مَنْ یَّنْتَظِرُ اس کو تلاش کیا تو خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس ملی تب میں نے اس کو اپنی جگہ سورۃ میں لکھ دیا۔

زہری کی اس حدیث سے یہ پانچ باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) حذیفہ بن الیمان کو آرمنیہ اور آذربیجان کے غزوہ میں جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں قرآن میں اختلاف ہے تو واپسی کے بعد حذیفہ نے خلیفہ سوم سے درخواست کی کہ اس کا انتظام کریں اور اس اختلاف کو روکیں۔

(۲) خلیفہ سوم نے حذیفہ کے مشورہ سے زید، سعید، عبد الرحمٰن، عبد اللہ کو اس پر مقرر کیا کہ وہ خلیفہ اول کے لکھائے ہوئے قرآن کی نقلیں کریں اور اگر کسی لفظ میں اختلاف ہو تو لغتِ قریش کے موافق اُسے لکھیں۔

(۳) ان نقل شدہ قرآن کا ایک ایک نسخہ ہر طرف روانہ کیا۔

(۴) اس قرآن میں سورۂ احزاب کا اخیر نہ تھا جس کو خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس سے تلاش کر کے لکھا۔

(۵) حضرت عثمانؓ نے سوا اس کے کہ حضرت ابوبکرؓ کے قرآن سے نقل کرائی اپنی طرف سے اور کوئی امر جدید نہیں کیا۔ میں یہاں چند اُمور کی تنقیح کرتا ہوں جس سے حضرت عثمان کے اس جمع قرآن کی روایت پر بہت کچھ روشنی پڑے گی۔

تنقیح (۱) آذربیجان والوں نے جو معاہدہ خلیفہ دوم کے عہد میں ۲۲ھ میں کیا تھا وہ خلیفہ سوم کے زمانہ میں توڑ دیا۔ اس پر خلیفہ سوم سے ۲۵ھ میں ولید بن عقبہ کو آذربیجان پر متعین کیا اور ولید نے پھر دوبارہ اُسے فتح کیا۔ اور ۲۵ھ میں ہی حضرت عثمانؓ نے قرآن لکھائے۔ اگرچہ ابن خلدون اور کامل ابن اثیر وغیرہ مورخین لے لکھا ہے کہ ۳۰ھ میں یہ قرآن لکھائے گئے مگر علامہ ابن حجر شارح بخاری فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ درحقیقت یہ ۲۵ھ میں ہوا ہے۔ چونکہ خلیفہ دوم کا انتقال ۲۳ھ کے آخر میں یعنی ۲۷ ذی الحجہ ۲۳ھ میں ہوا تو یہ اختلاف جس کی خبر حضرت حذیفہؓ نے حضرت عثمانؓ کو دی تھی نیا نہ تھا یعنی خلیفہ سوم کے عہد میں پیدا نہ ہوا تھا کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک سال کی مدت میں ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ دراصل یہ اختلاف قرار صحابہ میں تھا۔ اور صحابہ میں سے جو ملک میں تعلیم قرآن کے لئے روانہ کئے گئے تھے انھوں نے اپنی اپنی قراءۃ کے موافق قرآن پڑھایا تو وہ اختلاف ان کے شاگردوں میں رہا۔ اور خلیفہ اول اور دوم کے عہد میں برابر یہ اختلاف تھا جس کی خبر حذیفہ نے خلیفہ سوم کو دی مگر تعجب ہے کہ ان دونوں خلفاء نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور یہ ناممکن ہے کہ اس اختلاف کا علم ان دونوں خلفاء کو نہ ہوا ہو خصوصاً خلیفہ دوم کو جو اپنے عہد میں تمام باتوں کی خبر رکھتے تھے۔ حالانکہ خلیفہ اول اور دوم کو اس کا بہت زیادہ خیال تھا کہ مسلمانوں میں کسی طرح سے اختلاف نہ ہو۔ اور اسی وجہ سے اُن کے عہد میں کسی قسم کا اختلاف مسلمانوں میں نہیں ہوا۔ جیسا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ازالۃ الخفاء کے مقصد دوم صفحہ ۱۳۴ میں لکھتے ہیں۔ "لہٰذا درین عصر اختلاف

مذہب و تشتت آرا واقع نشد ہمہ بریک مذہب متفق و بریک راہ مجتمع داں مذہب خلیفہ دراے او بود۔" اور یہی علامہ ابن حزم نے الفصل میں لکھا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی زیادہ توجہ کے قابل ہے کہ ۲۵ھ تک ممالک اسلامیہ میں قرآن کی جسقدر اشاعت ہوئی وہ خلیفہ دوم کی توجہ سے ہوئی۔ اُنھوں نے معلم بھیجے، وظائف مقرر کئے پھر ضروری ہے کہ ان تمام معلموں نے خلیفہ کی ہدایت کے موافق قرآن کی تعلیم دی ہوگی۔ کیونکہ فاروقِ اعظم کی یہ عادت تھی کہ معلمین کو روانہ کرتے وقت ضروری ہدایت کر دیتے تھے۔ خصوصاً ایسے امور سے سختی کے ساتھ روکتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف ہو جس کا لازمی اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ اس عہد میں قرآن میں ایسا اختلاف نہ ہوتا جس کے رفع کرنے کی ۲۵ھ میں خلیفہ سوم کو ضرورت پیش آئے۔

(۲) ۲۵ھ تک تمام ممالک اسلامیہ میں قرآن کی اشاعت جس قدر بھی ہوئی تھی وہ اُن صحابہ نے کی تھی جنھوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن یاد کیا تھا۔ اور آپ سے سُنا اور پڑھا اور لکھا تھا اور جن قرار اور حفاظ صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کانوں سے بارہا قرآن سُنا۔ آپ کی کی زبان مبارک سے قرآن کو لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سُنایا اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ان پر وثوق و اعتماد کر کے انھیں قرآن پڑھانے اور تعلیم کی اجازت دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہزاروں کو انھوں نے قرآن پڑھا دیا تو ان حفاظ اور قرار نے آنحضرت سے جس طرح قرآن سُنا اور یاد کیا وہ کبھی اور کسی حالت میں بھی اس کے خلاف نہیں کر سکتے تھے۔ اُن صحابہ کی تو بڑی شان ہے۔ آج بھی اگر کسی مسلمان کو اس کا یقین ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں کام اس طرح کیا ہے اور فلاں بات کو یوں فرمایا ہے یا قرآن کا فلاں حرف اس طرح پڑھا ہے تو وہ بھی اس کے خلاف ہرگز نہ کرے گا اور اسی پر قائم رہے گا خواہ اُسے مالی اور جانی دونوں قربانی کرنی پڑیں۔ اب جن صحابہ نے

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن یاد کیا تھا اور اسی طرح جن لوگوں نے ان صحابہ سے قرآن لکھا پڑھا تھا اگر ان میں باہم اختلاف تھا تو خلیفۂ سوم کے کہنے سے وہ اُس قرارت اور قرآن کو نہیں چھوڑ سکتے تھے جس کو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا اپنے اساتذہ، صحابہ کرام سے لیا اور سیکھا اور لکھا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ خلیفہ سوم ان سے اُن کے اس قرآن کو جو انھیں پہنچا تھا لے کر ضائع کر دیتے اور اُن کے دلوں سے اس نقش کو مٹا دیتے جو ان کے اساتذہ کرام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اُن کے پاک دلوں پر کیا تھا جن کو اس وقت کے مسلمانوں کی حالت سے واقفیت ہے اور جن حضرات نے ان مقدس اصحاب کی تاریخ کے دیکھنے کا شرف حاصل کیا ہے ان کو اِس امر کے باور کرنے کے لئے تاریکی کا کوئی پردہ حائل نہیں کہ خلیفہ سوم کے اختیار سے بلکہ خلیفہ دوم وسوم کے اختیار سے بھی یہ بات خارج تھی۔ بلکہ کوئی قوت بھی ایسی نہ تھی جو اُسے اُس قرأت کو چھڑا کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یا اُن کے استادوں سے اُنھیں پہنچی ہے دوسری قرأت کو رائج کرتے اور اس اختلاف کو اٹھا دیتے۔

(۳) ممالک اسلامیہ میں آج بھی جو قرآن لکھے ہوئے ہیں اور جس قدر قرآن کے قاری ہیں اس وقت بھی ان کی سندیں موجود ہیں اور ہر قاری آج بھی قرآن کو اسی طرح پڑھتا ہے جس طرح اس کے اُسے اپنے استاد سے سُنا ہے اور جو اختلاف قراءۃ قراءِ صحابہ میں تھا وہ آج تک بھی اُن کے شاگردوں میں ہے اور ہر شخص اسی طرح پڑھتا ہے جس طرح اسے پہنچا ہے۔ جو شخص تمام دنیا میں سفر کرکے مسلمانوں کی قرأت کو مختلف ملکوں میں سنے گا وہ ضرور اس اختلاف کو دیکھے گا پھر خلیفہ سوم نے وہ کس اختلاف کو مٹایا جو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے اور یہ اختلاف ایسا نہیں ہے جس سے کسی فتنہ کا خوف ہو۔ یہ معمولی لب ولہجہ وغیرہ کا اختلاف ہے۔ بلکہ یہ اختلاف سرورِ کائنات کے عہد میں بھی تھا جس کو خود آنحضرتؐ بھی جانتے تھے۔ اور آپؐ کے حضور میں یہ اختلافات پیش بھی کیے گئے

مگر آپؐ نے اس کو جائز رکھا۔ پھر جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز رکھا تو کیا کوئی مسلمان خصوصاً صحابہ اس کو ناجائز رکھیں گے؟ ہرگز نہیں دوسرے مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن کے اس اختلاف کی وجہ سے آج تک مسلمانوں میں کوئی فتنہ یا گمراہی نہیں ہوئی جس کا خطرہ اس روایت میں بیان کیا گیا ہاں ممکن ہے کہ قرآن کی رسمِ خط میں اختلاف ہو اور حضرت عثمانؓ نے قرآن کی رسمِ خط قائم کی ہو۔

(۴) مسلمان قرآن کے پڑھنے میں محض لکھے پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ اس میں اس کی ضرورت ہے کہ وہ قرآن ایسے شخص کو سنائیں جس کی سند کا سلسلہ آنحضرتؐ تک ہو اور بلا ایسے شخص کے سنائے اور سند حاصل کئے قرآن پڑھنا درست نہیں۔ اور اس میں مسلمانوں نے اِس قدر احتیاط کی ہے کہ قرآن کے سوا حدیث میں بھی اسی شخص کا اعتبار ہے جس نے سند حاصل کی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی سند ہو۔ جو شخص آج بھی بلا سند حاصل کئے محض اپنی قابلیت کے اعتماد پر لکھی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر حدیث پڑھانا چاہے تو اس کی حدیث کا اعتبار نہیں اور کوئی مسلمان اس سے حدیث نہیں پڑھے گا۔ اور ایسا شخص قابل سزا ہوگا جو لوگ قرآن پڑھنے اور حدیث کی قابلیت رکھتے ہیں لیکن سند نہیں رکھتے تو وہ بھی سند یافتہ کے حلقۂ درس میں برسوں رہ کر اور سنا کر سند حاصل کرتے ہیں تب وہ اس لائق ہوتے ہیں کہ لوگ اُن سے پڑھیں ورنہ نہیں۔ آج تک جس قدر قرا ہوئے اور ہیں وہ تمام اپنی قرأت اور قرآن کی سند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں جس سے اس امر میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا کہ مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس طرح سے قرآن پہنچا ہے اور صحابہ نے جس طرح انھیں پڑھایا تھا؟ آج تک بلا کسی تغیر و تبدل کے برابر پڑھتے چلے آئے ہیں اور اسی طرح مسلمانوں میں اس کا رواج ہے۔ جو اختلاف صحابہ کے قراءتوں میں تھا وہ اب بھی ان کے شاگردوں میں ویسے ہی محفوظ ہے۔ قرار صحابہ کی قراءتیں ہم تک بتواتر پہنچی ہیں

جن میں شبہہ کی اصلاً گنجائش نہیں ۔ اب ان متواترا ور یقینی باتوں پر اس ایک شخص کی خبر کا کیا اثر پڑ سکتا ہے ۔ اور ایسی ظنی او روہمی باتوں سے ہم یقین اور تواتر کو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام قراءت صحابہ کی سندیں آج تک رائج ہیں اور صحابہ نے جس ملک میں تعلیم دی اور وہاں کے باشندوں کو جس طرح سے پڑھایا آج تک وہاں کے باشندے اسی طرح پڑھتے ہیں ۔ تو پھر خلیفہ سوم کے اختلاف قراءت کے مٹانے کی روایت کا پورا پورا حال معلوم ہو جاتا ہے اور اس کی صحت اور صداقت کا پایہ جو ہے وہ ہر شخص پر ظاہر ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ علامہ ابن حزم کتاب الفصل میں لکھتے ہیں ۔ فَلَو رَامَ عثمان مَا ذکرُوا مَا قدرَ علیٰ ذٰلک ۔ یعنی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے تمام قراءت مٹا کر ایک قراءت رکھی ہے یہ انکی غلطی ہے ۔ یہ امر حضرت عثمانؓ کے اختیار میں نہ تھا ۔ اور جب ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں کہ قراءت صحابہ کا اختلاف قراءت اس وقت بھی ان کے شاگردوں میں برابر چلا آرہا ہے تو پھر حضرت عثمانؓ نے کس اختلاف کو مٹایا ۔

(۵) زید نے خلیفہ اول کے عہد میں ان صحائف میں تمام قرآن نقل کیا تھا مگر تعجب ہے ۔ بارہ تیرہ سال تک یہ ویسے ہی جزدان میں رکھا رہا ۔ کسی نے نہ دیکھا ۔ اور دیکھا بھی تو کسی کو اس کا پتہ نہ چلا کہ سورۃ احزاب سے ایک آیت اس میں لکھنے سے رہ گئی ۔ جس کا پتہ اس وقت خلیفہ سوم کے عہد میں نقل کراتے وقت ہوا ۔ اور تعجب ہے کہ آنحضرتؐ کے عہد مبارک سے خلیفہ سوم کے عہد تک سورۃ احزاب کی اس آیت کو کسی نے نہیں لکھا سوائے حزیمہ کے اور کسی کے پاس نہ نکلی ۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہی ایک بات اس روایت کی صداقت اور عدم صداقت کی عمدہ دلیل ہے ۔ علاوہ اس کے زید نے خلیفہ اول کے عہد میں جب نہایت کوشش اور سعی سے قرآن جمع کیا ' اور زید کو قرآن یاد بھی تھا ۔ تو اس وقت سورۃ احزاب کی آیت کا لکھنے سے رہ جانا ایک

ایسی بات ہے جو انسانی فہم سے بالاتر ہے۔ اور جب زید کے لکھنے اور حفظ کی یہی حالت ہے تو ممکن ہے کہ اس میں اور بھی بعض آیات چھوٹ گئی ہوں۔ اگر زید تیسری بار پھر نقل کرتے تو ممکن تھا کہ وہ پھر زید کو یاد آجاتیں مسلمانوں کے یہاں ایسی روایات کی جو وقعت ہے وہ اسے خوب جانتے ہیں جن کو ایسی روایات میں دخل ہے کیا محض زید کے لکھنے اور ان کی یاد کے بھروسے اور وثوق پر قرآن مان لیا گیا ہے۔ اور کیا محض زید کے کہنے اور لکھنے سے قرآن میں کسی آیت کا اضافہ ممکن تھا۔ این خیال ست و محال ست وجنون۔ ہزاروں قرآن کے نسخے بلکہ لاکھوں اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوں گے اور اس سے بھی بہت زیادہ حفاظ قرآن موجود تھے۔ اور مسلمانوں کے چھوٹے بڑے۔ مرد۔ عورت۔ ادنیٰ۔ اعلیٰ کی زبان پر قرآن کا حرف حرف برق کی طرح رواں تھا۔ مسجدیں اور نمازیں اس کی صدا سے گونج رہی تھیں۔ اس پچیس ۲۵ سال میں بلکہ سینتیس ۳۷ سال میں جس قدر قرآن کی اشاعت ہوگئی تھی وہ زید اور خلیفہ سوم کی سعی سے بے نیاز تھی۔ اور اتنے مسلمانوں کے دلوں سے کسی حرف یا قراءت کا دھو دینا کسی انسان کا کام نہیں تھا۔

ہم مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ قرآن کے الفاظ خدا کے الفاظ ہیں اور وحی الٰہی کے جو لفظ تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بعینہ انھیں الفاظ کو پہنچایا۔ اُن آسمانی الفاظ کے بجائے دوسرے لفظوں کو رکھنا خواہ وہ آسمانی لفظوں کے ہم معنی ہی کیوں نہ ہوں نہ آنحضرتؐ سے ممکن ہے اور نہ کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے۔ آنحضرتؐ کی نبوت سے ۳۸ھ تک یعنی اڑتیس سال کی مدت میں تمام اسلامی شہروں میں اس کی اشاعت کمال عروج تک پہنچ گئی تھی۔ اور مسلمانوں کے سینوں اور سفینوں دونوں میں قرآن کا ہر ایک لفظ آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ رمضان میں اسلامی دنیا کی ہر مسجد میں کم سے کم ایک بار ضرور پڑھا جاتا تھا۔ پنجگانہ نمازیں۔ آخر رات میں روزانہ تلاوت

یں اس کا معمول تھا۔ اس وقت قرآن کی یہ حالت نہ تھی کہ اس سے مسلمان ناواقف ہوں۔ یا جو قرآن مسلمانوں کے دلوں۔ زبانوں۔ صحیفوں۔ تعلیم گاہوں میں داخل ہو گیا تھا اس پر شک وشبہ کا پردہ کوئی ڈال سکے۔

اب ایسی حالت میں خلیفہ سوم کا ان لوگوں کو جو قرآن لکھنے پر مقرر کئے گئے تھے یہ ہدایت کرنا (اگر کسی لفظ میں تمھیں اختلاف ہو تو ایسی صورت میں وہ لفظ لکھنا جو قریش کے یہاں مستعمل ہو۔ کیونکہ قرآن قریش ہی کی لغت میں نازل ہوا جیسا اس روایت میں ہے۔ وَقَالَ لِلرَّهْطِ الْقُرَشِيِّيْنَ الثَّلَاثَةِ مَا اخْتَلَفْتُمْ اَنْتُمْ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فَاكْتُبُوْهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ فَاِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِهِمْ۔ یعنی خلیفہ سوم نے ان لوگوں میں سے جو قرآن لکھنے پر مقرر کئے گئے تھے قریشوں کو کہا کہ تم سے اور زید سے اگر کسی لفظ میں اختلاف ہو تو اپنی زبان کا لفظ لکھنا کیونکہ تمہاری ہی زبان میں قرآن اترا ہے) اس روایت کے اعتبار کو مسلمانوں سے کیا مخالفین اسلام کی نظروں سے بھی کھو دیتا ہے۔ اور جو شخص مسلمانوں کی حالت اور قرآن کی تاریخ سے واقف ہے وہ ہرگز کسی حالت میں اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن اس ہی روایت کے موافق جب قریش کی لغات میں نازل ہوا ہے قریش کی زبان کے سوا کسی دوسری زبان کا لفظ اس میں نہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن جن الفاظ میں نازل ہوا ان ہی الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا اور مسلمانوں نے وہی الفاظ یاد کئے۔ لکھے۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ زید جو انصاری ہیں نہ قریشی سے ان کے قرآن میں کوئی ایسا لفظ ہو جو قریشی نہیں یعنی وہ درحقیقت قرآن کا لفظ نہیں یا ان کو قرآن کے الفاظ کے بجائے دوسرے لفظ یاد ہوں۔ حالانکہ زید وہ شخص ہیں جو پچیس سال تک برابر قرآن پڑھاتے رہے۔ قرآن کا درس دے کر کئی ہزاروں کو قرآن کا حافظ بنایا۔ عہد مبارک میں وحی یعنی قرآن لکھتے تھے۔ آخر سال ہی حضرت جبرئیل سے جو آنحضرتؐ نے دو بار قرآن کا دور کیا تھا تو اس میں یہ زید برابر کے شریک تھے۔ تمام قرآن آنحضرتؐ کے عہد میں یاد کیا۔

تھا۔ اور لکھا تھا۔ خلیفہ اول و دوم نے ان کے مقابلہ میں کسی کو ترجیح نہ دی اور انھیں پر اپنا زیادہ اعتماد ظاہر کیا اسی لئے انھیں کو تنہا قرآن لکھنے پر مقرر کیا۔ اور اس وقت کسی قریشی کو اس کام میں ان کا شریک نہ کیا اور نہ یہ ہدایت کی کہ قریش کی زبان میں لکھنا۔ اب ایسی صورت میں خلیفہ سوم کا زید کے ساتھ ان کو یعنی سعیدؓ، عبدالرحمٰنؓ، عبداللہ جو قریش ہیں شریک کرنا اور یہ فرمانا کہ تم تینوں سے اور زید سے اگر کسی لفظ میں اختلاف ہو تو وہاں زید کا اعتبار نہ کرنا۔ بلکہ اپنی زبان کے موافق لکھنا۔ حالانکہ یہ تینوں شخص نہ مشہور قرار سے ہیں اور نہ زید کی مثل ماہر ہیں اور نہ اس قابل ہیں کہ زید کے مقابلہ میں ان کا پلہ بھاری ہو۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت سعید اور عبداللہ نو ۹ سال کے تھے۔ عبدالرحمٰن دس برس کے اور آنحضرتؐ سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا تھا۔ اور زید نے تمام قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا۔ پھر ایسی صورت میں زید سے یہ تینوں اگر قرآن کے کسی لفظ میں اختلاف کریں تو بمقابلہ زید کے پھر بھی ان کا اعتبار ہونا، مسلمان اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور کیا یہ ممکن تھا کہ زید نے جن الفاظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سُنا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تعلیم فرمایا۔ ان الفاظ کو چھوڑ کے خلیفہ کی ہدایت کے موافق ان تینوں کے بتائے ہوئے لفظوں کو لکھتے۔ ہرگز نہیں اور کیا کوئی مسلمان اس کا یقین کر سکتا ہے کہ خلیفہ نے زید کو اس قسم کی ہدایت کی ہوگی کہ تم نے جن الفاظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن الفاظ کو تمھیں تعلیم دیا۔ جن الفاظ کو تم اب تک پڑھتے رہے۔ اور ایک بڑی جماعت کو تم نے تعلیم کیا۔ ان الفاظ کو تم محض اس لئے چھوڑ دینا کہ وہ قریش کی لغت کا نہیں۔ اور قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ زید نے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن میں عربی کے سوا دوسری زبان کا لفظ بھی سنا یا پڑھا ہوتا تو پھر تمام عالم کے کہنے سے بھی وہ اس لفظ کو کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ خواہ ان کو یوں سمجھایا ہی جاتا کہ قرآن عرب کی زبان میں نازل

ہوا ہے اور یہ لفظ عربی نہیں۔ کیونکہ کسی لفظ کا قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سُن لیستا یا آپ سے تعلیم پانا ایک ایسی مضبوط اور مستحکم دلیل ہے کہ قرآن کی تمام عمارت اِسی پر قائم ہے نہ کسی قیاس اور گمان پر۔ اور کیا ایسے قیاسات سے کہ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے یا قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ قرآن کا کوئی حرف اپنی جگہ سے متزلزل ہوسکتا ہے۔ اور مسلمانوں کے اس یقین میں جو انوار نبوت سے حاصل ہوا ہے کسی قسم کی تاریکی کا دھبہ پڑ سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔ اس کے علاوہ تمام قرآن کا قریش کی لغات کے موافق ہونا خود صحیح نہیں۔ بلکہ قریش کے سوا دوسرے الفاظ بھی قرآن میں ہیں۔ پھر جب یہ بات خود ثابت نہیں اور خلاف ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضرت عثمانؓ قرآن کے متعلق ایک غلط بات فرمائیں اور زید بن ثابت اسے تسلیم کرلیں۔ اور اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسا فرمایا تھا اور واقعی یہ امر صحیح بھی تھا کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے تو پھر یہ ضروری تھا کہ یہ موجودہ قرآن جو اس وقت تمام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے اور حضرت عثمانؓ کا لکھا ہوا ہے اس میں کوئی لفظ غیر قریش کا نہ ہوتا۔ حالانکہ اس میں قریش کے سوا بھی دیگر اہلِ عرب کے لغات ہیں اب موجودہ قرآن کو اس روایت کے اس معیار پر جانچو اور دیکھو کہ یہ وہی قرآن ہے جس کو حضرت عثمانؓ نے فرمائشی لکھایا تھا۔ یا ویسا نہیں۔ اور اسی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ روایت کس درجہ قابل تسلیم ہے۔

(۷) قرآن اگر قریش ہی کی زبان سے مخصوص ہے تو ایسی بات نہیں جس کو صرف حضرت عثمانؓ ہی جانتے ہوں بلکہ یہ وہ امر ہے جسے اس وقت کا ہر قرآن داں جو عرب کا باشندہ تھا جانتا ہوگا۔ خصوصاً خلیفہ اول اور دوم تو ہرگز اس سے ناواقف نہ ہوں گے۔ پھر جو قرآن زید سے خلیفۂ اول نے بہ مشورہ خلیفہ دوم لکھایا تھا ضرور وہ قریش ہی کی زبان میں لکھا یا ہوگا۔ اور ضرور خلیفہ اول اور دوم کی نظر سے گذرا ہوگا۔ اب یہ نا ممکن ہے کہ اس قرآن میں کوئی اس زبان کا

لفظ ہو جس میں قرآن نازل نہیں ہوا۔ کیونکہ اول تو زید نے خود ہی اس قرآن میں ایسے لفظ نہ لکھے ہوں گے۔ اور اگر غلطی سے لکھے بھی ہوں تو خلیفہ اول اور دوم نے ضرور اس کی اصلاح فرما کر اس غلطی سے زید کو متنبہ کیا ہوگا تاکہ پھر یہ غلطی نہ ہو کہ قریش کے لغات کے سوا دیگر اہلِ عرب کی لغات کا کوئی لفظ قرآن شریف میں لکھا جائے اور اس اصلاح اور تنبیہ کے بعد ناممکن ہے کہ اس قرآن شریف میں جو خلیفہ اول کے وقت میں لکھا گیا تھا پھر ایسا لفظ ہوتا جو قریش کی لغات سے نہ ہوا اور دیگر اہل عرب کے لغات سے ہوتا اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کی تاکید اور تنبیہ کے باوجود زید سے پھر بھی ایسی غلطی ہوئی ہو کہ کوئی لفظ قریش کے لغات کے سوا کا ایسا رہ گیا ہو جس پر زید کی نظر کسی وجہ سے نہ پڑی ہو لیکن خلیفہ سوم کے عہد میں جب قرآن شریف کے نقل کی خدمت زید کو ملی اور سعید اور عبد الرحمٰن عبد اللہ بن زبیر کار جو بطون قریش سے ہیں) اس لئے تقرر ہوا۔ کہ جب کسی لفظ میں اختلاف ہو تو لغت قریش کے موافق اسے لکھیں اور پھر حسب حکم خلیفہ سوم کے ان لوگوں نے لکھا تو اب ایسی حالت میں یہ غیر ممکن تھا کہ قرآن شریف میں کوئی ایسا لفظ رہ گیا ہو جو قریش کے لغات سے نہ ہو۔ مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اور قرآن شریف میں اس وقت بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جو قریش کے لغات کے سوا دیگر اہل عرب کی لغات سے ہیں جس سے صاف اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ روایت قابلِ احتجاج نہیں ہے۔

(۴) زید کا یہ بیان کہ سورۂ احزاب کی اس آیت کو جسے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے سنا تھا نہیں پایا۔ اور تلاش کے بعد خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس سے ملی یہ وہ بات ہے جو بالکل خلاف عقل ہے اس لئے کہ زید کے پاس خود اپنا ذاتی لکھا ہوا قرآن ایسا صحیح موجود تھا جس کو زید نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود آپ کی زندگی کے اس آخری رمضان میں سنایا تھا جس

یں آپ نے دو مرتبہ قرآن شریف حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دور فرمایا تھا۔ علاوہ اس کے اور دوسرے صحابہ جیسے معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زید بن ثابت ابودردا، ابوزید، محمد بن عبید، عثمان بن عفان، تمیم داری، عبادہ بن صامت ابو ایوب کے پاس بھی پورا قرآن شریف جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھایا ہوا موجود تھا پھر یہ بات کسی طرح قابل تسلیم نہیں ہوسکتی کہ تلاش کے بعد محض ابوخزیمہ یا خزیمہ کے پاس ملی بلکہ یہ ایک ایسی نا قابل قبول بات اس روایت میں ہے جو اس روایت کو معیار صحت سے گرادینے کے لئے کافی ہے بالخصوص جبکہ اس کے خلاف پورے قرآن شریف کے عہد نبوی میں لکھے جانے کے متعلق اس کثرت سے روایتیں موجود ہیں جو تواتر کے مرتبہ کو پہونچ گئی ہیں۔

(۹) اشتباہ کی تیسری روایت جو بخاری کی ہے اس میں زید کا بیان ہے کہ میں نے کھجور کے پتوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور آدمی کے سینے سے قرآن جمع کیا اور لکھا یعنی کسی آیت یا کسی سورۃ کو محض لکھے ہوئے ٹکڑوں پر اعتماد کر کے خلیفہ اول کے عہد میں قرآن میں نہیں لکھا گیا تھا بلکہ حفاظ صحابہ پر بھی آیت اور سورۃ پیش کی گئی تھی اس کے بعد لکھا گیا تھا۔ تو اب حیرت ہے کہ ایسی حالت میں جب سورۃ احزاب حفاظ پر پیش کی گئی کس طرح اس کے آخر کی آیتیں لکھنے سے رہ گئیں جو خلیفہ سوم کے عہد میں نقل کے وقت معلوم ہوئیں ؟ کیا حفاظ صحابہ کی جماعت میں سب کو ایک قلم یہ آیت ذہول ہوگئی تھی اور کسی کو سورۂ احزاب کی آخری آیتیں یاد نہ تھیں جس کی وجہ سے مصحف صدیقی ناقص رہا۔ اور خود زید کو بھی جو مصحف صدیقی کے کاتب تھے اور قرآن کے حافظ تھے وہ بھی اس کو سارے حفاظ صحابہ کے ساتھ بھول گئے تھے۔ ایسے واقعہ پر کوئی آنکھ بند کر کے صحت کی مہر کردے۔ مگر کوئی ذی ہوش اور صاحب بصیرت ایسے نا قابل قبول واقعہ پر ایک منٹ کے لئے اعتماد نہیں کرسکتا ہے۔ بالخصوص یہ کہ عہد صدیقی میں حفاظ صحابہ

پیش کرکے قرآن جمع کیا جاتا ہے اور خلفائے راشدین رحمہم اللہ موجود ہیں اور چاروں قرآن کے حافظ ہیں پھر بھی مصحف صدیقی میں سورۂ احزاب کی آخری آیتیں لکھی نہیں جاتی ہیں یہ سورہ ناقص رہتی ہے حالانکہ خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کو قرآن کی حفاظت اور اس کی صحت اور اس کے لفظ لفظ کی درستگی کا جس قدر اہتمام تھا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات ایسی خلاف درایت معلوم ہوتی ہے جس کو کوئی ذی علم جو حفاظ صحابہ اور خلفاء راشدین کی زندگی سے علم رکھتا ہو ہرگز صحیح نہیں سمجھ سکتا ہے۔

(۱۰) اس روایت میں جس قرآن کو حضرت حفصہؓ کے پاس سے خلیفہ سوم نے طلب کیا تھا وہی قرآن ہے جس کے متعلق بخاری کی حدیث میں زید کا بیان یہ ہے کہ میرا لکھا ہوا قرآن زندگی بھر خلیفہ اکبر کے پاس رہا۔ ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پھر ان کے بعد ان کی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا مگر اتنے زمانہ تک جن صحابیوں کے پاس یہ قرآن رہا آیا اس طرح رہا۔ جس طرح مسلمان تبرکاً قرآن اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک صحابہ کرام خصوصاً خلفاء راشدین اور ازواج مطہرات کے متعلق ایسا خیال ایسی بدظنی ہے جو بعض الظن اثم کے مصداق ہے۔ بہرحال ان بزرگوں کی زندگی پر نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ضرور اس قرآن سے تلاوت کی جاتی ہوگی کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے کہ یہ یاد سے دیکھ کر تلاوت کو وہی فضیلت ہے جو فرض نماز کو نفل پر صحابہ کرام کی ذات سے بالکل مستبعد ہے کہ اس علم کے بعد ان کی خواہش اور کوشش نہ ہو۔ کہ دیکھ کر تلاوت کریں بالخصوص خلفاء راشدین اور ازواج مطہرات۔ پس باوجود اس کے کہ مصحف صدیقی خلیفہ سوم کے عہد تک ہمیشہ ایسے لوگوں کے پاس رہا جو حافظ تھے اور جو بفحوائے حدیث مذکور باوجود حافظ ہونے کے دیکھ کر تلاوت فرماتے ہوں گے مثلاً حضرت ابوبکر پھر اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ باوجود حافظ ہونے کے فضیلت مذکور کی بنا پر

ضرور دیکھ کر تلاوت فرماتے ہوں گے۔ اسی طرح حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی باوجود حافظ ہونے کے دیکھ کر تلاوت فرماتی ہوں گی۔ تو ایسی حالت میں سورۂ احزاب کے آخر کی آیتوں کے متعلق کسی کو خبر نہ ہو اور اس غلطی کا اتنے دنوں تک رہ جاتا اور خلیفہ سوم کے عہد میں زید کو اس کے نقل کے وقت معلوم ہوتا ایک ایسی بات ہے جو انسان کی فہم سے بالاتر ہے کہ ایک حافظ نہیں بلکہ تین تین حافظوں نے اس زمانہ تک جس قرآن میں تلاوت کی ہو اس میں ایسی غلطی رہ گئی ہو اور پھر خصوصیت یہ کہ ان تین حافظوں میں دو تو خلفاء راشدین کے سرتاج حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ تیسرے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عمرؓ کے گھر میں پلی ہوں اور ان کی تربیت میں نشو و نما پائی ہو اس پر بھی غلطی رہ جائے اور کسی کو خبر نہ ہو۔ میرے نزدیک ایسے اختلاف قرآن کے مٹانے کے لئے جس کو خود حضورؐ نے سن کر سمجھ کر جائز رکھا تھا اور خلیفہ سوم کا قرآن شریف کی نقل پر زید کو مامور کرنا۔ اور اس کی نقل کے لئے باوجودیکہ خود زید کے پاس اپنا لکھا ہوا اور جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو سنایا ہوا قرآن موجود تھا۔ حضرت حفصہؓ کے پاس سے قرآن شریف طلب کرنا اور باوجود اس کے کہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس پورا قرآن جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا لکھا ہوا موجود تھا۔ سورۂ احزاب کی آخری آیتوں کا محض خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملنا ایسی باتیں ہیں جو یا تو بالکل بے اصل ہیں یا درمیان کے کسی راوی کے بیان کی وہ غلطی ہے جو اقتضاء بشریت سے بعید نہیں ہے۔ بہر حال یہ تمام روایات بمقابلہ اس تواتر اور توارث کے جس سے قرآن ہمیں ملا ہے لائق اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عبداللطیف رحمانی

(حضرت مفتی صاحب کے مزید تعارف کے لیے "تاریخ القرآن" کے شروع میں حضرت سید ابوالحسن شاہ ازہری کا مقدمہ اور علامہ انور شاہ کے داماد مولانا احمد رضا بجنوری کی انوار الباری شرح بخاری (اردو) کا مقدمہ ج ۲ ملاحظہ ہو۔ ...)

روایتِ افک اور زہری

(از: مولانا حکیم نیاز احمد فاضل دیوبند)

حکیم صاحب کا یہ مضمون ہم نے ان کی کتاب روایت افک "، ناشر مشکوٰۃ اکیڈمی ۲/ الف / ۸۹ خالد بن ولید روڈ، پی، ای، سی ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹ کے صہ۳۲ تا صہ۴۰ سے لیا ہے۔ تمہیدی باتوں کے بعد وہ لکھتے ہیں :۔

(۴) مفصّل روایتِ افک زہری سے منقول ہے جو انہوں نے بقول خود چار تابعیوں سے سنی ہے اور ان چار ٹکڑوں کو مجموعہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اب میں نے اس روایت کے متن اور سند کو پرکھا، تو معلوم ہوا، زہری نے اپنی ذاتی تاریخی معلومات سے دوسری صدی کے ربع اول میں یہ روایت مرتب کی ہے۔

(۵) اس کی سند کو دیکھا تو حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے دور میں اس روایت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کوئی صحابی اس روایت کا راوی نہیں ہے دَورِ تابعین میں اس کا وجود نہیں ہے۔ کوئی تابعی اس روایت کا راوی نہیں ہے صرف نسبت ہے۔

(۶) اس روایت کی اسناد کو دیکھا، زہری تک سلسلہ ملتا ہے اور آگے منقطع ہے۔

(۷) افک کی پوری تفصیل زہری کی روایت میں ہی ملتی ہے۔ اس سے باہر اجمال، ابہام اور اہمال کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(۸) اس روایت کا ایک کوفی اجمال مسروق کوفی سے منقول ہے جو اُمِّ رُومان کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے مگر اس کی سند مشکوک اور غیر معتبر ہے۔

(۹) محدثین نے احکام کی روایات کی خوب چھان بین کی ہے اور تاریخی روایات غیر منقح بھی قبول کر لی ہیں۔ اس لئے طلّاب حدیث کے لئے ان روایات میں تحقیق اور تنقیح کی گنجائش موجود ہے۔

(۱۰) زہری کی ...یت افک کے علاوہ دیگر روایات افک کی اسناد میں یا تدلیس ہے یا ارسال ہے یا ادر ج ہے وہ سب مجروح ہیں۔

(۱۱) زہری کے ...لات مفصّل، رجال کی کتابوں میں نہ مل سکے، اتنا معلوم ہوسکا کہ زہری مُدلس بھی ہے ...رسل بھی ہیں، مدرج بھی ہیں بسند کے تینوں عیوب ان کی روایات میں پائے جاتے ...ن کی متضاد روایات سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کا اصل مرض نفاق ہے

(۱۲) میں نے مرویاتِ زہری کو تلاش کیا کہ کسی محدّث نے زہری کی مرویات کو جمع کیا ہو، اس طرح زہریات ایک جگہ جمع مل جائیں گی۔ تو پتہ چلا کہ مشہور محدث امام محمد بن یحییٰ الذہلی نیشاپوری اُستاد بخاری رحمہ نے ایک کتاب علل حدیث الزہری لکھی تھی۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے مگر تلاش کے باوجود اس کا پتہ نہ چل سکا۔ پھر میں نے خود مرویاتِ زہری کو مختلف کتب حدیث سے جمع کیا، ان کا خلاصہ میں نے اپنی اس کتاب میں زہری کے حالات میں لکھ دیا ہے۔ اگر میں مرویات زہری پر جو میں نے جمع کی تھیں۔ بحث کرتا تو ہزار صفحات سے اُوپر ذخیرہ ہو جاتا مگر چونکہ میرا مقصد تو عمرِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پہ کام کرنا تھا۔ اس لیئے اس کو نظرانداز کرنا پڑا۔

(۱۳) روایت افک پر ضمنی بحث کرنے کا خیال تھا مگر چونکہ یہ روایت منکرات پر مشتمل ہے۔ باب افک میں حرفِ آخر ہے۔ اس لئے اس پر بحث کرنی پڑی۔ اس لئے یہ حصہ بھی کافی طویل ہوگیا۔ اصل کتاب کشف الغمّہ کا آدھا حصّہ انہیں مباحث نے گھیر لیا۔ گویا مور سے لمبی اس کی دم ہوگئی۔

(۱۴) اس حصّے کو میں نے مختصر کرنے کی کوشش کی مگر نہ کر سکا۔ اسلئے اصل کتاب کو بغیر ان مباحث کے شائع کیا۔

(۱۵) زہری ذُوجہات شخصیت ہیں۔ ان کی ماہیت اور حقیقت پر مطلع ہونا مشکل ہے۔ زہری متضاد روایات کے مرجع ہیں جن کی توجیہ اور تطبیق مشکل ہے۔ زہری

انتشار اور افتراق کے بانی ہیں۔ زہری اُلجھی ہوئی ڈور ہیں جس کا سرا پالینا مشکل ہے۔ زہری کے معمے کو حل کرنے کا آسان راستہ یہ نظر آیا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زہری نے زندگی کہاں اور کیسے گذاری۔ زہری جب علم سے فارغ ہوئے تو ۸۰ھ میں عبدالملک کے دربار میں پہنچ گئے اور عبدالملک کی اولاد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ پھر ان کے احفاد کے بھی اتالیق رہے۔ آخر کار ۱۲۴ھ میں اسی عہدے پر بنو مروان کے دربار سے متعلق تھے کہ وفات پائی یعنے ۴۵ سال بنو مروان کے ملازم رہے بلکہ تمام عمر انہیں کی خدمت میں صرف کر دی۔

(۱۶) حقیقت میں ان میں وہ تمام صفات تھیں جو مطلق العنان بادشاہوں کے درباریوں میں ہوتی ہیں۔ نفاق۔ آقاؤں کی مزاج شناسی، موقع پرستی، سخن شناسی، سخن سازی برمحل سخن پروری، بدیہہ گوئی، قدرت کلام، مخالف ماحول کی برداشت، کامل ابن الوقتی، حصولِ مقصد کے لطیف ذرائع کا شعور اور ان کا استعمال۔ عام انسانوں کی معمول سازی وغیرہ وغیرہ

(۱۷) مرویات زہری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابۂ کرام رضؓ اور صحابیات رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے متعلق زہری سخت سیّئ الرّائے تھے ان کی روایات میں جا بجا اس کا اظہار ملتا ہے۔ وہ آخرت کی بازپرس سے مستغنی تھے، ان کا دل خوفِ خدا سے خالی تھا۔

(۱۸) روایات کی تنقیح کے متعلق ہماری کتاب کشف الغمّہ میں تمام مباحث تفصیل سے آچکے ہیں۔ دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ مَن یشاء فلیراجع الیہ اگر تفصیل دیکھنی ہو تو اس کا مطالعہ کریں۔

(۱۹) مگر قبول خبر کے مختصر ضوابط بیان کئے دیتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں تاریخی روایات کو پرکھا جائے اور قبول کیا جائے۔

ا۔ نص قطعی کے خلاف روایات مردود ہوگی۔

(ب) منصب نبوت کے خلاف روایت مردود ہے۔

(ج) سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو داغدار کرنے والی روایت مردود ہے۔

(د) عظمت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کیخلاف روایت اہانت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی روایت مرُدود ہے۔

(ہ) کردار صحابہ اِسلام میں ایک مستقل قدر ہے۔ حضرات صحابہ کی کردارکشی کی تمام روایات مستردہیں خصوصیت سے السابقون الاولون کے لئے رضاءِ الہٰی بنص ثابت ہے اس لئے ان کی کردارکشی کی روایات بنص مردود ہیں۔

(و) بنیادی اسلامی تعلیمات کے خلاف تمام روایات مردود ہیں۔

(ز) یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ تاریخی روایات غیر منقح ہیں۔ ان کی گنجائش خود محدثین نے رکھی ہے۔ اس لئے تنقیح کے بعد قابل قبول ہوں گی

(ح) مدلس، مرسل، مُدرج روایات تحقیق اور تنقیح کے بعد قابل قبول ہوں گی۔

(ط) خصوصیت سے مدرج روایات کی زیادہ چھان بین کی ضرورت ہے۔ اصل روایت اور سند پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ ادراج بعد میں کیا جاتا ہے۔ اور اس کی شناخت مشکل ہوجاتی ہے محض اضافہ ثقہ کے ضابطوں سے اسے قبول نہیں کرینگے۔

(ی) صحاح ستہ میں صرف احکام کی روایات ہی نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخی، مغازی ملاحم۔ فتن۔ مناقب مثالب کی روایات بھی درج ہیں۔ مؤخر الذکر روایات اکثر غیر منقح ہیں۔ اور ان میں تسامح بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے حضرات صحابۂ کرام رض کے کردار کی روایات کو دیکھ بھال کو قبول کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اسلام کا براہِ راست نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے تربیّت یافتہ طبقہ ہے۔ وہی اسلام کے اوّلین ناقل وعامل ہیں۔ اگر وہی طبقہ کچے کردار کا قرار دیا جائے تو دین کی تمام عمارت ناقابل اعتماد ہوگی۔ اس لئے تاویل اور توجیہہ کی بجائے صحابہ کرام رض کو چھوڑ کر ان سے نیچے کے رُواۃ پر جرح وقدح کے بعد ان کے بیان کو قبول کیا جائے یا رَد کر دیا جائے۔

(۲۰) ہم نے روایت افک کو کم عمری کے ماخذ کے طور پر لیا تھا۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ روایت نہیں افسانہ ہے۔ کم عمری کے مأخذ کے طور سے تمام بحث "تحقیق عمر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا" میں آچکی ہے۔ میری تحقیق یہ ہے کہ زہری حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کم عمری کی روایت کے راوی نہیں ہیں۔ عبدالرزاق نے ایک سند میں ان کا نام استعمال کیا ہے۔ زہری سنہ ۱۲۴ھ میں وفات پا گئے تھے اور کم عمری کی روایت سنہ ۱۴۵ھ میں منظر عام پر آئی۔

(۲۱) زہری کی روایتِ افک میں اس کی موضوع لہا اور رمی علیہا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا بیان کی گئی ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی اپنی زبان سے یہ واقعہ بیان کرایا گیا۔ حالانکہ واقعہ میں یہ قصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ پیش نہیں آیا۔ اور نہ انہوں نے کبھی اسے بیان کیا یہ زہری کی خود ساختہ پرداختہ روایت ہے۔ زہری نے از خود سند میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بھانجے عروہ کا نام استعمال کیا ہے۔ عروہ سے زہری کا نہ لقا ثابت ہے نہ سماع ثابت ہے۔ (تفصیل تحقیق عمر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ میں ہے) یہیں سے یہ عیاں ہے کہ زہری منافق ہیں اور مُدلس ہیں۔ یہ روایت زہری نے تصنیف کی ہے۔ اس روایت کے سب سے پہلے راوی زہری ہیں۔ وہی اس روایت کے موجد ہیں اور اس روایت کی تہذیب اور تشہیر عبدالرزاق نے کی ہے

(۲۲) عرصے تک مَیں اور میرے ساتھی زہری کے حالات پر غور کرتے رہے۔ اور زہری کی جلالتِ شان کے پیشِ نظر فیصلہ کرنے میں متأمل رہے۔ پھر روایت زہری کی روشنی میں اور ان کی تضاد بیانی اور صحابہ کرام رضؓ سے سوءِ ظن کی بناء پر ہم نے طے کر لیا کہ ممنوع التکلم قرآنی افک کو رائی سے پربت بنانے والے زہری ہیں۔ اس روایت کی سند موضوع ہے زہری سے اوپر کا وجود نہیں ہے۔

(۲۳) یہ بھی ملحوظ رہے کہ مکی زندگی میں منافقین کا طبقہ نہیں تھا۔ مکی سورتوں میں اس طبقے کا ذکر نہیں ہے۔ مدینے کی زندگی میں جب اسلام ایک طاقت بن گیا۔ یہ طبقہ وجود میں آیا۔ مدنی سورتوں میں اس کا ذکر ہے۔ بیشتر منافق مدنی ہیں۔ جوں جوں اسلام قوی تر ہوتا گیا۔ یہ منافق نفاق میں شدید تر ہوتے گئے۔ پھر ان میں مفتوح ممالک کے

منافقین بھی شامل ہوتے چلے گئے اور ان کی ذریت بھی بڑھتی رہی اور ان کی سرگرمیاں خفیہ تر راہ اختیار کرتی رہیں۔ زہری حزب نفاق کے فرد ہیں۔ زہری کی تربیت اور راہنمائی نے بنو مروان کو اس انجام تک پہنچا دیا جو زہری چاہتے تھے۔ زہری کی وفات کے بعد صرف ۸ سال تک یہ سلطنت باقی رہ سکی۔ زہری کے تربیت یافتہ تلمیذ بادشاہوں کے ہاتھوں ہی یہ سلطنت ختم ہوگئی۔ اور بنو مروان بھی ختم ہوگئے۔ بنو مروان کے لئے زہری کا وہی کردار ہے اور کامل کردار ہے۔ جو ابن علقمی کا کردار بنو عباس کے لئے ہے۔ لیکن ابن علقمی کا کردار ناقص اور بھونڈا ہے۔ زہری کا کردار کامل تام ہے، عیب ہے۔ اور بے مثال ہے۔ کوئی شخص انگلی نہیں رکھ سکتا کہ زہری کا بنو مروان کی تباہی میں ہاتھ ہے۔ ابن علقمی نے بھی اسی کردار زہری کو برتا ہے مگر بے احتیاطی سے برتا ہے اس لئے برہنہ ہو گیا۔ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ مستحق لعنت ٹھہرا۔ اپنے مدعو اور ممدوح ہلاکو خان کی نظروں سے بھی گر گیا اور ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا۔ تاریخ میں اسی حزب نفاق کے ایک فرد نصیر الدین محقق طوسی بھی تھے۔ ابن علقمی اور محقق طوسی کی ملی بھگت سے سلطنت عباسیہ تباہ ہوئی۔

غرض سلطنتوں کے اکھاڑ پچھاڑ کے کھیل آسان نہیں۔ اس میں بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زہری اس فن میں کامل تھے

(۲۴) زہری تاریخ کے امام ہیں۔ بغیر سند کے ان کے اقوال معتبر خیال کئے جاتے ہیں واقعتاً مستور الحال ہیں۔ ظاہراً مشیخت کے لبادہ میں ملبوس ہیں اُن پر گفتگو کرنا اپنے آپ کو ہدف مطاعن بنانا ہے مگر ہم ایمان بالرسل کے مکلف ہیں۔ اسلئے زہری پر قلم اٹھانا پڑا۔

(۲۵) زہری کسی فقہی مسلک کے امام نہیں ہیں محض تاریخ کے راوی ہیں۔ اُن کا مقام وہ نہیں ہے جو ائمہ مسلک کا ہے۔ اس لئے زہری پر بحث سے کوئی مسلک مجروح نہیں ہوتا۔

(۲۶) زہری ائمہ نقد میں سے نہیں ہیں۔ صرف ناقلین روایت میں سے ہیں۔ جن میں رطب و یابس سب کچھ ہوتا ہے۔

(۲۷) حجیت حدیث کا ضابطہ احکام کی روایات سے متعلق ہو سکتا ہے حجیت روایت کوئی اصول نہیں ہے۔ رطب و یابس میں کیا حجت ہے۔

(۲۸) تلقی بالقبول کا اصول تاریخی روایت میں استعمال نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کا حوالہ بے محل ہے۔

(۲۹) آب سے بیس سال پہلے میں نے اور میرے ساتھیوں نے یعنی مولانا قاری حافظ الیعث اللہ صاحب عثمانی فاضل دیوبند و مولانا حافظ عظمت اللہ صاحب فاضل دیوبند بانی مدرسہ تفہیم القرآن جھنگ صدر نے یہ مرتب کیا تھا۔

(۳۰) یہ دونوں مضمون تحقیق عمر حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ عنہا اور روایت افک عائشہؓ اکٹھے ایکدم لکھے گئے تھے۔ اسلئے حدیث پر ابحاث اکھٹی ہی تھے۔ بعد میں روایت افک بعض علماء کے مشورہ سے علیحدہ کر دی گئی۔ اس لئے قاری کے لئے مناسب ہے کہ پہلے تحقیق عمر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اصولی مباحث پر نظر ثانی کرے۔ پھر اس کتاب کو پڑھے۔

(۳۱) تکرار روایت کے پیش نظر کہیں کہیں۔ استدلال میں تکرار آگیا ہے اس کو دانستہ باقی رکھا گیا ہے تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

(۳۲) بعض جگہ تنقید میں لہجہ سخت ہو گیا ہے اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

(۳۳) شروع میں یہ مضمون ذاتی قلبی تسکین کے لئے لکھا گیا تھا۔ شائع کرنے کا خیال نہیں تھا مگر بعد میں عام فائدے کے لئے تحقیق عمر حضرت عائشہ صدیقہؓ کو شائع کر دیا۔ اس لئے اب حصے کو بھی حسب وعدہ شائع کر رہا ہوں۔

(۳۴) میں ہرگز منکر سنت و حدیث نہیں ہوں۔ یہ صرف ایک تاریخی روایت کی تنقیح اور تنقید ہے۔

(۳۵) زہری پر اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ کتب رجال میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہی نقل کیا گیا۔ یعنے مدلس، مرسل، مدرج ہیں۔

البتہ ان کی مرویات کی روشنی میں ان کو ذو وجہات شخصیت قرار دیا گیا۔ اور دربای

خصوصیات کی بناء پر حزبِ نفاق کا فرد تصوّر کیا گیا۔ یہ آخری صفت ان میں مَیں نے اپنے مطالعہ کی بناء پر معلوم کی۔

جب زہری السابقون الاوّلون کو ایک دوسرے کی زبان سے منافق کہلواتے ہیں۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان کی یہ گفتگو نقل کرتے ہیں اور ان کی ساری گفتگو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی زبان سے ادا کراتے ہیں۔ تو اب ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ زہری کی روایت پہ اعتماد کرکے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کو بے اثر تصوّر کریں۔ السّابقون الاوّلون کو جاہلیت میں گرفتار۔ بے کردار۔ نبی کی شان میں گستاخ خیال کریں اور ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپس میں حاسد تریا چلتر کی ماہر اور نبی علیہ السلام کی صحبت سے غیر مستفیض بے اثر کوری دنیا دار بیویاں تسلیم کریں اور سورۂ احزاب کی آیت

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۔ ترجمہ: تحقیق مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرماں برداری والے مرد اور فرمان برداری کرنے والی عورتیں اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد او عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنیوالے مرد اور خیرات کرنیوالی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالےٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

کی مبیّنہ صفات سے ان کو عاری اور بے گانہ خیال کریں۔ یا زُہری کی اس روایت کو ناقابلِ اعتماد تصوّر کر کے زہری کو حزبِ نفاق کا فرد تصوّر کریں اور روایت افک عائشہؓ کو زہری کا خود ساختہ افسانہ سمجھ کر اپنے ایمان کی حفاظت کریں اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے مایوس اور حضرات صحابۂ کرام رضہ سے بدظن نہ ہوں۔ ہم نے روایت زہری کو ناقابل اعتماد قرار دے کر اپنے آپ کو سوئِ ظن سے بچا لیا ہم نے اھون البلیتین کا راستہ اختیار کیا۔ صحابہؓ و صحابیاتؓ کے کردار کو مشکوک خیال کرنے سے یہ بہتر ہے کہ راوی روایتِ افک زہری کے کردار کو مشکوک قرار دیں ہم ایمان بالرسول کے مکلّف ہیں ایمان بالزہری کے مکلّف نہیں ہیں۔

۳۶۔ تاریخی روایات میں محدثین کے نزدیک بھی جرح و قدح کی گنجائش ہے صحاح ستّہ میں کسی تاریخی روایت کے آنے سے اس کی اہمیت نہیں بدل جاتی وہ روایت تاریخی ہی رہتی ہے۔ اس کی صحت و سقم کا دار و مدار سند کے رواۃ پر ہے ان کو دیکھا اور پرکھا جائے اسی سے روایت کا درجہ متعیّن ہو گا۔

۳۷۔ ہر مصنّف سند بیان کر کے بری الذمّہ ہو جاتا ہے۔ سند بیان ہی اس لیے کی جاتی ہے کہ دیکھو اور پرکھو۔ یہ خبر احاد ہیں ان کا مرتبہ آیاتِ منزلہ کا نہیں ہے۔

۳۸۔ ہر استدلال میں مجالِ گفتگو ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس روایت پر تمام مباحث احقاق حق کے لیے ہیں۔ اگر اہلِ علم مجھے کسی کوتاہی پر مطلع فرمائیں گے۔ ممنون ہوں گا۔ وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء

۳۹۔ اس تاریخی روایت کی تحقیق محض تاریخی حیثیت سے ہے اس کا تعلق کسی مکتب فکر سے نہیں ہے۔

زہری کی مختلف فیہ شخصیت

یہ مضمون بھی حکیم نیاز احمد صاحب فاضل دیوبند کی کتاب روایت افک کے صہ ۲۲۶ تا صہ ۲۵۹ سے ماخوذ ہے۔ (طاہر)

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اصحابی کالنجوم کی سچی خبر دی ہے جو حضرات صحابہ کرامؓ کے لئے درحقیقت ایک سندِ مقبولیت ہے۔

صادق و مصدوق صلے اللہ علیہ وسلم کی اس سند کے بعد ہر صحابیؓ کی سیرت ستاروں کی طرح جگمگاتی ہوئی صاف و شفاف منوّر و منیر بے داغ، بے غبار اور قابلِ استناد و اعتماد ثابت ہو جاتی ہے۔ اور کسی راوی یا مؤرخ و محقّق کے لئے ان پر نکتہ چینی اور حرف گیری کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔

ہم "اصحابی کالنجوم" اور "الصحابۃ کلھم عدول" کی روشنی میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین پر رُواۃ کو توقربان کر سکتے ہیں لیکن رُواۃ کو معصوم عن الخطاء سمجھ کر ان کے ہاتھوں صحابہ کرام رضؓ کی سیرت ہائے مطہرہ کو مشکوک اور داغدار کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔

ہماری کتاب "عمر نکاح حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ" کا نہایت اہم اور مثبت حصّہ ہنوز باقی ہے۔ مگر ہم اس حصّے کو شروع کرنے سے پہلے شان رسول صلے اللہ علیہ وسلم و حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کھیلنے والے زہری کی خود اپنی شان گرامی کا ایک متعلقہ حصّہ آپ کے سامنے لانا مقدّم سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ زیر بحث روایت زہری (یا داستان زہری) کا پس منظر اسکے بغیر تکمیل پا ہی نہیں سکتا۔

زہری ایک مختلف فیہ مشکوک اور ذوالوجہین شخصیت ہیں اور اس کی وضاحت یہ ہے۔

۵۸ھ تا ۱۲۴ھ

زہری کی پیدائش سن ہجری کے عشرہ خامسہ یعنی ۵۸ھ میں ہوئی۔ بعض علماء رجال کے بیان کے مطابق حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سال پیدا ہوئے اور وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی۔

زہری کے والد بنواُمیہ کے سخت مخالف تھے

تعلیم و تربیت بنواُمیہ کے مخالف ماحول میں پائی، ان کے والد مسلم، مُصعب بن زبیر کے متوسلین میں سے تھے۔ مُصعب آخر دم تک بنو مروان سے برسرِ پیکار رہے۔ یہ اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر رضؓ کی طرف سے ان کی خلافت کے زمانے میں عراق کے مختلف علاقوں میں گورنر رہے اور آخر میں کوفے کے گورنر تھے کہ شہادت پا گئے۔

مصعب بن زبیر اصل میں اپنے بھائی کی خلافت سے پہلے امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھی تھے۔ ان کی شہادت کے بعد علویوں کا کوئی محاذ نہ رہا تھا۔ لہٰذا ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا۔ کہ یزید کے خلاف اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ ہو جائیں۔ اور یزید کے خلاف جنگ برپا کریں۔

مصعب بن زبیر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ مصعب کی محبوب ترین اور قابلِ فخر بیوی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی پیاری بیٹی سکینہ تھیں۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ اس وقت قریش کا حسین ترین جوڑا یہ ہی دونوں میاں بیوی تھے۔

چونکہ مصعب کے نزدیک اس سلطنت کی بنیاد ہی ظلم و استبداد پر تھی۔ اور ان کے خسر یعنی چہیتی بیوی کے باپ کے قاتل یہ ہی لوگ تھے۔ اسلئے مُصعب نے جان دینا گوارا کیا مگر عبدالملک بن مروان کے ساتھ مصالحت گوارا نہ کی، حالانکہ عبدالملک اور مصعب کے درمیان بچپن ہی سے دوستی اور محبّت قائم تھی۔

عبدالملک نے آخر تک ہر ممکن کوشش کی کہ بہادر مصعب میرے ساتھ مل جائے پرانی دوستی کے واسطے دیئے۔ انجام سے ڈرایا لیکن مصعب نے اپنا مقام نہ چھوڑا یہاں

تک کہ شہید ہو گئے ۔

عبدالملک : افسوس کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ مصعب سے بہادر کہاں پیدا ہوگا لیکن سلطنت کی کوکھ بانجھ ہوتی ہے ۔ (لکن الملک عقیم) اس میں رأفت و محبت سے بھری رہ جاتی ہے ۔

زہری کے والد مسلم آخر تک مصعب کے ساتھ رہے اور بنو مروان کی مخالفت میں کبھی ہاتھ سے تلوار نہیں چھوڑی، ان کے سلطنت کے تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ان کی سلطنت کے انہدام میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ساری زندگی ان کی مخالفت میں صرف کر دی ۔

زہری مروانیوں کے اس مخالفت ماحول میں پیدا ہوئے اور اسی مخالف ماحول میں پرورش پائی ۔ بنو مروان کی نفرت ان کی گھٹی میں شامل کی گئی تھی ۔ ان کے دشمنوں سے محبت اس کا لازمی نتیجہ تھا ۔ مظلومیت حسین رض کا احساس بھی بد شعوری ہے ان پر اثر انداز رہا ۔ مزید برآں امام سجاد علی بن حسین کی تعلیم اور صحبت اور زہد و اتقائے نے زہری پر اتنا گہرا رنگ چڑھایا کہ آگے چل کر وہ رنگ اگرچہ اوپر اوپر سے کچھ دھل تو گیا تھا ۔ لیکن اندر اندر باقی ضرور رہا ۔

اس وقت مدینہ منورہ مرکز علم تھا ۔ جو لوگ وہاں اسوقت مرجع علم تھے ۔ ان کی اکثریت بنو مروان کے طور طریقوں کو پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ آزادی رائے جس کی تربیت لوگوں نے شروع اسلام سے آج تک حاصل کی تھی ۔ بنو مروان کے دور میں سوال زوال پذیر ہو رہی تھی ۔ لوگ اس حبس ضمیر سے گھٹن محسوس کرتے تھے ۔ حق کہنا مصائب کو دعوت دینے کے مترادف نظر آنے لگا تھا ۔ اس سے پہلے واقعہ حرہ پیش آچکا تھا جس کی تلخی ساکنانِ مدینہ کے کام و دہن میں تازہ تھی ۔ حادثہ کربلا کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا ۔ اس کے اثرات عامۃ الناس اور علماءِ کرام کے قلوب پر ثبت تھے ۔ بقیۃ السیف اہل بیت بھی مدینہ منورہ ہی میں قیام پذیر تھے ۔ جن کی بیکسی اور بے بسی کو دیکھ کر اہلِ مدینہ اندر ہی اندر کھولتے تھے ۔ مگر کچھ نہ کر سکتے تھے ۔ بنو مروان نے رُوحِ اسلام کے خلاف

ملوکیت کی بنیاد رکھی تھی اور جاہلی عصبیت کے زیر اثر اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے۔ غرض مجموعی اور ہنگامی حیثیت سے مدینہ منورہ کی پوری فضا بنو مروان کے خلاف تھی۔

زہری کی تربیت و تعلیم بنو مروان کے مخالف ماحول میں ہوئی۔

زُہری حصول علم کے لئے جب مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں کی فضا ان کے مزاج کے مناسب تھی۔ اس وقت عمال بنو مروان اپنی سلطنت کے استحکام میں منہمک تھے اور اس مقصد کے لئے ہر قسم کی تعدی کر گزرتے تھے اور زہری کے مدنی اساتذہ بھی کسی نہ کسی درجے میں ان کے مظالم کا شکار ہونے کی وجہ سے ان کے شاکی اور ان سے متنفر تھے۔

مثلاً زہری کے اُستاد سعید بن المسیب جو مدینہ کے تابعی علماء میں اس وقت سب کے سرتاج تھے۔ بنو مروان سے سخت نالاں تھے۔ کیونکہ عبدالملک اپنے لڑکے ولید سے ان کی لڑکی کا رشتہ چاہتا تھا۔ مگر انہوں نے نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ ایک نہایت غریب مگر صالح آدمی ابو زراعہ سے فوراً ہی لڑکی کا نکاح کر کے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ جس پر عبدالملک نے نہایت برہم ہو کر حکام مدینہ طیبہ کو ہدایت کر دی تھی کہ سعید بن المسیّب کے ساتھ نرمی نہ برتیں۔ دوسری مستقل وجہ ناراضگی یہ بھی تھی کہ وہ بنو مروان کی خواہشات کے خلاف فتوٰی دینے اور کلمۃ الحق کہنے سے کبھی باز نہیں رہتے تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر وہ ہمیشہ بنو مروان کے معتوب اور عمال کے ہاتھوں سخت جسمانی اور روحانی اذیتوں کا شکار رہے۔ یہاں تک کہ انہیں دُرّے بھی مارے گئے اور سخت سردی میں ٹھنڈے برف آب سے اُن پر آب ریزی بھی کی گئی۔

دوسرے اُستاد حضرت امام زین العابدین علی بن الحسین رضی اللہ تعالےٰ عنہ پر مدینہ منورہ میں بنو مروان کی کڑی نگرانی تھی۔ وہ ان کی ذات کو اپنی سلطنت میں بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔ ان کے متعلق ہمیشہ بیجا شبہات میں گرفتار رہے۔

اپنے اساتذہ کی مظلومیت سے زہری کا متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ وہ اس سے بدرجۂ

اتم متأثر ہوئے۔

اس کے علاوہ اس وقت حجّاج کی سخت گیری کا عام چرچا تھا۔ جس نے زہری کے تنفّر کو مزید استحکام بخشا۔

اس ماحول میں زہری کے دل و دماغ کا جو سانچہ تیار رہوا اس میں بنو مروان کے متعلق آخر تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور مظلومیت حسینؓ کا جو گہرا رنگ ابتداء سے ان کی طبیعت نے قبول کیا تھا۔ اس میں عمر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ ماحول اور حالات کے اثرات کی وجہ سے اضافہ تو ہوا۔ لیکن کمی بہت کم آئی۔

زہری کی حضرت زین العابدینؒ سے عقیدت

حضرت امام سجاد زین العابدین کی شخصیت اور ان کے علم و زُہد کا اثر زہری نے اس درجہ قبول کیا کہ زہری کے دل اور دماغ پر ان کی شخصیت پوری طرح احاطہ گیر ہوگئی اور زہری کے نزدیک ان ہی کی ذات حق و باطل کا معیارِ آخر بن کر رہ گئی۔ حضرت سجّاد اپنے کردار اور اپنی عبادت و ریاضت کی وجہ سے مرجعِ اَنام اور مرکزِ خلائق تھے۔ تلامیذ اور مستفیدین کے لئے مطاع اور مقتدا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے سرمایۂ افتخار تھے۔

زہری حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کو بوجوہ مستحق خلافت گردانتے تھے اور اس وقت کے حالات سے متاثر ہونے کی وجہ سے ان کا یہ ہی خیال تھا کہ اگر زمام کار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آتی اور پھر اُن کی اولاد و احفاد میں منتقل ہوتی۔ تو مسلمان مَردانی دَور کے موجودہ ناگفتہ بہ حالات سے دوچار نہ ہوتے۔

زُہری کی عبدالملک کے دربار میں رسائی

زہری تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو طلبِ معاش میں شام چلے گئے۔ وہاں کے حلقۂ علماء میں حاضری دینے لگے۔ ایک روز اتفاق سے ایک اہم مسئلہ عبدالملک کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے وہاں کے علماء سے استفسار کیا۔ زہری نے تسلّی بخش جواب دیا اور اسی بنیاد پر دربار میں پہنچ گئے۔

جب عبدالملک کو یہ بات معلوم ہوئی کہ نووارد مدینہ سے آیا ہے اور مسلم کا بیٹا ہے۔ تو بہت بگڑا اور کہا مجھے تم سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جب کہ تمہارے والد نے ہمیشہ ہماری مخالفت کی ہے اور ہماری سلطنت کی بیخ کنی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

لیکن زہری نے آہستہ آہستہ عبدالملک کا غصہ فرو کر دیا اور اسے اپنے ڈھب پر لے آئے اور اس کا اعتماد حاصل کر لیا اور اپنے علم وفضل کی وجہ سے دربار میں مقام حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ اتالیق مقرر ہو گئے اور پھر ساری عمر انہیں مروانیوں کے دربار میں گزار دی۔

زُہری کا تفاوت قلب وشکم

زہری نے ساری عمر روزی تو بنو مروان سے حاصل کی مگر عقیدت اتنی شدید تھی کہ زہری اسبابِ قریبہ اور واصلہ سے جو امام حسینؓ اور ان کی اولاد سے سلبِ خلافت کی بنیاد تھے۔ نفرت کرنے کرتے ان اسباب بعیدہ، فاصلہ (بلکہ مفروضہ) سے بھی نفرت کرنے لگے تھے جن کا سلب خلافت سے نی الواقع کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔

زہری نے اپنے اسی انتہا پسندانہ ذہن سے ان واقعات کو بھی جو ابتداءً پیش آئے تھے اور جن کا تعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کے سلب خلافت کے ساتھ نہیں تھا۔ سلبِ خلافت کے اسباب میں شامل کر دیا تھا، اور دونوں کو ایک ہی درجہ میں شمار کرتے تھے۔

زُہری کا خود ساختہ تصوّرِ عائشہؓ

علیٰ ہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں قصاص عثمان رضؓ کے سلسلہ میں واقعات پیش آئے تھے اور سبائیوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جو فسادات کئے اور کرائے تھے، جن کا تعلق نہ حضرت علی رضؓ کے دانستہ ارادے سے تھا اور نہ حضرت عائشہ رضؓ سے۔ ان کو بھی زہری نے بعد میں پیش آنے والے واقعات کے لئے ایک تمہیدی سبب قرار دے لیا اور پھر ان اتفاقی واقعات کا رابطہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ابتدائی زندگی

کے واقعات سے ملا کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی حضرت علی رضؓ کے خلاف تھیں اور ہر اہم معاملہ میں ہمیشہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرتی رہیں۔ اور خالکم بدہن کج فطرتی کیوجہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر بھی اثرانداز ہونے کی کوشش کرتی رہیں۔ اور ڈانٹ بھی سنتی رہیں لیکن باز نہیں آئیں۔

زُہری کا غلو فی ذمِّ عائشہ رضؓ

چونکہ زہری کے خیال میں حضرت عائشہ رضؓ ابتداءً ہی سے ذہنًا حضرت علی رضؓ کے خلاف تھیں۔ اسلئے ہمیشہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور آپؐ کی وفات کے بعد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالف رہیں۔ اسی لئے زہری نے سابقہ اسباب خلافت میں حضرت عائشہ صدّیقہ رضؓ کی اس مفروضہ مخالفت کو بھی رکھ لیا اور اپنی نفرت کا دائرہ اسبابِ قریبہ سے بڑھا کر اسباب سابقہ تک پہنچا دیا۔ حُبِّ علیؓ کے غلو میں بغض وعنادِ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا تک پہنچ گئے۔

زُہری کا دَورِ عُروج دوسری صدی ہے

زہری نے اپنی روایات کو تحریری شکل دی، اور آخری عمر میں ہی احادیث کے چھوٹے چھوٹے مجموعے تیار ہوئے اور اساتذہ کیطرف سے تلامذہ کو اجازت کے ساتھ دیئے جانے لگے۔ انہیں اسوقت صحیفہ کہا جاتا تھا۔

زہری نے جو کچھ لکھا، سو سال بعد لکھا

زہری کے بیشتر تلامذہ جن کو زہری کے علوم میں اضبط اور اتقن بیان کیا جاتا ہے۔ پہلی صدی ہجری کے بالکل آخر کی پیدائش ہیں۔ مثلاً امام مالک رحؒ ۹۵ھ معمر بن راشد ۹۶ھ وغیرہ یا دوسری صدی کے شروع میں پیدا ہوئے۔ جیسے سفیان بن عیینہ ۱۰۷ھ وغیرہ

لہٰذا روایت زہری میں بیشتر وہی لوگ ہیں جنہوں نے بالکل اخیر عمر میں زہری سے سماعت کی۔ اسلئے کہ زہری کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی۔

دوسری صدی ہجری کے ابتداء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات کے عینی شاہد یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو وفات پا چکے تھے اور صحابۂ کرام رضی سے براہ راست استفادہ کرنے والے تابعین بھی وفات پا چکے تھے۔ واقعات کے دھندلے سے اشارات اذہان میں موجود ہوں گے۔ جن کے خلاف زہری نے اپنے ذہن سے پورے کر دیئے اور روایت خوشنما بھی ہوگئی اور مربوط بھی۔

تشنہ واقعات کے خلاء کو زہری نے اپنے مخصوص ذہن سے پُر کیا

اس لئے نفسِ واقعہ کے علاوہ جس قدر توجیہات اور اسباب وعلل اور ان کے نتائج کا روایات میں بیان ہے۔ وہ سب کچھ زہری کا اپنا ہے اور زہری اپنے دَور کے جذبات واحساسات سے پوری طرح متأثر تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو واقعات پیش آئے اور جن اسباب کے تحت پیش آئے وہ اسباب بالکل دوسرے تھے۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تمام اُمور کا مرجع اور مرکز تھے۔ ہر معاملہ میں آپؐ کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا تھا۔ آپؐ کے وصال کے بعد ذمہ داری خود حضرات صحابۂ کرام رضی پر آ پڑی تو وہ بھی قرآن وسُنّت کی روشنی میں اپنے علم اور صوابدید کے مطابق فیصلے کرنے پر مجبور ہوئے۔

زہری نے ہنگامی حالات کو مستقل تاریخی حیثیت دی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد جو واقعات پیش آئے وہ سب ہنگامی فطرت کے واقعات تھے۔ تھوڑی سی علالت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا صدمہ اور شدہ انقطاع وحی کیوجہ سے صحیح نتائج تک پہنچنے کی روشنی کا فقدان اور ملّت کے شیرازے کو متحد کرنے کا تردّد ایسے اُمور تھے۔ جن سے فوری اور اچانک واسطہ پیش آگیا۔ اس وقت کسی کے

دل میں بھی یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ امیر بنے بلکہ یہ فکر تھی کہ کوئی انتشار پیدا نہ ہو۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے سلسلہ میں رنگ آمیزی

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین ابھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین میں ہی مشغول تھے۔ اور آپ کی وفات کے صدمہ سے بحال نہیں ہوئے تھے کہ اطلاع ملی کہ انصار میں سے کچھ لوگ سقیفہ بن ساعدہؓ میں جمع ہیں اور اپنے میں سے کسی شخص کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ نامزد کرنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجرّاح رضی اللہ عنہم سب حاضرین کے مشورہ سے فوراً وہاں پہنچے کہ مبادا انصار عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔ وہاں جا کر جو صورتحال ان حضرات نے دیکھی اور جو گفتگو وہاں ہوئی۔ اس سے یہ ہی عیاں تھا کہ انصار یہی چاہتے تھے کہ ہم نے اسلام کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ہمارے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ انصار نے ان حضرات کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک امیر تمہارا ہو اور ایک ہمارا (منّا الامیر ومنکم الامیر) اس طرح ہمارے اور تمہارے حقوق برابر ہو جاتے ہیں اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی۔ وہاں کسی فردِ خاص کا معاملہ نہیں تھا۔ بلکہ مہاجرین و انصار کا معاملہ تھا۔ لیکن انصار کی یہ تجویز عملی حیثیت سے چلنے کے قابل نہ تھی۔ اس کا نتیجہ انتشار تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھیوں نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہ امیر ایک ہی ہوگا دو نہیں ہو سکتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مُدلّل گفتگو کا ماحصل یہ ہی تھا کہ امیر ایک ہی ہوگا۔ سقیفہ بنی ساعدہ کی تمام گفتگو اسی میں دائر رہی کہ اگر مہاجرین میں سے امیر نہ بنایا گیا تو نتیجہ انتشار ہوگا۔

انصار کو ان کے حقوق کی حفاظت کا یقین دلا دیا گیا۔ جب وہاں گفتگو طول پکڑ گئی۔ اور مجمع بڑھنے لگا۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے مسئلے پر غور کرنے کے بجائے بات چیت میں جذبات کا رنگ آگیا۔ تو ان لوگوں نے اس مسئلے کو اس حالت

میں ناتمام چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور فوری فیصلہ کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر وہیں بیعت کر کے اعلانِ خلافت کر دیا گیا۔ انصار نے بھی بیعت کر لی اور معاملہ طے ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان سابق مشورے کی بناء پر تھا

تاریخ میں جو یہ مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ساتھی اچانک انصار کے اجتماع کی خبر سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے غلط ہے۔ یہ لوگ مشورہ کرنے کے بعد وہاں گئے تھے اور یہ طے کر کے گئے تھے کہ جیسے حالات ہوں۔ ویسا کر لینا چاہیئے۔ مشورے میں تمام اکابر صحابہ کرام اور بنو ہاشم شریک تھے۔ وہاں سے آکر اس فیصلے سے سب کو مطلع کر دیا اور سب نے اسے تسلیم کر لیا۔

اس موقع کے منتشر جملوں سے بعد والوں نے جو تاریخ مرتب کی ہے اور اب اس نے جو اشاعتی اور تحریری تواتر کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔ وہ مقتضائے حال اور سقیفہ بن ساعدہ کے مجمع کی گفتگو سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لئے یہ بات متعین ہے کہ اس مشورے میں تمام مہاجر صحابۂ کرام شریک تھے۔

میراثِ نبیؐ کے مسئلہ میں رنگ آمیزی

اسکے بعد جناب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا معاملہ پیش آیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بتلا دیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ ما ترکنا صدقہ ذاتی جائیداد آپ کی کوئی نہیں تھی، بحیثیتِ امیرِ ریاست کے آپؐ جو کچھ خرچ ریاست کے ذرائع سے لیتے تھے۔ اس کے متعلق آپؐ نے خود ظاہر فرما دیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیان سے سب مطمئن ہو گئے تھے اور یہ معاملہ بھی ابتداء ہی میں طے ہو گیا تھا۔

میراث کے ضابطے سے تین فریق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جائیداد کے حقدار بنتے تھے۔ ازواج، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ بحیثیت ذوی الفروض

کے، اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بحیثیت عُصبہ کے اور تینوں ہی حضرات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جواب سے مطمئن ہو گئے تھے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ میراث کے معاملہ کو اتنی ہوا کیوں دی گئی۔ حالانکہ سہام کے لحاظ سے ازواج کا حصّہ نکالنے کے بعد حضرت عباس اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے اپنے سہام کے حقدار تھے۔ لیکن عباسیوں نے کبھی اسکے لئے کوشش نہیں کی اور نہ اس بنیاد پر کبھی کسی پر زبانِ طعن درازکی (لیکن شیعانِ علی رضؓ نے اور ان کے متبعین نے اسے سرمایۂ زیست بنالیا۔)

خلافت و شہادتِ عثمانؓ کا اثر تاریخ اسلام پر

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔ حضرت عمر بن الخطاب رضؓ نے انتخاب کے لئے صحابۂ کرام رضؓ میں سے ایک جماعت مقرر کر دی تھی جنہوں نے حضرت عثمان رضؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ ان کی خلافت کے آخری دَور میں مرکز کی گرفت میں نرمی کے باعث ایسے واقعات پیش آئے جن کا وقت پر سدّ باب نہ ہو سکا۔ اور فتنہ پردازوں کو من مانی کرنے کا موقع مل گیا اور نوبت بہ شہادت امیرالمؤمنین رسید۔

ان حالات میں شہادت عثمان رضؓ کے بعد حضرت علیؓ نے عنان اختیار ہاتھ میں لے لی، مگر حالات اس قدر ابتر ہو چکے تھے کہ فی الفوران کی اصلاح مشکل تھی حضرت عثمان رضؓ کی مظلومانہ شہادت کے باعث جذبات متلاطم تھے۔ قاتلین عثمان رضؓ نے حضرت علی رضؓ کے جھنڈے تلے پناہ لی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ گروہ گرفتار ہو کر کیفر کردار کو پہنچیں ان حالات میں قصاص عثمانؓ کا مسئلہ اہمیت پکڑ گیا جس نے بعد میں سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ یک روزہ حادثہ جمل کو جذباتی راویوں نے خواہ مخواہ تاریخ کا ایک موڑ بنا دیا۔

...ت عثمان رضؓ کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مکے میں تھیں خبر سُن کر ...بد متاثر ہوئیں کہ کچھ اس تاثر کی شدّت میں ان کی نسوانی فطرت کا بھی حصّہ تھا کہ قصاص

عثمان رضؓ کا فوری مطالبہ کیا ۔ اپنے متعلقین کو قصاص کے لئے جد و جہد کی ہدایت کی ۔ اور خود بھی اس کی کوشش میں مکہ سے براہِ راست بصرہ تشریف لے گئیں ۔

اگرچہ اس قتل کی سازش میں ان کے اپنے بھائی محمد بن ابی بکر کا نام بھی لیا جاتا تھا ۔ لیکن انہوں نے مطالبۂ قصاص میں اپنے بھائی کی بھی پرواہ نہیں کی ۔

سبائیوں کی فتنہ پسندی

جس سبائی گروہ نے اپنی جان بچانے کے لئے شیعانِ علی رضؓ میں شرکت کی تھی ۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بصرے میں آپ کے خلاف لشکر جمع ہو رہا ہے ۔ فتنہ کے سر اٹھانے سے پہلے ہی اس کا سر کچل دینا ضروری ہے ۔ اسلئے ہمیں بھی جلد بصرے پہنچ جانا چاہئے ۔ چنانچہ حضرت علی رضؓ بھی اپنی جمعیت کے ساتھ بصرے پہنچ گئے ۔

بعض اکابر صحابۂ کرام رضؓ کی کوششوں سے یہ امید تھی کہ معاملہ افہام و تفہیم سے طے ہو جائے گا ۔ لیکن سبائی بلوائیوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر ان حضرات کی آپس کی غلط فہمیاں دُور ہو گئیں تو پھر ہماری خیر نہیں ہے ۔ مفاہمت کے راستے میں عوائق پیدا کئے اور اشتعال انگیز بے بنیاد افواہوں کے ذریعے فریقین کو ایک دوسرے سے دُور رکھنے کی کوشش کرتے رہے ۔ اور جب اس میں بھی انہیں ناکامی دکھائی دینے لگی تو آخری سازش یہ کی کہ رات کی تاریکی میں اپنے آدمیوں سے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے کیمپ میں حملہ کروا دیا جس نے فریقین کی لاعلمی اور غلو ذہنی کی حالت میں ایک حادثاتی جھڑپ کی صُورت اختیار کر لی جس پر ہر دو فریق نے اسی دن قابو پا لیا ۔ اس لئے کہ ان دونوں میں سے ایک بھی جنگ کے لئے تیار نہ تھا ، اور زیادہ سے زیادہ جو متنازعہ تھا وہ تعجیل قصاص اور التوائے قصاصِ عثمان رضؓ کا تھا ۔ یہ یک روزہ حادثہ تھا جو اسی دن شام کو ختم ہو گیا ۔

بات صرف اتنی سی تھی ۔ جسے فتنہ پسندوں نے اور تاریخ بازوں نے داستان امیر حمزہ بنا کر رکھ دیا اور بزعمِ خویش تاریخ پر بہت بڑا احسان کیا ۔ حالانکہ نگاہ صداقت و تحقیق میں انہوں نے احسان کے بجائے تاریخِ اسلام کو داغدار کیا ہے اور ایسے

داغ دھبوں کا دور کرنا سلیمُ الفِکر مؤرخین اسلام کا اوّلین فرض تھا۔ جو پورا نہیں کیا گیا۔

مسئلہ قصاصِ عثمانؓ پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں تھا

مطالبۂ قصاص سے پہلے بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ حادثۂ جمل کے بعد بھی کبھی اختلاف نہیں ہوا اور اس مطالبۂ قصاص کے وقت بھی کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں تھا۔ خون عثمان کو ہدر اور رائیگاں دونوں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ قصاص پر دونوں متفق تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فوری قصاص کے حق میں تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہنگامی حالات کے پیشِ نظر تاخیر قصاص کو قرینِ مصلحت سمجھتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہا ہی پہ کیا موقوف ہے صحابہ کرام میں سے کون ایسا تھا جو قصاص نہ چاہتا ہو۔ بافوری یا درتاخیر کے بارے میں اپنی کوئی ایک رائے نہ رکھتا ہو۔

بلاشبہ یہ ایک شخصی مسئلہ کی حد سے گذر کر ملّی سطح کا مسئلہ بن چکا تھا اور اسکے بارے میں قومی سطح پر ہی سوچا جا رہا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اور اکابر صحابۂ کرام کی ایک تعداد اس مؤقف پر تھی کہ فوری قصاص لے لیا گیا تو ہنگامہ ختم ہو جائیگا اور حضرت علی اور (اشیائے علی) کا موقف یہ تھا کہ بلوائیوں کے ہنگامی جذبات فوری قصاص کو بجائے خود کسی اور ہنگامے کی بنیاد بنالیں گے۔ اس لئے قصاص سازگاری حالات تک مؤخر کر دینے ہی میں قومی مفاد ہے۔

اس اختلاف کو زیادہ سے زیادہ اختلاف رائے کا نام دیا جا سکتا ہے اور اسی اختلاف رائے کو حضرت علی رضؓ پر مؤثر انداز میں پیش کرنے کے لئے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ بصرے

کے اہل الرائے سے مشورہ کرنے اور ان کی ہمنوائی حاصل کرنے کے لئے بصرے تشریف لے گئی تھیں اور براہِ راست مدینہ طیبہ اس لئے تشریف نہیں لے گئی تھیں کہ وہاں کا ماحول ہنگامی اور اشتعال انگیز ہو چکا تھا اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اس مسئلہ کو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ پر سکون ماحول میں طے فرمانا چاہتی تھیں۔

لیکن بلوائی قاتلین یہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں افہام و تفہیم کے بعد ان کے لئے کسی شرمناک موت کا متفقہ فیصلہ صادر کرنے کے قابل ہوں۔ لہٰذا انہوں نے دونوں کیمپوں میں تقسیم ہو کر دونوں ہی کیمپوں کے مطالبینِ قصاص کو راتوں رات قتل کرنے کی سازش بنائی۔ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ پر ان کا قابو چل گیا۔ مگر حضرت عائشہ رضؓ کو اللہ تعالیٰ نے بال بال بچا لیا۔ دن نکلا تو فریقین کے اکابر اس جھگڑے کے فرو کرنے میں لگ گئے اور بالآخر دن کے دن ہی اسے فرو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور خود حضرت علی رضؓ نے حضرت عائشہ رضؓ کو اپنے مخصوص حفاظتی دستے کی نگرانی میں بعزّت تمام مدینہ روانہ فرما دیا۔

جمل کے بعد کے واقعات سے بھی حضرت عائشہ رضؓ غیر متعلق رہیں۔

اس سلسلہ میں جو مزید واقعات بعد میں پیش آئے۔ ان سے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کوئی تعلق نہیں۔ حادثۂ جمل کے بعد حالات نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ واقعہ صفین۔ واقعہ تحکیم، خوارج کی علیحدگی اور اس کے نتائج سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حسنین نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے چند شرائط پر معاہدہ کر کے ان کو امیر تسلیم کر لیا تھا۔ بیس سال تک حضرت معاویہ رضؓ امارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حضرت حسن رضؓ کی وفات کے بعد بھی حضرت حسین حسبِ معاہدہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاون رہے۔

شہادتِ حسینؓ کا جذباتی دَور

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد واقعات نے کروٹ لی۔

اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ ان کی شہادت کے چند سال بعد ہی بنو مَروان برسرِ اقتدار آ گئے۔ پھر پچھتّر سال بنو مَروان نے حکومت کی۔ اس دوران میں دو مرتبہ فاطمیوں نے انہیں اقتدار سے اُتارنے کی کوشش کی۔ لیکن دونوں مرتبہ ناکامی ہوئی۔ حتیٰ کہ بنو مروان کے خلاف ہاشمیوں کے حق میں ایک عمومی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی اور یہ اُس کی نذر ہو گئے۔

اس تحریک کا سارا فائدہ عباسیوں کو پہنچا اور فاطمی پھر بھی محروم رہے۔ غرض یہ تھا تاریخ کا مروان گریز سیاسی دَور جس میں زہری نے آنکھ کھولی اور آخر وقت تک ایک ہی زاویۂ نظر سے تاریخ کا مطالعہ اور تاریخ سازی کرتے رہے۔

اب ہمیں ایک اچٹتی ہوئی نظر اس بات پر بھی ڈال لینی چاہیئے کہ زہری کے دَور میں کتنے مذہبی فرقے وجود پذیر ہو چکے تھے اور زہری کس فرقے سے وابستہ تھے یہ نکتہ ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ رُواۃِ حدیث کسی ملکوتی دنیا کے رہنے سہنے والے نہیں تھے۔ سب ہماری طرح جذباتی انسان تھے۔ اُن کے دَور کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی عوامل ان پر اسی طرح اثر انداز تھے جس طرح ہم اپنے دَور میں ان عوامل کا اثر محسوس کرتے ہیں۔

زہری کی پیدائش سے پہلے ناصبی، شیعہ اور خوارج تین فرقے پیدا ہو چکے تھے جن میں سے خوارج پورے زور و شور سے آخر تک مَروانیوں سے برسرِ قتال رہے۔

ان پُرانے فرقوں کے علاوہ نئے فرقے جو زہری کے وقت پیدا ہوئے وہ معتزلہ، جبریہ، قدریہ اور مرجیہ تھے۔ اگرچہ اس وقت ان فرقوں کے اُصول و فروع اور مابہ الامتیازات اس منقح صورت میں مرتب نہیں ہوئے تھے۔ جیسے آج کتابوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ان فرقوں کا آغاز ہو چکا تھا۔

پہلی صدی ہجری کے آخر تک فلسفیانہ مباحث کا نہج شروع نہیں ہوا تھا

اس لئے کہ یہ تو عبّاسی دَور کی پیداوار ہے۔ باقاعدہ تصنیف و تالیف کا آغاز بھی ہنوز نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی بنیاد بھی ابوجعفر منصور کے ہاتھوں رکھی گئی

البتہ قرآن شریف کے معانی و مطالب میں گہرے غور و فکر کا رجحان پیدا ہو چکا تھا، تاویل و توجیہہ کا دروازہ کھل چکا تھا۔ سُنّت سے استدلال کا طریقہ رواج پذیر تھا۔

زہری غالی محبّانِ آلِ علیؓ میں سے ہیں

زہری طبقہ رابعہ کے راوی ہیں طبقہ ثانیہ اور ثالثہ سے روایت بیان کرتے ہیں، پہلے دونوں طبقوں کے حالات اور واقعات سے پوری طرح واقف اور متاثر ہیں۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے غالی محبّانِ آلِ علیؓ میں سے ہیں۔

زہری کے وقت میں چونکہ شیعوں کے موجودہ فرقے ہنوز وجود پذیر نہیں ہوئے تھے۔ اسلئے انہیں ان میں سے کسی ایک میں شامل کرنا حقیقت کے خلاف ہے۔

چوتھے امام حضرت زین العابدین کے تلمیذِ خاص ہیں جو اثناءِ عشری اور زیدی۔ دونوں فرقوں کے امام ہیں۔

حضرت زینُ العابدین کے بعد ان کے دونوں بیٹے زیدالشہید اور محمد باقر اپنے اپنے فرقہ کے امام ہیں لیکن زہری کی نظر میں یہ اُستاذزادے اور قابل اتباع ہستیاں ہیں۔

زہری ان کی محبّت میں سرشار اور اُن کے والد کے علوم کے حامل دامین ہیں چنانچہ محدّثین اہل سنّت کے نزدیک زہری کی سب سے زیادہ مستند سند بھی یہی ہے۔ الزہری عن علی بن الحُسین بن علی عن ابیہ عن جدّہٖ۔

زہری اُن کی وجہ سے اپنے ولی نعمت بنومروان سے سخت ناراض ہیں۔ نہ صرف بنومروان اور بنواُمیّہ سے بلکہ حضرت عمرؓ حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا حتیٰ کہ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ سے بھی خوش نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد سے سلب خلافت کا سبب بنے اور قتل علیؓ، قتل حُسینؓ اور قتل زید وغیرہ کا بنیادی سبب ان کے نزدیک یہی

حضرات تھے۔ اگر یہ لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں عجلت کے ساتھ غلط فیصلہ نہ کرتے اور اگر ہو گیا تھا تو بعد میں متفقہ طور سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان لیتے تو ان کے خیال میں واقعات صحیح نہج پر تشکیل پاتے۔

کیا زُہری شیعہ نہیں تھے؟

جو شیعہ یہ کہتے ہیں کہ زُہری شیعہ نہیں تھے وہ درست کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس وقت تک شیعوں کے مسلّمہ فرقے اثناء عشری وغیرہ موجودہ صورتوں کے ساتھ وجود میں نہیں آئے تھے اور مندرجہ ذیل وجوہات بھی انہیں شیعہ قرار دینے میں شاید مانع نظر آتی ہے۔

۱۔ وہ بنو مروان کے درباری اور عبدالملک کی اولاد کے اتالیق تھے

۲۔ جو لڑکے ان کی تربیت سے تیار ہوئے وہ اپنے سے پہلے اُمراء پر ظلم وجور میں سبقت لے گئے۔

۳۔ ساری عمر بنو مَروان کے ایسے وفادار رہے کہ انہیں ان کی نمک حلالی میں کبھی شک وشُبہ پَیدا نہ ہوا۔

۴۔ اکثر علماءِ اہلِ سنّت ان کے تلامیذ ہیں اور ان سے روایات بیان کرتے ہیں۔

۵۔ ان سے ایسی روایات بھی منقول ہیں۔ جو عام شیعہ رواۃ کے منافی ہیں۔

اس لئے جب زہری موجودہ شیعوں کے معیار پر پورے نہیں اترتے تو وہ ان کے شیعہ ہونے ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔

کیا زہری شیعہ تھے؟

لیکن جو شیعہ کہتے ہیں ان کا قول بھی کچھ بے حقیقت اور بے وزن معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ زہری امام رابع امام سجاد زین العابدین کے تلمیذِ خاص اور محب عاشق ہیں۔ روزی سے مجبور ہو کر عبدالملک کے دربار میں چلے تو گئے لیکن ساری عمر وہاں کا اثر نہیں لیا۔

کتمانِ حال کی مہارت

مخالف ماحول میں نباہنے اور اپنا حال پوشیدہ رکھنے میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ مخالف حالات

کو برداشت کرنے کا زبردست ملکہ تھا، ساری عمر بنو مروان کے دربار میں رہے۔ لیکن آخر تک ظاہر نہ ہونے دیا کہ تمہارے مخالف گروہ سے تعلق رکھتا ہوں، وہ حالات سے مجبور تھے اور انہیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔

زہری کی افسانہ طراز فطرت

زہری چونکہ اپنی فطرت اور ذہنی ساخت کے اعتبار سے درباری ذہن کی اور قلبی استعداد رکھتے تھے۔ اسلئے وہ دربار میں بالیدگی اور خوشی محسوس کرتے رہے۔ درباروں میں ایسے ہی لوگ بار پایا کرتے ہیں جنہیں بادشاہوں کے تیور پہچاننے مزاج کے مطابق بات کو بننگڑ بنانے رُخ زیبا کے ساتھ ساتھ بات کا رُخ بدلنے، بگڑتی بات کو فوراً پلٹ کر بنا دینے اور ضرورت پڑنے پر اسے پھر بگاڑ دے۔ نالائق کو لائق ثابت کر کے سفارش کر دینے اور لائق میں کیڑے نکال کر برخواست کروا دینے، مزاج عالی کے تقاضوں کی آبیاری میں فتاویٰ تلاش کرنے اور جواز پیدا کر دینے کی صلاحیتیں اور سلیقے جرأتیں اور حوصلے ہوں۔

ان صلاحیتوں کو لے کر دربار پہنچے۔ پسند آ گئے۔ عمر گزار دی۔ اور شاہی دربار میں رہتے رہتے بالآخر خود بھی مناقب و مثالب کے بادشاہ بن گئے۔ جیسے کہ ان کی سَرویات دراز میں ان کا یہ رنگ کہیں نمایاں طور پر اور کہیں مخفی طور پہ دیکھا جا سکتا ہے۔

زہری کی پیوند کاری

جو واقعات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں سادہ اسباب کے ماتحت پیش آئے۔ پھر جو واقعات شیخین کے وقتوں میں ہنگامی اسباب کے تحت ظہور پذیر ہوئے اور پھر جو حادثات کے بعد دَور فتن میں اپنے اپنے وقت کے تقاضوں سے رُونما ہوئے بلکہ وہ واقعات بھی جو سابقہ اسباب کے بالکل برعکس اسباب کے ماتحت سامنے آ گئے۔ زہری نے ان سب کو ایک ہی سلسلے میں مربوط کر کے ایک مسلسل روداد تیار کی۔ اور اس طرح سابقہ اور لاحقہ وقتی اور معمولی اختلافات کو مستقل اور دائمی اور غیر معمولی اختلافات کی صورت دے کر رکھدیا۔ جسے پڑھنے والا یہی سمجھتا ہے کہ باہمی اختلافات تو خود

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں باقی اور کارفرما تھے۔ اسلئے بعد کا کیا شکوہ اور اب کا کیا صدمہ۔

زہری یہ سب کچھ رعب دربار اور شان ثقاہت کے زور پر کر گئے۔

زہری سرکاری اتالیق اور درباری عالم ہونے کی حیثیت سے مروانی دور کے طبقۂ امراء میں سے تھے۔ خدام اور دربان رکھتے تھے۔ عوام سے الگ رہتے تھے مصنوعی اور چمکدار ثقاہت وجاہت کا خول ان کی اصل شخصیت پر چڑھا رہتا تھا۔ اسلئے کسی شخص کے لئے ان کے صحیح خیالات تک رسائی حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ علاوہ ازیں مخالف دربار میں رہ کر انہوں نے اپنے اندر ضبط و کتمان کا ایک راسخ ملکہ پیدا کر لیا تھا

زہری سے امام مالک رح کے تلمذ کی نوعیت

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کے وقت زہری چالیس[۴۰] کے پیٹے میں تھے۔ جب امام مالک رحمۃ اللہ نے ان سے روایات سنی ہیں تو یہ پینسٹھ اور ستر کے درمیان تھے۔ امام صاحب پر ان کا صحیح کردار اور ان کے صحیح خیال کیا ظاہر ہوتے۔ وہ تو اس وقت نوجوان اور طلب حدیث میں مستغرق تھے اور وہ دور بھی سراسر اخذ حدیث کا دور تھا۔ جہاں سے جو چیز ملی لے لی۔ دور نقد حدیث نہیں تھا کہ وہ روایت کی بھی چھان بین کرتے اور راوی کی بھی۔ جب ایک شخص بلا مزد روایات بیان کرتا تھا۔ تو امام مالک رح ان سے کیوں نہ سنتے اور کیوں نہ لیتے۔

بایں ہمہ تعجب ہے کہ امام مالک رح نے ان سے روایت افک نہیں لی حالانکہ اس روایت کو زہری کے ۲۳، ۲۴ کے قریب تلامیذ ان سے بیان کرتے ہیں۔ اور تقریباً وہ سب کے سب ہی عمر میں امام مالک رح سے چھوٹے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ امام مالک رح نے بھی سنا ہو، مگر سننے کے بعد اسے درخورِ اعتناء نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو۔

زہری راوی بھی ہیں اور مصنف بھی

زہری نے تاریخی واقعات میں مخصوص ذہن استعمال کر کے ان کو افسانہ بنا

دیا ہے، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات بیان کرنے میں غیر محتاط اوران کا کردار بیان کرنے میں گستاخی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں، تاریخ میں روایت بالمعنے کے بہانے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کیطرف غیر واقعی امور کی نسبت کر جاتے ہیں

زہری تاریخی اعتبار سے صحابہؓ کے متعلق خود ساختہ افسانے بیان کرتے ہیں اور ان کی شخصیتوں کو اپنا ذہنی کردار بنا کر ان کی (زبان) سے ایسی ایسی باتیں کہلواتے ہیں۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اوران کا باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

شیعہ اور سنّی اختلافات کے بیشتر مسائل زہری کی روایات نے پیدا کئے ہیں۔ یہ اپنی عقیدت اور اپنی نفرت دونوں کے جوش میں آکر عقیدت اور نفرت دونوں کے ایسے بیج بو گئے جو ان کے بعد تناور درخت بن بن کر ہمیشہ منافرت کے پھل ٹپکاتے اور ملت اسلامیہ کو دو متحارب ملتوں میں تقسیم کرتے رہیں گے۔

طُلّابِ علم نے ان کی ظاہری ثقاہت و وجاہت سے مرعُوب ہو کر ان کی تاریخی دلچسپ روایات کو قبول کیا۔ مُرورِ زمانہ نے انہیں استحکام بخشا اور آج انہیں شہرت اور تواتر کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ فاین المفر من ھذا الخطر

زہری ائمہ رجالِ شیعہ کے نزدیک شیعہ تھے۔

شیعہ محقّقین کا رجحان یہ ہی ہے کہ زہری شیعہ تھے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل حوالہ ظاہر کرتا ہے۔

قَد ذکرہُ علماءُ الجمھور و	علماءِ جمہور نے اس کا ذکر کیا اور اس کی بہت
اثنوا علیہِ ثناءً ابلیغًا وقیل	بہت زیادہ تعریف کی اور کہا گیا کہ اسے حفظ
انہُ قَد حفظ علم الفقہاء	تھے۔ فقہاءِ سبعہ کے علوم اور ہمارے علماء
السّبعۃِ اختلفت کلماتُ	میں اس کی مدح اور قدح میں اختلاف
عُلمائِنا فی مُدحۃ وقدحۃ	ہے۔ اس کی تفصیل صاحب روضات نے
وفصل صاحبُ الروضاتِ	کی۔ وہ ابتداء میں علماءِ اہلِ سنت میں سے تھا

انہ کان فی بدء امرأة من
جُملةِ علماء السُّنَّة وندما
حزبُ الشیطٰنِ اٰراد بھمٖ
عبد المَلک بن مروان
وبنیہِ ثمانّ علمہٗ ووادراکہٗ
ادرکاہُ وارشداہُ الی الحقّ
المُبین فصیراہ فی اٰخر عمرہٖ
من الراجعین إلی الإمامِ
زین العابدین (ع) وفی زمرةِ
المستفدین من برکات
النّفاسة الشّریفة۔
ثمّ ذکر شواھد قولہٗ
ولیسَ مقام ذکرہٗ من اراد فارجع
ثمہٗ ذکر خلافة عبد الملک
بن مروان تتمّہ المُنتھٰی
فی وقائع امام الخلفاء جلد
سوئم منتھی الإمال (بترجمہ

اور شیطان کے ندیموں میں تھا۔ یعنے
عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے
پھر اس کے علم اور وجدان نے اس کی
راہنمائی کی اور سمجھا دیا۔ سیدھا راستہ
اور واضح حق۔ وجدان وعلم نے اسے
پھیر دیا۔ آخر عمر میں امام زین العابدین
کی طرف اور وہ ان کی طرف راجع ہوگیا
اور اس زمرے میں شامل ہوگیا کہ آپ
کی ذات بابرکات سے مستفید ہو رہے تھے
پھر اس نے اپنی بات پر شواہد پیش
کئے۔ یہ ان کے ذکر کا موقع نہیں جو نہیں
معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ وہاں رجوع
کرے۔ ذکر خلافت عبدالملک بن مروان
تتمہ المنتہیٰ امام سوئم کے وقائع میں ہے

کتاب طبقات الخلفاء واصحابُ
الائمہ والعلماء تالیف مرحوم ثقة المحدثین آقائے
الحاج شیخ عباس قمی ص۸۷ محمد بن
شہاب زہری۔
وزاد حبّة من اصحٰب علیٰ
بن الحُسین، وفی ق ـــ

محمد بن شہاب زہری اس کی محبت
زیادہ ہوگئی۔ علی بن حسین رض کے ساتھیوں
میں سے ہے۔ (ق) ابن مسلم جیسا کہ ابھی آتا
ہے۔ اور علی بن خوارزمی نے اپنی کتاب

ابن مسلم کما یاتی . وروی	الکفایہ میں ایک روایت نقل کی ہے .
الثقۃ الجلیل علی بن محمدٍ	جو ابن شہاب کے شیعہ ہونے پر
الخوارزمی فی کتابہ الکفایۃ	دلالت کرتی ہے۔ اور بعض لوگوں نے
روایۃ تدل علیٰ تشیعہ	اس سے نقل کیا ہے کہ وہ علی بن حسینؒ
وروی عنہ البعض علیٰ	سے بارہ اماموں کا قائل تھا۔ اور علی
کون الأئمۃ اثنیٰ عشر	بن حسین رضؓ کی اولاد میں سے مہدیؑ
من علی بن الحُسین وانّ	ساتویں امام تھے۔
المھدی سابع اولادابنہ	

(تتمہ روضات الجنات ذکر زہری)

زہری ائمۂ رجال اہلِ سنّت کے نزدیک شیعہ نہیں تھے۔

کتب رجال اہل سنت میں زہری کے متعلق ہمیں کہیں نہیں ملا کہ یہ شیعہ تھے یا متہم بہ تشیُّع تھے۔ اسی لئے ہم نے ان کو شیعہ نہیں کہا اور ان کے جو خصائل مطالعہ سے معلوم ہوئے وہ ہم نے تحریر کر دیئے۔ ان کی روایات میں جو رطب ویابس پایا جاتا ہے۔ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے مسلک کو متعین کرنا اہل علم کا کام ہے اور ہمیں اپنے متعلق یہ خوش فہمی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم زہری کے مَسلک کے تعیّن سے معذور ہیں۔

ہمارے علماءِ رجال نے انہیں مرسل مُدلس اور مُدرج قرار دیا ہے، ہم بھی اس سے زیادہ نہیں کہتے۔ اہل فن نے بھی اپنے اپنے مطالعہ اور علم کے مطابق مُرسلاتِ زہری کو شرُّ المرسلات کہا ہے اور ہم نے بھی اپنے مطالعہ کی بنیاد پر انہیں اشر المرسلین ہی پایا۔ اور ظاہر کیا ہے۔

ہم زہری کی روایات کے طور پر منکر نہیں ہیں لیکن ان بعض سردیات سے ہمیں سخت اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر ہے۔

زُھری سے ہمارے اختلاف کی تیس وجوہات

۱۔ مختصر روایات کو پھیلا کر بیان کرتے ہیں۔
۲۔ روایات کا سیاق و سباق اپنے ذہن سے تیار کر کے اسے روایت کا جُزو بنا دیتے ہیں۔
۳۔ چھوٹی روایات کو بڑی روایات کا جُزو بنا دیتے ہیں۔
۴۔ روایات میں خوبصورتی اور زور پیدا کرنے کے لئے ایک روایت کے پسندیدہ جملے اٹھا کر دوسری روایت میں جوڑ دیتے ہیں۔
۵۔ توجیہ واقعات اپنی طرف سے کرتے ہیں اور یہ ظاہر نہیں کرتے کہ یہ میرا کلام ہے
۶۔ مشکل الفاظ کی تشریح درمیان میں اس طرح کرتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے وہ بھی روایت کا جزو ہوں۔
۷۔ منتشر واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط روایت بن جاتی ہے۔ حالانکہ یہ ترتیب خلافِ واقعہ ہوتی ہے۔
۸۔ مجمل واقعات کو اس طرح مفصّل کرتے ہیں کہ داستان کی کیفیت پیدا ہو جائے
۹۔ بعض اکابرِ صحابہ رضؓ کا کردار بیان کرتے ہیں گستاخی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔
۱۰۔ واقعات کے خلا کو اپنے ذہن سے پُر کرتے ہیں۔
۱۱۔ دَورِ فتن سے متاثر ہیں اور اسی بیمار ذہن سے سابقہ واقعات کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔ جیسے ابتداءِ اسلام ہی میں ان فتنوں کے اسباب موجود اور کارفرما تھے۔
۱۲ تاریخی واقعات کا بیان اپنے مخصوص معتقدات کی رنگ آمیزی کے ساتھ کرتے ہیں
۱۳۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کی طرف غیر واقعی اقوال منسوب کرنے میں نہایت بے باک اور آخرت کی باز پرس سے بے پروا معلوم ہوتے ہیں۔

۱۴۔ نفسِ واقعہ سے زائد امور کو بھی صحابہ کرام رضؓ کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ اور نبیؐ کی طرف نسبت کرتے ہیں۔

۱۵۔ روایات بیان کرتے میں بلا واسطہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں اور مضمون روایت کو خود متکلم کو زبان سے ادا کروا تے ہیں

۱۶۔ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کو اپنا ذہنی کردار بنا کر جو چاہتے ہیں ان کی زبان سے ادا کروا تے ہیں اور روایت کو افسانہ یا کہانی بنا دیتے ہیں

۱۷۔ تعبیر واقعات میں اپنے دَور کی تعبیرات اور اسالیب کلام برتتے ہیں۔

۱۸۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم اور حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق بیانِ واقعات میں غیر محتاط زبان استعمال کرتے ہیں۔

۱۹۔ مشاجرات صحابہ کو رنگ آمیزی کر کے بیان کرتے ہیں

۲۰۔ سخت مدلّس ہیں۔ سنتے کسی سے ہیں۔ اور منسوب کسی کیطرف کر دیتے ہیں۔

۲۱۔ ضعفاء سے روایات لیتے ہیں۔ اور پھر انہیں درمیان سے نکال کر اُوپر کے قابل قبول راویوں کی طرف نسبت کر کے بیان کرتے ہیں۔

۲۲۔ بعض صحابہ کرام رضؓ سے انہیں خدا واسطے کا بَیر ہے۔

۲۳۔ زہری کی غیر محتاط روایات نے شیعہ سنّی اختلاف کو وسیع کیا ہے۔

۲۴۔ دوسری صدی ہجری کے ابتداء میں جمع روایات کا کام شروع کیا مگر ظاہر یہ کیا کہ یہ روایات صحابہؓ سے اسی طرح آرہی ہیں۔

۲۵۔ درباری ذہنیت کے خوشامدی سرکاری ملازم ہیں۔

۲۶۔ باوجود علم کے بچپن کے ذہنی اثرات سے اپنے آپ کو آخر تک آزاد نہ کر سکے۔

۲۷۔ بچپن کی تعلیم و تربیت سے جو یک رُخی پیدا ہو گئی تھی اور ذہن جس سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ وہ آخر تک علیٰ حالہٖ قائم رہا اور ان کی تحریروں میں اُس کا اثر باقی ہے۔

۲۸۔ دو عملی کا شکار تھے۔ معاش بنو مروان سے حاصل کرتے تھے اور عقیدت

علی بن حسین سے رکھتے تھے۔

۲۹۔ کلمۂ حق کہنے کی جرأت سے محروم تھے اسلئے ساری عمر سلاطین جابرہ (بہ عقیدۂ زہری) کی خدمت میں گذاری۔

۳۰۔ رائی کا پربت بنانا ان کا فن تھا جو درحقیقت کذب ہی کی ایک قسم خفی ہے۔

ہم ایمان بالرُّسل کے مکلّف ہیں ایمان بالزُّہری کے نہیں،

ہم ایمان بالرّسل کے مکلّف ہیں۔ ایمان بالزّہری کے ہرگز نہیں ہیں۔ ہم شانِ نبوت کے تحفّظ کی خاطر زہری پر جتنی تنقید کریں گے۔ داخلِ حسنات ہوں گے۔ لیکن اگر زہری کے تحفظ میں شان نبوت میں استخفاف کا ادنیٰ شائبہ بھی آجائے گا۔ تو وَالَّذِینَ یُؤْذُونَ رَسُولَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیمٌ کی وعید سے ہمیں کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ زہری نے اپنی خود ساختہ روایت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کردار کو اس رنگ میں پیش کیا کہ نعوذ باللہ آپ مَردم شناس نہیں تھے۔ کانوں کے کچے تھے اپنی محبوب ترین بیوی پر اعتماد نہیں تھا۔ شکّی مزاج تھے منافقین کی افواہوں کے زیر اثر آجاتے تھے اور مخالفینِ اسلام کے بہتان کو حقیقت خیال کر کے اپنے معتمد ترین ساتھیوں کی دل آزاری کرتے تھے۔ اور اپنے گھر والوں کے کردار کو مشکوک تک مان لیتے تھے۔ تنک مزاج اور ڈھل مِل یقین تھے۔ منافقین کے بہتان کیوجہ سے ایک ایک مہینہ تک اپنی بیوی سے بات تک نہ کرتے تھے اس کی بیماری کی حالت میں اس سے بے رُخی برتتے تھے۔ (اور حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کے داماد علیؓ اور ان کی بیوی عائشہ رضؓ میں اختلاف ہے۔ تمام صحابۂ کرام کو چھوڑ کر منافقین کے بہتان کے متعلق اپنے داماد کو بلاکر اس سے اپنی بیوی کے کردار کے متعلق تحقیق کرنے کو فرماتے تھے۔ اور حضرت عائشہ رضؓ کو طلاق دینے کا مشورہ کرتے تھے۔ معاذ اللہ! اتنے سادہ تھے کہ اپنی جماعت کے تمام اہل الرائے کو چھوڑ کر

ایک بارہ سال کے لڑکے اسامہؓ سے حضرت عائشہ رضؓ کے کردار کی تحقیق فرماتے تھے اور طلاق کا مشورہ کرتے تھے۔ پھر اپنے داماد کے مشورہ کے مطابق ایک چھوکری باندی سے حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کے مشکوک کردار کی ان کی موجودگی میں تصدیق چاہتے تھے۔ اور ان کا داماد حضرت عائشہ رضؓ کی اس باندی کو سچی بات کہنے پر حضور صلے اللہ علیہ وسلّم اور حضرت عائشہ رضؓ کی موجودگی میں زجر و توبیخ کرتے تھے اور سوکن سے کردار کی تفتیش کرتے تھے۔ مار کر بھرکس نکال دیتے ہیں۔ یعنے جو تو کہہ رہی ہے جھوٹ ہے۔ سچ بول یعنے جھوٹی تہمت کی تصدیق کر لے سے دیکھتے رہے۔ اس محبوب بیوی کے باپ جو افضل البشر بعد الانبیاء ہیں۔ ٹک ٹک دیدم، دَم نہ کشیدم، کی تصویر تھے۔ آپ اس بیوی کے ماں باپ کی موجودگی میں اس باعصمت بیوی کو نعوذ باللہ فرماتے ہیں۔ ان قارفت یعنے اگر تو مرتکب زنا ہوئی ہے۔ یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کا قدیم ساتھی اپنی باعصمت لڑکی کی صفائی میں ایک کلمہ تک نہیں کہتا اسے یہ خدشہ ہے کہ کہیں .... دشمنوں کی بات صحیح نہ ہو۔ اور گویا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کی تبلیغ اور تربیت قطعی بے اثر تھی۔ جن لوگوں نے آپؐ کو بلایا تھا۔ اور آپؐ کی وجہ سے تمام عرب کا ہدف بنے تھے۔ وہ تک اس معاملہ میں منافقین کی حمایت کرتے تھے۔ جب آپؐ نے مسجد نبوی میں رئیس المنافقین کی ایذاء کا ذکر کیا اور اس کے تدارک کے لئے کہا تو اوس کے قبیلے کے سردار نے آپؐ کو حمایت کا یقین دلایا۔ یہ چھوٹا قبیلہ تھا اور بڑا قبیلہ خزرج کے سردار نے منافقوں کی حمایت کی اور دونوں قبیلے آپؐ کی موجودگی میں ابھی آپؐ منبر پر ہی تھے کہ مسجد نبوی میں تو تو نکار پر اُتر آئے اور تلواریں سونت لیں۔ آپؐ نے اپنی شکایت کو بیچ میں چھوڑا بڑی مشکل سے دونوں قبیلوں کو ٹھنڈا کیا۔ پہلے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ آپؐ کے فدائی تھے مگر اب باغی ہو گئے تھے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ آپؐ کے قریب ترین ساتھی بھی حضرت عائشہ رضؓ کے کردار کے متعلق مشکوک تھے۔ مثلاً مہاجرین میں آپؐ کے قریبی رشتہ دار مسطح بن اثاثہ، ہاشمی آپؐ کی پھوپھی زاد بہن

حمنہ حضرت علی رض اور اُن کے ہم خیال اور انہوں نے آپؐ کو حضرت عائشہ صدیقہ رض کے چھوڑ دینے کا مشورہ دیا اور انصار میں سے سعدؓ بن عبادہ اور ان کا پورا قبیلہ منافقین کے ساتھ تھے۔ اور اس جھگڑے نے ثابت کر دیا کہ ان پر آپؐ کی تعلیم و تربیت کا کوئی اثر نہ تھا اور اِسلام کے مشہور شاعر حسانؓ بھی منافقوں کی تہمت میں شریک تھے۔ حالانکہ سعدؓ بن عبادہ قدیم الاسلام ہیں۔ ہر روز دودھ کا ایک بڑا پیالہ آپؐ کو بھیجا کرتے تھے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ آنے کی دعوت دینے والوں میں سے تھے۔ کسی غزوہ سے غیر حاضر نہیں رہے اور حسانؓ بن ثابت اسلام سے شاعری کے محاذ کے سپہ سالار تھے۔ مگر آپؐ کی تعلیم و تربیت کے اثر سے کورے رہے نعوذ باللہ من ذٰلک۔

آپؐ نعوذ باللہ اتنے غافل تھے کہ بیوی کو سفر میں پیچھے چھوڑ آئے اور آپؐ کو پتہ تک نہ چلا اور معاذ اللہ حضرات صحابۂ کرام رض اتنے لاپرواہ اور نادان تھے کہ خالی ہودج اونٹ پر رکھ دیا۔ اور لاپرواہی سے چل دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت عائشہ رض اتنی لالچی تھیں کہ منکوں کے ہار کی تلاش میں رکی رہیں۔ اور قافلہ نکل گیا۔ یہ نہیں کیا کہ قافلہ جو ابھی چلا تھا۔ جلدی چل کر اس تک پہنچ جاتیں حالانکہ قافلہ کا گرد و غبار سامنے تھا۔ اور اتنی بے حس تھیں۔ کہ وہیں جنگل میں پڑ کر سو رہیں اور اتنی بلیدۃ الذہن تھیں کہ ایک مہینہ تک آنحضرتؐ کی بے توجہی کو نہ بھانپ سکیں سارے مدینہ کی بستی کو اس افواہ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا مگر ایک مہینہ تک حضرت عائشہ رض اس سے بے خبر رہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج ایک دوسرے سے کد رکھتی تھیں اور آپؐ اور آپؐ کے اصحابؓ اس معاملہ میں اتنی دور جا چکے تھے اور بہک گئے تھے کہ اہدنا الصراط المستقیم کی دعائیں تک بے اثر رہیں۔

یہ روایت اِسلام کی روح کے خلاف اس مندرجہ بالا مضمون پر مشتمل نقل کی بنا پر محدثین کے نزدیک مقبول ہے اور اسی روایت کا اجمال قلت نقل کی بناء پر شاذ ہے۔

میرے نزدیک اس روایت کے موجد زہری منافقین کے گروہ سے تھے اور یہ روایت اپنے گروہ کی خوشنودی کے لئے تیار کی تھی۔ اس روایت کا نہایت مختصر خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ موم کی ناک تھے۔ اور کانوں کے کچے تھے۔ آپؐ میں مستحکم کردار اور اصابت رائے نہیں تھی اور حضرات صحابۂ کرام رضؓ پر آپؐ کی تعلیم و تربیت کا کوئی اثر نہیں تھا۔ آپؐ کی نبوت برائے نام اور بے اثر تھی۔

قبیلۂ خزرج پورے کا پورا اور اس کا سردار سعد بن عبادہ منافق تھے صحابۂ کرام رضؓ صاحبُ الرائے نہیں تھے اور نہ ان میں کوئی پختہ کردار تھا۔ افواہوں پر یقین رکھتے تھے۔ حق بات کہنے سے عاری تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ماکِ ضدی، ناعاقبت اندیش اور کند ذہن عورت تھیں۔ نعوذ باللہ من ہٰذہِ الخرافات

جو روایت اس زہریلے مضمون پر مشتمل ہو وہ کیسے قابل تسلیم ہو سکتی ہے۔ محض زہری کے بیان پر اتنا بڑا افتراء اور کذب ؎

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اس روایت سے کوئی حکم بھی متعلق نہیں۔ معلوم نہیں۔ اس زہری کی غیر واقعی روایت کو اربابِ سنن اپنی کتابوں میں مختلف ابواب میں درج کرنے کے لئے کیوں لائے اور بار بار ذکر کرکے اس کی کیوں تشہیر کی گئی۔ اور یہ تو زہری کی مرتب کردہ روایت ہے۔ اس کا حدیث رسولؐ سے کیا تعلق۔ نقل روایت کے دور میں اس کا کہیں وجود نہیں۔ مؤطا امام مالک رحؒ اس سے خالی ہے۔ مؤطا امام محمد رحؒ میں یہ روایت نہیں ہے مسند ابو داؤد میں یہ نہیں۔ جامعہ معمرؒ میں یہ نہیں۔ حالانکہ معمرؒ اسکے راوی ہیں امام محمدؒ کی ظاہرُ الروایۃ کی چھ کتابوں میں یہ نہیں۔ کتابُ الخراج میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ کتابُ الاُمِ امام شافعی میں اس کا ذکر نہیں۔ سب سے پہلے عبدالرزاق نے اس روایت کو اپنے مصنف میں لکھا اور اسی نے اس کی تہذیب کی ہے۔ عبدالرزاق سے ہی یہ روایت امام احمد رحؒ نے اپنے مسند میں ذکر کی ہے۔ محمد بن اسحاق نے زہری سے یہ روایت اپنی تاریخ میں بیان کی ہے۔ ناقدین رجال کا بیان ہے کہ محمد بن اسحٰق مہتمم بالتشیع ہے۔

اس کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وضع اسانید کا بھی مرتکب ہے کیونکہ اس کی بیان کردہ دیگر اسانید سے کسی محدث نے اس روایت کو قبول نہیں کیا۔

تیسری صدی کے ابتداء میں اسانید اور سنن میں یہ روایت منظر عام پر آئی اور صرف زہری، معمر اور عبدالرزاق کے واسطے سے پھر اسی کو مختلف اسانید سے متعلق کیا گیا۔

ذخیرۂ روایات میں زہری سے سب سے پہلے جس نے تشہیر کے لئے اس روایت کو پسند کیا وہ عبدالرزاق ہیں۔ اس روایت کی ایجاد کا شرف زہری کو حاصل ہے اور اس کی پہلی تشہیر کا شرف عبدالرزاق کو۔ یہ دونوں ہی حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اور عام صحابہؓ کے بارے میں سیئ الرائے ہیں۔ عبدالرزاق اور زہری، محمد بن السائب کلبی کیطرح منافق بھی ہیں۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ کلبی کی سبائیت زہری کے نفاق کا چربہ ہے۔ کلبی کی تاریخی روایات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس لئے اس کی تاریخی داستان بے اثر ہے۔ ارباب سنن اس کو کذاب تصور کرتے ہیں۔ اور اس لئے اس کو متروک قرار دے دیا گیا۔

زہری تاریخ کے ابوالاباء ہیں۔ ان کے دماغ کے انعکاس کا نام تاریخ ہے۔ تاریخ ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ زہری مختلف فنون میں ماہر تھے۔ قرآن وحدیث پر ان کی گہری نظر تھی۔ لغت وادب پر کامل عبور تھا۔ اصناف سخن پر کامل قدرت تھی۔ شاہی دربار نے انہیں سیاست میں ماہر بنا دیا تھا۔ کتمان حال پر قدرت اور اسکے ماہر تھے۔ درباری خصوصیات رکھتے تھے۔ ذوجہات شخصیت کے مالک تھے عقیدہ کچھ تھا۔ عمل کچھ اور تھا۔ ۴۵ سال بنو مروان کے دربار سے متعلق رہے کئی بادشاہوں کے اتالیق رہے۔ بعد کے بنو مروان بادشاہ انہیں کی تربیت سے بے راہ بنے۔ اور ان کے مشوروں نے انہیں اس انجام تک پہنچا دیا۔ جو زہری چاہتے تھے۔ حافظہ بہت قوی پایا تھا۔ اہل علم ان کے محتاج تھے۔ شاہی دولت نے ان کے وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔ عوام سے کم آمیزی نے انہیں عجوبۂ روزگار بنا دیا تھا۔ ظاہری رکھ رکھاؤ نے ان کی اصل شخصیت پر دبیز پردے ڈال دیئے تھے۔ ہر شخص کی رسائی ان کی بارگاہ تک مشکل تھی۔ ڈیوڑھی تھی۔ دربان تھے، علمی وقار تھا۔ دولت تھی۔ دبدبہ تھا۔ علم کی

دولت سے مالا مال تھے۔ مخصوص تلامیذ کا ایک گروہ تھا۔ کوئی ماخذ اور دلیل پوچھنے والا نہ تھا۔ بے مزد تعلیم تھی۔ اس لئے اِحسان ہی اِحسان تھا۔ شاہی معلم تھے۔ "مسند ہے میرا فرمایا ہوا" کے مصداق تھے۔ کسی کے لئے مجال سوال نہ تھی۔ جو کہہ دیا وہی حُجّت تھا۔ دل خوفِ خدا سے خالی تھا۔ طبعاً منافق تھے۔ ظاہراً ناصبی تھے مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ کتمانِ حال کے ماہر تھے۔ اپنی تعلیم میں اپنے مخصوص ذہنی زہر کو اس طرح سمویا کہ لوگوں کے ذہن سے حق و باطل کی تمیز اٹھ گئی۔ حضرات صحابۂ کرام رضؓ کے حلیے کو اس قدر بگاڑا کہ شرفِ صحابیت کوئی چیز نہ رہی۔ اکثر روایات میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں صحابۂ کرام رضؓ پر نیش زنی ضرور کی۔

مقصد یہ ہے کہ اصل زہری علماء کرام کی نظروں سے پوشیدہ رہے اور ظاہری زہری ثقاہت کے پردہ میں لپٹے ہوئے روایات بیان کرتے رہے۔ ابن علقمی نے بھی زہری کے کردار کو اپنایا مگر خام اپنایا۔

کلبی زہری سے متأخر ہے اور ان کا خوشہ چین ہے اور رُوح کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ ھٰذا ما عِندِی والعلم عند اللہ

زہری اور سُنّی شیعہ مباحث

از : حضرت مولانا محمد نافع صاحب : اُستاذ جامعہ محمدیہ ضلع جھنگ

یہ تین مضامین مولانا محمد نافع صاحب کی کتاب رُحَمَاءُ بَینَھُم حصّہ اوّل، ناشر دار التّصنیف جامعہ محمدی ۱۹۷۵ء کے مندرجہ ذیل صفحات سے نقل کیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ص۱۱۳ تا ص۱۲۸ دوسرا مضمون ص۱۷۰ تا ص۱۹۲ تیسرا مضمون ص۲۲۲ تا ص۲۳۲۔ (اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ ۵ بخشی اسٹریٹ بیرون موری دروازہ سرکلر روڈ سے بھی شائع ہو چکا ہے) پیشِ نظر کتاب کے شروع میں جن مشاہیر اہلِ علم کی تائید اور تقریظات درج ہیں۔ ان کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

مشاہیر کی آراء سے چند اقتباسات

(۱) حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب (شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور)

نے تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا :۔

"کتاب نہایت محققانہ بسط وتفصیل اور حجّت و دلیل کے ساتھ لکھی گئی ہے ـــ ـــ ـــ ۔ مآخذ وحوالہ جات موثق ومعتمد ہیں۔ـــ ـــ ـــ میرے ذہن میں جو کچھ تھا آپ نے تفصیل کے ساتھ اسے تحریر میں لا دیا ہے ـــ ـــ ... یہ کتاب انشاء اللہ حرفِ آخر ثابت ہوگی۔"

(۲) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (صدر ومہتمم دارُالعلوم کراچی) رقمطراز ہیں:۔

ـــ ـــ ۔ ـــ ـــ ۔ ـــ ـــ ۔ ـــ ماشاءَ اللہ مُستند مَعلومات جمع فرمائی ہیں جو منصف کے لئے باعث سکُون واطمینان اور معاند کے لئے انشاءَاللہ مُسکت ہوں گی۔

---

(۳) حضرت مولانا محمد یوسف صاحِب بنّوری رحمۃُ اللہُ علیہ (مہتمم جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی) نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ـــ ۔ ـــ ۔ ـــ ۔ ـــ ماشاءَ اللہ اپنے موضوع پر ایک محققانہ تالیف ہے ـــ ـــ ۔ ـــ ۔ ـــ موصوف کی یہ کتاب اہم دستاویز اور کامیاب کوشش ہے۔ اور اہلِ علم وارباب تحقیق اس قدر کریں گے۔

---

(۴) حضرت علامہ پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری مہتمم دارالعلوم غوثیہ بھیرہ سرگودھا (مدیر ماہنامہ ضیائے حرم نے) لکھا ہے۔

ـــ ـــ ـــ ـــ حضرت مولانا محمد نافع صاحبؒ نے "رُحماءُ بینھم" لکھ کر انتشار وافتراق کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی پُرخلوص کوشش فرمائی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس پروپیگنڈا کی قلعی کھل جاتی ہے جو صحابۂ کرام رضا اور اہلِ بیت اطہار کے تعلقات کو معاندانہ ثابت کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے:

---

(۵) حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب صدیقی ندوی صدر شعبۂ دعوت وارشاد بنوری ٹاؤن کراچی اور سابق مہتمم وشیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ نے کتاب پر مفصل تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے :-

"______ مصنف نے قرآن مجید اور روایات واحادیث کی روشنی میں اس افتراء (صحابۂ کرام واہلِ بیت کے مابین بُغض ومناقشت تھی) کی قلعی کھول کر دین کی اہم خدمت سر انجام دی ہے جس کے لئے وہ مُستحقِ شکریہ ولائق صد مبارک باد ہیں ______ مولانا محمد نافع صاحب کی یہ تصنیفِ لطیف بہت نافع ومفید ہے۔

---

(۶) حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب چکڑالوی نے تبصرہ عربی زبان میں لکھا چند اقتباسات کا ترجمہ دیا جاتا ہے :-

"اللہ کی قسم! میں نے اس قدر قلیل حجم میں کثیر المنفعت کتاب نہیں دیکھی"

"یہ کتاب زرّین حروف میں لکھنے کے قابل ہے"

"یہ کتاب اپنی قسم میں نئی اور نرالی ہے"

---

(۷) مناظرِ اہلِ سُنّت حضرت مولانا عبد الستار صاحب تونسوی نے اپنے تبصرے میں ذیل کے ارشادات رقم فرمائے ہیں :-

"مسائل پر بہترین دلائل جمع کئے ہیں اور اثباتِ مسائل پر قیمتی مواد جمع کیا ہے ______ مجھے مؤلف کے بیان کردہ حوالہ جات پر اعتماد ہے"

(ان تعارفی کلمات کے بعد آپ مولانا محمد نافع صاحب کے تینوں عالمانہ مضامین کا مطالعہ فرمائیے ۔ (طاہر)

(۱)

جاگیرِ فدک اور حضرت صدیق اکبرؓ و حضرت فاطمہ رضؓ کے تعلقات

ایک معقول سوال

مافیل جو چیزیں آپ نے پیش کی ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں اور ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان معاملات بہت بہتر تھے۔ ایک دوسرے کے قدر دان تھے۔ ایک دوسرے کے حق ادا کرنے والے اور وعدہ وفا تھے جو اُن کے مابین حُسنِ سُلوک کا بہترین ثبوت ہے۔

لیکن آپؐ کی حدیث کی کتابوں (بخاری شریف اور دیگر کُتب) میں پایا جاتا ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حق وراثت دینے سے انکار کیا۔ تو فَغَضِبَتْ فَاطِمَۃُ فَھَجَرَتْہُ فَلَمْ تُکَلِّمْہُ حَتّٰی تُوُفِّیَتْ

یعنی: حضرت فاطمہ رضؓ غضب ناک ہوگئیں اور وفات تک حضرت ابوبکر رضؓ کو چھوڑ دیا اور پھر کوئی کلام نہ کی۔

سو معلوم ہوا کہ آلِ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) خصوصًا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان سخت ناچاقی واقع ہوگئی تھی اور باہمی ناراضگی آگئی تھی۔ اور اُن کی یہ چیز مدّۃ العُمر علی گئی

یہ بات آپ کے سابقہ بیانات اور پیش کردہ روایات و حُسن معاملات سب کی تغلیط و تردید کر رہی ہے۔ لہٰذا اس معمّہ کو حل کیا جائے۔ کیونکہ تعلقات کے تمام سابقہ واقعات اس روایت نے مشتبہ کر ڈالے ہیں۔ جب زندگی کے آخری لمحات میں کشیدگی و رنجیدگی پائی جاتی ہے تو گذشتہ مراسم و تعلقات کا کیا فائدہ ہوا۔ وہ تو خود بخود کالعدم متصور ہو کر رہ گئے۔ بنابریں آپ اس مسئلہ کو صاف کریں۔

مرغوب جواب

سوال مندرجہ کا جواب پیش کرنے سے پہلے یہ لکھنا مفید ہے کہ :-

(۱) مسئلہ فدک کی یہ نازک اور اہم بحث ہے۔ اس پر علماءِ کرام نے اپنے اپنے دور میں عمدہ کلام کیا ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ چودھویں صدی ہجری کا آخری دور جا رہا ہے یعنے اس وقت ۱۳۹۱ھ شروع ہے۔ مسئلہ فدک پر ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا سید احمد شاہ صاحب بخاری مرحوم و مغفور نے ایک کتاب "تحقیق فدک"[1] کے نام سے ۱۳۷۴ھ ۱۹۵۵ء میں تحریر فرمائی تھی۔ جو اس بحث کے متداول پہلوؤں پر مشتمل لاجواب کتاب ہے۔ عوام و خواص کو اس کتاب سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ہم نے بھی تحقیق فدک کے فوائد سے انتفاع کیا ہے۔ جن مسائل کی حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بنیاد قائم کی تھی۔ ان کی تکمیل کرنے میں ہم نے اپنے مقدور کے موافق سعی کی ہے مالک کریم منظور فرمائے تو اس کی نوازش ہوگی۔

(۲) دوسری یہ چیز مفید معلوم ہوتی ہے کہ اسکے جواب کے دو حصّے کر دیئے جائیں ایک تو عوام کے لئے یہاں متن میں ہی درج کیا جائے جس میں ان کے معیار لیاقت کے مطابق کلام لکھا جائے اور اہل علم حضرات کے لئے یہاں حاشیہ میں ان کے مذاق کے موافق ذرا تشریح کے ساتھ ان کی تسلی کا سامان پیش کیا جائے۔ فلہٰذا اہلِ فہم و علم کے لئے یہاں ایک ضروری حاشیہ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ باذوق اور تحقیق پسند حضرات ہماری معروضات کی قدر دانی فرمائیں گے اور اگر پیش کردہ علمی چیز میں کوئی خامی اور نقص ہوا تو اس کی اصلاح فرمائیں گے۔

---

[1] قولہ تحقیق فدک۔ کتاب ہذا۔ ضمیمہ جات کے ساتھ اضافہ ہو کر دو بارہ بلکہ سہ بارہ طبع ہو چکی ہے اور پتہ ذیل سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ سرگودھا شہر، بشیر کالونی، مسجد ثانی اثنین، مولوی محمد قاسم شاہ صاحب

ان معروضات کے بعد واضح ہو کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطالبۂ فدک و خمس وغیرہ کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ان کے والد شریف جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان پیش کیا کہ لَانُوْرِثُ مَا تَرَکْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ یعنے "ہم جماعتِ انبیاءؑ کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو ترکہ ہم چھوڑ جائیں۔ وہ صدقہ (اور مسلمانوں پر وقف) ہوتا ہے۔ او کما قال علیہ السّلام۔

غور و فکر کی یہاں یہ چیز ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس جواب میں خاتونِ جنّت رضی اللہ عنہا کے لئے ناراضگی کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے۔

(۱)

اوّل تو حدیث نبوی سُن کر ناراض ہو جانا نقل کے برخلاف ہے۔ قرآن مجید کی ذیل کی آیات کا حکم مُلاحظہ ہو۔

(۱) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا ۝ (پ ۲۲) یعنے اللہ اور اس کا رسول جس بات کا فیصلہ فرما دیں تو مؤمن مرد و مؤمن عورت کے لئے اپنا اختیار باقی نہیں رہتا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ واضح طور پر گمراہ ہو گیا اور بھٹک گیا۔)

---

(۲) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (پ۵) یعنی تیرے رب کی قسم ہے وہ مؤمن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو اُن کے درمیان واقع ہو۔ پھر نہ پاویں اپنے جی میں کسی قسم کی تنگی تمہارے فیصلہ سے اور تسلیم کر لیں۔

(۲)

دوسرا عقل و اُصول کے متضاد یہ چیز ہے کہ جو ارشاد سیّد دو عالم صلّے اللہ علیہ وسلم فرمادیں۔ ایسے آپ کی اولاد شریف سُن کر تسلیم نہ کرے۔ اور چیں بچیں ہونے لگے۔ اسکو عقلِ سلیم باور نہیں کرسکتی۔

جب عقل و نقل کے اعتبار سے یہی صحیح ہے کہ حضور علیہ السّلام کے فرمان کو تسلیم کرنا ہر ایک کے لیئے فرض منصبی ہے اور امت مسلمہ میں سے کوئی ایک فرد بھی اس مسئلہ سے مستثنیٰ نہیں ہے تو حضرت فاطمہ رض بھی اسی اُصول کے ماتحت شریعتِ مصطفیٰ صلّے اللہ علیہ وسلم کی پابند ہیں۔ اور اس پر کاربند ہیں۔ بنابریں یقیناً یہ درست ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفۂ اوّل نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطالبۂ میراث کے جواب میں مذکورۂ بالا فرمان نبوی پیش کیا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے مسئلہ ہٰذا کی صحیح پوزیشن معلوم کر لینے کے بعد خاموشی اختیار کرلی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پیش کردہ مسئلہ کو صحیح طور پر تسلیم کرلیا اور کسی قسم کی ناراضگی کی روش نہیں اختیار کی۔ اور اس چیز پر ہم انشاءاللہ شواہد قرائن پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس سے قبل ان روایات کا مطلب اور حل بیان کر دینا لازمی ہے جن میں حضرت ابوبکر صدیق رض کا جواب سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے غضبناک ہوجانے کا ذکر پایا جاتا ہے۔ تاکہ ناظرین کرام کی وہ پریشانی زائل ہوسکے

جو ان روایات کے ملاحظہ کرنے کے بعد ایک ظاہر بین آدمی کے لئے پیدا ہوسکتی ہے اسلیئے اوّلاً ہم ان روایات کا حل سامنے رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اصل مسئلہ کیطرف عَود کرکے یہ ثابت کریں گے کہ ان دونوں بزرگ ہستیوں (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے درمیان کسی قسم کی ناراضگی اور رنجیدگی نہ تھی اور ان کے مابین تعلقات صحیح اور درست تھے۔ انشاءاللہ الرحمٰن واللہ المستعان وعلیہ التکلان

حل روایات

محدثین کے ہاں ایک مسئلہ کسی روایت سے معلوم کرنا ہو تو اسکے متعلق طریقہ یہ ہے کہ اس نوع کی تمام روایات کو پیش نظر لانے کے بعد مسئلہ کو مستنبط کیا جاتا ہے۔ اس طرز کے اختیار کرنے سے اس مسئلہ کے جمیع جوانب و اطراف سامنے آجاتے ہیں اور اگر بالفرض رُواۃ کیطرف سے کوئی اس متن میں کمی و بیشی ہوگئی ہو۔ یا راویوں کی تعبیر میں فرق پیدا ہوگیا ہو۔ یا ناقلین روایت کی طرف سے الفاظ میں تغیّر و تبدّل واقع ہوگیا ہو تو وہ آسانی سے دریافت ہوسکتا ہے۔

قدیم علماء میں حدیث سے مسئلہ کے اثبات کے لئے یہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اہلِ علم اس چیز کو بخوبی جانتے ہیں۔ عوام ناظرین کے لئے یہ چیز بطور تمہید بیان کر دی گئی ہے۔ اس تمہیدی امر کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ناظرین کی خدمت میں عرض ہے کہ :-

(۱)

"جن روایات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جواب سُن لینے کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا غضب ناک ہوجانا، ناراض ہوجانا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دینا، کلام نہ کرنا وغیرہ مذکور ہے۔ ان روایات کو ہم نے اپنے مقدور کے موافق متون حدیث کی متداول حدیث کتب سے تلاش کیا ہے۔ قریبًا سولہ عدد مقامات متونِ حدیث و تاریخ میں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ جہاں یہ مذکورہ مضمون مروی ہے۔ ان تمام مقامات مذکورہ میں ابن شہاب زہری ہی اس روایت کا راوی ہے۔ کوئی ایک مقام بھی اس روایت کے متعلق اب تک ایسا نہیں مل سکا۔ جہاں حضرت فاطمہ رض کی ناراضگی و ہجران کا ذکر پایا جائے اور وہ روایت ابنِ شہاب زہری کے بغیر کسی دوسرے راوی سے مَروی ہو۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کی روایات جہاں جہاں محدثین نے اپنی پوری سند کے ساتھ ذکر کی ہیں۔ ان جمیع مقامات پر نظر غائر کرنے سے یہ دریافت ہوا

ہے کہ ابن شہاب زہری (محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب زہری) کے بغیر کسی راوی نے بھی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی غضب ناکی ہجران وغیرہ کا روایتِ ہذا میں ذکر نہیں کیا حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی طرف سے مناقشانہ گفت گو صرف ایک (زہری) نے ہی نقل کی ہے اور کسی راوی نے بالکل نہیں نقل کی۔

(۲)

نیز ان سب روایات میں (جن میں ناراضگی کے کلمات وغیرہ کا ذکر ہے) تدبر و تفکر کرنے سے یہ چیز بھی دستیاب ہوئی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب مطالبہ ہذا کے جواب میں فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اَلَا نُورثُ مَا تَرَکنا صَدَقَۃ ذکر کیا اور کہا کہ اِنَّما یاکل اٰلِ مُحَمَّدٍ مِن ھٰذا المَالِ الخ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جواب ہذا مکمل ہونے کے بعد اس روایت میں اس طرح درج ہے کہ قَالَ فھَجَرَتْہُ فاطمۃ فلم تُکَلِّمہُ حَتّٰی مَاتَت۔ یعنی اس مرد روایت کرنے والے نے کہا کہ (فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا اور کلام تک نہ کی حتیٰ کہ وفات پائی۔)

مطلب یہ ہے کہ لفظ قال کے بعد یہ ناراضگی وغیرہ کا ذکر پایا جاتا ہے اور یہ قال کا مقولہ ہے۔ سابقہ روایت جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے اس کا یہ حصہ نہیں ہے بلکہ اس سے خارج ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس قال کا فاعل کون مرد مذکر ہے؟ عورت کا قول تو نہیں ہے تاکہ کہا جا سکتا کہ اوپر واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نقل کیا ہے۔ یہ کلام بھی ان کا قول ہوگا۔ اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہو تو عربی زبان کے قواعد کے اعتبار سے لفظ قَالَت (صیغہ واحد مؤنث غائب) کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جانا چاہیئے تھا۔ مگر اس طرح نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ لفظ قال (جو صیغہ واحد مذکر غائب ہے) کا فاعل دوسرا مذکر شخص ہے۔ وہ ابن شہاب زہری ہے اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے) ان کلماتِ مناقشہ کو نقل کرنے والا اس کے بغیر اور کوئی شخص نہیں۔

(۳)

تیسری چیز یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رض نے اپنے مطالبہ کے جواب میں جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مذکورہ جواب تسلی بخش اور اطمینان دِہ پایا۔ تو اس مسئلہ کے متعلق خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اصل واقعہ اتنا ہی ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیر رح نے البدایہ جلد ۵ صـ۲۸۹ پر یہ چیز بڑے عمدہ الفاظ میں درج فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں :-

وَقَدْ رُوینا ان فاطمۃ رضی اللہ عنہا احتجت اولاً بالقیاس وبالعموم فی الآیۃ الکریمۃ فاجابھا الصدیق بالنص علی الخصوص بالمنع فی حق النبیؐ وانھا سلمت لہ مَا قال وھٰذ المظنون بِھَا رضی اللہ عنہا ترجمہ : یعنے روایات بتلاتی ہیں کہ خاتون جنت نے پہلے پہلے اپنے قیاس اور آیتِ وراثت کے عموم کے ساتھ استدلال پکڑا تھا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس وراثت کے عمومی مسئلہ سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم خارج ہیں اور ان کے لئے حکم مخصوص ہے۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا اس کو خاتونِ جنت نے تسلیم کر لیا۔ حضرت فاطمہ رض کے متعلق ہمارا یہی حُسن ظن ہے۔

(البدایۃ لابنِ کثیر جلد ۵ صـ۲۸۹ بیان روایۃ الجماعۃ لما رواہ الصدیق وموافقتہم علٰے ذالک)

لیکن راوی (زہری) نے جو عُروہ سے اور وہ عائشہؓ سے ناقل ہے۔ اپنے زعم میں سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی خاموشی کرنے کو ناراضگی اور غضبناکی پر محمول کر کے یہ الفاظ ذکر کر دیئے۔ حالانکہ کسی چیز کے متعلق سکوت وخاموشی اختیار کر لینا ہمیشہ رنجیدگی کی وجہ سے ہی نہیں ہوتا۔ خاموشی نیم رضا بھی ہوا کرتی ہے۔ (جیسا کہ عوام میں بطور مقولہ مشہور ہے) اور اس بات کے متعلق اطمینان ہو جانے کی صورت میں بھی انسان سکوت اختیار کر لیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ علم کی اصطلاح میں اس کو ظن راوی (یعنے راوی کا گمان) کہا جاتا ہے۔ روایتِ ہٰذا میں راوی کا اپنا ظن و گمان ہے۔ وہ راوی ابن شہاب زہری ہیں۔ (عافاہُ اللہ تعالےٰ)

ان تمام مقامات میں جہاں یہ الفاظ غضبت، وجدت، ہجرت وغیرہ پائے گئے ہیں "ظنِ راوی" ہے۔ پھر ان سولہ مواضع میں سے چھ مقامات میں زہری کے بعض شاگردوں نے قال کے لفظ کو ساقط کر دیا ہے۔ اور عموماً مشاجرۃ کے الفاظ قال کے بعد مذکور پائے جاتے ہیں (جہاں قال موجود ہوتا ہے) اہلِ علم کے اطمینان کے لئے اس مقام کے حاشیہ میں ہم نے مقامات مذکورہ کی نشان دہی کر دی ہے۔ عوام کو اس کی حاجت نہ تھی۔ اس لئے یہاں نہیں ذکر کئے۔

مختصر یہ ہے کہ سوال مذکور کا جواب اس طرح اختتام پذیر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جواب باصواب پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بالکل ناراض نہیں ہوئی ہیں (جیسا کہ مفصلاً عرض ہو چکا ہے) بلکہ جواب مطمئن حاصل ہونے پر خاموشی اختیار کی۔ اس روایت میں جو ان کی رنجیدگی کا ذکر کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ وہ سراسر راوی کا اپنا وہم اور خیال ہے جو روایت میں ملا دیا گیا ہے اور لوگوں کے لئے غلط فہمی کا موجب بن گیا۔

اب روایۃ ہٰذا ملاحظہ کرتے وقت آپ کے لئے انشاء اللہ تعالےٰ باعثِ اشکال نہ ہوگا۔ بلکہ موجب اطمینان ہوگا۔ (بفضلہٖ تعالےٰ)

مسئلہ کی تکمیل

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطالبۂ میراث جواب میں جب حدیث (نحنُ معاشر الانبیاء لانورث ما ترکنا صدقۃ) پیش کی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس مسئلہ کا صحیح جواب پا کر خاموش ہو گئی تھیں۔

اس مقام میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اس چیز پر ہمارے پاس شواہد موجود ہیں اور قرائن پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کہ ہماری گذارش درست ہے۔ فلہٰذا اب مسند امام احمدؒ، ایک۔

روایت ہم تحریر کرتے ہیں ۔ جو ہمارے معروضات کی تائید کرتی ہے ۔ مسنداتِ فاطمہؓ میں امام احمدرحہ نے اپنی سند کے ساتھ ذیل کی روایت تخریج کی ہے :-

حدّثنی جعفر بن عمرو بنِ اُمیّۃ قالَ دخلت فاطمۃ عَلیٰ اَبی بکرٍ فقالت اخبرَنِی رسُولُ اللّٰہ صَلّیَ اللّٰہ عَلیہ وَسلّم اِنّی اَوّلُ اَھلِہ لحوقًا بِہٖ (مسند احمد جلد ۶ ص۲۸۳ احادیث فاطمہؓ) یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئیں اور کہا کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ آپ کے گھر والوں میں سے سب سے پہلے میں آپ سے جا کر ملوں گی ۔"

روایت ھٰذا کے فوائد ونتائج

۱۔ ان دونوں بزرگ ہستیوں کے درمیان عداوت اور مناقشت ہرگز نہیں ، ورنہ ایک دوسرے کے پاس تشریف لے جانے کا کوئی مطلب نہیں ہے ۔

۲ ——— دوسری چیز یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں جا کر عام گفتگو نہیں کی ۔ بلکہ حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جا کر سنائی ہے ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث ایک دوسرے کو سنانا مستقل ثواب اور خیر و برکت کی چیز شمار ہوتی تھی ۔ یہ معمولی بات چیت کے درجہ میں نہیں تھی یہ مؤانست اور موافقت کی علامات میں سے ہے ۔

۳ ——— تیسرا یہ امر واضح ہوا کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک راز دار چیز حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بطور پیشین گوئی بیان کی ہوئی تھی ۔ وہ راز انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جا کر بتایا ہے جو خوشخبری کے درجہ میں تھا ۔ دوست دوستوں کا راز سُن کر مسرور اور خوش ہوا کرتے ہیں ۔ اسی بناء پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے محبت کے انداز میں محبوب کی چیز محبوب کے محبوب کو جا کر سنائی (فسبحان اللّٰہِ عَلیٰ حُسنِ سُلُوکِھِم)

۴ ـــــــــ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ فلم تتکلم حتیٰ ماتت کا جملہ اپنے اطلاق پہ چھوڑا جائے۔ تو راویوں کا محض اپنا خیال شریف ہے اور صرف اپنا ظن منیف ہے اور بالکل اپنا گمانِ لطیف ہے اور واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ یہاں تو ان حضرات کی ملاقات برابر جاری ہے گفتگو ہوتی ہے، آمد و رفت رہتی ہے۔ دینی مسائل آپس میں سُننے سُنائے جاتے ہیں: تا دفات نہ کلام کرنا کیسے صحیح ہوا۔ (اہلِ فکر غور کریں)

مُطالبہ کی روایت کے متعلق ایک حاشیہ

عرض یہ ہے کہ بخاری شریف کی ایک روایت جس کا مفہوم یہ ہے۔ غضبت فاطمۃ فھجرتہ فلم تتکلم حتی ماتت الخ سے مخالفین صحابۂ کرام رض حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی باہمی دائمی رنجیدگی و ناراضگی ثابت کرتے ہیں اور اولادِ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی حق تلفی کی بنیاد اس پر قائم کرتے ہیں۔

اس روایت کی وجہ سے مخالف دوستوں کی طرف سے ملک بھر میں اس قدر اِنتشار و خلفشار، افتراق و انشقاق پیدا کر دیا گیا ہے جس کی نظیر نہیں۔ اس لئے اسکے جواب میں کچھ تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ چند چیزیں یہاں اہلِ علم کے لئے ذکر کرنا مناسب ہیں۔ پسند خاطر ہوں تو قبول فرمائیں۔ ورنہ ترک کر دیں۔

ظنِ راوی کا بیان

اوّلاً عرض ہے کہ اس روایت میں "غضب، وجد، ہجران و عدم تکلم" وغیرہ اشیاء اصل روایت کا جزء نہیں بلکہ یہ ظنِ راوی ہے۔

چنانچہ بعض علماءِ کرام نے یہ توجیہ ذکر کر دی ہے۔ ایک تو شیخ العلماء حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالےٰ کی تقریر لامع الدراری علی جامع البُخاری جلد دوم میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ فرماتے ہیں کہ :-

قوله فغضبت فاطمة الخ هٰذا ظنّ من الرّاوی حیث استنبط من عدم تکلّمها ایّاهُ انما غضبت علیه (لامع الدراری علٰی جامع البخاری، جلد ثانی ص۵ کتابُ الجہاد ۔ باب فرض الخمس ۔طبع سہارنپور، یوپی)

دوسرا حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاوٰی امدادیہ جلد چہارم کتابُ المناظرہ میں اس روایت کی توجیہ اس طرح تحریر کی ہے کہ:۔

"علماءِ محقّقین لم تتکلّم را بر معنی لم تتکلّم فی ہٰذا الامر محمول کردہ اند۔ ولو سلّمنا کہ لم تتکلّم بر معنی متبادر محمول باشد۔ تاہم چہ دلیل کہ ایں ہجران از ملالت بود واگر بر روایتے تصریح ہم برآید، یمکن کہ ظن راوی باشد" الخ

(فتاوٰی اِمدادیہ جلد ۴، کتابُ المناظرہ ص۱۳۲ طبع قدیم مجتبائی، دہلی)

اس کے بعد یہ مسئلہ پیش آئیگا کہ آیا "صحیحین" میں ظن راوی جاری ہو سکتا ہے؟ تو اسکے متعلق اکابر علماءِ کرام نے ذکر کیا ہے کہ صحیحین بیشتر صحیح ہیں لیکن کہیں کہیں وہم راوی پایا جاتا ہے۔

چنانچہ فیض الباری علٰی صحیح البخاری (از علّامہ کبیر حضرت مولانا سیّد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) جلد چہارم کتاب بداءُ الخلق میں مذکور ہے۔ فرماتے ہیں:۔

وایّ اعتماد بہ (بالتاریخ) اذا لم یخلص الصّحیحان عن الأوہام حتّٰی صنفوا فیہا کتبًا عدیدۃً فأین التاریخ الّذی یدوّن بأفواہ النّاس وظنّون المؤرّخین لاسند لہا ولامدد (فیض الباری حاشیہ بخاری، جلد ۴ ص۷۷ جلد رابع، باب مبعث النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم)

حاصل یہ ہے کہ صحیح روایت میں جب وہم راوی کی گنجائش ہے اور خاص اس روایت میں علماءِ کبار ظن راوی کا قول بھی کر رہے ہیں تو آسانی سے جواب مرتب ہو گیا کہ کشیدگی پر دلالت کرنے والے یہ الفاظ سب کے سب وہم راوی ہیں اور اصل روایت سے خارج ہیں۔

بعد ازاں یہ صاف کرنے کا معاملہ ہے کہ وہ کون بزرگ ہیں جن کا یہ ظن اور گمان ہے۔

ہماری جستجو اور تلاش کے موافق اس سند کے رواۃ میں سے ابن شہاب زہری ہیں۔
یہ سب الفاظ ان کے گمان کی پیداوار ہیں۔
اس چیز پر قرینہ یہ ہے کہ مذکورہ چیزیں (غضب و عدم تکلم وغیرہ) صرف ابن شہاب زہری کی مرویات میں ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ مطالبہ (فدک وخمس وتوریث) کی روایت جہاں بھی ابن شہاب زہری کے ماسوا کسی سند سے پائی گئی ہے تو وہاں مذکورہ الفاظ بالکل مفقود ہیں۔ ہم نے اپنی ناقص تلاش کے موافق مسئلہ ہٰذا کو اسی طرح پایا ہے۔ آپ حضرات بھی تحقیق فرمالیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ چیز درست ثابت ہوگی۔

(۲)

ادراج راوی کا بیان

——— سوال مذکور کے جواب میں "وہم راوی" کے بجائے اس طرح بھی آپ تعبیر کر سکتے ہیں کہ (مطالبہ والی) "روایت مدرج" ہے اور راوی کی طرف سے روایت ہٰذا میں ادراج پایا گیا ہے وہ اس طرح کہ اس روایت کے بعض مواضع میں "قال" کا لفظ پایا جاتا ہے۔ اور قال کے بعد (ھجرتہ فلم تکلمہ حتی ماتت) وغیرہ الفاظ مذکور ہیں۔ یہ کلمات "قال" کا مقولہ ہیں۔ یعنے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اصل روایت سے یہ الفاظ خارج ہیں۔ اور راوی کی جانب سے روایت میں لطور ادراج مذکور ہوئے ہیں۔

پھر یہ چیز قابل توجہ ہوگی کہ کن کن مواقع میں لفظ "قال" پایا جاتا ہے؟ جس کو اہل ادراج فی الروایۃ کا قرینہ قرار دیا ہے۔ اور کن محدثین و مؤرخین نے اس روایت کو تخریج کیا ہے۔

تو اس کے متعلق (مطالبہ کی روایات کا) ہم ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں جو ہم کو اس بحث کے مطالعہ کے تحت حاصل ہوا ہے۔ اس کے ملاحظہ کرنے سے ناظرین کو ایک گونہ رہنمائی حاصل ہو سکے گی۔ مزید برآں آپ تتبع و تعمق فرما کر مسئلہ ہٰذا کو پایۂ

تحقیق تک پہنچا سکتے ہیں۔ (اعاننا اللہ تعالے وایاکم)

تعدادِ مرویات کا اجمالی نقشہ

سیدہ فاطمۃُ الزّہراء رضی اللہ عنہا کی طرف سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کی روایت احادیث و روایاتِ تاریخ کی مندرجہ ذیل باسند کتب سے قریباً چھتیس (۳۶) مواضع سے دریافت ہوئی ہے۔

اَسماءِ کُتب

۱۔ (۱) المُصنّف لعبد الرزّاق میں (ایک عدد)

(۲) بخاری شریف میں (۵ عدد) (۳) مسلم شریف میں (۲ عدد)

(۴) مسند امام احمد میں (" ") (۵) طبقات ابن سعد میں (" ")

(۶) مُسند ابی عوانہ اسفرائینی میں (۳ ") (۷) ترمذی شریف میں (۲ عدد)

(۸) ابوداؤد شریف میں (۴ ") (۹) نسائی شریف میں (ایک عدد)

(۱۰) المنتقیٰ لابن جارود میں (ایک عدد) (۱۱) شرح معانی الآثار طحاوی میں (" ")

(۱۲) مشکلُ الآثار طحاوی میں (" ") (۱۳) السُّنن الکبریٰ للبیہقی میں (۲ عدد)

(۱۴) تاریخُ الامم والملوک لابن جریر طبری (ایک عدد)

(۱۵) فتوحُ البُلدان بلاذری میں (یک عدد)

ان مقامات میں مذکورہ روایت بعض جگہ مفصّل ہے اور بعض مواضع میں مجمل ہے اور تفحّص اور تفکُّر سے واضح ہوا ہے کہ مندرجہ چھتّیس (۳۶) مواضع میں

قریباً گیارہ عدد مطالبۂ فدک کی۔ وہ روایات ہیں (جن کی سند میں ابن شہاب زہری نہیں ہے۔) اور دیگر صحابۂ کرام مثلاً حضرت ابو ہُریرہ رضہ۔ ابُو الطّفیل عامر بن واثلہ، اُمِّ ہانی وغیرہم سے مروی ہیں۔ یعنے حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول نہیں۔ یہاں کسی ایک مقام میں بھی رنجیدگی وکشیدگی کا نام ونشان نہیں۔

ان کے ماسوا پچیس مقامات (جن کی سند میں زہری موجود ہے) دو طرح پائے گئے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ سند میں زہری موجود ہونے کے باوجود مناقشہ نما الفاظ بالکل مفقود ہیں اور کشیدگی سیدہ رضؓ کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ایسے مواضع قریباً نو عدد ہیں۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اس روایت میں وجد و عدم تکلم وغیرہ ہمایہ چیزیں منقول ہیں۔ ان مقامات کی ہر سند میں زہری موجود ہے (زہری سے کوئی ایک سند بھی خالی نہیں۔) قریباً یہ سولہ مواضع ہیں۔

لفظ "قال" کی دریافت

مذکورہ سولہ مقامات میں (جہاں مناقشانہ کلمات پائے جاتے ہیں) تدبر کرنے سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ مذکورہ الفاظ مندرجۂ ذیل مواضع میں قَالَ کے بعد مذکور ہوئے ہیں۔ یعنے قَالَ کا مقولہ ہیں۔ قالت کا مقولہ نہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کلام سے خارج ہیں۔

اس قَالَ کا قائل زہری کا کوئی شاگرد ہے۔ مُعمَّر بن راشد یا کوئی دوسرا آدمی اور قَالَ کا فاعل خود ابن شہاب زہری ہے اور کشیدگی کے مذکورہ کلمات اس کے اپنے فرمودات میں سے ہیں جو اصل روایت میں آمیخت کر دیئے گئے ہیں۔

قَالَ کے مواقع

ہمارے محترم حضرات کو انتظار ہوگی کہ مطالبہ کی روایت میں قال کن مواضع میں دستیاب ہوا ہے؟

اس کے متعلق عرض ہے کہ ایک ناقص جستجو کے موافق مندرجہ ذیل مقامات میں قَالَ کا لفظ روایت میں پایا گیا ہے۔

(۱)

حافظ کبیر ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام المتوفی ۲۱۱ھ کے المصنف جلد خامس میں

روایت ہذا منقول ہے۔

۔۔۔۹۷۷۴ اخبرنا عبد الرّزاق عن مُعمّر عن الزهری عَن عُروۃ عن عائشۃ اَنّ فاطمۃَ والعبّاس اتیا ابا بکرٍ یلتمسانِ مِیراثہما من رّسول اللہِ صَلّی اللہ علیہِ وسلّم وھُما حِینئذٍ یطلبان اَرضہٗ من فِدکٍ وسَھمہٗ من خیبر فقال لھُما اَبُوبکر سمعتُ رسُول اللہ صَلّی اللہ علیہِ وَسَلَّم یقول لا نورث مَا ترکنا صدقۃ انّما یاکل اٰل محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم مَن ھٰذا المال وانی واللہ لا اَدعُ امراً رأیت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسَلّم یصنعہٗ الا صنعتہ قال فہجرتہ فاطمۃ فلم تکلّمہ فی ذالک حتّٰی ماتت فدفنھا علی رض لیلاً ولم یؤذن بھا ابابکرٍ رض الخ (المصنّف لعبدالرزاق ص۴۷۲۔۳۔۴۷۲ جلد ۵ تحت عنوان خصومۃ علی والعباس رض مطبوعہ مجلس علمی کراچی و ڈابھیل طبع بیروت)

(۲)

امام محمد بن اسمٰعیل البخاری نے بخاری جلد ۲ کتابُ الفرائض میں روایت ہذا ذکر کی ہے :۔

حدّثنی عبد اللہِ بن محمّدٍ قال حدثنا ھشام (بن یُوسف الیمانی) قال اخبرنا معمّر عن الزھری عن عروۃ عن عائشۃؓ ان فاطمۃؓ والعباسؓ اتیا ابابکرٍ یلتمسانِ مِیراثھما من رسُول اللہ صَلّی اللہ علیہ وسلّم وھُما یَومئذٍ یطلبان ارضیھما من فدک وسَھمہٗ من خیبر فقال لھُما ابُوبکر سمعت رسول اللہ صَلّی اللہ علیہ وسلّم یقول لا نَورث ما ترکنا صدقۃ إنما یاکُلُ اٰل محمد مِن ھٰذا المَالِ قالَ ابوبکر رض واللہ لا اَدعُ امراً رأیت رسول اللہ صَلّی

اللہ علیہ وسلّم یصنعہٗ فیہ إلّا صنعتہ قال فھجرتہ فاطمۃ فلم تکلمہ حتی ماتت۔

(الصحیح للبخاری المجلد الثانی کتابُ الفرائض ۔ باب قول النّبی صلے اللہ علیہ وسلّم لانورث ما ترکنا صدقۃ صہ ۹۹۶ طبع مجتبائی ۔ نور محمدی ۔ دہلی ۲)

(۳)

مسند ابی عوانہ جلد رابع میں منقول ہے :۔

حدّثنا الدبری عن عبد الرزّاق عن معمّر عنِ الزّہری عن عروۃ عن عائشۃ (رضی اللہ عنھا) اَنّ فاطمۃ والعباس رضی اللہ عنھما اتیا ابا بکرؓ یلتمسانِ میراثھما من رسول اللہِ صلّی اللہ علیہ وَ سلّم وھُمَا حینئذٍ یطلبان ارضہ من فدک وَسھمَہ من خیبر فقال لھُما ابوبکرٍ انی سمعتُ رسُولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم لانورث ما ترکنا صدقۃ انما یاکل الِ مُحمّد (صلی اللہ علیہ وسلّم) من ھٰذا المال وانی وَاللہِ لا ادع امرًا رأیتُ رسُول صَلّی اللہ علیہ وسلم یصنعہٗ إلا صنعتہ" قال" فھجرتہٗ فاطمۃ فلم تکلمہ فی ذٰلک حتی ماتت فدفنھا علی رضؓ لیلًا ولم یؤذن ابا بکر رضؓ الخ (مسند ابی عوانہ، جلد رابع صہ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ باب اخبار الدالۃ علی الاباحۃ ان العمل فی اموال من لم یوجف علیہ الخیل طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

(۴)

علامہ ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی نے اپنی تصنیف مشہور السُّننُ الکبرٰی جلد سادس میں اس روایت کو درج کیا ہے :۔

اخبرنا ابُومُحمّد عبدُ اللہ بن یحیٰی بن عبدُ الجبار ببغداد انا اسمٰعیل بن مُحمّد الصّفار ثنا احمد بن منصُور ثنا عبدُ الرّزّاق انا معمّر عن الزہری عن عروۃ عن

عائشة رض انّ فاطمة والعبّاس اتيا ابا بکرؓ یلتمسانِ میراثها من رّسُولِ الله صلّی الله علیه وسلّم وهُما حینئذٍ یطلبانِ ارضه من فدك وسهمه مِن خیبر فقال لهُما ابوبکر سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقُول لانُورث ما ترکنا صدقة اِنما یأ کلُ ال مُحمّدٍ من هٰذا المال وَالله انی لا ادعُ امرًا رأیتُ رسول الله صلی الله علیهِ وسلّمَ یصنعه بَعد الا صنعتہٗ - قال" فغضبت فاطمة رضی اللهُ عنها فهجرَته فلم تکلّمه حتی مَاتت فد فنها علیٌ لیلًا ولم یؤذن بها ابا بکر رض الخ - (السُّنن الکبرٰی، بیہقی جلد سادس، صـ ۳۰۰ کتاب قسم الفیٔ والغنیمۃ الخ)

(۵)

مسلم شریف میں مذکور ہے :-

------ عن ابن الشهاب (الزُّهری) عن عروه عَن عائشة رضی الله عنها------

------ (مطالبہ کی تمام سابقہ روایات کی طرح درج ہے۔ اگرچہ رُواۃ کی جانب سے تصرّف وتغیُّر پایا گیا ہے تاہم اس میں عبارت ہٰذا موجود ہے ------ قال فهجرَته فَلَم تکلّمهُ حتی توفّیَت الخ

(مسلم شریف، جلد ۲ صـ ۹۱، ۹۲ باب حکم الفیٔ۔ طبع نور محمدی دہلی)

(۶)

تاریخ الاُمم والملوک لابی جعفر محمد بن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ھ میں ہے :-

حَدّثنا ابوصالح الضّراری قال حدّثنا عبدُالرزّاق عَن معمّر عن الزّهری عن عروۃ عن عائشة رض ان فاطمة

والعبّاس اتیا ابابکر یطلبان میراثهما من رسول الله صلّی الله علیہ وسلّم وھما حینئذٍ یطلبانِ ارضہٗ مِن فدلک وسھمہٗ من خیبر فقال لھما ابوبکرؓ اما انّی سمعت رسُولُ الله صلّی الله علیہ وسلّم یقول لانُورثُ مَاترکنا صدقۃ انما یأکل آل محمّدؐ فی ھٰذا المال وانّی وَاللهِ لا ادعُ امرًا رأیت رسُولُ اللهِ صلّی الله علیہ وسلّمَ یصنعہٗ اِلاّ صنعتہٗ قال فھجرتہ فاطمۃ فلم تکلّمہٗ فی ذٰلک حتی ماتت فدفنھا علیؓ ولم یؤذن بھا ابابکر۔

(تاریخ ابن جریر طبری ص ۲۰۱ - ۲۰۲ جلد ثالث تحت حدیث السّقیفہ وَالسنۃ الحادی عشرۃ)

حافظ عمادُ الدّین ابن کثیر رحمہُ اللہ نے البدایہ جلد خامس ص ۲۸۵، ص ۲۸۷ باب بیان انہٗ علیہ السّلام قال لانُورث میں یہ روایت بخاری سے نقل کی ہے وہاں روایت میں اسی طرح لفظ درج ہیں کہ ———— قال فھجرتہ فاطمۃ فلم تکلّمہ حتی ماتت یعنی کشیدگی کے الفاظ بعد از قال روایت میں مندرج پائے گئے ہیں اور سند ہٰذا میں زُہری موجود ہے۔

———— (۷) ————

سابقہ حوالہ جات قال کے متعلق اہل سنّت کی کتابوں میں سے نقل کئے ہیں اب یہ ایک حوالہ شیعی کتب سے بھی بطور تائید مسئلہ یا بطور الزام تحریر کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ابن ابی الحدید شیعی معتزلی ان کے مشہور عالم ہیں اور نہج البلاغۃ کے قدیمی شارح ہیں۔ انہوں نے اپنی شرح ہٰذا میں فدک کے لئے ایک طویل بحث کی ہے تین فصلیں قائم کی ہیں۔ الفصل الاوّل میں ابوبکر الجوہری سے مکمل سند کے ساتھ مطالبۂ فدک کی کی روایت ذکر کی ہے وہاں لفظ قال روایت میں موجود ہے اور بعد از قال الفاظ

وہی منقول پائے گئے ہیں جو سابقہ حوالہ جات میں درج ہیں تمام روایت ملاحظہ ہو

قال ابوبکر (الجوھری) اخبرنا ابوزید قال حدثنا اسحٰق بن ادریس قال حدثنا محمد بن احمد عن معمر عن الزہری عن عروہ عن عائشۃ ان فاطمۃ والعباس اتیا ابابکر یلتمسان میراثھما من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھما حینئذ یطلبان ارضہ بفدک وسھمہ بخیبر فقال لھما ابوبکر انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا نورث ما ترکنا صدقۃ انما یاکل ال محمد صلی اللہ علیہ وسلم من ھذا المال وانی واللہ لا اغیر امرا رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصنعہ الا صنعتہ قال فھجرتہ فاطمۃ فلم تکلمہ حتی ماتت۔ (شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید شیعی معتزلی جلد رابع صہ ۱۱۲۔ بحث فی ذکر ما جرای علی فدک بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ طبع بیروت شام در چہار جلد کلاں)

اگر بعض لوگ یہ خیال کریں کہ یہ سنیوں کی روایت ہے (جو ابھی ابوبکر جوہری کی سند سے نقل ہوئی ہے) اور جوہری لہٰذا سُنّی ہے۔ اس سے ان پر الزام کیسے ہو سکتا ہے تو اس کا مختصر و معقول جواب یہ ہے کہ

ابوبکرِ الجوھری کا مقام

(۱) کتاب شرح نہج البلاغۃ حدیدی ابوبکر جوہری کی روایات سے مملو ہے۔ اول، اوسط، آخر کتاب میں سب جگہ ابن ابی الحدید نے اس کی روایات اپنی تائید میں مدون کی ہیں اور حدیدی کے جس مقام سے ہم نے روایت مندرجہ نقل کی ہے وہاں حدیدی نے بحث فدک کے لئے تین فصل قائم کئے ہیں۔ وہاں بحث ہٰذا کی ابتداء میں تصریح کر دی ہے کہ وجمیع ما نوردہ فی ھذا الفصل من کتاب

ابی بکر احمد بن عبد العزیز الجوہری فی السقیفۃ وفدک وما وقع من الاختلاف والاضطراب عقب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ط

(۲) دوسری یہ عرض ہے کہ جوہری بزرگ نے ایک مستقل کتاب بنام کتاب السقیفہ تصنیف کی ہے۔ یہ چیز اسکے تشیع کی قوی علامت ہے۔ اہل سنت کو اس واقعہ کے لئے (یعنے سقیفہ کے لئے) الگ کتاب مرتب کرنے کی حاجت نہیں ہے جس طرح خم غدیر کے واقعہ کے لئے یہ لوگ[1] بڑی بڑی تصانیف مرتب کرتے ہیں۔ اہل سنت کو اس میں الگ الگ کتاب مرتب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ہے۔

(۳) تیسری یہ چیز ہے کہ ابوبکر جوہری ان کی معتبر کتاب "فروع کافی" جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب السجود والتسبیح صـ ۱۹۱ طبع نول کشور لکھنؤ میں سند میں موجود ہے۔[2] اور اصول اربعہ کے لئے معتبر راوی ہے۔ اسی طرح اصول اربعہ کی کتاب "تہذیب الاحکام" باب کیفیۃ الصلوٰۃ جلد اول صـ۱۴۲ طبع ایرانی قدیم طبع تختی کلاں کی سند میں موجود ہے ثقہ راوی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ان کی اصول اربعہ میں یہ بہت جگہ راوی ہے۔

(۴) چوتھی یہ گذارش ہے کہ شیعی تراجم کی معتبر کتابوں میں اس کا تذکرہ دریافت کیا گیا ہے۔ وہاں اس کی توثیق موجود ہے اس پر کچھ رد نہیں لیا گیا۔ اگر یہ شخص قابل رد ہوتا تو اس کے ترجمہ میں اس کو رد کر دیتے ہیں۔ اور اس کی تنقیص واضح کر دیتے۔ کسی جرح کا نہ پایا جانا ہی اس کے عند الشیعہ مقبول ہونے کی بین دلیل ہے۔ عبارات ذیل ملاحظہ ہوں۔

(۱) جامع الرواۃ۔ محمد بن علی الاردبیلی جلد اول صـ۵۲ میں درج ہے۔

احمد بن عبد العزیز (ق ۔ ست) الجوہری لہ کتاب السقیفہ الکوفی الخ

(۲) "روضات الجنات" خوانساری الموسوی (میرزا محمد باقر) صـ۱۱ پر درج ہے کہ

---

[1] طبری نے بھی خم غدیر پر مستقل کتاب لکھی ہے۔ (طاہر) [2] اسی طرح کافی میں محمد بن مسلم بن شہاب زہری موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو مولانا قمر الدین سیالوی وغیرہ کا حوالہ ہماری تقدیم میں۔ (طاہر)

منهمُ الشیخ المتقدّم البارعُ احمد بن عبدُ العزیز الجوهری صاحبُ کتابُ السّقیفۃ الّذی یعتمد علی النقل عنہُ ابن ابی الحدید وغیرہ

(۳) ـــــــــــ "مجمعُ الرّجال" (مولی عنایت اللہ علی القہپائی)
جلد اول ص ۱۲۳ پر درج ہے۔ (ست) احمد بن عبدُ العزیز الجوہری لہٗ کتابُ السّقیفہ،
نوٹ: "ست" سے مراد "فہرست" شیخ ابی جعفر طوسی "شیخ الطائفہ" ہے۔
یعنی اس میں یہ جوہری بزرگ مندرج و مذکور ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں دلالت کرتی ہیں کہ جوہری صاحب دوستوں کے فریق کے یگانہ فرد ہیں اور ان کے مذہب کے خاص آدمی ہیں۔ فلہٰذا ان کی روایات و مرویات اہل سنت کی روایات نہیں ہوسکتیں۔ ان گذارشات کے بعد اصل مسئلہ کی طرف عود کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے۔ بہرکیف روایت ہٰذا میں لفظ قال کے ساتھ راوی کا ادراج اس مقام میں مسلّم و متیقّن ہے۔ قریباً چھ مقامات و مواضع میں لفظ قال کا پایا جانا کوئی اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ واقع میں یہ اضافہ فی الرّوایت ہے۔ امید ہے کہ حق پسند طبائع اور حمایتِ حق کرنے والے علماءِ کرام اس کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔

بعد ازاں یہ چیز مزید قابلِ وضاحت باقی ہے۔ آیا قال کے ساتھ جو ادراج فی الرّوایت کا مسئلہ ثابت کیا گیا ہے۔ یہ فاضل زہری سے صادر ہوا ہے؟ یا کلمہ قال کا فاعل کوئی دوسرا راوی ہے۔

تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ ہمارا پختہ خیال ہے کہ یہ ادراج زہری کی ہی طرف سے ہے۔ اس چیز کے ثبوت کے لئے ہمارے پاس قرائن و شواہد موجود ہیں۔ بلا دلیل اور سینہ زوری سے یہ مسئلہ نہیں طے کیا گیا۔ آئندہ سطور میں ہم اس چیز کے متعلقات پیش کرتے ہیں۔ بنظر غائر ملاحظہ فرما کر حق بات کی حمایت فرمادیں۔

محدّث زُہری کے متعلقہ کوائف

ان کا پورا نام ابوبکر محمد بن مسلم بن عبداللہ بن شہاب زُہری (المتوفی ۱۲۴ھ) ہے۔
پہلی یہ گذارش ہے کہ ہمارے تراجم ورجال کی کتابوں میں ان کی بڑی توثیق موجود ہے۔ بڑے پایہ کے محدّث اور فاضل ہیں۔ جو چیزیں ہم آئندہ سطور میں درج کر رہے ہیں۔ ان کی اتنی حیثیت ہی آپ تصور کر لیں کہ ان کی تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے جو ہم نے مختلف مواضعات سے فراہم کر کے پیش کر دیا ہے۔

—— ایک چیز تو اس مقام میں وہی ہے جو سابقاً ہم نے ذکر کر دی ہے، یعنی مطالبۂ فدک وخمس خیبر وغیرہ کی روایات میں جہاں کہیں کشیدگی ورنجیدگی کے الفاظ (مثلاً غضب ناک ہونا۔ ہجران، عدمِ تکلّم، عدمِ اطلاع و فات فاطمہ وغیرہ وغیرہ) دستیاب ہوتے ہیں۔ وہاں سند میں ابن شہاب زہری ضرور موجود ہے۔ زہری سے خالی سند تاحال نہیں ملی، یہ امر اس بات کا مستقل قرینہ ہے کہ قال کا فاعل ان مقاماتِ مذکورہ میں یہی ابنِ شہاب زہری ہے دوسرا شخص نہیں ہے۔

نیز ابن شہاب زہری کے متعلق بعض کتابوں میں یہ چیز ملتی ہے کہ حسب بعض اوقات روایات کی وضاحت کے لئے از خود تفسیر کر دیتے تھے۔ پھر اس مفسرانہ کلام کے تفسیری حروف واداۃ کو بعض مواضع میں ساقط بھی کر دیتے تھے۔ اس طریقے سے روایت کے اصل الفاظ اور تفسیری الفاظ میں فرق نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ نفس الامر میں اختلاط ہو جاتا تھا۔

زہری کے اس طریقۂ کار کو علامہ سخاوی نے اپنی کتاب فتح المغیث شرح الفیہ الحدیث العراقی بحث مُدرج میں ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تصنیف "النکت" میں لکھا ہے، فرماتے ہیں کہ :-

كذا كان الزهري يفسر الاحاديث كثيرًا وربما اسقط اداة التفسير فكان بعض اقرانه دائمًا يقول له افصل كلامك من كلام النبي صلى الله عليه وسلم الى غير ذالك من الحكايات

(النکت علیٰ کتاب ابن صلاح والفقیۃ العراقی لابن حجر عسقلانی)

تحت النوع العشرون (المدرج) قلمی درکتب خانہ پیرجھنڈا اسندھ) (۲) فتح المغیث سخاوی صـ۱۰۳ بحث مدرج مطبوعہ انوار محمدی لکھنؤ، طبع قدیم)

اب اس چیز کی مزید وضاحت کے لئے (ابن شہاب) کے متعلق چند ایک حوالہ جات ناظرین کرام کی خدمت میں ہم پیش کرتے ہیں کہ جن سے بعض روایات میں ان کا طریق کار مزید روشن ہو جائے گا۔ اور بعض اقران جو زہری کو بطور نصیحت افہام و تفہیم کر رہے ہیں وہ بھی متعین ہو سکیں گے۔

ایک تو امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر جلد ثانی قسم اول صـ۲۶۲۔ تذکرہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (ربیعۃ الرائی) میں امام مالک رح کے حوالہ سے زہری کے حق میں ربیعہ ہذا کا قول ذکر کیا ہے۔ وہ ملاحظہ فرماویں:-

---------- قال عبد العزیز بن عبد اللہ حدثنا مالک کان ربیعۃ یقول لابن شہاب ان حالتی لیس تشبہ حالک انا اقول برأی من شاء اخذہ وانت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فتحفظ الخ (تاریخ کبیر جلد ۲ ق ا صـ۲۶۲)

دوسرا خطیب بغدادی نے اپنی کتاب الفقیہ والمتفقہ "باب ذکر اخلاق الفقیہ وادبہ وما یلزمہ استعمالہ مع تلامیذہ واصحابہ" میں دو روایتیں اپنی مکمل سند کے ساتھ درج کی ہیں۔ وہ ملاحظہ فرماویں۔ انشاء اللہ تعالے اس کے بعد زہری کا طریق کار (بعض روایات میں) آپ پر پوری طرح منکشف ہو جائے گا یہاں ان کے ہم عصر ربیعہ کورا اور زہری صاحب ان دونوں کی باہمی گفتگو ہو رہی ہے۔

(۱) اخبرنا عثمان بن محمد بن یوسف العلاف انبانا محمد بن عبد اللہ الشافعی حدثنا ابو اسمعیل الترمذی حدثنی ابن بکیر حدثنا اللیث قال قال ربیعۃ لابن شہاب یا ابابکر اذا حدثت الناس برأیک فاخبرہم بانہ رأیک واذا حدثت الناس بشیء من السنۃ فاخبرہم انہ سنۃ

(۲) لا یظنّون انّہ رأیك ۔

اخبرنا مُحَمَّد بن الحسن بن الفضل القطان اخبرنا عبد اللہ بن جعفر بن درستویۃ حدثنا یعقوب بن سُفیان ثنا مُحمّد بن ابی زکریا انبأنا ابن وھب قال حدثنی مالك قال قال ربیعہ لابن شھاب اذا اخبرت النّاس بشیء من رأیك فاخبرھُم انّہ رأیك

(کتابُ الفقیہ والمتّفقہ للخطیب بغدادی ۔ باب ذکر اخلاق الفقیہ وادبہٖ الخ ص ۱۴۸ طبع مکّہ شریف)

تیسرا حافظ شمسُ الدّین الذہبی رح نے اپنی کتاب تاریخ الإسلام وطبقات المشاہیر والاعلام میں بعبارت ذیل ربیعہ مذکور کی کلام ذکر کی ہے جو علّامہ زہری کے ساتھ ہوئی ۔

(۳) ـــــــــــــــــ قال الاویسی قال مالك کان ربیعۃ یقول للزھری انّ حَالی لیسَت تشبّہ حالك قال وکیف؟ قال أنا اقول برأیٍ من شاءَ اخذہ ومن شاءَ ترکہ وانتَ تحدّث عن النبی صَلَّی اللہ علیہ وسَلّم فیحفظ ”

(تاریخ اسلام ذہبی جلد خامس ص ۲۴۸ تذکرہ ربیعۃ الرأی طبع مصر)

حاصل یہ ہے کہ فاضل سخاوی کی عبارت میں بعض اقران جو مذکور ہے اس سے مُراد ربیعۃُ الرائے ہے ۔ ربیعہ علّامہ زہری کو نصیحت کرتے ہیں کہ جب لوگوں کو آپ روایت بیان کریں تو اپنی رائے اور روایت میں فرق قائم رکھا کریں تاکہ لوگوں کو آپ کی رائے میں اور روایت میں مفارقت معلوم ہوسکے ۔ دونوں میں تخلیط نہ ہے ۔

ناظرین با تمکین پر عیاں ہوگیا کہ ابن شہاب زہری اپنی مَرویات میں اختلاط وتخلیط فرمایا کرتے تھے ۔ اس وجہ سے ان کے ہم عصر حضرات کو اس گفتگو اور اس مکالمہ کی ضرورت پیش آئی ۔

نیز اہلِ علم کے اطمینان کے لئے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ علاّمہ ابن شہاب زہری کے ادراجات فی الرّوایات بے شمار پائے جاتے ہیں۔ بہت سے اکابر علماء مثلاً دارقطنیؒ، طحاویؒ، ابن عبد البرؒ، بیہقیؒ، ابوبکر الحازمیؒ، امام نوویؒ، جمال الدّین زیلعیؒ، ابن کثیرؒ، ابن حجر عسقلانیؒ، جلال الدّین سیوطیؒ اور ملاّ علی قاریؒ وغیرہم نے زہری کے ادراجات کو تصریحاً ذکر کیا ہے اور ان کی عبارات کو ہم نے جمع کیا ہے۔

اندریں حالات اگر مطالبۂ فدک کی مذکورہ (معہودہ) روایت میں مناقشانہ الفاظ کا اضافہ (جو قال کے بعد مذکور ہے) ابنِ شہاب زہری کی طرف سے "مدرج" تسلیم کر لیا جائے اور زہری کا ظن قرار دیا جائے تو اس چیز میں کوئی امر مانع نہ ہوگا اور قیاس کے موافق و واقع کے مطابق ہوگا۔

حضرت الاستاذ مولانا سیّد احمد شاہ صاحب (اجنالوی چوکیردی) مرحوم و مغفور نے اپنی کتاب "تحقیق فدک" میں اس[1] مسئلہ کی ابتداء فرمائی تھی۔ ہم نے اپنی حقیر تلاش کی رُو سے اس کے مزید مواقع و مواضع فراہم کر کے علماءِ کرام کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔ حق کی حمایت کرنے والے علماءِ عظام امید ہے اس کی تائید فرمائیں گے اور اگر کوئی خامی نظر آئے گی تو اس کی اِصلاح فرمائیں گے۔

ماحصل بحث یہ ہے کہ جن کلمات پر اعتراضات کی بنیاد قائم کی جاتی ہے وہ اصل روایت میں نہیں بلکہ رُوات کی جانب سے درج شدہ الفاظ ہیں۔

---

[1] ان کو اس کی ابتداءً توجہ علامہ تمنا عمادی کے مضمون ابن شہاب زہری سے ہوئی ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا نیز اسی کا اثر خواجہ قمر الدین سیالوی پر پڑا۔ (دیکھئے ان کی کتاب "مذہب شیعہ" مولانا احمد شاہ بخاری کے واسطے سے اس طرف مولانا نافع کو توجہ ہوئی۔ اگرچہ اولیت کی وجہ سے گالیاں علامہ تمنا عمادی مرحوم پر پڑیں۔ اور صرف اسی وجہ سے انہیں منکر حدیث کہا گیا۔ (طالع)

(۲)

حضرت صدّیق اکبر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اور سیّدہ فاطمہ رضہ کے جنازے کا مسئلہ

سابقہ[1] اوراق میں حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے آخری مرض میں پیش آمدہ بعض واقعات پیش خدمت کئے گئے ہیں اور ساتھ ساتھ حضرت صدّیق اکبر رضہ اور حضرت عمر رضہ کے متعلقات بھی ذکر کئے ہیں۔ جن سے ان حضرات کا باہمی تعلق معلوم ہو سکتا ہے۔

اب سیّدہ فاطمہ رضہ کی وفات کے بعد ان کے جنازے کا مسئلہ درپیش ہے۔ اسکے متعلقات اپنی کوشش وبساط کے موافق یکجا کر کے حاضر خدمت کئے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین کرام منظور فرما کر دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے۔

لوگوں میں مشہور کیا جاتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر الصدیق رضہ رضی اللہ عنہ سے سخت ناراض تھیں۔ انہوں نے آخری وقت ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیّت فرمائی تھی کہ میرے جنازے میں وہ نہ شریک ہوں تو حضرت علی رضہ نے رات کو ہی فاطمہ رضہ کا جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کی اطلاع ہی نہ کی۔ (ہکذا فی بعض الروایات)

مسئلہ ہٰذا کو بعض روایات کی بناء پر بہت اہمیّت دی گئی ہے۔ خلاف پروپیگنڈا کرنے والے دوستوں نے اس مسئلہ کو مخالفت کا اور عناد کا زبردست ثبوت بنا کر نا واقف عوام میں پھیلا دیا ہے۔ بنا بریں ضرورت ہوئی کہ اس مسئلہ کو بڑے عمدہ انداز سے صاف کر دیا جائے اور صدیق اکبر رضہ کا فاطمہ رضہ کے جنازہ میں شامل ہونا روشن داشت ائی کا مستقل نشان ہے۔ اس کو حقائق کی روشنی میں قوم کے

---

[1] رحماء بینہم جلد اوّل میں

سامنے رکھا جائے اور اس دوران میں کچھ طوالت آجائے تو امید ہے کہ ناظرین کرام گرانی محسوس نہیں فرمائیں گے جو کچھ معروض ہوگا وہ ضرورت کے تحت ہوگا۔

اس بحث کو مدوّن کرنے کی ترتیب یہ تجویز کی گئی ہے کہ سب سے پہلے اصل مسئلہ کے لئے مثبت روایات سامنے رکھی جائیں گی۔ پھر اس مسئلہ کے مؤید قواعد شرعی ذکر ہوں گے۔ پھر اس پر تاریخی شواہد پیش کئے جائیں گے جن سے بنی ہاشم کا تواتر عملی واضح ہو سکے گا۔ اس کے بعد ازالۂ شبہات کے لئے مزید قابل ذکر امور درج ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالےٰ

(۱)

اصل مسئلہ کے لئے روایات

(۱) صاحب طبقات نے اپنی تصنیف طبقات ابن سعد میں اپنی مکمل سند کے ساتھ مندرجۂ ذیل روایت ذکر کی ہے :-

—— عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ النَّخَعِيْ قَالَ صَلّٰى اَبُوْبَكْرِ الصِّدِّيْقُ عَلٰى فَاطِمَةَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَبَّرَ اَرْبَعًا۔ یعنے : ابراہیم نخعی نے کہا کہ ابوبکر الصدیق رضی نے فاطمہ رضی اللہ عنہا دختر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نماز جنازہ پڑھی اور چار تکبیریں کہیں۔

(طبقات ابن سعد جلد ۸ صہ ۱۹۔ تذکرہ فاطمہؓ مطبوعہ لیدن (یورپ)

(۲) اسی طبقات ابن سعد میں اسی مسئلہ کے لئے دوسری روایت ملاحظہ ہو۔

—— عَنْ مُجَالِدٍ عَنِ الشَّعْبِيْ قَالَ صَلّٰى عَلَيْهَا اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَعَنْهَا۔ یعنے : شعبی کہتے ہیں کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھی۔ (طبقات ابن سعد صہ ۱۹ جلد ۸، تذکرہ فاطمہ رض طبع لیدن یورپ)

(۳) تیسری روایت مسئلہ ہذا کے لئے بیہقی سے سند کے ساتھ منقول ہے لکھتے ہیں:

ثنا محمد بن عثمان بن ابی شیبۃ ثنا عون بن سلام ثنا سوار بن مصعب عن مجالد عن الشعبی ان فاطمۃ رضی اللہ عنہما لما ماتت دفنها علی لیلاً واخذ بضبعی ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ فقدمه یعنی فی الصلوٰۃ علیها۔

ترجمہ: یعنی جب حضرت فاطمہ رضؓ فوت ہوئیں تو حضرت علی رضؓ نے ان کو رات میں دفن کیا۔ اور (جنازہ کے موقعہ پر) حضرت علیؓ نے ابوبکر رضؓ کے دونوں بازو پکڑ کر جنازہ پڑھانے کے لئے مقدم کیا۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی مع الجواہر النقی جلد ۴ ص ۲۹ کتاب الجنائز۔
(۲) کنز العمال جلد ۷ ص ۱۱۴ بحوالہ بیہقی کتاب الفضائل - فضائل فاطمہ، طبع اول تحتی کلاں)

(۴) امام محمد باقر سے مروی روایت صاحب کنز العمال علی المتقی الہندی نے بحوالہ خطیب ذکر کی ہے۔ عبارت روایت یہ ہے۔

عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ مَاتَتْ فَاطِمَۃُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَجَآءَ اَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ رضی اللہ عنہما لِیُصَلُّوْا فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ لِعَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ تَقَدَّمْ: فَقَالَ مَاکُنْتُ لِاَتَقَدَّمَ وَاَنْتَ خَلِیْفَۃُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَتَقَدَّمَ اَبُوْبَکْرٍ وَصَلّٰی عَلَیْهَا۔

یعنی: امام جعفر صادق امام محمد باقر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دختر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہوئیں تو حضرت ابوبکرؓ و عمر رضؓ دونوں نماز جنازہ پڑھنے کے لئے تشریف لائے۔ ابوبکر رضؓ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کو (جنازہ پڑھانے کے لئے) کہا کہ آگے تشریف لائیے! تو علی المرتضے رضؓ نے جواب دیا کہ آپؐ خلیفہ رسولؐ ہیں۔ میں آپ سے

پیش قدمی نہیں کرسکتا۔ پس ابوبکر رضؓ نے مقدم ہو کر نماز جنازہ پڑھائی۔
(کنز العمّال (خط فی رواۃ مالک رح جلد ۶ ص۳۱۸ طبع قدیم
روایت ۵۲۹۹ باب فضائل الصحابۃ۔ فضل الصدیق۔ مسندات
علی رضؓ۔ تحتی کلاں)

(۵) اب امام زین العابدین کی ایک روایت حاضر خدمت ہے۔ اس مسئلہ کو اس روایت نے بڑی حسنؑ کے ساتھ صاف کر دیا ہے۔ محبّ الطّبری نے ریاض النّضرۃ میں اس کو نقل کیا ہے

عن مَالكٍ عن جعفر بن محمّدٍ عن ابيه عن جَدّہٖ علی بن حُسین قَالَ مَاتَتْ فَاطِمَۃُ بَیْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ فَحَضَرَهَا اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانَ وَالزُّبَيْرُ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فَلَمَّا وُضِعَتْ لِیُصَلّٰی عَلَیْهَا قَالَ عَلِیٌّ رضؓ تَقَدَّمْ يَا اَبَا بَكْرٍ قَالَ وَاَنْتَ شَاهِدٌ يَا اَبَا الْحَسَنِ ؟ قَالَ نَعَمْ ! تَقَدَّمْ ! فَوَاللهِ لَا يُصَلِّي عَلَيْهَا غَيْرُكَ نَصَلّٰی عَلَيْهَا اَبُوْبَكْرٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ وَدُفِنَتْ لَيْلًا۔ خَرَّجَهُ الْبَصْرِي وَخَرَّجَهُ ابْنُ السَّمَّانِ فِي الْمُوَافَقَۃِ

حاصل یہ ہے کہ جعفر صادق اپنے والد محمد باقر رح سے اور وہ اپنے والد زین العابدین سے روایت کرتے ہیں کہ مغرب اور عشاء کے درمیان فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی (ان کی وفات پر) ابوبکرؓ و عمر رضؓ و عثمانؓ و زبیرؓ و عبدالرحمٰنؓ بن عوف (حضرات) حاضر ہوئے۔ جب نماز جنازہ پڑھنے کے لئے جنازہ (سامنے) رکھا گیا تو حضرت علی رضؓ نے ابوبکر رضؓ کو کہا کہ اے ابوبکرؓ (نماز پڑھانے کے لئے) آگے تشریف لائیے۔ ابوبکر رضؓ نے جواب دیا۔ کہ اے ابوالحسن! آپ کی موجودگی میں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! آپ آگے تشریف لائیے۔ اللہ کی قسم! آپ کے بغیر کوئی دوسرا شخص فاطمہ رضؓ پر نماز جنازہ

نہیں پڑھائے گا۔ پس حضرت ابوبکر رضؓ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر نماز جنازہ پڑھائی اور رات کو دفن کی گئیں۔

(ریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ المبشرۃ لمحب الطبری جلد اول ص۱۵۶ باب وفات فاطمہ رضی اللہ عنہا)

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تحفۂ اثنا عشریہ (مطاعن صدیقی) میں طعن ۱۴ کے آخر میں فصل الخطاب، سے نقل کرتے ہوئے مذکورہ مندرجہ روایت کے قریب قریب ذکر کی ہے۔ ناظرین کے فائدہ کے لئے ریاض النضرۃ کی تائید میں یہ درج کی جاتی ہے۔

"در فصل الخطاب آوردہ کہ ابوبکر صدیقؓ و عثمانؓ و عبدالرحمٰنؓ بن عوف رضؓ و زبیرؓ بن عوام وقت نماز عشاء حاضر شدند و رحلت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا درمیان مغرب و عشاء شب سہ شنبہ سوم ماہ رمضان (۱۱ھ) بعد از شش ماہ از واقعہ سرور جہاںؐ بوقوع آمدہ بود و سنین عمرش بست و ہشت بود و ابوبکر رضؓ بموجب گفتۂ علی رضؓ مرتضیٰ پیش امام شد نماز بروے گذاشت و چہار تکبیر برآورد۔"

(تحفہ اثناء عشریہ، مطاعن صدیقی، آخر طعن ۱۴ ص۲۷۵ طبع نولکشور لکھنؤ)

روایت ہٰذا کا خلاصہ یہ ہے کہ فصل الخطاب" کے مصنف نے ذکر کیا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ و عثمان رضؓ و عبدالرحمٰنؓ بن عوف و زبیرؓ بن عوام رضی اللہ عنہم تمام حضرات عشاء کی نماز کے وقت حاضر ہوئے اور سیدہ فاطمہ رضؓ کی رحلت مغرب اور عشاء کے درمیان ہوئی تھی منگل کی رات تیسری رمضان شریف تھی حضور علیہ السلام کے بعد چھ ماہ بعد فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔ اس وقت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ حضرت علی المرتضٰے رضی اللہ عنہ کے فرمان کے مطابق حضرت ابوبکر الصدیقؓ نماز جنازہ کے امام بنے اور چہار تکبیروں کے ساتھ اس پر نماز گذاری۔ [1]

---

[1] صلیت جنازۃ الزھراء با مامۃ الصدیق رضؓ باصرار علی رضؓ ھٰذا ھو

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۶) حافظ ابُونعیم اصفہانی نے حلیۃ الأولیاء میں اپنی مکمّل سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جنازہ کی روایت نقل کی ہے

عن میمُون بن مھران عن عبد اللہ بن عبّاس اِنَّ النّبیَّ صَلّی اللہ عَلَیہ وسلّمَ اُتِیَ بجنازۃ فصلّی علیھا وکبّر علیھا اَربعًا وقالَ کبّرت الملٰئکۃ علی آدم اَربَعَ تکبیراتٍ وکبّر ابُوبکرٍ علیٰ فاطمۃ اَربعًا وکبّر عُمر علی اَبی بکرٍ اَربعًا وکبّر صُھیبٌ علیٰ عُمر اَربعًا۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) الصحیح روایۃ ودرایۃً (مولانا شمس الحق افغانی رح)

ایک تنبیہ

نوٹ: روایات ہذا کے اندراج کے بعد ضروری اشیاء ذکر کرنے سے قبل دوستوں کے دفع وہم کے لئے ان کو ایک اطلاع کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے اور چیزیں بعد میں ذکر ہوتی رہیں گے۔ وہ یہ ہے کہ ان کے مشہور معتمد عالم و مجتہد سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے کتاب الشافی میں کتاب المغنی کا رد کرتے ہوئے حضرت فاطمہ رض کے جنازے کے مسئلہ میں لکھا ہے کہ فھو شیءٌ ما سمع الا منك وان کنت تلقیتہ من غیرك فمن یجری مجراك فی العصبیۃ والا فالروایات المشھورۃ وکتب الاثار و السیر خالیۃ من ذالك: (کتاب الشافی صہ ۲۳۹ مع تلخیص طبع قدیم)

خلاصہ یہ ہے کہ (ابوبکر الصدیق رض کا فاطمہ رض کے جنازہ کو چہار تکبیروں کے ساتھ پڑھنا) یہ چیز صرف آپ سے ہی سنی جا رہی ہے۔ اگر تم نے کسی دوسرے سے اخذ کی ہے تو وہ بھی آپ جیسا متعصب ہے ورنہ مشہور روایات وسیرت و آثار کی تمام کتابیں اس ذکر سے خالی ہیں۔ اور یہ شافی کی عبارت شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید میں بحث فدک فصل ثالث میں بھی منقول ہے۔ شافی اور شرح نہج حدیدی کی ہر دو عبارات لہذا پیش کرانے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اتنی مُرسل و مسند روایتیں باسناد لوگوں سے ہم نے جمع کر کے پیش کی ہیں۔ اور بھی ذخیرہ روایات سے دستیاب ہونے کی توقع ہے۔ پھر اس مسئلہ کے حق میں یہ تحریر کرنا کہ کتب سیرت و آثار اس سے خالی ہیں۔ کہاں تک بانسداد آنہ تحقیق ہے؟ اور اکابر مجتہدین شیعہ کا فرمان کس حد تک درست ہے؟ ناظرین کرام انصاف فرمائیں اور ان کی محققانہ رائے زنی کی داد دیں۔

یعنے : حضرت ابن عباس رضیَ اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک جنازہ لایا گیا۔ آپؐ نے اس پر نماز جنازہ پڑھی اور چہار تکبیریں کہیں اور فرمایا کہ ملائکہ نے آدم علیہ السّلام پر چہار تکبیریں کہیں تھیں اور (ابن عبّاس رضہ کہتے ہیں کہ) ابوبکر الصدّیق رضہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا (کے جنازہ کے موقعہ) پر چہار تکبیریں کہیں اور حضرت عمر رضہ نے ابوبکر رضہ پر چہار تکبیریں کہیں اور صہیبؓ رضہ نے عمر رضہ پر چہار تکبیریں کہیں۔

(حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصفہانی جلد۴ ص۹۶ تذکرہ میمون بن مہران)

مندرجہ روایات کے فوائد ونتائج

قریبًا چھ سات عدد روایات اس مسئلہ کے لئے آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان میں تین عدد روایات غیر ہاشمی حضرات کی ہیں اور تین عدد خود ہاشمی بزرگوں (یعنے امام محمد باقر رحہ امام زین العابدین رحؒ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بن عبد المطلب) کی روایت کردہ ہیں۔ ان تمام مرویات سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ:

(۱) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ان بڑے بڑے اکابر صحابۂ کرام سب کو ہوگئی تھی (خصوصًا صدّیق اکبر رضہ کو تو اپنی زوجہ اسماء بنت عمیس کے ذریعہ بھی خاتون جنت کے تمام احوال کی خبر یقینًا ہوتی رہتی تھی۔ اور وفات کی اطلاع نہ ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ اس نہایت اندوہناک واقعہ کی خبر ان کو بالیقین حاصل تھی۔

(۲) دوسری یہ چیز ان روایات نے بتلائی کہ اطلاع وفات کے بعد ان جنازہ کے لئے تمام حضرات بمع ابوبکر صدّیق رضؓ وعمر فاروق رضہ کے تشریف لائے اور حضرت علی رضہ سے تکلّم وکلام بات چیت ہوئی ہے۔ خاص طور پر یہ تذکرہ ہوا کہ جنازہ کے پڑھانے کی کون سعادت حاصل کرے۔ حضرت علی رضہ اور حضرت ابوبکر رضہ کی باہمی گفتگو کے بعد حضرت علی المرتضےٰ کے فیصلے کے مطابق یہ طے ہوا کہ خلیفۂ رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ ہیں۔ فلہذا جنازہ کی امامت کے یہی حقدار ہیں۔

گویا اکابر صحابۂ کرام رضؓ اور ہاشمی بزرگوں کی موجودگی میں یہ مسئلہ حل ہوگیا کہ مسلمانوں کے خلیفۂ وقت کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص امامت کا حقدار نہیں ہوتا۔ پنجگانہ نماز ہو یا جنازہ کی نماز ہو۔ ان میں ایک ہی حکم ہے۔

(۳) تیسری یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ نے یہ جنازہ پڑھایا اور چہار تکبیروں کے ساتھ پڑھایا۔ یعنے پانچ تکبیروں کے ساتھ یہ جنازہ نہیں پڑھایا گیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے بھی آخری جنازوں پر صرف چہار تکبیریں کہیں تھیں۔ اور آدم علیہ السّلام کا جنازہ جو فرشتوں نے پڑھایا تھا وہ بھی چہار تکبیرات کے ساتھ ہوا تھا اور ابوبکر الصدیق رضؓ کا جنازہ عمر فاروق رضؓ نے پڑھایا تھا۔ وہ چار تکبیروں کے ساتھ پڑھایا گیا تھا۔ اور حضرت صہیب رُومی رضؓ صحابیٔ رسول ؐ نے جب عمر فاروق رضؓ کا جنازہ پڑھایا۔ وہ بھی چہار تکبیروں کے ساتھ پڑھایا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ناظرین کرام کو یاد رہنی چاہیئے کہ علمائے کرام نے لکھا ہے کہ جب علی المرتضےٰ رضؓ کی شہادت ہوئی ہے تو اس وقت امام حسن رضؓ نے جنازہ پڑھایا اور چہار تکبیروں کے ساتھ پڑھایا تھا۔ (ملاحظہ ہو مستدرک حاکم جلد ۳ ص۱۴۳)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ فاطمہ بنت اسد کا جنازہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم نے چہار تکبیرات کے ساتھ ادا فرمایا (ملاحظہ ہو جمع الفوائد، جلد ۲ ص۴۰۸ بحوالہ طبرانی کبیر و اوسط) الحمدُ للہ ثمّ الحمدُ للہ کہ ان تمام حضرات کے جنازے سے حضرت علی رضؓ کے جنازے تک سب چہار تکبیروں کے ساتھ مروی ہیں۔ اور اسی پر عمل کرنا صحیح ہے۔ پانچ تکبیروں پر عمل کرنا متروک ہے۔

(۴) چوتھی یہ چیز مذکور ہوئی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضؓ کو جنازہ کرنے کے بعد رات کو ہی دفن کر دیا تھا۔ یہ چیز عام روایات میں مذکور ہے۔ ایک تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شرعِ اسلامی کا قاعدہ ہے کہ وفات کے بعد میّت کو زیادہ دیر نہ روکا جائے۔ بلکہ جلد تر اس کے کفن دفن کا انتظام کیا جائے اور حضرت فاطمہ رضؓ کی وفات

مغرب کے بعد اور عشاء سے قبل ہوئی تھی ۔ اس بنا پر بھی رات کو ہی دفنانے کا جلد تر مناسب تھا۔ دوسری یہ چیز ہے کہ رات کے اندر دفنانے میں پوری طرح پردہ داری رہتی ہے۔ خاتون جنت کے جنازہ میں ان کی وصیت کے مطابق تستّر و پردہ داری ہی مطلوب تھی ۔ اس وجہ سے بھی رات کو ہی دفن کرنا درست تھا۔ شب کے اندر دفنانے میں یہ ہرگز مقصود نہیں تھا کہ ابوبکر رضؓ الصدیق اور عمر فاروق رضؓ کے فاطمہ رضؓ کے جنازے میں شامل ہونے سے پرہیز کیا جائے اور ان کو اس کی اطلاع نہ ہونے پائے ۔ یہ چیز سراسر واقعات کے خلاف تیار کرلی گئی ہے ۔ اس کے متعلق ازالۂ شبہات کے درجہ میں ہم عنقریب انشاءاللہ کلام چلائیں گے ۔

(۵) ہمارا اصل مسئلہ باہمی مؤدت و دوستی اور خوشگوار تعلقات کا جاری تھا۔ روایات مندرجۂ بالا سے جہاں اور مسائل ثابت ہو رہے ہیں ۔ وہاں علی المرتضیٰ رضؓ و فاطمہ رضؓ اور صدیق اکبر رضؓ کے باہمی مراسم اور خوشتر تعلقات بھی نمایاں ہو رہے ہیں لیکن مخالفین صحابۂ کرام رضؓ ان واقعاتِ صحیحہ اور حقائقِ صریحہ کو قطع و بُرید کرکے اور غیر واقعی چیزوں کی آمیخت و ملاوٹ کرکے منافرت کی وبا اور مخالفت کی ہوا پھیلانے کو اپنا فریضہ منصبی خیال کرتے ہیں ۔ نصوص صریحہ اور مسلمہ واقعات کے خلاف کرنے میں ذرہ بھر بھی اللہ کا خوف نہیں کرتے ۔ فالی اللہ الشکوٰی

امامتِ نماز کے متعلق اسلامی دستور

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جنازہ کی بحث میں پہلے اگر اسلام کا قاعدہ اور قانون معلوم کر لیا جائے تو بڑی آسانی سے یہ مسئلہ سمجھ میں آسکتا ہے ۔

شرعِ اسلامی میں (پنجگانہ نماز ہو یا نماز جنازہ ہو) کے متعلق دستور ہے کہ مسلمانوں کا امیر اور خلیفۂ وقت نماز کی امامت کا اصل حقدار ہوتا ہے اگر وہ خود موجود نہ ہو یا کوئی عذر ہو تو امیر المؤمنین کی طرف سے جو آدمی مقرر ہو وہ امامت کا مستحق ہوتا ہے۔ ہر دور کے تمام مسلمان اس مسئلہ کو بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں اور اسلامی کتابیں اور اسلامی

تاریخ اس مسئلہ پر شاہد وگواہ ہے۔

ناظرین کرام اور احباب کی تسلی کے لئے چند ایک حوالہ جات (ان کی اپنی روایات ومسلّمات سے) پیش کرنے کا خیال ہے۔ امید ہے منظورِ خاطر ہو سکیں گے۔

اس مسلّمہ دستور کے ثبوت کے لئے اپنی کتابوں کے کسی حوالہ کی حاجت نہیں ہے فقہ کی کتابوں میں بابُ الامامت اٹھا کر ملاحظہ کرلیں تسلی ہو جائے گی۔

البتہ احباب کے اطمینان کی خاطر ان کی شیعی کتابوں سے چند ایک معتبر حوالہ جات سپُردِ قلم کئے جاتے ہیں۔ بغور مطالعہ فرمانے سے مقصد برآری ہو سکے گی۔

(۱) لوگوں نے امام جعفر صادق سے اس مسئلہ کے متعلق سوال کیا تو امام نے جو جواب فرمایا ہے۔ وہ فروع کافی جلد اول کتابُ الصّلوٰۃ "باب من احق ان یؤم القوم" میں مروی ہے:-

فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَتَقَدَّمُ الْقَوْمَ، اَقْرَأُھُمْ لِلْقُرْاٰنِ فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقِرَاۃِ سَوَاءً فَاَقْدَمُھُمْ ھِجْرَۃً فَاِنْ کَانُوْا فِی الْھِجْرَۃِ سَوَاءً فَاَکْبَرُھُمْ سِنًّا۔ (فروع کافی جلد اول کتابُ الصّلوٰۃ باب من احقّ ان یؤمّ القوم ج اول ص۲۲۵، طبع نول کشور لکھنؤ)

(۲) وَاَوْلَی النَّاسِ بِالتَّقَدُّمِ فِی جَمَاعَۃٍ اَقْرَأُھُمْ لِلْقُرْاٰنِ فَاِنْ کَانُوْا فِی الْقُرْاٰنِ سَوَاءً فَاَقْدَمُھُمْ ھِجْرَۃً فَاِنْ کَانُوْا فِی الْھِجْرَۃِ سَوَاءً فَاَسَنُّھُمْ (امالی الشیخ الصّدوق ص۳۸۲۔ المجلس الثالث والتسعون)

ان ہر دو حوالہ جات کا حاصل یہ ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے۔ جو شخص دوسرے لوگوں میں سے قرآن مجید کا زیادہ قاری ہو وہ قوم کی امامت کرائے۔ اگر حاضرین قراءت کے اعتبار سے مساوی ہو تو جو شخص ہجرت میں مقدم ہو وہ امامت کرائے اور اگر ہجرت میں مساوی ہوں تو ان میں سے جو عمر رسیدہ ہو وہ جماعت کرائے۔

(۳) شیعہ مجتہدین نے اس مسئلہ میں اپنا مفتی بہ فیصلہ یوں تحریر کیا ہے:-

فَاِنْ تَسَاوَوْا فِی الْفِقْہِ وَالْقِرَاۃِ فَالْاَقْدَمُ ھِجْرَۃً مِنْ دَارِ الْحَرْبِ اِلٰی دَارِ الاسلام ـــ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ فَاِنْ تَسَاوَوْا فِیْ ذَالِکَ فَالْاَسَنُّ مُطْلَقًا ـــ ـ ـ ـ ـ ـ ـ وَالاِمَامُ الرَّاتِبُ فِیْ مَسْجِدٍ مَخْصُوْصٍ اَوْلٰی مِنَ الْجَمِیْعِ لَوِاجْتَمَعُوْا وَکَذَا صَاحِبُ الْمَنْزِلِ اَوْلٰی مِنْھُمْ وَمِنَ الرَّاتِبِ وَصَاحِبُ الْاِمَارَۃِ فِیْ اَمَارَتِہٖ اَوْلٰی مِنْ جَمِیْعِ مَنْ ذُکِرَ اَیْضًا۔

(شرح لمعہ جلد اول صـ۱۰۱ کتاب الصلوٰۃ فصلُ الحادی عشر فی الجماعۃ، طبع تبریز طبع جدید)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر (حاضرینِ نماز) علم فقہ و قرأۃ میں برابر ہوں تو دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرۃ کرنے میں جو شخص مقدم ہو وہ امامت کے لئے زیادہ حقدار ہے ــ ــ ــ ــ اگر (حاضرین) اس فضیلت ہجرۃ میں برابر ہوں تو ان میں سے جو عمر رسیدہ ہوگا وہ مطلقاً زیادہ مستحق ہے۔ اور مقرر امام جو مسجد مخصوص کے لئے متعین ہو وہ دیگر سب لوگوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے۔ اسی طرح "صاحبِ خانہ" باقی لوگوں سے امامت کا زیادہ حق رکھتا ہے اور امیر المؤمنین اور خلیفۂ وقت تو تمام مذکور لوگوں سے اِمامت کا زیادہ حقدار ہوتا ہے۔"

(۴) آخری حوالہ امام جعفر صادق کا قول ہے۔ ملاحظہ فرماویں:۔

ـــــــــــ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ اِذَا حَضَرَ الْاِمَامُ الْجَنَازَۃَ فَھُوَ اَحَقُّ النَّاسِ بِالصَّلٰوۃِ علیھا یعنے امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں کہ جب وقت کا امیر جنازہ کے موقعہ پر موجود ہو تو وہ تمام لوگوں سے نماز پڑھانے کا زیادہ حقدار اور زیادہ مستحق ہے۔" (فروع کافی جلد اول کتابُ الجنائز صـ۹۳ طبع نول کشور لکھنو) باب اَوْلَی النَّاسِ بِالصَّلٰوۃِ عَلَی الْمَیِّتِ)

(۵) قرب الاسناد" میں خود حضرت علیؓ سے اس طرح مروی ہے کہ:۔

قَالَ عَلِیٌّ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَلْوَالِی اَحَقُّ بِالصَّلٰوۃِ عَلَی الْجَنَازَۃِ مِنْ وَلِیِّھَا۔ یعنی: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ والی وحاکم وقت نمازِ جنازہ کا زیادہ حقدار رشتہ دارانِ میت سے ہوتا ہے۔" (قرب الإسناد حُمیری ص۲۱ باب من احق بالصّلٰوۃ علی المیّت)

ان تمام شیعی حوالہ جات کا حاصل یہ ہے کہ امام المسلمین خلیفۃ المؤمنین کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے مؤمن مسلمان کو امامتِ نماز کی اجازت نہیں ہے۔ امامت کرنا صرف اسی کا حق ہے، نمازِ پنجگانہ کی امامت ہو یا نمازِ جنازہ کی امامت ہو

ائمۂ کرام کے فرمودات معلوم کرلینے کے بعد آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ امامت کے شرائط کس شخص میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں ان کے ائمہ اور بزرگوں نے فرمان دیا ہے کہ مسلمانوں کی حاضر جماعت میں سے اگر تمام حاضرین فقہ دینی اور قرأۃ قرآنی میں برابر ہوں تو مسلمان اس شخص کو نماز کا امام بنائیں جو ہجرت کرنے میں متقدّم اور سابق ہو اور اگر حاضرین اس ہجرت میں مساوی ہوں تو امام اس کو بنائیں جو شخص عمر رسیدہ ہو اور معمّر ہو۔ پھر اس کے بعد محلہ کی مسجد کا مخصوص امام امامت کا زیادہ حقدار ہے اور پھر اس کے بعد امام وقت و خلیفۂ مُسلمین کا درجۂ امامت کرانے میں سب سے فائق ہوتا ہے۔ جہاں خلیفۂ وقت اور مسلمانوں کا امیر ہو، وہاں کسی کو بھی امامت کرانے کا حق نہیں ہے صرف اسی کو حق ہے۔

اب مہربانی فرماکر اصل مسئلہ (یعنی سیّدہ فاطمہ رضہ کے جنازہ) کے متعلق توجہ فرمائیے کہ ان قواعد مندرجۂ بالا کی رُو سے اس چیز کا حقدار کون ہوسکتا ہے؟

اللہ کی قدرت یہ ہے کہ جو اس وقت حضرات جنازۂ ہٰذا کے لئے موجود تھے ان میں سیّدنا ابوبکر الصدّیق رضی اللہ عنہ (۱) ہجرت اسلامی میں سب سے مقدّم وسابق تھے۔ (۲) اور دوسرا ان حضرات میں ابوبکر الصدّیق رضہ عمر رسیدہ تھے۔ (۳) یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضہ کے محلہ کی مسجد (یعنی مسجد نبویؐ) کے امام بھی ابوبکر الصدّیق رضہ تھے۔ (۴) چوتھی چیز ، جو نہایت ہی اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے

کہ اس وقت کے تمام مسلمانوں کے امیر و خلیفۂ وقت و امام بھی ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

پھر یہ چیز بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ مدینہ طیبہ میں موجود اور حاضر ہیں۔ کہیں غائب نہیں نہ کہیں سفر پر ہیں۔ پھر ان کو فاطمہ رضؓ کے جنازہ کی اطلاع بھی ہوئی اور جنازہ پر تشریف لے گئے۔ قدرت کی طرف سے اتفاق ہی ایسا ہے کہ تمام بالا اوصاف و شرائط ان میں بطریق اتم موجود تھیں

ان معروضات کے بعد انصاف ناظرین پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ خود فیصلہ فرما لیں۔ جنازہ کا پڑھانے کا حقدار کون ہے اور کس نے پڑھایا؟ مندرجہ بالا کوائف کی روشنی میں انصافاً یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ خلیفۂ رسول اللہ صدیق اکبر رضؓ ہی ہیں۔ جنہوں نے سیدہ فاطمہ رضؓ کا جنازہ پڑھایا اور رفاقت کا حق ادا کیا۔

(۳)

مسئلہ ہٰذا کی تائید و تصدیق میں تاریخی شواہد۔

قارئین کرام خیال فرمادیں کہ پہلے ہم نے اس مسئلہ کے اثبات کے لئے چھ عدد روایات پیش کی ہیں۔ اس کے بعد ہم نے اس مسئلہ کو اسلامی قانون و دستور کی صورت میں (جو فریقین میں مسلّم ہے) پیش کیا ہے اور اس دستور کے متعلقہ حوالہ جات بھی حاضر کر دیئے ہیں۔

اب ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اس شرعی قانون و قاعدہ پر (کہ نماز جنازہ پڑھانا امیر المؤمنین کا حق ہوتا ہے) بنی ہاشم حضرات کا کہاں تک عملدرآمد رہا ہے؟ اور میدانِ عمل میں ہاشمیوں نے اس کو قابلِ عمل سمجھا ہے یا نہیں؟ یہ ایک تاریخ کا مسئلہ ہے۔ تاریخی واقعات کی رُو سے اس کو ثابت کرنا اور مکمل کرنا مناسب ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے قلیل سی جستجو کی ہے۔ جو ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں

پیش کردہ واقعات کی روشنی میں آسانی کے ساتھ مسئلہ ہٰذا کی تائید دستیاب ہوسکے گی اور واضح ہو جائے گا کہ بنی ہاشم حضرات کے جنازے ہمیشہ خلفاءِ وقت اور مسلمانوں کے امیر پڑھاتے رہے ہیں یا کوئی اور پڑھاتا تھا۔ مسئلہ ہٰذا کو تاریخی شواہد کی صورت میں پیش کرنے کی خاطر چند ہاشمی حضرات کے جنازے اسلامی تاریخ سے ذکر کیئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمادیں۔

(۱)

جنازۂ اوّل

ہاشمی بزرگوں میں سے نوفل بن الحارث بن عبد المطّلب بن ہاشم ہیں۔ ان کی وفات ۱۵ھ میں مدینہ شریف میں ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ وقت تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنّت البقیع میں دفن ہوئے۔

وتُوفّی نوفل بن الحارث بعد ان استخلف عمر بن الخطاب بسنة وثلاثة اشهر فصلّی علیہ عمر بن الخطّاب ثمّ تبعہ الی البقیع حتّی دُفِن ھناك یعنی نوفل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایک سال تین ماہ بعد ۱۵ھ میں فوت ہوئے۔ ان پر حضرت عمر رض نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر بقیع تک ساتھ گئے اور وہاں دفن ہوئے۔

(طبقات ابن سعد ص۳۱ ص۳۲ جلد ثانی قسم اول۔ تذکرہ نوفل بن حارث)

(۲)

جنازۂ دوم

دوسرا ہاشمی بزرگ ابوسفیانؓ بن الحارث بن عبد المطّلب بن ہاشم ہیں

ابوسفیان حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کے رضاعی بھائی بھی ہیں حضرت حلیمہ

دونوں کی رضاعی ماں ہے۔ ان کے متعلق لکھا ہے :۔

وَتُوُفِّيَ اَبُوْسُفْيَانَ سَنَةَ عِشْرِيْنَ وَصَلّٰى عَلَيْهِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَقِيْلَ مَاتَ بِالْمَدِيْنَةِ بَعْدَ اَخِيْهِ نَوْفَلَ بْنَ الْحَارِثِ بِاَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ الخ یعنی : یہ ابوسفیان ۲۰ھ میں فوت ہوئے اور اُن پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھی اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ اپنے بھائی نوفل کے چار ماہ بعد فوت ہوئے۔

(اسد الغابہ لابن اثیر الجزری جلد ۵ ص۲۱۴ ص۲۱۵ طبع تہران - ذکر ابوسفیان)

جنازہ (۳) سوم

تیسرا موقعہ حضرت عباس بن عبدالمطلب عمّ النبی صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال کا ہے۔ ان کے متعلق علماء کرام نے لکھا ہے کہ :۔

تُوُفِّيَ الْعَبَّاسُ بِالْمَدِيْنَةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ سَنَةَ ۳۲ھ قَبْلَ قَتْلِ عُثْمَانَ بِسَنَتَيْنِ وَصَلّٰى عَلَيْهِ عُثْمَانُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَدُفِنَ بِالْبَقِيْعِ وَهُوَ ابْنُ ثَمَانٍ وَثَمَانِيْنَ سَنَةً۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عباس رض بن عبدالمطلب کا انتقال جمعہ کے روز مدینہ شریف میں ۳۲ھ میں ہوا تھا۔ اور حضرت عثمانؓ بن عفان کی شہادت سے دوسال قبل ہوا۔ حضرت عثمان رض خلیفۂ وقت نے ان کا جنازہ پڑھایا اور جنّت البقیع میں دفن ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھاسی (۸۸) سال تھی۔

(۱) الاستیعاب لابن عبدالبرّ معہ اصابہ، تذکرہ عباس بن عبدالمطلب، جلد ثالث صفحہ ص۱۰۱ (۲) اسد الغابہ جلد ۷ ص ۱۶۳)

تنبیہ

مذکورہ بالا تینوں جنازوں کے موقع پر مدینہ شریف میں حضرت علی المرتضے رض خود موجود تھے اور تینوں جنازے خلفاء و اُمراءِ وقت نے پڑھائے ہیں۔

(۴)

جنازۂ چہارم

اس مسئلہ میں چوتھا جنازہ امام حسن رضؓ کا ہے۔ ان کا انتقال بھی مدینہ شریف میں ہوا۔ اس وقت (نزد بعض علماء) ۵۰ھ (پچاس) ہجری تھا۔ خلیفہ و امیر وقت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے لیکن وہ شام میں تھے۔ ان کی جانب سے امیر مدینہ سعید بن العاص اموی تھا۔ حضرت امام حسین رضؓ بنفسِ نفیس خود موجود تھے۔ جنازہ کے لئے سعید مذکور کو امام حسین رضؓ نے مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ سنّت نہ ہوتی تو میں آپ کو مقدم نہ کرتا۔

وَقَدَّمَ الْحُسَيْنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِلصَّلٰوةِ سَعِيْدَ بْنَ الْعَاصِ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ اَمِيْرُ الْمَدِيْنَةِ وَقَالَ تَقَدَّمْ فَلَوْلَا اَنَّهَا سُنَّةٌ لَمَا قَدَّمْتُكَ

(ترجمہ) امام حسین رضؓ نے امام حسن رضؓ کے جنازہ پر سعید بن العاص رضؓ کو جو اس وقت امیر مدینہ تھا فرمایا کہ آگے ہو کر جنازہ پڑھائیے۔ اگر یہ سنتِ اسلام کی نہ ہوتی تو آپ کو مقدم نہ کرتا۔

(۱) شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید شیعی معتزلی جلد ۴ صـ ۲۵ طبع بیروتی۔ ذکر موت الحسن ودفنہ)

(۲) مقاتل الطالبین لابی الفرج علی بن الحسین بن محمد الاصفہانی الشیعی المتوفی ۳۵۶ھ جزء اول۔ اخر تذکرہ امام حسن، جلد اول صـ ۵۱۔ طبع بیروت)

نوٹ: شیعی علماء مجتہدین نے امام حسین رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان نقل کیا ہے اب یہ جملہ جو امام حسینؓ نے امام حسن رضؓ کے جنازہ پہ ارشاد فرمایا۔ اہل سنّت کی کتابوں سے بھی آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ صرف حوالہ دے دینا کافی سمجھا گیا ہے

پوری عبارتیں نقل کرنا موجب طوالت تھا۔ اسلئے ترک کر دی ہیں۔ ذیل مقامات میں الفاظ وہی موجود ہیں کہ لَوْلَا اَنَّهَا السُّنَّةُ لَمَا قَدَّمْتُكَ

(۱) تاریخ صغیر امام بخاری صہ ۵۴ طبع الہ آباد۔ الہند)

(۲) الاستیعاب معہ اصابہ جلد اوّل صہ ۳۷۳ - تذکرہ امام حسن رضؓ

(۳) کنز العمال جلد ۸ صہ ۱۱۴ (بحوالہ طب۔ ابو نعیم کرد) طبع قدیم سختی کلاں)

(۴) السُّنن الکبرٰی للبیہقی، جلد ۴ کتاب الجنائز صہ ۲۹

(۵) المصنّف لعبدالرزّاق ج ۳ صہ ۴۷۲۔ طبع مجلس علمی)

(نوٹ) امام حُسین رضی اللہ عنہ کے جملہ مذکورہ کے تحت شاہ عبدالعزیز رح نے تحفۂ اثنا عشریہ میں ایک توضیحی فقرہ ذکر کیا ہے۔ اہل علم کے لئے ہم بھی اسکو نقل کرتے ہیں "پس معلوم شد کہ حضرت زہراء رضؓ بنا بر پاس نماز ابوبکر ایں وصیت نہ فرمودہ بود دالّا حضرت امام حسین رضؓ خلاف وصیّت زہراء چہ قسم بعمل می آورد وظاہر ست کہ سعید بن العاص بہزار مرتبہ از ابوبکر رضؓ کمتر بود در لیاقت امامت نماز" (تحفہ اثنا عشریہ، بابُ المطاعن، طعن صدّیقی ۱۴ صہ ۴۶۵ فارسی طبع نول کشور لکھنؤ)

(۵)

جنازہ پنجم

حضرت عبدُاللہ بن جعفر طیار کا جنازہ

—— وَعَلَيْهِ اَكْثَرُهُمْ اَنَّهُ تُوُفِّيَ سَنَةَ ثَمَانِيْنَ (۸۰ھ) وَصَلّٰى عَلَيْهِ اَبَانُ بْنُ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ اَمِيْرُ الْمَدِيْنَةِ وَذٰلِكَ الْعَامُ يُعْرَفُ بِعَامِ الْجُحَافِ الخ

یعنی: اکثر لوگ اس طرف ہیں کہ عبداللہ بن جعفر طیار ۸۰ھ میں فوت

ہوئے اور اس وقت (عبدالملک بن مروان کی طرف سے) امیرِ مدینہ ابان بن عثمان غنی تھے۔ انہوں نے عبداللہ پر نماز پڑھائی۔ یہ وہ سال تھا جس کو عام الجحاف کہتے تھے (یعنی سیلاب کا سال)

(۱) کتاب نسب قریش ص۸۲ تذکرہ ولد جعفرؓ بن ابی طالب

(۲) الاستیعاب معہ اصابہ جلد۲ ص۲۷۶ تذکرہ عبداللہؓ بن جعفر طیارؓ

(۳) اسد الغابہ لابن اثیر جلد۳ ص۱۳۵ تذکرہ عبداللہؓ مذکور

تنبیہ: اور شیعہ علماء نے بھی اس مسئلہ کو (عبداللہ کے جنازہ کو) عبارت ذیل میں ذکر کیا ہے۔

ومَاتَ عبدُاللہِ بِالمَدِینَۃِ سَنَۃَ ثَمَانِینَ وَصَلّٰی عَلَیہِ ابانَ بنُ عثمان بن عفّان ودفِنَ بِالبقِیعِ۔

منتہی الآمال "شیخ عباس قمیؔ میں ہے کہ":۔

"در عمدۃ الطالب ست کہ عبداللہ بن جعفر در ۸۰ھ ہجری در مدینہ وفات یافت ابان بن عثمان بن عفّان بروے نماز گذاشت"

(۱) عمدۃ الطّالب فی انساب آل ابی طالب ص۳۸ بحث عقب جعفر طیّار۔ طبع جدید۔ (۲) منتہی الآمال جلد اوّل ص۲۰۵ فصل ہفتم ذکر عبداللہ بن جعفر طیار۔

(۶)

جنازہ ششم

حضرت علی المرتضیٰ رضؓ کے بیٹے محمد بن حنفیہ ۸۱ھ میں فوت ہوئے ہیں جب ان کا جنازہ لایا گیا تو محمد بن حنفیہ کے لڑکوں نے ابان بن عثمان غنی رضؓ کو (یہ اس وقت عبدالملک بن مروان کی طرف سے امیر مدینہ شریف تھے) خطاب کرکے کہا کہ:۔

نَحنُ نعلمُ انَّ الإمَامَ اولیٰ بِالصَّلٰوۃِ ولَولَا ذَالِکَ مَا قَدَّمنَاکَ ـــــ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰی عَلَیہِ۔

یعنی: ہم یقیناً جانتے ہیں کہ امام وقت اور امیرِ وقت نماز کے لئے زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ اگر یہ دستور شرعی نہ ہوتا تو ہم آپ کو مقدم نہ کرتے پھر آبان آگے ہوئے اور جنازہ پڑھایا۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ صہ۸۶ تذکرہ محمد بن حنفیہ ۔
طبع لیدن، یورپ)

(۷)

جنازہ ہفتم

ایک جنازہ یہ بھی ذکر کر دیا جو شیعہ عالم ابو علی محمد بن محمدّ بن الاشعث الکوفی نے اس طرح نقل کیا ہے کہ :-

عن جَعفر بن مُحمّدٍ عن اَبیہِ لَمَّا تُوُفِّیَتْ ام کلثوم بنتِ امِیر المؤمنین عَلَیہِ السَّلام خرجَ مروان بن الحکم وھو امیر یومئذٍ عَلَی المَدِینَۃِ فقال الحسین بن علیؑ علیہِ السَّلام لَولَا السُّنّۃ مَا ترکتُہٗ یُصلِّی عَلَیھَا

یعنی: امام جعفر صادق امام محمد باقر سے ذکر کرتے ہیں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لڑکی اُمِّ کلثوم فوت ہوئی تھیں تو اس وقت امیر مدینہ مَردان بن حکم تھا وہ جنازہ کے لئے نکل کر آیا تو امام حسین رضؓ نے فرمایا اگر یہ سنت نہ ہوتی تو مَیں مَردان کو نماز پڑھانے کی اجازت نہ دیتا۔"

(کتابُ الجعفریات صہ۲۱ باب مَن احق بالصّلوۃ علی المیّت - طبع ایران سن طباعۃ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ
مطبوعہ بمع قرب الاسناد حمیری)

نوٹ: مندرجہ روایت شیعہ بزرگوں کی ہے۔ ہمارے ہاں اس جنازہ میں مختلف اقوال ہیں۔ بہرکیف دوستوں کی تسلی کے لئے ان کی اپنی روایات سے

اعتبار سے یہ جنازہ بھی پیش کر دیا ہے۔ تو امید ہے کہ ان کے لئے موجب اطمینان ہو سکے گا۔

آخر میں عرض ہے کہ اس طرح تلاش جاری رکھی جائے تو بہت سے ہاشمی حضرات کے جنازے تاریخ اسلامی میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً حضرت عباس بن مطلب کی اولاد فضل بن عباس قثم بن عباس عبیدُاللہ بن عباس وغیرہم کے جنازے اگر تلاش کئے جائیں تو یقیناً وہ اسی طرح ملیں گے کہ خلفاء و امراء وقت کے حکم کے تحت ہی ادا ہوئے ہوں گے۔ خلاصہ یہ ہے اس اسلامی دستور و قاعدہ کو بنی ہاشم نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ اور اس پر عملدرآمد جاری رکھا ہے۔

ناظرین حضرات! اس قلیل سی جستجو و تلاش کی بناء پر بنی ہاشم بزرگوں کے چند ایک جنازے ہم نے ذکر کر دیئے ہیں۔ ان تاریخی واقعات پر غور و فکر کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسئلہ ہٰذا کی حقانیت پر بنی ہاشم کے بزرگوں کے عمل نے مہر تصدیق ثبت کر دی اور اپنے تواتر عملی کو اس مسئلہ کی صداقت پر انہوں نے شاہد و گواہ بنا دیا ہے اب روز روشن کی طرح یہ چیز صاف ہو گئی کہ امامتِ نماز کا حق خلیفۃ المسلمین و امام زمان و امیر وقت کو ہی حاصل ہوتا ہے یا جس کو وہ اجازت دے وہ کرا سکتا ہے۔

اس کے بعد حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے جنازہ کے متعلق امید ہے قارئین کرام کسی دوسری تشریح و توضیح کے محتاج نہ ہوں گے۔ کیونکہ اس موقعہ پر امام المسلمین، خلیفۃ المؤمنین، حاکم وقت، مسجد مخصوص (یعنے مسجد نبوی) کے امام صرف سیدنا ابوبکر الصدیق رض تھے۔ فلہٰذا ہر لحاظ سے اس نماز جنازہ کے حقدار بھی یہی "یار غار" ہیں اور دوسرا شخص مستحق نہیں اور حضرت سیدہ فاطمہ رض کا جنازہ انہوں نے پڑھایا ہے۔

چند قابلِ ذکر اُمور اہلِ علم کی توجہ کے لئے۔

سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے جنازہ کی بحث کے آخر میں چند چیزیں قابل وضاحت تھیں۔ اگر یہ ذکر نہ کی جائیں تو یہ بحث ناقص رہے گی۔ اس لئے ان کا بیان

کرنا مفید معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ اُمور عوام ناظرین کی لیاقت سے شاید کچھ بلند ہوں تو وہ حضرات ملال نہ فرما دیں۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ سہل عبارت میں بیان ہو۔ اہل علم و فہم کی توجہ کی خاطر ذکر کئے جاتے ہیں۔ اگر منظور خاطر ہو سکیں تو مہربانی ہو گی

پہلی عرض تو یہ ہے کہ جن حضرات کی روایات پر نظر وسیع ہے۔ وہ ہماری سابقہ بیان کردہ اشیاء (سات عدد روایات، پھر امامت نماز کے قواعد، پھر بنی ہاشم کا عملی تواتر) ملاحظہ کرنے کے بعد خود بخود متقاضی ہوں گے کہ یہ چیزیں فلاں روایت کے برخلاف آپ نے ذکر کی ہیں لہٰذا اس کو صاف کیا جائے۔

تو اسکے متعلق گذارش ہے کہ جس روایت سے تعارض و تخالف کا شبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ صحاح و غیر صحاح دونوں جگہ میں اس مفہوم کے ساتھ مروی ہے۔ وَ دَفَنَهَا زَوْجُهَا عَلِيٌّ لَيْلًا وَلَمْ يُؤْذِنْ بِهَا اَبَا بَكْرٍ وَصَلّٰى عَلَيْهَا یعنے: فاطمہ رضؓ کو اسکے زوج علی رضؓ نے رات کو دفن کر دیا۔ اور حضرت ابوبکر رضؓ کو جنازہ کی اطلاع نہیں کی اور اس پر حضرت علی رضؓ نے نماز پڑھی۔

اس مسئلہ میں ان کی جانب سے یہ انتہائی روایت ہے اور اس روایت سے تین چیزیں مرتّب کی جاتی ہیں۔ ایک تو فاطمہ رضؓ کو راتوں رات دفن کیا گیا۔ دوسرا حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کو علی المرتضےٰ رضؓ نے اس سانحہ کی اطلاع نہ کی۔ تیسرا فاطمہ رضؓ کو خود علی رضؓ نے نماز پڑھ کر دفن کر دیا۔

گویا ان حضرات کے درمیان آخر تک مناقشت و مخالفت قائم و دائم رہی اب اس کے متعلق چند معروضات پیش خدمت ہیں:۔

تفرُّج و اِدراج زُہری

(۱) ایک تو یہ عرض ہے کہ جہاں جہاں یہ روایت ہم نے تلاش کی ہے۔ اس کی ایک فہرست ہمارے سامنے ہے۔ ان تمام مقامات کی سند ابن شہاب زہری سے مروی ہے۔ اس روایت کی کوئی ایک سند بھی ہماری جستجو کے موافق

تاحال اس سے خالی نہیں مل سکی۔ یہ واقعہ دوسرے رواۃ بھی اپنی جگہ ذکر کرتے ہیں اس میں اس قسم کی کشیدگی کی چیزیں نہیں ملتیں۔ لیکن ابن شہاب زہری کی روایات میں مناقشہ نما چیزیں دستیاب ہوتی ہیں (فیہ مافیہ)

چنانچہ ناظرین صاحبان دیکھ چکے ہیں کہ جہاں حضرت فاطمہ رضہ کے مطالبۂ فدک وغیرہ کا مسئلہ پیش آیا تھا۔ وہاں بھی غضب، وجد، ہجران، عدمِ تکلّم وغیرہ متفرد اشیاء صرف اسی زہری کی روایات میں منقول تھیں۔ اب جنازہ فاطمہ رضہ کا موقعہ ہے تو یہاں بھی ابن شہاب زہری کی مرویات میں ہی یہ مسئلہ میسّر ہو رہا ہے اسی طرح آئندہ بھی مقامات آرہے ہیں۔ جہاں فاضل زہری کی روایات میں ہی یہ اشیاء آپ کو مترشح ہوتی نظر آئیں گی۔ انشاء اللہ تعالےٰ وہاں بھی ہم اس بزرگ کے تفرّد و ادراج کی نشاندہی کر دیں گے

اس لئے یہ چیز اہل علم وفن کی خاص توجّہ کے قابل ہے کہ جب بھی واقعات ابنِ شہاب زہری کے ماسوا رُواۃ سے آپ تلاش کریں تو وہی واقعات ملتے ہیں اور کتابوں میں درج ہیں۔ مگر زہری کی روایت والے کلمات وہاں نہیں پائے جاتے مالک تعالےٰ بہتر جانتا ہے کہ زہری سے یہ متفرّد اشیاء (و مدارج) دانستہ صادر ہوئی ہیں۔ یا نادانستہ صادر ہوئیں۔ ایک سطحی نظر ڈالنے والے آدمی کے لئے ان کی مرویات موجب شبہات بن سکتی ہیں۔ مالک کریم ان کو معاف فرمائیں اور ہم کو ان مشتبہ چیزوں کے داغ شبہات سے محفوظ فرما دیں۔ مبادا کہ یہ چیزیں صحابۂ کرام رضہ کے حق میں سُوءِ ظنّی پیدا ہونے کا باعث بننے لگیں۔ (اعاذنا اللہ منہ)

(۳)

حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت سے حضرت علیؓ کا چھ مہینے تک تخلف

فصلِ ثانی (برائے جوابات) گذارش ہے کہ اس فصل میں بیعت کی متعلقہ روایات میں توجیہ و تطبیق و ترجیح و تحقیق وغیرہ اختصاراً بیان کرنے کا ارادہ ہے۔ فلہٰذا اس میں علمی مصطلحات و اطلاقات ذکر ہوں گے۔ جو عوام قارئین کرام کی لیاقت سے بالاتر ہوں گے۔ بنابریں عرض ہے کہ امید ہے عوام حضرات اس بات پر ملال نہیں فرمائیں گے۔ گویا یہ فصل صرف اہلِ علم کے مناسب ہے۔ نیز عرض ہے کہ اگر کوئی چیز خلاف تحقیق معلوم ہو اور قابلِ اصلاح نظر آئے تو مطلع فرما کر ممنون فرمائیں البتہ وَالْحَقُّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ کا قول بھی پیش نظر رکھیں۔ اور دعائے خیر سے یاد فرمادیں۔

گذشتہ فصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر الصّدیق کے ساتھ تعجیلاً بیعت کرنا ثابت کیا گیا ہے اور سُننِ کبریٰ، بیہقی، مُستدرک، حاکم، ابن جریر طبری، البدایہ ابن کثیر وغیرہ سے چند روایات ہم نے نقل کر دی ہیں۔ اہلُ السنّۃ والجماعت کے ہاں مسئلہ ہٰذا کے اثبات کی خاطر روایات کا ایک ذخیرہ ہے جس میں سے چند ایک روایات ہم نے یہاں درج کی ہیں۔ یہ مسئلہ ہٰذا کا مثبت پہلو ہے۔ اس کی دوسری جانب یہ ہے کہ حضرت علی المرتضٰے کرّم اللہ وجہہ نے ایک مدّت تک بیعت نہیں کی۔ یہ اس مسئلہ کا منفی پہلو ہے۔ منفی مضمون کی روایات بھی کتب حدیث و تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ اب معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ کون سی چیز درست ہے؟ منفی مضمون کی روایات صحیح ہیں یا غیر صحیح؟ اگر غیر صحیح ہیں تو قابل توجّہ ہی نہ ہوں گی اور متروک العمل ہوں گی اور اگر سنداً صحیح ہیں تو پھر اُن کا کیا محل ہے؟ ان کی کیا توجیہ ہے؟ قواعد کے اعتبار سے ان کا کیا مقام

و مرتبہ ہے ۔

فلہٰذا اکابر علماء و مشہور مُصنّفین کے بیانات کی روشنی میں چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں ۔ اُمّید ہے کہ ان کے ملاحظہ کے بعد مسئلہ ہٰذا بڑی عمدگی سے صاف ہو سکے گا ۔ (بعونہٖ تعالیٰ)

تعجیلاً بیعت کی نفی کنندہ روایات میں سب سے اہم وہ مرویات ہیں ۔ جن میں مذکور ہے کہ حضور اکرم صلّے اللہ علیہ وسلّم کے انتقال کے بعد جب تک حضرت فاطمہ رضؓ حیات تھیں (یعنے شش ماہ تک) حضرت علی رضؓ نے حضرت ابوبکر الصّدیق رضؓ کے ساتھ بیعت نہیں کی تھی ۔ بلکہ بعض مواضع میں مذکور ہے کہ بنی ہاشم میں سے کسی ایک نے بھی اس مدّت تک بیعت نہیں کی تھی ۔ فلہٰذا اوّلاً ان کے متعلقات ذکر کرنے مناسب ہیں ۔

(۱)

گذارش ہے کہ ایک عام تفحّص و جُستجو کے مطابق شش ماہی والی روایت بخاری جلد ثانی ، مسلم جلد ثانی ، مسند ابی عوانہ جلد رابع ، سنن کبریٰ بیہقی ، تاریخ ابن جریر طبری (بحثُ السّقیفہ) جلد ثالث ۔ کتاب انسابُ الاشراف بلاذری جلد اوّل میں پائی جاتی ہے ۔

ان تلاش شدہ مقامات کی سند میں سب مواضع میں ابن شہاب زہری موجود ہیں اور اس روایت میں غور و فکر کرنے سے دریافت ہوا کہ تمام روایت غلط نہیں ، بلکہ اس جگہ اصل روایت صحیحہ میں تخلیط اور راوی کی جانب سے ادراج ہے ۔

ان مخلوط شدہ اشیاء میں سے ایک یہ چیز بھی ہے کہ مدّت حیاتِ فاطمہ رضؓ میں یعنے شش ماہ تک حضرت علی رضؓ نے بیعت نہیں کی اور بعض جگہ یہ مزید اضافہ ہے کہ کسی ایک بنی ہاشم نے بھی بیعت نہیں کی تھی ۔ چنانچہ اس موقع کی روایت کے مدرج الفاظ اس طرح پائے جاتے ہیں ۔

فَلَمَّا تُوُفِّيَتْ (فاطمہ رضؓ) اِسْتَنْكَرَ عَلِيٌّ وُجُوْهُ النَّاسِ ــــ

فَالْتَمَسَ مُصَالِحَةَ اَبِی بَکْرٍ وَمُبَایَعَتِهٖ وَلَمْ یَکُنْ یُبَایِعُ تِلْکَ الْاَشْهُرِ الخ (بخاری جلد ۲ آخر غزوہ خیبر (۲) مسلم جلد ۲ باب حُکْمُ الْفَیْئِ)

(۲) ---------- لَمْ یُبَایِعْ عَلِیٌّ رض اَبَا بَکْرٍ حَتّٰی مَاتَتْ فَاطِمَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهَا بَعْدَ سِتَّۃِ اَشْهُرٍ فَلَمَّا مَاتَتْ ضَرَعَ اِلٰی صُلْحِ اَبِیْ بَکْرٍ الخ

(۳) انساب الاشراف بلاذری جلد اول ص۵۸۶)

(۴)(۵) فَقَالَ رَجُلٌ لِلزُّهْرِیْ اَفَلَمْ یُبَایِعْهُ عَلِیٌّ سِتَّۃَ اَشْهُرٍ قَالَ لَا وَلَا اَحَدٌ مِنْ بَنِیْ هَاشِمٍ حَتّٰی بَایَعَهٗ عَلِیٌّ الخ

(۴) تاریخ ابن جریر طبری بحث السقیفہ

(۵) مسند ابی عوانہ جلد ۴ ص ۱۴۲)

(۶) قَالَ مُعَمَّرٌ قُلْتُ لِلزُّهْرِیْ کَمْ مَکَثَتْ فَاطِمَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهَا بَعْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ستۃ اشهر فقال رجل للزهری فَلَمْ یُبَایِعْهُ عَلِیٌّ حَتّٰی مَاتَتْ فَاطِمَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهَا قَالَ وَلَا اَحَدٌ مِنْ بَنِیْ هَاشِمٍ

(السنن الکبریٰ جلد ۶ ص ۳۰۰ کتاب قسم الفیئ والغنیمۃ)

جملہ حوالہ جات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رض کی وفات کے بعد حضرت علی رض نے حضرت ابوبکر الصدّیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصالحۃ وصلح کر کے بیعت کر لی اور حضرت فاطمہ رض کا ششماہ کے بعد انتقال ہوا۔ ان چھ ماہ تک نہ حضرت علی رض نے بیعت کی اور نہ بنی ہاشم میں سے کسی ایک نے بیعت کی۔

پیش کردہ حوالہ جات کے الفاظ میں تدبّر فرما دیں۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا ایک درمیانی حصّہ ہیں۔ ایک شخص مرد مذکر زہری صاحب کو کہتا ہے، پھر زہری خود جواب دیتے ہیں کہ نہ حضرت علی رض نے ششش ماہ بیعت

کی۔ نہ کسی فرد بنی ہاشم نے ابوبکر الصدّیق رض سے بیعت کی۔ حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا کلام یہ ہرگز نہیں۔ یہ اس راوی کا اپنا ظن لطیف اور زعم شریف ہے۔ قَال و قَالت کے مقولہ میں بدیہی فرق ہر ایک ذی علم خوب جانتا ہے۔ وہ یہاں موجود ہے۔ ان سے مافوق کون سے قرینہ کی حاجت باقی ہے

بس اتنی چیز ہے کہ بخاری و مسلم کی عبارت میں راوی کی طرف سے اختصار کی وجہ سے قَالَ رَجُلٌ لِلزُّہرِیِ یا قلتُ للزُّھری وغیرہ اس موقعہ کے کلمات عبارت سے ساقط ہیں اور تاریخ طبری، مُسندِ ابی عوانہ، سُنن کُبریٰ بیہقی وغیرہ میں یہ کلمات صراحتًا و اصالتًا موجود ہیں۔ جو اصل واقعہ کو صاف صاف بیان کر رہے ہیں کہ مضمون ہٰذا جناب ابن شہاب زہری کی جانب سے روایت مدرج و مخلوط ہے۔ فاعتبروا یا اُولی الابصار

مسلم شریف جلد ثانی میں چند ایک چیزیں علّامہ ابن شہاب زہری کے متعلّق دستیاب ہوئی۔ یہاں ان کا ذکر کر دینا فائدہ سے خالی نہیں ہے

(۱)

مسلم شریف کتابُ الوصیّۃ کی چھٹی حدیث میں زہری کیطرف سے ادراج کا نمونہ موجود ہے۔ اس روایت کا اسناد اس طرح ہے۔

حَدَّثَنَا یحییٰ بن یحییٰ التَّمیمی قال أنا ابراھیم بن سعدُ عن ابن شہاب (الزُّھری) عن عامر بن سعد عَن اَبیہِ قَالَ عَادَ لِی رسُولُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّمَ

(اس روایت کے آخر میں یہ لفظ ہے کہ) قال رثیٰ لہ رسُولُ اللّٰہ صَلّی اللّٰہ عَلَیہِ وَسَلَّمَ مَن اَن تُوفّیٰ بِمَکّۃِ۔

آخری جملہ کے متعلق امام نووی رح نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ ھَذا ھو من کلام الرَّاوی ولیس ھو من کلام النّبیّ صَلَّی اللّٰہُ علیہِ وسلّم

بعد ازاں اختلاف ذکر کیا ہے کہ یہ کس راوی کا کلام ہے؟ پھر فرمایا ہے کہ

قال القاضی (العیاض) واکثرما جاء انہ من کلام الزھری ...الخ (مسلم شریف جلد ۲ ص۴۱ کتاب الوصیۃ ۔ طبع نور محمدی)

روایت ہٰذا میں ثابت ہوا اور علماء نے تصریح کردی۔ یہ ادراج ابن شہاب زہری کیطرف سے ہے ۔

(۲)

دوسری یہ چیز ہے کہ امام مسلم بن حجّاج نے مسلم شریف جلد ثانی کتاب الایمان والنذور میں ابن شہاب زہری کے متعلق لکھا ہے کہ ابن شہاب زہری بعض عمدہ اسانید کے ساتھ روایات ذکر کر دیتے ہیں۔ ان کے نقل کرنے میں وہ متفرد ہوتے ہیں اور کوئی راوی ان کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ امام مسلم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

قالَ ابُوالحُسین (مُسلم بن حُجّاج القشیری) ھٰذا الحرف (قولہٗ تعالیٰ انا مُرك فلیتصدّق) لایرویہ احدٌ غیرالزّھری قال وللزّھری نحوًا مِن تسعین حرفًا یرویہ عن النّبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم لایشارکہٗ فیہ احدٌ باسانید جیادٍ (مسلم شریف جلد ثانی کتابُ الایمان والنُّذور ۔ النّھی عن الحلف بغیراللّٰہ)

(۳)

تیسری یہ چیز معروض ہے کہ مسلم شریف جلد ثانی ۔ کتابُ الفضائل باب فی اسمائہ صلّے اللّٰہ علیہ وسلّم میں روایت ہے ۔

ـــ ـــ ـــ سُفیان بن عُیینۃ عن الزُّھری سمع جُبیر بن مطعم عن ابیہ انّ النّبیّ صلّی اللّٰہُ علیہ وسلّم قال انا مُحمّدٌ وانا احمدُ وانا الماحی الّذی یُمحیٰ بی الکُفر وانا الحاشرُ الّذی یحشرالنّاس علیٰ عقبی وانا العاقب والعاقبُ الّذی لیس بعدہٗ نبیٌّ

اس کے بعد اسی باب کی تیسری سند میں مذکور ہے کہ د فی حدیث مُعمَر قال قلت للزّھری وما العاقب؟ قَالَ الّذِی لَیس بعدہٗ نبیٌّ

(مسلم شریف ج ۲ ص۲۶۱ کتابُ الفضائل باب فی اسمائہٖ)

عاقب کی یہ تفسیر زہری نے کی ہے۔ اس کو علماء نے ادراج فی الروایۃ کہا ہے چنانچہ علّامہ سیُوطی رحؒ نے تنویرُ الحوالک شرح مؤطا امام مالک جلد ثالث کے آخر میں مذکور حدیث (وانا العاقِبُ) کے تحت ذکر کیا ہے کہ

زاد مسلم وغیرہ من طریق ابن عیینۃ والعاقب الّذِیْ لَیس بَعدہٗ نبیٌّ وھو مُدرج من تفسیر الزّھری۔

(تنویر الحوالک شرح مؤطا امام مالکؒ جلد ۳ ص۱۲۳ آخر جلد ۳ طبع مصری)

یہ چند چیزیں صرف مسلم شریف سے نقل کی گئی ہیں۔ بخاری شریف میں بھی زہری کے ادراج کو بعض علماء نے ذکر کیا ہے۔

اور مزید تسلّی کرنا مطلوب ہو تو اس کتاب کی بحث فدک کے حواشی کیطرف رجوع فرماویں۔ وہاں تاریخ کبیر امام بخاری رحؒ اور فتح المغیث سخاوی اور الفقیہ و المتفقہ خطیب بغدادی وغیرہ سے چند اشیاء زہری کے متعلق جمع کی ہیں۔ وہ ملاحظہ فرماویں۔

ان تمام محولہ مقامات کے ملاحظہ کرنے کے بعد یہ چیز بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ شش ماہ تک تاخیر بیعت کی روایات میں رُواۃ کی طرف سے ادراج فی الروایۃ پایا گیا ہے (اگرچہ وہ روایات صحاح ستّہ میں پائی جاتی ہیں) اور ادراج کرنے والے بزرگ علّامہ ابن شہاب زہری ہیں۔

اس کے بعد یہ مرحلہ باقی ہے کہ محدّث زہری کے اس قول کو (یا ان کے اس ظن وگمان کو) اکابر علماءِ محدّثین نے آیا تسلیم کر لیا ہے؟ یا اس کو رد کیا ہے؟ اس کے متعلق کوئی جرح وتنقید کی ہے؟ یا اس پر کچھ کلام کیا ہے؟

اب اس چیز کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ناظرین باانصاف سے امید ہے کہ

مندرجہ ذیل معروضات کو معاینہ و ملاحظہ فرما کر حق و انصاف کا ساتھ دیں گے۔
(والحقُّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ)

محدّث زُہری کا قول عُلمائے کرام کی نظروں میں۔

حضرت علی المرتضٰے کرّم اللہ وجہہٗ کی تاریخ بیعت کے متعلق جو (ابن شہاب) زہری کا قول روایات میں مذکور پایا گیا ہے۔ اس کو بہت سے جیّد علماء نے مرجوح و متروک وضعیف قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان علماء کرام کی تحقیقات اس مسئلہ کے متعلق ہم ایک ترتیب سے پیش کرتے ہیں۔

(۱)

فاضل بیہقی نے اپنی مشہور تصنیف السّنن الکبریٰ جلد سادس میں فرمایا ہے کہ
(وقول الزّہری فی قعودِ علی عن بَیعۃ ابی بکر رضی اللہ عنہٗ حَتّٰی توفیت فاطمۃ رضی اللہ عَنہا مُنقطع وحدیثِ اَبی سعیدِ الخُدریؓ فی مُبایَعَتِہ ایّاہ حَتّٰی بویع بَیعۃِ العامّۃِ بَعدَ السَّقِیفَۃِ اَصَحُّ الخ

زہری (جو تابعین میں ہے) کا یہ قول کہ علی المرتضٰے رضؓ حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے ساتھ بیعت کرنے سے حضرت فاطمۃ الزہراء رضؓ کی وفات تک رکے رہے تھے۔ (سنداً) منقطع ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضؓ (صحابی) کی وہ روایت جس میں سقیفہ کے بعد متصلاً بیعت کرنا مروی ہے۔ جب کہ عامّۃ المسلمین نے بیعت کی تھی۔ (وہ روایت متصل) اصح ہے
(السنن الکبریٰ للبیہقی ص۳۰۲ جلد۶۔ کتاب قِسمُ الفیٔ والغنیمۃ)

تنبیہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی وہی روایت ہے۔ جو اوپر فصل اول میں البدایۃ و مستدرک حاکم وغیرہ کے حوالہ جات سے پیش کی گئی ہے۔ جس کو امام مسلم وابن خزیمہ وغیرہ محدثین نے صحیح فرمایا ہے۔

دوسری عرض یہ ہے کہ علامہ بیہقی نے اپنی دوسری تصنیف "الاعتقاد" میں واشگاف الفاظ میں اس مسئلہ کو مزید صاف کر دیا کہ حضرت علی رضؓ کی تاخیر بیعت کا مسئلہ محدّث ابن شہاب زہری کا اپنا قول منقطع ہے۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کا فرمان نہیں ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

والّذی روی ان علیًا لم یبایع ابابکر ستّۃ اشھر لیس مِن قول عائشۃ رضؓ انما ھو من قول الزھری فادرجہ بعض الرُّواۃ فی الحدیث عن عائشۃ رضؓ فی قصّۃٍ فاطمۃ وحفظہ معمّرًا بن راشد فرواہ مفسّلًا وجعلہ من قول الزھری منقطعًا من الحدیث وقد روینا فی الحدِیث الموصُولِ عن ابی سعید الخدری ومن تابعہٗ من اھل المغازی ان علیًا بایعہٗ فی بیعۃ العامۃ بعدَ البیعۃ التی جرت فی السقیفۃ۔ (الاعتقاد علی مذہب السلف للبیہقی ص۱۸۰ طبع مصر)

——— (۲) ———

حافظ ابن حجر رحؒ عسقلانی شرح بخاری فتح الباری جلد سابع آخر غزوۂ خیبر میں مسئلہ بیعت کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

وقد صحّح ابن حبان وغیرہٗ مِن حدیثؔ ابی سعید الخدری وغیرہ ان علیًا بایع ابابکر رضؓ فی اول الامر واما ما وقع فی مسلمٍ عن الزھری ان رجلًا قال لہٗ لم یُبایع علی ابابکر حتی ماتت فاطمۃ قال لا ! وَلَا احد من بنی ھاشمٍ فقد ضعفہٗ البیھقی بانّ الزھری لم یسندہٗ وَانّ الرّوایۃ الموصُولۃ اَصحّ

(فتحُ الباری لابن حجر جلد ۷ ص۳۹۹)

لہ قولہ من حدیث ابی سعید الخدری. قول ابی سعید ان علیا بایع الصدیق وقت بیعۃ العامۃ اصح۔

(۱) لانہ متصل وقول الزھری منقطع والمتّصل راجع عن المنقطع وایضا

یعنے ابن حبان اور دیگر علماءِ کرام نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے جس میں حضرت علی المرتضےٰ رضہ کا حضرت ابوبکر صدیق رضہ کے ساتھ اولاً ہی بیعت کر لینا مذکور ہے۔ اور جو مسلم شریف میں آیا ہے کہ زہری سے کسی صاحب نے دریافت کیا کہ ابوبکر الصدیق کے ساتھ حضرت علی المرتضےٰ نے وفات فاطمہؓ تک بیعت نہیں کی تھی۔ تو زہری نے جواب دیا کہ وفات فاطمہ رضہ تک بنی ہاشم میں سے کسی ایک نے بھی بیعت نہیں کی تھی۔ زہری کے اس قول کو فاضل بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے کہ زہری کا یہ قول مسند متصل نہیں ہے۔ اور ابُوسعید خدری کی روایت موصول متصل السند ہے فلہٰذا وہ قول زہری سے زیادہ صحیح ہے۔

(۳)

فاضل قسطلانی نے اپنی شرح بخاری مسمّی ارشاد الساری جلد ۸ ص۱۵۸، آخر غزوۂ خیبر میں فتح الباری مذکور کے حوالہ سے وہی سابق تنقیح و تحقیق درج کی ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

وقد صَحَّحَ ابن حبان وغیرہ من حدیث ابی سعید الخُدری ان علیًا بایع ابابکرٍ فی اول الامر واما ما فی مسلم عن الزہری ان رجلًا قال لہ لم یبایع علیٌ ابابکرٍ حتی ماتت فاطمۃ قال ولا احد من بنی ھَاشمٍ فقد ضعفہ البیہقی

---

(۲) ولأنہٗ قول الصّحابی والزہری مِن صغار التابعین وقول الصّحابی ارجح
(۳) ولانّ علیًا قبل امامۃ الصّدیق فِی الصّلوۃ بامر النّبِیّ صَلّی اللّٰہُ علیہ وسلّمَ من غیر تاخیرٍ فکیف یتاخر فی بیعۃ الخلافۃ
(۴) وَلأنّہٗ لَم یقبل الخلافۃ بعد قتل عثمان اِلّا کرھًا الدَفع الفتنۃ مَعَ اَنّہٗ لَمیکن حینئذٍ من یدانیہِ فضلًا عمن یساویہ فکیف یتامّل فی البَیعۃِ عندَ وجُود الصّدیق (منجانب لعلامہ مولانا شمس الحق افغانی)

بانّ الزهری لم یسندہ وانّ الروایۃ الموصولۃ عن ابی سعید اصحّ۔ (ارشادُ السّاری شرح بخاری جلد ہشتم ص۵۸ للقسطلانی)

(ترجمہ سابق کافی ہے) گویا حافظ ابن حجر رح کی تحقیق کی فاضل قسطلانی نے حرف بحرف تصدیق کر دی۔ یعنے بیہقی اس تحقیق میں منفرد نہیں رہے۔ بلکہ بعد کے علماء اس کی تائید و تصویب کر رہے ہیں۔

اس کے بعد مولانا حیدر علی فیض آبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تالیف "منتہی الکلام" میں اس مسئلہ کے بارے میں تحقیق فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

۱۔ — — — — پس احادیث اصحاب رضی اللہ عنہم کہ شریک واقعہ (بیعت) باشد بمقتضائے حدیث لیس الخبر کالمعاینۃ بر حدیث اُمّ المؤمنین مسطور کہ حضور اُو دراں مجامع — — ہرگز ثابت نیست رجحانے داشتہ باشد

(۲) چہ جائے آنکہ مخلصش نفی بیعت تا شش ماہ بود و محصول روایات اصحاب بیعت مُرتضوی قریب وفات جناب پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم باشد کہ اسہل از نفی مذکور است۔ وَقَدْ ثَبَتَ اَنَّ الْاَثْبَات مقدّم عَلَی النَّفی۔

(۳) در روایت معرفت امام یعنے من لم یعرف امام زمانہ مات میتتًا جاہلیۃً و مانند آنکہ در کتب معتمدہ مندرج است مؤید ہمیں است کہ طول مکث در بیعت واقع نشدہ" (کتاب منتہی الکلام ص۵۲ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ، از مولانا حیدر علی رح۔ طبع قدیمی)

(۴) پھر اس بحث کو تمام کرتے ہوئے شروح بخاری کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ "مے توانم گفت کہ ایں روایت کہ دال بر تاخیر بیعت ست بسبب عدم اتّصال اسناد زہری ضعیف است و غیر مقبول و روایت ابی سعید

کہ منطوق آں بیعت امیرالمؤمنین و حضرت زبیرؓ روز اول است مُسند و موصول پس این البتہ اصح خواہد بود و بحمد اللہ کہ طریق تطبیق و دفع اختلاف روایات عقلاً و نقلاً آشکارا شُد۔ و ضرورتے بداں نماند کہ گوئیم بیعت اولیٰ نوعی باختفاء و ثانیہ باعلانیہ واقع شدہ۔

(کتاب منتہی الکلام ص۵۷ مطبوعہ قدیمی ۱۲۸۲ھ نول کشور، لکھنؤ)

حاصل کلام یہ ہے کہ کتاب منتہی الکلام میں چار چیزیں یہاں مذکور ہوتی ہیں

(۱)

ایک تو یہ ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ کے موافق جو حضرات صحابہ کرامؓ واقعہ ہذا میں شریک و شامل تھے۔ ان کی روایات اُمّ المؤمنین رضؓ کی روایت کے بہ نسبت راجح ہوں گی۔ اس لئے کہ حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا ان بیعت کی مجالس میں شامل و شریک ہونا ہرگز ثابت نہیں۔

تنبیہ : (یہ توجیہات اس تقدیر پر ہیں کہ تمام روایات کو حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کا مقولہ فرض کر لیا جائے)

(۲)

دوسری یہ چیز ہے کہ ششماہ والی روایت کا حاصل بیعت کی نفی کرنا ہے اور دیگر اصحاب کی روایات کا ماحصل اثبات بیعت ہے جو کہ نفی سے زیادہ آسان ہے اور اثبات نفی پر مقدّم ہوتا ہے۔ یعنے مثبت روایات اخذ کی جاتی ہیں اور نفی کنندہ ترک کی جاتی ہیں۔

اور حافظ ابن کثیرؒ نے بھی البدایہ میں مسئلہ ہٰذا کے تحت یہی قاعدہ (والمثبت مقدم علی النافی) درج کیا ہے۔

مولانا حیدر علی اس قاعدہ کو پیش کرنے میں منفرد نہیں ہیں۔ ابن کثیرؒ جیسے کبار علماء نے اس قاعدہ کو اس موقعہ درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (البدایہ جلد پنجم ص۲۸۶)

(۳)

تیسرا یہ کہ روایات میں مذکور ہے۔ زمانہ کے امام کی معرفت و تصدیق ضروری امر ہے تو یہ چیز بھی اس کی مؤید ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی (تاکہ وعید کا مصداق نہ بن سکیں)

(۴)

چوتھی یہ چیز ہے کہ تاخیر بیعت کی روایت جو ابن شہاب زہری کے ذریعہ مروی ہے۔ وہ اسناد غیر متصل (اور منقطع) ہونے کی وجہ سے ضعیف اور غیر مقبول ہے اور ابو سعید (وغیرہ) کی روایت جس سے حضرت علی و زبیر رضی اللہ عنہما کی تعجیلاً بیعت ثابت ہوتی ہے۔ وہ مسند و موصول ہے۔ پس یہ روایت صحیح نہ ہو گی۔ اب اس طرح تطبیق و توجیہ کی وجہ سے اس قول کی حاجت نہیں رہی کہ دو بار بیعت ہوئی تھی۔ ایک خفیہ ہوئی تھی۔ دوسری علانیہ ہوئی تھی۔

خلاصۃ المرام یہ ہے کہ ابن شہاب زہری کے قول ہٰذا کے متعلق اکابر علماء کی آراء اور تبصرے آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ آخر میں اُصول و قواعد کے پیش نظر یہی عرض کیا جاتا ہے کہ محدّث زہری کا یہ قول کسی صحابی کیطرف منسوب نہیں۔ یہ ان کا اپنا بیان ہے اور خود شرکاءِ واقعہ صحابۂ کرام رضا کا بیان اس کے مقابلہ میں راجح اور مقبول ہو گا۔ اور زہری کا اپنا قول مرجوح اور متروک ہو گا۔

حافظ ابن کثیر رح کی تحقیق

مندرجۂ بالا تحقیقاتِ علماءِ کرام کے آخر میں حافظ ابن کثیر عماد الدین الدمشقی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اسی مسئلہ بیعت کے متعلق پیش کرنا ضروری ہے۔ وہ ملاحظہ فرما دیں۔ اس نے مسئلہ ہٰذا کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ اگرچہ ابن کثیر رح کا یہ قول قبل ازیں بھی درج ہو چکا ہے تاہم بطور یاد دہانی کے بحث ہٰذا کے آخر میں درج کرنا مناسب ہے۔

هی مُبایعۃ علیّ بن ابی طالبٍ اِمّا فی اوّل الیوم او فی الیوم الثانی من الوفاۃ وھٰذا احقُّ فانّ علی ابن ابی طالب انّہ لم یفارق الصّدِّیق فی وقت من الاوقات ولم ینقطع فی صلٰوۃٍ من الصّلٰوتِ خلفہ کما سنذکرہٗ وخرج معہٗ اِلٰی ذی القصّۃ لمّا خرج الصّدیق شاھرًا سیفہٗ یرید قتالَ اھل الردّۃ ...

(البدایۃ جلد پنجم بحث یوم السقیفہ جلد ۵ ص۲۴۸، ص۲۴۹)

یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضؓ کا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرنا وفات نبوی ؐ کے پہلے روز یا دوسرے روز میں ہی ثابت ہے اور یہی بات حق ہے۔ اس لئے کہ

(۱) حضرت علی رضؓ حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ سے کسی وقت میں بھی جدا نہیں ہوئے (مشورہ اور مشاورت میں بھی ساتھ رہتے تھے۔)

(۲) اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھنا منقطع نہیں۔ ہر نماز با جماعت ان کی اقتداء میں ادا کرتے تھے

(۳) جب حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ مرتدین کے قتال اور جنگ کے لئے تیغ برہنہ (یعنے ننگی تلوار) لے کر نکلے ہیں تو حضرت علی المرتضیٰ بھی ان کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے۔

یہ تمام اشیاء اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ حضرت علی رضؓ کی بیعت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعجیلاً وابتداءً ہی واقع ہوئی۔ اس میں کوئی تاخیر نہیں پیش آئی۔

اور اگر حضرت علی المرتضیٰ رضؓ نے حضرت صدیق اکبر کے ساتھ تعجیلاً بیعت نہیں کی تھی۔ تو بعض قبائل کے ارتداد کے موقعہ پر ان کے ساتھ جنگ وقتال کے لئے حضرت علی رضؓ بغیر بیعت کرنے کے صدیق اکبر رضؓ کے ساتھ کیسے شامل وشریک ہو گئے۔

(اہلِ فہم غور فرمادیں)

حصّہ دوم

تفسیر و تاریخ کے مدوّن اوّل
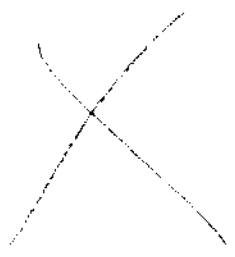
ابن جریر طبری

حصّۂ دوم

تفسیر و تاریخ کے مُدوّن اوّل

ابن جریر طبری بحیثیت مفسّر

علّامہ تمنّا عمادی ؒ

(۱)

رجال و تاریخ والے لکھتے ہیں کہ "ابو جعفر محمد بن جریر الطبری ایک ہی زمانہ میں دو تھے اور دونوں بڑے عالم، بڑے فاضل، بڑے ادیب اور صاحب تصانیف تھے مگر ان میں ایک تو کٹر رافضی تھے اور دوسرے ہلکے پھلکے شیعہ تھے۔ دونوں کا نام ایک ولدیت ایک، کنیت ایک، وطن ایک اور زمانہ ایک، پھر مشرب بھی تقریباً ایک ہی، فرق پیدا کیا گیا ہے تو صرف دادا کے نام کا۔ یعنے صاحب تفسیر و تاریخ جو ہلکے پھلکے شیعہ تھے۔ ان کے دادا کا نام "یزید" تھا اور دوسرے جو کٹّر رافضی تھے ان کے دادا کا نام "رستم" تھا۔

شیعہ حضرات کی کتاب رجال میں "ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری" کا ذکر کافی شدّومد کے ساتھ موجود ہے اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر ہے اور ابن جریر بن یزید کا ذکر مختصر طور سے کر کے لکھ دیا ہے کہ کان عامی المذھب یعنے یہ اہل سنّت تھے شیعہ حضرات اپنی کتابوں میں اہل سنت کو عامّہ یعنے عوام لکھتے ہیں اور سنّی کو،

ك ابن جریر طبری سے بعض متقدم مفسرینؒ کا ذکر کتابوں میں ضرور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعضوں نے اسّی جلدوں میں اپنی تفسیر مکمل کی تھی۔ مگر وہ تفسیر جب دنیا کی نظروں کے سامنے صدیوں سے نہیں ہیں تو ان کا ذکر ہی فضول ہے کہ وہ تفسیریں صحیح ہوں۔ اس لئے ملاحدۂ عجم ہی نے ان کو ضائع کر دیا ہو سب سے قدیم تفسیر ابن جریر ہی کی دنیا کے سامنے ہے۔ اس لئے یہی زیر بحث آسکتی ہے۔

عامی المذھب یعنے عوام کا مذہب رکھنے والا۔ اور اہل سنت کی کتب رجال میں ابن جریر بن یزید، کا ترجمہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بعد تمیز کے لئے "ابن جریر بن رستم" کا بھی کچھ ذکر کر دیتے ہیں۔ اور لکھ دیتے ہیں کہ یہ غالی شیعہ رافضی تھے۔

امام ذہبی، میزان الاعتدال میں اور علامہ ابن حجر العسقلانی لسان المیزان میں ابن جریر بن یزید صاحب تفسیر و تاریخ کے متعلق اس کا اعتراف تو کرتے ہیں کہ فیہ تشیع یعنے ان میں "شیعہ پن" تھا مگر ان کے تشیع کو ہلکا کرنے کے لئے حد سے زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ امام ذہبی لکھتے ہیں۔ فیہ تشیع کے بعد ہی وموالاۃ لا تضر وا۔ یعنی ان میں تشیع تھا اور حضرت علی رض اور ان کے اہل بیت کے ساتھ کچھ غیر معمولی موالات تھی جو ضرر رساں نہیں ہو سکتیں۔

ابن حجر عسقلانی لسان المیزان میں امام ذہبی رح کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں مگر فیہ تشیع کے بعد اپنی طرف سے "لیسیر" کا لفظ بڑھا دیتے ہیں یعنے ان میں تشیع تو تھا مگر ہلکا پھلکا۔

امام ذہبی رح نے امام سلیمانی علامہ حافظ احمد بن علی پر الزام دیا ہے کہ انہوں نے بڑا ظلم یہ کر دیا کہ ابن جریر بن یزید کے متعلق لکھ دیا کہ کان یضع للروافض یعنی یہ رافضیوں کی حمایت میں حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ابن جریر تو کبار آئمۂ اسلام میں سے تھے۔ سلیمانی نے محض ان پر اتہام کیا ہے اور بڑا غضب کیا ہے۔ پھر خود ہی امام ذہبی لکھتے ہیں کہ علماء کا کلام جو بعض کا بعض کے متعلق ہو۔ اس میں توقف کرنا چاہیئے۔ یعنے یہ لوگ برابر کے تھے انہیں باہم چشمکیں بھی رہتی تھیں۔ اس لئے اگر ایک دوسرے کے متعلق کچھ کہا جائے تو دوسروں کو ان کے آپس کی باتوں سے متأثر نہ ہونا چاہیئے۔

پھر امام ذہبی یہ لکھتے ہیں کہ شاید علامہ سلیمانی نے ایسا جملہ دوسرے ابن جریر

لہ امام ذہبی کی میزان الاعتدال اور حافظ ابن حجر رح کی لسان المیزان انہیں راویان حدیث و تفسیر کے حالات میں ہے جو کم و بیش مجروح ہیں اور آئمۂ حدیث نے جن کی حدیثیں کم قبول کی ہیں یا جن کو

یعنی ابن رستم کے متعلق کہا ہو۔

حافظ ابن حجرؒ امام ذہبی کی پوری عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اگر میں قسم کھا لوں کہ علاّمہ سلیمانی نے جو الزام ابن جریر پر لگایا ہے۔ اس سے ان کی مراد وہی ابن جریر بن رستم رافضی ہے (ابن جریر بن یزید مفسر نہیں) تو میں اپنی قسم میں نیک کار یعنی سچا رہوں گا۔ (اس کو کہتے ہیں عقیدت اور یہ ہے جذبۂ روایت پرستی کا غلو ہے) کیونکہ علاّمہ سلیمانی حدیث کے حافظ ہیں متقی ہیں۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان کے دماغ سے کون سی بات نکل رہی ہے۔ اس لئے میں ہرگز یہ اعتقاد نہیں رکھ سکتا۔ کہ انہوں نے ایسے امام پر ایسا باطل حملہ کیا ہوگا۔ اتنا لکھ کر فوراً ہی ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس واللہ اعلم سے ہر فریق اپنے موافق پہلو نکال سکتا ہے۔

پھر ابن حجر لکھتے ہیں کہ ہمارے شیخ الشیوخ ابو حیان کو بھی علاّمہ سلیمانی کے قول نے دھوکہ دیا۔ کہ انہوں نے اپنی تفسیر کے اوائل میں لفظ صراط پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قال ابوجعفرُ الطبری وھو امام مِّن ائمّۃ الامامیّۃ الصّراط بالصّاد لغۃ قریش الخ یعنے ابوجعفر طبری جو فرقہ امامیہ میں سے ایک امام ہیں۔ ان کا قول ہے کہ صراط صاد سے قریش کی زبان ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ ابن جریر طبری کو اشتراک نے نقصان پہنچایا۔ نام کا اشتراک کنیت کا اشتراک، باپ کے نام کا اشتراک، نسبت کا اشتراک اور پھر معاصرت اور ان سب پر کثرت تصانیف۔ اتنا لکھ کر پھر ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔ والعلم عند اللہ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) بالکل ترک کر دیا ہے۔ میزان الاعتدال میں تو صحاح کے راوی بھی کچھ ہیں مگر لسان المیزان میں صحاح کے راوی ایک بھی نہیں۔ ابن جریر سے صحاح میں کوئی روایت بھی نہیں ملتی آخر کیوں؟ متاخرین ان کی جتنی بھی حمایت کریں۔ مگر ائمۂ حدیث خود ان سے روایت نہیں کرتے تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ حافظ سلیمانی کے وقت تک دوسرے ابن جریر تصنیف ہی نہیں کئے گئے تھے۔ یہ تو تقریباً دو صدی بلکہ زیادہ بعد کی ایجاد ہیں۔

(یہ والعلمُ عندَ اللہ) پہلے واللہ اعلم کیطرح دو پہلو نہیں ہے بلکہ یہ واللہ اعلم اور والعلمُ عندَ اللہِ دونوں جملے غمازی کر رہے ہیں۔ کہ خود ابن حجر رحمہ کے دِل میں بھی کچھ کھٹک تھی۔ اور ان کی فطرت سلیمہ اور مہارت فن ان کو ابن جریر طبری کی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ مگر روایت پرستی کا غلو ان کو مجبور کرتا تھا کہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھالو۔ اور علاّمہ سلیمانی جیسے امام فن اپنے شیخ الشیوخ ابنِ حبان کی شہادتوں کی طرف کان نہ دو، اور ابن جریر کو اہل سنت ہی کہتے رہو۔ ورنہ یہ تفسیر و تاریخ کے سارے ذخیرے تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔

پھر ابن حجر لکھتے ہیں۔ واما نبذ بالتشیّع لانّہ صحّحَ حدیث غدیر خم۔ یعنی ابن جریر مفسّر پر جو شیعیت کا الزام لگا۔ وہ صرف اس لئے کہ انہوں نے غدیر خم والی حدیث (مَن کنتُ مولاہُ فعلیٌّ مولاہُ) کو صحیح قرار دیا ہے کیونکہ اگلے تمام محدثین کے نزدیک یہ حدیث موضوع اور شیعوں کی من گھڑت ہے۔ شیعہ حضرات کے سوا کوئی فرقہ بھی اس حدیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ اور آج بھی محققین اس حدیث کو موضوع ہی سمجھتے ہیں۔ مگر شیعوں اور ان کے رفیق کار صوفیوں کے پروپیگنڈے نے اس حدیث موضوع کو اتنا مشہور کر دیا۔ کہ کچھ اہل سنت بھی اس کو صحیح حدیث سمجھنے لگے۔ اہل سنت میں تفضیلیہ فرقہ اسی قسم کی جھوٹی حدیثوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔

اس کے بعد ابن حجر نے ابنِ جریر کے سنّی ہونے کے ثبوت میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ

واخرج ابن عَساکر من طریق محمد بن علی بن سھل بن الامام۔ قال سمعت اباجعفری الطبری وذکر علی رضؓ فقال ابوجعفر من قال اَبابکر وعمر رضؓ لیسا باما می ھدًی الیش ھو؟ فقال لہُ الطبری منکوا علیہ مبتدعٌ، مبتدعٌ ھٰذا؟ یقتل من قال اَنّ ابابکرٍ وعمر لیسَا

بامامی ھدًی یُقتَل۔

یعنی ابن عساکر بطریق محمد بن علی بن سہل بن الامام روایت کرتے ہیں۔ کہ ابن الامام نے کہا کہ میں نے ابوجعفر طبری کو کہتے ہوئے سنا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہو رہا تھا کہ ابوجعفر نے کہا کہ جو شخص یہ کہے کہ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) ہدایت کے امام نہ تھے وہ کیا ہے؟ ابن الامام نے کہا کہ وہ بدعتی ہے، تو ابن الامام کی بات کا انکار کرتے ہوئے ابوجعفر نے کہا کہ وہ بدعتی ہے، بدعتی ہے۔ قتل کیا جائے گا۔ جس نے کہا کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہدایت کے امام نہ تھے۔ قتل کیا جائے گا۔ قتل کیا جائے گا۔

سب سے پہلے تو یہی معلوم کرنا ہے کہ ابن عساکر جن کی ولادت ۴۹۹ھ اور وفات ۵۷۱ھ میں ہوئی۔ تو ابن الامام کی ولادت ۲۷۱ھ میں اور وفات ۳۵۷ھ میں ہوئی۔ تو ابن الامام کی وفات کے ایک سو بیالیس برس کے بعد ابن عساکر پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے جب تک ابن عساکر اور ابن الامام کے درمیان کا راوی معلوم نہ ہو، اس وقت تک اس روایت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔

مگر میرے خیال میں یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس عبارت ہی میں شیعیت کی پوری شان نمایاں ہے۔ شیعہ حضرات کا یہ دستور ہے کہ اپنے اُصول تقیہ و کتمان کے ماتحت اکثر دو پہلو باتیں ضرورت کے وقت کرتے ہیں۔ اور ایسی باتیں غالباً وہ پہلے سے سوچے ہوئے رکھتے ہیں کہ ضرورت پڑی تو بولیں گے جس کی متعدد مثالیں شیعہ علماء و مصنفین کے اقوال میں ملتی ہیں۔ چنانچہ اسی عبارت کے وقف و وصل کو ذرا بدل کر یوں پڑھیئے۔

فقال ابو جعفر مَن قال ان ابا بکرٍ و عُمر لیسا بامامی ھدًی الیش ھو؟ فقال لہ ابن الإمام مبتدع۔ فقال لہُ الطّبری منکرًا علیہ مبتدع مبتدع ھٰذا؟ یُقتَلُ من قال۔ اِنَّ ابا بکرٍ و عمر لیسا بامامی ھدًی یُقتَلُ یُقتَلُ۔

اب اس عبارت کا ترجمہ یوں ہوا کہ ابن جریر سے ابوجعفر نے پوچھا کہ جو شخص

یہ کہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضؓ ہدایت کے امام نہیں ہیں۔ وہ کیا ہے۔ (یعنے اگر کسی نے ایسا کہا تو اس پر کیا الزام ہے؟) ابن الامام نے کہا کہ وہ بدعتی ہے۔ تو ابن الامام سے طبری نے کہا۔ ان کی بات کا انکار کرتے ہوئے کہ وہ بدعتی ہے؟ وہ بدعتی ہے؟ قتل کیا جائے گا جو ایسا کہے گا۔ (یعنے جو اسکو بدعتی کہے گا وہ قتل کیا جائے گا۔) بے شک ابوبکر و عمر رضؓ ہدایت کے امام نہ تھے۔ قتل کیا جائے گا، قتل کیا جائے گا۔ (یعنے وہ جس نے ان دونوں کے امام ہدایت ہونے سے انکار کرنے والے کو بدعتی کہا۔)

مَیں نے بریکٹ میں جو مفہوم کو واضح کرنے کے لئے عبارت بڑھائی ہے۔ وہ صرف سمجھانے کے لئے ایسا نہ ہو کہ عام ناظرین یہ سمجھیں کہ پہلے ترجمہ میں اس طرح کے بریکٹ نہ تھے۔ اس لئے وہ ترجمہ صاف تھا اور یہ ترجمہ زبردستی بنالیا گیا ہے۔ اس لئے اتنے بریکٹ کی ضرورت پڑی۔ جو شخص عربی جانتا ہے اور عربی ادب سے کچھ بھی مناسبت رکھتا ہے۔ وہ دونوں ترجموں کے مطابق عربی عبارت کو بخوبی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے اور یہ نہیں الزام دے گا کہ بریکٹ کے زور سے قائل کے مقصود کے خلاف ایک معنی اور زبردستی نکالے جا رہے ہیں۔

مَیں نے اوپر لکھا ہے کہ شیعہ مصنّفین اپنی کتابوں میں ایسے دو پہلو الفاظ رکھا کرتے ہیں کہ حسبِ موقع اسکے پہلو اختیار کئے جائیں تو مناسب ہے کہ اس کی دو ایک مثال بھی پیش کر دوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

شیعوں کے مشہور محدّث و عالم علمِ رجال علامہ شیخ حلی اپنی کتاب خلاصۃ الاقوال فی معرفۃ الرّجال کے ص۱۴۱ میں محمد بن شہاب زہری کے متعلق لکھتے ہیں۔ عِدّ من اصحاب علی بن الحُسین عَدَوّۃ یعنی: لوگوں نے ان کو حضرت علی بن الحسین (زین العابدین) کے اصحاب میں شمار کیا ہے۔ مگر آپ اس کو عَدُوٌّہ بھی پڑھ سکتے ہیں تو ترجمہ یہ ہو گا کہ یہ علی بن الحسین کے اصحاب میں تھے مگر ان کے دشمن تھے۔

اہلِ کوفہ میں سے کسی نے حضرت علی رضؓ سے حضرت ابوبکر رضؓ و حضرت عمر رضؓ کے

متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا۔ انہما امامان عادلان قاسطان کانا علی الحق یعنے وہ دونوں عادل وانصاف ور امام تھے۔ حق پر رہے اور حق پر مرے۔ یہ پوری روایت شیعوں کی قدیم کتابوں میں موجود ہے، یہاں تک کہ "تحفہ جہان کشائے نادری ص۲۴۵" میں بھی موجود ہے۔ مگر متاخرین شیعہ حضرات نے صرف آدھی بات اپنی کتابوں میں لکھی یعنے انہما امامان عادلانِ قاسطانِ ہی تک اور عادل کا ترجمہ کیا۔ حق سے عدول یعنی انحراف کرنے والا اور قاسط کا ترجمہ کیا۔ ظالم۔ کیونکہ "عادل" جس طرح "عدل" کا اسم فاعل ہے۔ اسی طرح "عدول" کا بھی اور "قسط" لغاتِ اضداد سے ہے۔ اس کے معنیٰ انصاف کے بھی اور ظلم کے بھی۔ حالانکہ "عدل وقسط" جب ساتھ آئیں گے تو ان سے "عدل وانصاف کے ہی معنیٰ لئے جائیں گے۔ کبھی انحراف و رُوگردانی وظلم کے معنیٰ نہیں لئے جاسکتے۔ مگر اسی معنوی تحریف کے لئے تو پوری روایت نقل نہیں کرتے آدھی بات لکھتے ہیں۔

(بالکل یہی حال فرقہ شیعہ کا ہے) تاریخ بتاتی ہے کہ دورِ اوّل میں شیعہ حضرات اہل سنت کے ساتھ گھل مل کے رہے ہیں اور ہمیشہ تقیہ وکتمان کی نقاب اپنے چہروں پر ڈالے رہے۔ کبھی کبھی فضیلت شیخین کا راگ بھی باآواز وہل الاپتے رہے۔ یہاں تک کہ بعض نے حضرت علی رضؓ کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخیاں حلانیہ طور سے کر کے اپنے آپ کو خارجی بھی مشہور کر لیا۔ مگر تھے وہ درحقیقت شیعہ، اس لئے روایتیں ہمیشہ شیعوں کے موافق بیان کرتے رہے۔ تاکہ عوام اور ناواقف یا سادہ لوح محدثین یہ سمجھیں کہ ایک خارجی ہو کر جب یہ ایسا کہہ رہا ہے تو ضرور یہ روایت سچی ہو گی۔

آپ شیعہ حضرات کی کتب احادیث کو ملاحظہ فرمائیں۔ ایک مستقل باب "باب الکتمان" آپ کو ملے گا۔ جس میں ان کے آئمہ کی تاکیدی تصریحات موجود ہیں کہ ہر شیعہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے دین اپنے عقیدہ کو دوسروں سے پوشیدہ رکھے۔ چنانچہ اُصول کافی میں یہ حدیثیں موجود ہیں کہ لَا تَبُثُّوا سِرَّنَا وَلَا تُذِيعُوا اَمْرَنَا۔ یعنی ہمارا راز فاش نہ کرو۔ اور ہمارا دین شائع نہ کرو۔

انکم علی دینٍ من کتمہٗ اعزّہ اللہ ومن اذاعہٗ اذلّہ اللہ تم لوگ ایسے دین پر ہو کہ جس نے اس دین کو پوشیدہ رکھا۔ اللہ تعالےٰ اس کو عزت دے گا اور جو شائع کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرے گا۔ اگرچہ میرا ایمان ہے کہ ایسے لغو اقوال جو خلاف قرآن ہیں کبھی حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما یا ان کے ابناء و احفاد رضی اللہ عنہم کے نہیں ہو سکتے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ حضرات ان احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ بہرحال جب تک ان کو سیاسی طاقت حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس وقت تک علماءِ اہلِ سنت پر ان کا صحیح عقیدہ کبھی واضح نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ابان بن تغلب جیسے غالی شیعہ کے متعلق جس کے متشدد شیعہ ہونے کی شہادت خود شیعوں کی کتب رجال سے مل رہی ہے۔ امام ذہبی رح میزان الاعتدال میں کان غالیاً فی التشیع اور ذائغٌ مجاھرٌ لکھنے کے بعد بھی وثقہ احمد بن حنبل رح وابن معین وابو حاتمؒ لکھتے ہیں اور پھر خود ہی لکھتے ہیں کہ ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ مبتدع کی توثیق کیونکر جائز ہو سکتی ہے تو پھر اس کا جواب یوں دیتے ہیں۔ کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو بدعت صغریٰ جیسے غلو فی التشیع یا تشیع بلا غلو و بلا تحرق تو یہ اکثر تابعین میں تھا۔ اور تبع تابعینؒ میں باوجود ان کے دین و ورع اور صدق کے تو اگر ان سب لوگوں کی حدیثیں ردّ ہی کر دی جائیں تو سارے آثارِ نبویہؐ جاتے رہیں گے۔ اور یہ مفسدۂ عظیمہ ہے اور دوسری بدعتِ کبریٰ

لہ مگر وہی تابعین و تبع تابعین جو راویان حدیث تھے۔ جو یقیناً سو میں دس پانچ سے زیادہ نہ تھے اور پھر انہیں تابعین و اتباع تابعین کے زمرے میں منافقین عجم بھی تو تھے۔ اس لئے صرف تابعی ہونے کی وجہ سے ہر کسی کو تابعی ثقہ لکھ دینا اور سمجھ لینا تو درحقیقت اصل مروی عنہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ظلم کرنا ہے۔ اب کرتا ہے ہر خبر پہ تمنا! یقین کیوں؟ ناداں، تو یہ دوست فریب عدو نہ ہو۔ کہ آثار نبویہ ان سے حاصل نہ ہوتے مگر البتہ ان کی روایتوں کے ذریعے تمام آثار نبویہ مٹا دیئے گئے۔ یہاں تک کہ اس کا بھی آج پتہ نہیں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آخری نماز کس طرح کی تھی اور آپ نے آخری نماز میں کس طرح کی تھی اور آپ نے آخری نماز میں تحریمہ کس طرح باندھا تھا۔

ہے۔ مثل رفض کامل اور غلو فی الرفض کے اور حضرات شیخین رضہ پر حملے اور اس مسلک کی طرف لوگوں کو دعوت دینا۔ تو ایسی بدعت کبریٰ والوں کی سند نہیں لی جائے گی اور ان میں کوئی بزرگی نہیں ہے .... پھر آگے چل کر امام ذہبی رح لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا سچا آدمی اس جماعت کا نہیں ہے۔ جو کذب سے محفوظ ہو، بلکہ کذب ان کا شعار اور تقیہ و نفاق ان کا ورثہ ہے۔ تو جس کا یہ حال ہو اس کا قول کیونکر قبول کیا جائیگا مگر زمانہ سلف میں شیعہ غالی وہ تھا جو حضرات عثمان اور طلحہ و زبیر و معاویہ رضی اللہ عنہم کی شان میں کچھ گفتگو رکھتا تھا۔ اور جن لوگوں نے حضرت علی سے محاربہ کیا ان کو کچھ بُرا بھلا کہتا تھا۔ مگر اس زمانے کے شیعے تو حضرات شیخین سے اظہار بیزاری کرتے ہیں اور حضرات عثمان و طلحہ و زبیر و معاویہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر کرتے ہیں[1]۔ غرض امام ذہبی آخر میں فرماتے ہیں کہ آبان بن تغلب ایسے نہ تھے۔ وہ شیخین کی شان میں کچھ تعرّض نہیں کرتے تھے۔ صرف حضرت علی رضہ کو ان دونوں سے افضل ضرور سمجھتے تھے

حیرت ہے کہ امام ذہبی رح اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ اگر یہ لوگ مسلک کتمان کو اختیار نہ کرتے تو ان سے حدیثیں کون لیتا۔ اور کون ان کا اعتبار کرتا۔ اس لئے وہ اپنے مسلک کتمان کے مطابق ہمیشہ اپنے عقائد کو پوشیدہ ہی رکھتے تھے۔ اور کبھی حضرات شیخین کی کھلم کھلا بے موقعہ نہ بول سکے۔ بلکہ اپنی بے تعصبی دکھانے کے لئے فضیلت شیخین کی روایتیں بھی کبھی کبھی بیان کرتے رہے۔ مثلاً عبدالرحمٰن بن صالح اللذدی العتکی، ابو صالح ویقال ابو محمد الکوفی جو کہا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے بعد افضل امّت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ حالانکہ محترق فی التشیّع تھا۔ اور اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی ہجو و تنقیص میں کتاب تصنیف کر رکھی تھی۔ اور حضرات اُمّہات المؤمنین ازواج نبی صلے اللہ علیہ وسلّم کی ہجو و منقصت بیان کرتا تھا۔ مگر جن لوگوں کے سامنے ایسی ناشائشتہ باتیں

---

[1] یہ امام ذہبی متوفی ۷۴۸ھ اپنے زمانے کے شیعوں کا حال تحریر فرماتے ہیں۔ ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ (یہ زبان درازی شیعوں کی تمرّد ہونے کے بعد یعنی چھٹی صدی سے شروع ہوئی ہے۔ امام ذہبی رح نے اس کو خیال نہیں کیا۔ وما تخفی صدورہم اکبر شرح ہی ان پر صادق آتی ہے۔

بیان کرتا تھا اور جنہوں نے اس کی کتاب ہجو منقصت دیکھ لی۔ انہوں نے اس کو رجل سوء (نہایت برا آدمی کہا) اور محترق فی التشیع کہا اور اس سے جو حدیثیں لی تھیں ان سب کو جلا دیا اور جن کے سامنے یہ کتمان کرتا رہا۔ وہ اس کو نہایت ثقہ اور سچا سمجھتے رہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رہ اور یحییٰ بن معین وغیرہما اس کے بڑے معتقد اور مداح تھے۔ باوجود اس کے کہ اس کو شیعہ سمجھتے اور جانتے تھے

یہی حال سلیمان بن مہران الاعمش اور ابو اسحاق السبیعی اور زبید الیامی اور منصور بن معتمر وغیرہم کا ہے۔ عبداللہ بن المبارکؒ فرمایا کرتے تھے کہ افسد حدیث اھل الکوفۃ ابو اسحٰق واعمشکم ھٰذا یعنی اہل کوفہ کی حدیثوں کو ابو اسحٰق نے اور تمہارے اس اعمش نے برباد کیا۔ اور قریب قریب اسی کے معین بن عیسیٰ ابو یحیی القزاز المدنی نے بھی کہا کہ افسد حدیث اھل الکوفۃ الاعمش وابو اسحٰق ان سارے اقوال کے علاوہ تہذیب التہذیب میں یہ بھی ابن حجر نے میزان سے نقل کیا ہے:۔

کان من اھل الکوفۃ قوم لا یحمد الناس مذاھبھم ھم رؤوس محدثی الکوفۃ مثل ابی اسحٰق ومنصور وزبید الیامی والاعمش وغیرھم من اقرانھم ط

یعنی اہل کوفہ میں ایک قوم تھی جن کا مذہب لوگوں کو ناپسندیدہ تھا اور وہ محدثین کوفہ کے سرداروں میں تھے۔ مثل ابو اسحٰق اور منصور اور زبید الیامی اور اعمش کے اور ان کے سوا ان کے اقران۔

مگر باوجود ان تحریروں کے احادیث اہل سنت کے دفاتر آج انہی لوگوں کی روایتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جس کی وجہ وہی ہے جس کو امام ذہبی رہ نے کہا کہ اگر ان لوگوں سے روایتیں نہ لیں۔ تو پھر (بزعم ایشان) آثار نبویہ کا ایک بہت بڑا حصہ جاتا رہتا ہے۔ ابن حجر تہذیب التہذیب بضمن ترجمہ قتادہ بن دعامہ لکھتے ہیں:۔

قال ابن المدینی یحییٰ بن سعید ان عبدالرحمٰن یقول اترك

كل من كان راسًا فى البدعة يدعوا إليها قال كيف تصنع بقتادة وابن ابى رواد وعمرو بن ذر و ذكر قومًا. ثمّ قال يحيىٰ ان تركت هذا الضرب تركت ناسًا كثيرًا ط

یعنی : علی بن المدینی یحیٰی بن سعید سے کہنے لگے کہ عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں (یہ تینوں کبار ائمۂ حدیث اور اساطین جرح و تعدیل ہیں) کہ وہ شخص جو بدعت میں سردار ہو۔ اور دوسروں کو بدعت کیطرف دعوت دے، اس کو ترک کر دو تو یحیٰی بن سعید نے کہا تو پھر قتادہ اور ابن ابی رواد اور عمرو بن ذر وغیرہم۔ (ایک جماعت کا نام لے کر کہا۔) ان لوگوں کے ساتھ تم کیا کرو گے؟ پھر یحیٰی بن سعید نے کہا کہ اگر اس قسم سے ہم ترک کرنے لگیں تو ایک بڑی جماعت کو ترک کر دینا پڑے گا۔

انتہیٰ تفصیل سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ راویانِ حدیث میں کثرت اہلِ بدعت کی تھی۔ تابعین و تبع تابعین میں سے جو راویانِ حدیث تھے۔ ان میں تشیّعین بہت تھے اور مبتدعین بیحد۔ اور کیوں نہ ہوتے؟ منافقینِ عجم کی جماعت بھی تو انہیں میں ملی جلی تھی۔ اس لئے جو سچّے اور مخلص تھے۔ وہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے)

انتہیٰ تصریح سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ روایتوں کے لالچ میں آکر شیعوں اور روافض کے تشیّع و رفض کو کمزور کر کے آئمۂ حدیث ان سے روایتیں لیا کرتے تھے۔ اور یہ شیعی راویانِ حدیث شہد میں زہر گھول کر رکھتے تھے۔ ہر دس پندرہ روایت میں سے کم سے کم ایک دو روایت ایسی ضرور ہوا کرتی تھی جس سے کوئی نہ کوئی فساد ضرور پیدا ہو۔ چاہے وہ فسادات عقائد میں ہوں یا عبادات میں، اخلاق میں ہوں یا معاملات میں۔ مگر چونکہ وہ زہر شہد میں ملا ہوا ہوتا تھا۔ اس لئے شہد کی ظاہری صورت دیکھ کر بھولے بھالے شہد کے خریدار اس کو لے لیا کرتے تھے۔ انہیں اس کا گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس شہد میں زہر بھی ملا ہوا ہے۔ اور بعض جان بوجھ کر تا دیلی تریاق کے بھروسے پر وہ زہر آلود روایتیں بھی لیا کرتے تھے۔ مگر وہ زہر ان میں نہیں تو دوسروں میں اپنا کام کرتا رہا

بالکل اسی طرح ابنِ جریر طبری کی تفسیر ہے کہ تفسیری روایات جس کا زیادہ تر سرمایہ انہیں وضّاعین وکذابین وضعفاء ومتروکین اور روافض صوفیہ کے مفتریات ومکذوبات ہی سے مہیّا ہوا ہے۔ سب کو تقریبًا انہوں نے جمع کر دیا ہے اور بقول علاّمہ حافظ احمد بن علی السلیمانی بطور خود بھی روافض کے موافق بیسیوں روایتیں وضع کر کر کے اپنی تفسیر میں درج کر دی ہیں۔ مگر اتنا بڑا ذخیرہ تفسیری روایات کا جمع کرنے والا ان سے متقدم کوئی بھی نہیں گذرا۔ اگر ابن جریر کو رافضی و وضّاع تسلیم کر لیا جائے۔ تو پھر ان کی تفسیر سے ہاتھ دھولینا پڑے گا! اور یہ سرمایہ جس سے ہر فرقہ اپنے اپنے موافق تفسیری روایتیں لے لے کر اپنے اپنے فرقہ کی پشتبانی کرتا رہتا ہے ۔ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ بس صرف اسی لئے امام ذہبی اور ابن حجر دونوں نے ان کو صرف شیعہ تک رہنے دیا۔ وہ بھی مجبورًا چونکہ اس سے انکار نہ کر سکے ۔ باقی رہا رفض تو اس سے امام ذہبی رحؒ اور حافظ ابن حجر رحؒ دونوں نے سختی کے ساتھ انکار کیا کہ ابن جریر ہرگز رافضی نہ تھے ۔ حالانکہ دونوں لکھتے ہیں کہ علامہ حافظ سلیمانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ابن جریر روافض کے لئے جھوٹی حدیثیں وضع کیا کرتے تھے ۔ مگر ان کو نقل کرنے کے بعد بھی علاّمہ حافظ سلیمانی کے علم وفضل واتقان کے تسلیم کرنے کے باوجود بھی اس الزام کو اتہام قرار دیتے ہیں ۔ پھر ابن حجر کے شیخ الشیوخ ابو حیان اپنی تفسیر میں ان کو مذہب امامیہ کا ایک امام لکھتے ہیں اور انہوں نے کوئی حوالہ علامہ سلیمانی کا نہیں دیا ہے۔ مگر ابن حجر رحؒ اپنے شیخ الشیوخ پر بھی رجمًا بالغیب الزام دیتے ہیں کہ ان کو علاّمہ سلیمانی کے قول سے دھوکہ ہوا جو ایسا لکھ دیا۔ پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابن جریر نے حدیث غدیر خم کی تصحیح کی ۔ حالانکہ سارے آئمہ حدیث اس کو موضوع اور من گھڑت یقین کرتے تھے ۔ ان سب باتوں کے علاوہ ابن عساکر نے طلاق کے ایک فتوٰی کا بھی ذکر کیا ہے جس میں ابن جریر نے مذہب شیعہ کے مطابق فتوٰی دیا تھا ۔ اور حضرت علی رضؓ اور ان کے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے فضائل میں ایک خاص کتاب بھی لکھی تھی ۔ غرض یہ ہے کہ طرح طرح کے ثبوت ابن جریر کے رفض کے مل رہے ہیں ۔ مگر صرف ان کی تفسیر کی خاطر ان کو فقط شیعہ تک تو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں

مگر رفض سے انکار کئے جا رہے ہیں۔ اس "حمیت جاہلیہ" کا کیا جواب ہے؟

اگر واقعہ کے اعتبار سے ان کی تفسیر کو دیکھئے تو ہر اس مقام پر جہاں شیعوں نے اپنا مطلب نکالنا چاہا ہے۔ ایک نہ ایک تفسیری روایت شیعوں کے مطابق ضرور موجود ہے۔ سورۂ احزاب کی آیۂ تطہیر کو دیکھ لیجئے۔ پورا رکوع اور اس کی ایک ایک آیت بزبان حال خود پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس کے ہر جملے کی مورد امہات المؤمنین و ازواج النبی صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مگر شیعہ کہتے ہیں کہ ہاں پورا رکوع ضرور ازواج النبیؐ کے متعلق ہے۔ اور وہ آیت جس کا آخری ٹکڑا ہے۔ اِنَّمَا یُرِیدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیرًا آیت بھی ازواج کے متعلق ہے مگر صرف اتنا ٹکڑا حضرات علیؓ و فاطمہ حسن وحسین رضی اللہ عنہم کے متعلق ہے۔ اگرچہ اسکے بعد بھی پھر ازواج مطہرات رضی ہی کیطرف مخاطبت ہے۔ یہ قول خلاف سیاق وسباق درخلاف عقل و درایت جس قدر ہے معمولی سی عقل وفہم والا بھی سمجھ سکتا ہے۔ (مگر غلو لغیر الحق) کی وجہ سے ایسی خلاف عقل بات پر خواہ مخواہ کا اصرار کیا جا رہا ہے۔ شیعان کوفہ نے اس کے لئے واقعۂ کساؔء والی روایتیں گھڑ گھڑ کر اس کی خوب خوب اشاعت کی۔ یہاں تک کہ شیعہ حضرات کے ہاں اس قسم کی روایات کا پایا جانا قابل فہم ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ مسند احمد وغیرہ میں بھی اس کی روایتیں نظر آنے لگیں۔ مسند احمد کیا ہے؟ اس موضوع پر میرا ایک مستقل مضمون تیار ہے۔ انشاء اللہ کبھی شائع ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کا خلاصہ رسالہ البیان امرتسر مورخہ ۱۹۴۶ء کے دو پرچوں میں باقساط چھپ چکا ہے۔ اس لئے میں سر دست اس سے قطع نظر کرتا ہوں۔ بغرض مسند احمد اور ابن ابی حاتم کی کتاب میں اس واقعہ کی چند موضوع روایتیں ملتی ہیں۔ مگر تفسیر ابن جریر میں آپ دیکھ لیجئے۔ سولہ روایتیں اس واقعہ کساء کے متعلق انہوں نے ایسی ایسی درج کی ہیں۔ جن میں سے زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہی روایتیں ایسی ہوں گی۔

---

[1] یہ روایتیں اپنے اختلاف مضامین و اضطراب بیانات کی وجہ سے خود ایک دوسرے کی تردید کر رہی ہیں۔ میرا ایک مستقل رسالہ ہے تطہیر آیۃ التطہیر من دنس ہفوات الرواۃ والتفسیر جس میں نے اس رسالہ میں ان تمام روایات کی پوری قلعی کھول دی ہے۔

جو کسی اور کتاب میں بھی مذکور ہوں اور کم سے کم دس روایتیں تو یقیناً ایسی ہیں جو صرف امام ابن جریر کی خاص طبع زاد ہیں۔ ہرگز ہرگز کسی دوسرے کے پاس نہ ملیں گی۔ اسی طرح اور دوسرے مقامات کو بھی دیکھ لیجئے۔ علامہ سلیمانی کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ابن جریر شیعوں یا رافضیوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔

(۲)

مجھے تو یقین ہے کہ شیعہ حضرات نے جب سیاسی طاقت پیدا کی اور اپنے مذہب کی الگ تدوین شروع کر دی اور اپنی حدیث و تفسیر وغیرہ کی کتابیں بھی الگ کر لیں اور ان کا حصہ رسدی جو اہل سنت کی کتابوں میں رہ گیا تھا۔ یعنی ان کی حدیثیں جو اہل سنت نے اپنی کتابوں میں صرف اس لئے درج کر لی تھیں کہ الگ الگ دو فرقے نہ ہو جائیں اور ان کی دل جوئی بھی ہوتی رہے۔ وہ ساری کی ساری حدیثیں اہل سنت کے سر پڑ گئیں جن کے متعلق اب شیعہ حضرات کہا کرتے ہیں کہ تمہاری کتابوں میں بھی تو فلاں فلاں روایتیں موجود ہیں۔ حالانکہ وہ خود انہی کی دی ہوئی حدیثیں ہیں۔ ورنہ وہ بتائیں کہ جب بخاری و مسلم مدوّن ہو رہی تھی یا ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کی کون سی کتاب تھی؟ یہاں تک کہ مستدرک حاکم جو خالص شیعہ کی کتاب ہے اور صاحب مستدرک بالاتفاق شیعہ تھے امام ذہبی رح نے تذکرۃ الحفاظ میں اور ابن حجر رح نے لسان المیزان میں ان کا ترجمہ لکھتے ہوئے لکھا ہے

رافضیٌّ خبیثٌ کان شدیدُ التعصبِ فی الباطن وکان یُظْهِرُ السُّنَنَ فی التقدیم والخلافۃ یعنی؛ ابوعبداللہ الحاکم صاحب مستدرک رافضی تھے۔ شیعیت کے تعصب میں بباطن بہت سخت تھے اور سنّی ہونا ظاہر کرتے تھے شیخین کو مقدم ظاہر کر کے اور خلافت کا اقرار کر کے۔

مگر یہ بھی اپنی کتاب مستدرک کے ساتھ اہل سنت ہی سر رہے۔ بعض شیعہ راویانِ حدیث کے نام ہی بدل دئے گئے۔ کہیں حروف کا فرق، کہیں لفظوں کا فرق

لہ مثلاً میندل رجان اینا الی العزی کچھ کتب رجال شیعہ اور کتب رجال اہل سنت میں ان کے حالات دیکھ لیجئے

اس کی متعدد نقلیں کر کر کے حسب موقعہ اور حسب گنجائش تحریفوں کے بعد ان ملکوں تک ان نسخوں کو پہنچایا جن ملکوں تک امام بخاری رح نہ جا سکے تھے اور ان لوگوں تک پہنچایا جو نہ امام بخاری رح کے پاس آئے، نہ امام بخاری رح ان کے پاس پہنچے۔ مثلاً ابو جعفر ابن جریر الطبری کہ امام بخاری کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی تھی۔ اس وقت ابن جریر کی عمر بتیس ۳۲ برس کی تھی۔ امام بخاری خود عجمی تھے۔ ان کے علم و فضل کا کافی شہرہ عجمی ملکوں میں ہو چکا تھا اور وہ جس قدر علم کے حریص تھے۔ سب کو معلوم ہے۔ اگر امام بخاری کے دل میں کچھ بھی ابن جریر کی جگہ ہوتی۔ تو وہ ضرور ابن جریر کے پاس پہنچتے۔ اور ان سے حدیثیں بھی لیتے اور ابن جریر اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے کہ امام بخاری کے تلامذہ کی صف میں داخل ہوتے۔ مگر صحیح بخاری سامنے رکھ کر اس سے اسناد و مناسب ردّ و بدل کے ساتھ یا بعینہٖ لے لے کر اپنی من گھڑت حدیثوں پر چسپاں کر دیا کرتے تھے۔ لیکن امام بخاری کی تاریخ کبیر و تاریخ اوسط و تاریخ صغیر کی تو اشاعت ہوئی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ آج بھی تاریخ کبیر و تاریخ اوسط نہیں ملتی ہے۔ اس لئے امام بخاری رح کے کون شیخ کب وفات پا گئے۔ اس کی خبر ابن جریر کو پوری طرح نہ مل سکی۔ سعید بن الربیع اگرچہ ہروی الاصل یعنے ہرات کے رہنے والے تھے۔ مگر بصرہ میں آ کر رہ گئے تھے۔ اس لئے طبرستان کے رہنے والے ابن جریر کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سعید بن الربیع نے کب وفات پائی۔ یا ابھی زندہ ہیں یا نہیں۔ سمجھے کہ امام بخاری جو ہمارے ہم عصر ہیں۔ جب ان سے روایت کر رہے ہیں تو پھر ہم کیوں ان سے روایت نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جب وہ بھی عجمی ہی تھے۔ ہرات کے رہنے والے تھے۔ جو خراسان کا ایک شہر ہے۔ غرض یہ کچھ سمجھ کر ابن جریر صاحب نے بھی حدثنی سعید بن الربیع لکھ مارا۔ اس واقعہ سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ ابن جریر اسناد حدیث گھڑا کرتے تھے، چرایا کرتے تھے۔ جس کی کوئی اصلیت نہیں ہوئی تھی۔ تو جو شخص جھوٹے اسناد گھڑ سکتا ہے۔ کیا جھوٹی حدیثیں نہیں گھڑ سکتا۔ اگر تھوڑی محنت کی جائے تو ایسی مثالیں اور بھی یقیناً مل جائیں گی۔ انشاء اللہ تعالےٰ

کہیں نسبت کا فرق، کہیں ولدیت کا فرق پیدا کر دیا۔ اور کتنے شیعہ راویانِ حدیث سے شیعوں نے انکار کیا کہ وہ ہمارا راوی ہی نہیں اس لئے کہ اب ان کو ان سے کوئی کام تو نہیں رہا۔ وہ تو ان کا کام کر گئے کہ ان کتابوں میں جو اہل سنت کے سر پڑ گئی ہیں۔ شیعوں کی حمایت میں حدیثیں بھر گئے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ ابو جعفر محمّد بن جریر الطبری کو بھی ایک سے دو کر دیا گیا اور صرف دادا کے نام کا فرق پیدا کر کے سنیوں کو یہ دھوکہ دیا گیا۔ کہ ہمارا ابو جعفر طبری تو ابن جریر رستم ہے اور وہ جو مفسّر و مؤرخ ہے۔ وہ ابن جریر بن یزید ہے اور وہ تمہارا ہے۔ ہم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس میں شیعوں کو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ابن جریر کی تفسیر و تاریخ میں جو روایتیں شیعوں کے موافق ہیں۔ وہ سنیوں کے خلاف سنیوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں کہ دیکھو تمہارے مفسّر اور تمہارے مؤرخ ایسا لکھ رہے ہیں۔ مگر یہ الزام اور اس طرح کی ترکیبیں جب کی گئیں کہ اہل سنت ان چیزوں کو اپنے گلے لگا چکے۔ اس لئے حقیقت حال یہی ہے کہ دونوں ابن جریر ایک ہی ہیں۔ ہرگز دو نہیں اور بفرضِ محال دو ہوں بھی تو عینِ غین کی صورت ایک ہی ہے۔ اس لئے بہر حال دونوں ایک ہی ہیں۔

ابن جریر مفسّر کے شیوخ

ابن جریر مفسّر کے شیوخ تو بہت ہیں۔ مگر کیسے کیسے شیوخ ہیں۔ ان کو وہی خوب جانتے ہیں جنہوں نے کتب رجال کی کافی سیر کی ہے۔ اسی لئے امام حجر اور امام ذہبیؒ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) شیعوں نے مندل کو جو نون سے ہے: مبدل بائے موحدہ تحتانیہ سے اور عنزی کو جو نون اور زائے معجمہ سے ہے۔ عنزی تائے قرشت اور رائے مہملہ سے بدل دیا۔ اسی طرح مندل کے بھائی حبان العنزی جو بائے موحدہ سے ہے اس کو یائے مثناۃ سے بدل دیا۔ مگر یہاں عنزی کو علیٰ حالہ رہنے دیا کہ دونوں اپنے بھائی نہ سمجھے جائیں۔ اسی طرح یزید بن معاویۃ الکوفی شیعوں کا ایک بہت بڑا محدث تھا اس کو وہ پہلے تو برا نہیں سمجھتے تھے۔ متقدمین شیعہ کا نام "یزید" اور معاویۃ ہوتا تھا۔ بڑوں کے بعد سے تعصّب بڑھا۔ تو یزید کو برید بائے موحدہ اور رائے مہملہ سے بنا دیا۔ چونکہ اس سے کچھ روایتیں ان کتابوں میں بھی ہیں جو اہل سنت کی کہی جاتی ہیں۔ ورنہ یزید اور معاویہ نام کے راویانِ حدیث ان کی کتابوں میں آج بھی

نے ان کے محض چند ہی شیوخ کے نام گنائے ہیں۔ جن میں محمد بن عبدالملک البصری متوفی ۲۴۴ھ فلاس متوفی ۲۴۹ھ یعنی عمرو بن علی البصری۔ اسحٰق بن ابی اسرائیل المروزی، ثم البغدادی، متوفی ۲۴۰ھ، ہناد بن السری الکوفی متوفی ۲۴۳ھ، ابوکریب محمد بن العلاء الکوفی الہمدانی، متوفی ۲۴۳ھ اور ابوموسیٰ محمد بن المثنیٰ البصری متوفی ۲۵۰ھ یا ۲۵۱ھ یا ۲۵۲ھ (باختلاف اقوال) ایسے ہیں جن کو آئمۂ حدیث و رجال ثقہ تسلیم کرتے ہیں اور جن سے صحاح میں روایتیں ہیں۔ ان لوگوں کو بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ کوفی و بصری ہی ہیں۔ یا ایک صاحب مَرو کے رہنے والے بھی ہیں۔ جو بغداد میں آ بسے تھے۔ لیکن فلاس اور محمد بن عبدالملک دو بصریوں کے سوا کسی کے ترجمے میں فہرست تلامذہ کی جہاں لکھی ہے۔ وہاں ابن جریر طبری کا نام نہیں لکھا ہے۔ مگر ابن جریر کے ترجمہ میں ابن جریر کے شیوخ میں ان سب حضرات کے اسماءِ گرامی ضرور ملتے ہیں۔ بہرحال ابن جریر طبری کی ولادت ۲۲۴ھ کی ہے اور وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ اس لئے مذکورہ بالا اساتذہ میں سے صرف ابوموسیٰ محمد بن المثنیٰ ہی کا وقت یہ ایک حد تک پا سکے۔ اس لئے کہ ابوموسیٰ کی وفات کے وقت ان کی عمر چھبیس ۲۶ یا ستائیس ۲۷ یا اٹھائیس ۲۸ برس کی تھی۔ باقی لوگوں میں سے فلاس کی وفات بھی یہ پچیس ۲۵ سال کے ٹھہرتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ تو کسی کی وفات کے وقت سولہ برس کے کسی کی وفات کے وقت اٹھارہ ۱۸ یا انیس ۱۹ برس کے ہوتے ہیں اس لئے ان ثقہ حضرات سے روایتیں لینے کا فی الحقیقت موقعہ ہی کم ملا۔ اگرچہ ابوکریب سے یہ بہت روایت کیا کرتے ہیں۔ مگر ابوکریب کی وفات کے وقت یہ ہرگز انیس سال سے زیادہ کے نہ تھے۔ اور ابوبکر تو کوفی بھی تھے اور ہمدانی بھی۔ [1]

---

[1] یعنی کوفیوں سے تو اکثر لوگ واقف ہیں کیونکہ کوفہ شیعوں کا خاص مرکز تھا اور ہمدانیوں کے حال سے میں تنقید احادیث نزول مسیح کے ضمن میں لکھ چکا ہوں کہ ہمدانی بھی شیعوں کا ایک مستقل گڑھ تھا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ ابوکریب سے شیعوں کے موافق بہت حدیثیں ملیں گی۔ چنانچہ حدیث کساء کے اکثر طرق ان سے مروی ہیں۔ مگر بخاری و مسلم میں ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ اس لئے ائمہ رجال بخاری و مسلم کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی توثیق ہی کرتے ہیں اور یہی حال محمد بن المثنیٰ الکوفی کا ہے۔ ابن جریر کے ان ثقہ شیوخ کے ترجمے تہذیب التہذیب وغیرہ ہی دیکھ لیجئے۔ چونکہ اکثر صحاح ثقہ میں سے سب نے یا بعضوں نے ان کی حدیثیں لی ہیں اس لئے ائمہ رجال ان کی توثیق کرتے ہیں گو کبھی کبھی ان کے بعض الفاظ ان کے متعلق کچھ غمازی کرتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔

محمد بن حمید ی حبّان الرّازی

ابن جریر کے شیوخ میں ان کا نام لکھا ہے ان کے متعلق امام بخاری رح کہتے ہیں۔ فیہ نظر یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں۔ ان کے پاس منکر روایتیں بہت ہیں۔ امام نسائی نے کہاکہ غیر ثقہ ہیں۔ علامہ جوزجانی نے کہاکہ ردّی المذہب ہیں۔ غیر ثقہ ہیں۔ صالح بن محمد الاسدی مشہور محدث فرماتے ہیں۔ کہ ہم نے اللہ تعالٰی کے سامنے اسقدر ڈھیٹ کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ دوسروں کی حدیثوں کو لے لیا کرتے تھے۔ اور ان میں الٹ پلٹ کر لیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہاکہ مشاق جھوٹا دو آدمیوں جیسا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ ایک تو سلیمان الشاذکوفی، دوسرے محمد بن حمید امام ابوزرعہ نے اپنے بھتیجے سے ان کے متعلق کہاکہ یہ قصداً جھوٹی روایت کرتے تھے اور متعدد ائمہ رجال و حدیث نے ان کو کذاب کہا۔ تفصیل لسان المیزان و میزانُ الاعتدال میں طوالت کے ساتھ موجود ہے۔

اسمٰعیل بن موسٰی انفرادی

ابو محمدٌ ابو اسحٰق الکوفی۔ یہ بھی ابن جریر کے مذکورہ اساتذۂ خصوصی میں سے ہیں۔ ان کو لوگوں نے اسمٰعیل بن ابی کریمۃ السدّی مشہور مفسّر مگر غالی شیعہ اور معروف کذّاب اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن بن ابی کریمۃ السّدّی کا نواسہ لکھا ہے۔ جیساکہ امام بخاری، امام مسلم و امام نسائی وابن سعد وغیرہم نے قطعیت کے ساتھ لکھا ہے اور ابو علی جبائی نے ان کو سدّی کا بھانجا لکھا ہے مگر ان کو بقول ابو حاتم، سدّی کی قرابت قریبہ سے انکار تھا۔ بہر حال سُدّی ہی کیطرح بالاتفاق ان کو بھی سب نے شیعہ ہی تسلیم کیا ہے۔ مگر کوئی غالی شیعہ لکھتا ہے۔ کوئی خالی شیعہ۔ ابوبکر بن شیبہ اور ھنّاد بن سری اس کو فاسق کہتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سلف کو گالیاں دینے والے سے لوگ کیا حدیثیں لیتے ہیں۔ یہ شریک بن عبداللہ الکوفی جو تشیّع مفرط میں مشہور تھے۔ ان کے شاگرد تھے۔ مگر ان سے بھی ایسی روایت کیا کرتے تھے۔ جو کوئی دوسرا ان کا شاگرد نہیں جانتا تھا

عباد بن یعقوب الاسدی

الکوفی۔ نہایت غالی شیعہ تھے۔ شریک

بن عبداللہ الکوفی کے شاگرد رشید تھے۔ انہیں سے یہ روایت ہے کہ میرے منبر پر معاویہؓ کو دیکھو تو اس کو قتل کر دو۔ اس قسم کے قول کا بہتان یہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر باندھتے تھے۔ حضرت عثمان، حضرت طلحہ رضؓ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی شان میں کریہہ الفاظ بولتے تھے اور مناقب حضرت علی رضؓ وحضرت فاطمہ وحضرت حسن وحضرت حسین رضی اللہ عنہم میں جھوٹی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے ۲۵ھ میں وفات پائی۔

اور جن اساتذۂ ابن جریر کا نام ابن حجر رحؒ نے نہیں لکھا ہے۔ وہ تو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں بس مختصر سی تحریر میں کہاں تک لکھا جائے۔ اہلِ حق کو چاہیئے کہ تفسیر ابن جریر کو دیکھیں تو رجال کی کافی چھان بین کے بعد قرآنی سیاق وسباق سے ملاتے ہوئے تفسیری روایتوں کو دیکھیں اور ہرگز ہرگز کسی تفسیری روایت پر بلا تحقیق یقین نہ کرلیں۔ یہ واقعہ ہے کہ تفسیری روایات میں اسّی فیصدی روایات محض کذب وافترا ہیں۔ میرا یہ دعوٰی محض قیاسی یا تعصّب یا بدگمانی پر مبنی نہیں ہے۔ میرے پاس اس کے نہایت واضح دلائل موجود ہیں۔ اور میں اپنے دعوٰی پر شہادتیں رکھتا ہوں۔ مثلاً ابن جریر نے اپنی تفسیر کے مقدمہ (بصفحہ ۲۱ مطبوعہ مصر)

ایک روایت لکھی ہے جس کو یوں شروع کیا گیا ہے۔ حدّثنی سعید بن الربیع مگر سعید بن الرّبیع۔ صرف ایک ہی راوئ حدیث تھے جن کا پورا نام سعید بن الربیع الحرشی العامری البصری ہے۔ تہذیب التہذیب جلد ۴، میں حافظ ابنِ حجر رحؒ نے ان کو اقدم شیخ البخاری لکھا ہے۔ یعنے یہ امام بخاری کے سب سے قدیم ترین شیخ تھے۔ ان کی سال وفات ۲۱۱ھ دوسو گیارہ امام بخاری کی روایت سے لکھا ہے یعنے ابن جریر طبری کی ولادت سے تیرہ برس پہلے۔ کیونکہ ابن جریر کی ولادت ۲۲۴ھ میں ہوئی تھی۔ اور کوئی دوسرا راوی حدیث اس نام اور اس ولدیت کا کہیں ہے نہیں تو پھر یہ حدّثنی سعید بن الرّبیع کہہ کر ابن جریر کا کوئی حدیث روایت کرنا کیا معنے رکھتا ہے؟ بات خود بناتے تھے اور سلسلۂ اسناد صحیح بخاری سے مستعار لے لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری کی اشاعت تو امام بخاری کی خواہش سے بھی زیادہ ان کے ان شاگردوں نے کی جنہوں نے

ابن جریر کے تلامذہ

انسان اپنے ہم نشینوں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ ابن جریرؒ کے شیوخ تھے۔ وہ یقیناً شیعہ ہی تھے۔ محدثین اپنے جذبۂ مفاد و روایت پرستی کے لئے شیعہ و رافضی میں فرق کریں۔ یہ ان کو اختیار ہے حقیقت میں تو ہر شیعے کو رافضی ہی سمجھنا چاہیئے۔ غرض یہ ہے کہ جب ان کے شیوخ کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہے کہ کون واقعی ان کے شیخ تھے اور کون ایسے تھے جن کے نام ابن جریر نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں میں دیکھ کر اپنی حدیثوں میں جوڑ لئے تھے۔ تو یہ صورت شاگردوں میں تو نہیں ہو سکتی، شاگرد جو ان کے تھے وہ تو انہیں کے شاگرد تھے۔ اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ ان کے شاگرد کون کون لوگ تھے۔ یہ تو رہی ابن جریر کے شیوخ کی کیفیت اب دیکھنا چاہیئے کہ ان کے شاگرد کس قسم کے تھے۔ ان کے متعلق میں طوالت سے بچنے کے لئے مختصر طور سے لکھتا ہوں۔

ابو بکر الشافعی کا نام بھی ابن حجرؒ نے ابن جریر کے تلامذہ میں لکھا ہے۔ میں نے تاریخ مسند امام احمد میں ان کا پورا حال لکھا ہے۔ جو رسالہ البیان امرتسر کے اکتوبر و نومبر ۱۹۴۶ء کے دو پرچوں میں شائع ہوئی تھی۔ ابو بکر شافعیؒ کا ترجمہ نومبر کے پرچے میں چھپا ہے، یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ ان کے متعلق خلاصۃ الاقوال میں علامہ حلی شیعی نے خود یوں لکھا ہے کہ یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے اور باطن میں شیعہ امامیہ تھے اور دونوں مذہب کے فقیہ تھے۔ اور دونوں مذہبوں پر ان کی کتابیں ہیں۔ دیکھیئے خلاصۃ الاقوال صـ ۷۔)

محمد بن عبد اللہ القطان

رافضی معتزلی، ان کو محمد بن عبد اللہ بن محمد بن احمد بن الیوب ابو بکر القطان بھی کہتے ہیں۔ مگر عموماً باپ کا نام چھوڑ کر دادا کے نام کے ساتھ منسوب کیئے جاتے ہیں۔ اور محمد بن عبد اللہ القطان لوگ لکھتے ہیں، ابن حجر لسان المیزان جلد ۵ صـ ۲۲۹ میں ان کے متعلق رافضیؒ معتزلیؒ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ابن جریر سے ان کا حدیثیں سننا تو صحیح ہے۔ اَلَا اِنَّہٗ کان رافضیًا کان سیئُ المذھبُ واحسب انہٗ کان یکذب لتفضیل

علی رضا مات ۲۹۸ھ مگر یہ رافضی تھے۔ بد مذہب تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت علی رضا کو فضیلت دینے کے لئے جھوٹ کا استعمال کرتے تھے۔

ابراہیم بن حبیب لسان المیزان میں ابن حجر رح نے ان کا مختصر سا ذکر کیا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ طوسی نے ان کا ذکر رجال شیعہ میں کیا ہے۔ جس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ یہ شیعہ تھے۔

علی بن عبداللہ بن وصیف الناشی ابوالحسن الحلاّان کا ذکر بھی لسان المیزان میں ہے۔ اقراری شیعہ تھے۔ ادب ولغت کے ماہر تھے اور تشیع میں غلو رکھتے تھے۔ ۳۶۵ھ میں نوّے برس سے زیادہ عمر پاکر دنیا سے رخصت ہوئے۔

محمد اسحٰق بن مہران ابوبکر المقری شاموخ یہ بڑے قاری بھی تھے۔ ان سے قراءت کی روایتیں بھی مشہور تھے۔ ابن جریر کی من گھڑت قراءتوں کی یہ روایت کرتے تھے۔ مگر ابن جریر کے نام سے نہیں۔ کیونکہ ابن جریر کی قراءتیں قراءت کے بازار میں چالو نہ تھیں۔ جھوٹی حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے خصوصاً حضرت علی رضا اوران کے اہل بیت کے مناقب میں ۲۵۲ھ میں وفات پائی۔ تشیع میں کافی غلو رکھتے تھے۔

محمد بن المظفّر مشہور محدث تھے۔ ابوالولید الباجی کا بیان ہے کہ ان میں تشیع نمایاں تھا۔ ۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۷۷ھ میں وفات پائی۔ ابن جریر کی وفات کے وقت ۲۴ برس کے تھے۔ محض مثال کے طور سے یہ چند نام میں نے لکھ دیئے ہیں۔ اگرچہ کچھ محنت کی جائے تو ابن جریر کے شیعی تلامذہ کافی تعداد میں مل سکتے ہیں۔

دو نہیں، تین امام ذہبی اور حافظ ابن حجر رح تو دو ہی عدد، ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، مان کر سبکدوش ہو گئے مگر شیعوں کا کام ایک کو دو بنانے سے بھی نہیں نکلا۔ اس لئے ان کی بعض کتابوں میں ابوجعفر محمد بن جریر الطبری روایت

کرتے نظر آتے ہیں۔ ابو عبداللہ الحسین الغضائری سے اور غضائری کی وفات سنہ ۴۱۱ھ یا سنہ ۴۱۲ھ میں ہوئی تھی۔ یعنے ابو جعفر محمد بن جریر الطبری مفسر متوفی سنہ ۳۱۰ھ کی وفات کے ایک سو ایک یا ایک سو چار برس کے بعد۔ اس لئے مفسر ابو جعفر محمد بن جریر الطبری تو یہ ہو نہیں ہو سکتے۔ جو ابنِ یزید تھے۔ اور ابنِ رستم بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ابنِ یزید اور ابنِ رستم ان دونوں میں تو صرف "یزید اور رستم" کا فرق ہے۔ اور باقی جتنی باتیں ہو سکتی ہیں۔ سب میں مادرِ گیتی کے یہ دونوں فرزندِ ارجمند توام تھے۔ دونوں کے نام ایک، دونوں کے باپ کے نام ایک، دونوں کی کنیت ایک، دونوں کا ملک ایک (یعنے طبرستان) دونوں کا مولد یعنے جائے پیدائش ایک یعنے شہر آمل "مولد" اسم ظرف ہے۔ اسلئے ظرف مکان ہی میں دونوں متحد نہ تھے۔ بلکہ ظرف زمان میں بھی دونوں متحد تھے۔ یعنی دونوں کی پیدائش کا سنہ ۲۲۴ھ ایک اور مہینہ دن، تاریخ اور وقت بھی ایک ہی تھا اور پھر دونوں کی وفات بھی بالکل ساتھ ساتھ ایک ہی وقت ایک ہی دن ایک ہی مہینہ اور ایک ہی سنہ ۳۱۰ھ میں ہوئی اور پھر دونوں شاید ایک ہی قبر میں ساتھ ساتھ مدفون بھی ہوئے اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی نہ کوئی سنّی یا شیعہ ماہر فن رجال و تاریخ یہ ضرور لکھتا کہ ابنِ یزید، سنہ ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ابن رستم فلاں سنہ میں پیدا ہوئے۔ ابن یزید سنہ ۳۱۰ھ میں مرے تھے۔ اور ابن رستم فلاں سنہ میں دنیا سے رُخصت ہوئے۔ ابن یزید کی قبر فلاں جگہ ہے اور ابن رُستم کی قبر فلاں جگہ، صرف دادا کے نام کو بدل دینے سے ایک شخص ایک سے دو ہو جائے۔ جب تو بڑی آسانی کے ساتھ بھتیرے ایک کو دو کر دیا جا سکتا ہے۔

غرض یزید اور رستم کا فرق تو نکالا تھا شیعوں ہی نے جس کو علماءِ اہل سنّت نے بھی قبول کر لیا۔ مگر دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔ اگلے وضّاعین و کذّابین سے ایسی غلطیاں بہت ہوئی ہیں کہ کسی راوی کا سال ولادت یا سال وفات معلوم نہ ہو سکنے کی وجہ سے قیاس سے کام لیا۔ اور وہ قیاس غلط نکلا۔ بعد والوں نے جب فن رجال کی تدوین شروع کی اور راویوں کے سال ولادت و وفات کا پتہ لگا لگا کر قلمبند کرنا شروع کیا۔ تو

جہاں خود ان ائمۂ رجال کو اپنے شیوخ کی بعض کمزوریاں محسوس ہوئیں۔ وہاں کسی کا سال
ولادت حذف کر دیا کسی کا سال وفات کھا بدے۔ جس طرح علید بن سباق کا سال
ولادت و وفات اگر ائمۂ رجال لکھ دیتے تو حضرت زید بن ثابت رضہ سے ان کی روایت
حدیث جمع قرآن کیونکہ صحیح ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لئے نہ ان کا سال ولادت کسی نے لکھا
نہ سال وفات نہ گمر، باوجود اس کے کہ خود امام بخاری ؒ نے اپنی تاریخ میں سب کچھ
لکھ دیا تھا۔ لیکن بعد والوں نے اپنی کتابوں میں اس کو نقل کرنا مناسب نہیں سمجھا خود امام
بخاری نے کیوں لکھ دیا تھا؟ وہ اسلیئے کہ ان کے دل میں چور نہ تھا اور نہ انہوں نے وہ
جمع قرآن والی روایت اپنی کتاب میں درج کی تھی۔ یہ تو پورا "بَابُ جَمْعُ الْقُرآن"
ہی صحیح بخاری میں الحاقی ہے جس کو میں نے اپنی کتاب "جمع القرآن" میں زبردست
دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اور اگر اس باب کے الحاقی ہونے سے انکار کیا جائے گا۔
تو پھر سارا الزام خود امام بخاری ہی پر عائد ہو کر رہے گا۔ بس اتنا کہنا صحیح ہو گا کہ امام بخاری
نے روایت کو صحیح سمجھ کر ابن شہاب زہری کے اعتماد پر اپنی کتاب میں اس کو درج کر لیا
پھر بھی کم سے کم ان کی بصیرت فی الحدیث پر حرف ضرور آئے گا اور میرا دل اس کو قبول
نہیں کرتا کہ میں ان کو کم بصیرت سمجھوں اور جہاں ائمۂ رجال نے سال ولادت اور
و وفات کو ہڑپ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہاں کتنے وضاعین و کذابین کا
راز فاش ہو کر رہا۔ چاہے اگلوں میں سے کسی نے اس راز کو فاش کر دیا۔ چاہے قدرت
نے کسی کے متعلق اس حقیر تمنا عمادی کو منتخب کر رکھا تھا۔

اور شیعوں کے یہاں تو حدیثوں کی جمع تدوین ہی دیر کر کے شروع ہوئی۔ رجال
شیعہ پر اور بھی بہت دیر کر کے کتابیں لکھی گئیں۔ ابو عبد اللہ الغضائری (یعنے حسین بن
الحسن بن محمد بن مقیم بن محمد بن یحییٰ بن جلیس بن عبد اللہ الحزرجی الغضائری) جو بغدادی تھے جن کا سال
وفات شیعوں کی کتاب "تَنقِيحُ المَقَالِ فِي اسماءِ الرِّجال" میں ۴۱۱ھ لکھا ہے مگر
انساب سمعانی میں ۴۱۴ھ ہے۔ اس سے روایت گھڑنے والے صاحب واقف نہ تھے اس
لئے ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کو ان کا شاگرد لکھ کر طبری کی طرف سے ایک روایت لکھ

دی کہ میں نے اپنے شیخ غضائری کے ہاتھ کا لکھا ہوا یوں دیکھا ہے۔ غضائری غریب نے تو ابوجعفر ابن جریر طبری کی وفات سے ایک سو ایک یا ایک سو چار برس کے بعد دنیا میں قدم رکھا تھا۔ تو اب یہ روایت کس طرح درست قرار دی جائے؟ مگر اس دشواری کو دور کرنے میں کوئی دشواری تو تھی نہیں۔ جن لوگوں کو ایک سے دو کرنا آتا ہے۔ ان کو پھر دو سے تین بنا دینا کیا دشوار ہے۔ فوراً ایک اور ابوجعفر بن جریر الطبری تیسرے بھی بنا لئے گئے۔ دوسرے ابن جریر کی تصنیف کے وقت ان کے دادا کا نام یزید ایک ایسا نام تھا جس کا سننا بھی گوارا نہ تھا۔ اس لئے بدل دینا یوں بھی ضروری تھا اور پھر اصلی و جعلی میں کچھ تفریق دکھلانے کے لئے تو ضروری تھی۔ اس لئے دادا کے نام کو یزید سے رستم بنا دیا گیا تھا۔ مگر اب کے تو دوسرے کے بعد تیسرے کی تصنیف میں کسی رد و بدل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دونوں تو جعلی ہی ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ دونوں میں کچھ تفریق کیوں پیدا کیجائے اس لئے دوسرے اور تیسرے میں کسی قسم کا بھی فرق نہیں رکھا گیا۔ دونوں کا نام محمد، دونوں کی کنیت ابوجعفر اور دونوں کے باپ کا نام جریر تھا۔ دونوں کے دادا کا نام رستم، دونوں طبرستان کے رہنے والے، دونوں کا مولد آمل اور دونوں ہی نے امامت پر ایک کتاب لکھی تھی اور دونوں نے اپنی کتاب کا نام کتاب المسترشد ہی رکھا تھا۔ اور پھر دونوں کا سال ولادت و وفات کو نامعلوم ہی رکھنے میں دروغ بافی پر پردہ رہ بھی سکتا تھا۔ غرض ابن جریر تین تھے ایک تو عامی یعنی ایک اہل سنت سے تھے جو مفسر تھے جو ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری متوفی ۳۱۰ھ تھے اور دوسرے ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری جو ابن یزید کے معاصر تھے اور پھر تیسرے بھی ابوجعفر بن جریر بن رستم الطبری ہی تھے جو شیعوں کے شیخ الحدیث محمد بن الحسن الطوسی مصنف تہذیب و استبصار (کتب حدیث شیعہ) متوفی ۴۶۰ھ کے ہم عصر تھے۔ جیسا کہ تنقیح المقال میں مامقانی نے لکھا ہے۔ ان تینوں میں سے صرف پہلے مفسر اور مؤرخ مشہور تھے اور سنی تھے۔ اور باقی دونوں خاص شیعہ امامیہ تھے۔ اور اہل سنت ائمہ رجال کے نزدیک تو دو ہی ابن جریر تھے۔ پہلے جو مفسر و مؤرخ تھے۔ وہ ہلکے پھلکے شیعے تھے۔ اور دوسرے جو ان کے بالکل ہم عصر تھے۔ وہ کٹر تھے۔ تیسرے

سے تو اہل سنت علماء غالباً آج سے پہلے واقف بھی نہ ہوں گے۔ بلکہ اگلے شیعے ائمہ رجال بھی تیسرے ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری سے واقف نہ تھے۔ اسی طرح شیخ طوسی و علامہ نجاشی و علامہ حلی و شیخ تفریسی بہاؤ الدین عاملی وغیرہم نے ان تیسرے ابن جریر الطبری کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ پہلے پہل ان سے دنیا کو روشناس کیا ہے

علامہ شیخ عبداللہ لمامقانی مدظلہ صاحب تنقیح المقال نے جو ۱۳۵۰ھ تک تو زندہ تھے۔ بعد کا حال معلوم نہیں، اسی لئے وہ خود ان تیسرے ابن جریر کے ترجمے میں لکھتے ہیں۔ لیس له ذکر فی کتب اصحابنا الرجالین یعنے: ہمارے ماہرین علم رجال کی کتابو میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر چونکہ ان کو ابوعبداللہ حسین بن حسن الغضائری متوفی ۴۱۱ھ (وبقول انساب السمعانی ۴۱۲ھ) کا شاگرد سید ہاشم البحرانی نے اپنی کتاب مدینۃ المعاجز میں لکھ دیا ہے۔ اب اس کو نباہنا ضروری ہے (ورنہ اماموں کے معجزے جو گھڑ گھڑ کر سلسلۂ اسناد روایت جوڑ جوڑ کر غریب سید ہاشم البحرانی اپنے عالم بحران میں بمشکل اکٹھا لئے ہیں اور ان کے ذریعے امامت کی کھوکھلی دیوار پر پشتہ لگایا ہے۔ وہ سب کے سب رائیگاں چلے جائیں گے۔ بحرانی مذکور نے اس کتاب میں اماموں کے معجزے روایتوں کے ذریعہ بیان کئے ہیں۔ جو سب عجیب و غریب ہیں۔ یہاں ساتویں معجزے کی تفصیل تو مذکور نہیں۔ صرف پتھر سے شہد نکال لینے کا ذکر کیا ہے اور بتیسواں معجزہ حضرت حسن بن علی کا بیان کیا ہے کہ وہ بھیڑیئے سے کچھ بولے تو بھیڑیئے نے ان سے باتیں کیں) اس کتاب میں بہت سی روایتیں ابن جریر الطبری کی کتاب المسترشد فی الامامۃ سے بھی منقول ہے ایک جگہ کتاب المسترشد ہی سے یوں نقل کیا ہے۔ قال ابوجعفر بن جریر الطبری اس کتاب المسترشد کے مصنف تو خود ابوجعفر بن جریر الطبری ہی ہیں وہ کیوں لکھنے لگے کہ "ابوجعفر بن جریر الطبری نے کہا۔ بس اسی سے معلوم ہو گیا۔ کہ وہ ابن جریر بن رستم الطبری ہیں۔ وہ ابن جریر بن یزید تو عامی تھے۔ کوئی خاصی یعنے شیعہ ان سے کیوں روایت کرنے لگا۔ اس لئے یہ تو لکھ نہیں سکتے۔ تھے کہ ابن رستم نے ابن یزید سے روایت کی ہے۔ حالانکہ اگر واقعی کوئی ابن جریر بن رستم بھی تھے، تو وہ ابن جریر بن یزید کے ہمعصر تھے۔ اس لئے ایک، دوسرے

سے روایت کر سکتے تھے۔ مگر جب غضائری صاحب ان دونوں ہمعصروں کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے تو غضائری کے شاگرد تیسرے ابن جریر الطبری جو یقیناً پانچویں صدی کے آدمی ہوں گے یا چوتھی صدی کے آواخر کے وہ کس طرح سو سوا سو برس قبل کے آدمی سے روایت کر سکتے ہیں۔ بالفرض ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری الاملی دو تھے مگر جب دونوں کے درمیان سوا سو برس ڈیڑھ سو برس کا فاصلہ ہو تو پھر دونوں کے درمیان سلسلۂ روایت بلا واسطہ کیونکر صحیح مانا جا سکتا ہے۔

غضائری سے ابو جعفر بن جریر الطبری کی جو روایت بنائی گئی تھی۔ صرف اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دو ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری بنائے گئے تھے: تاکہ جس کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۲ھ میں ہو، اس سے اس ابو جعفر بن جریر الطبری کی روایت صحیح ہو سکے۔ مگر پھر جو ان دونوں ابن جریروں کے درمیان سلسلۂ روایت بیان کر دیا گیا، تو وہی دشواری بلکہ اس سے بھی سخت دشواری باقی رہ گئی۔ وہ اس طرح کہ سابق ابن جریر بن رستم ہمعصر ہیں۔ ابن جریر بن یزید متوفی ۳۱۰ھ کے اور ہم عصری بظاہر متقضی ہے۔ ہم سنی کے، امید یہی کی جاتی ہے کہ دوسرے ہم عصر کی بھی وفات دو چار برس پہلے یا بعد کو ہوئی ہوگی۔

اور غضائری کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۲ھ میں ہے تو ان کے شاگرد کو بظاہر قیاس ان سے چھوٹا ہی ہونا چاہیئے۔ اس لئے تیسرے ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری جو غضائری کے شاگرد تھے۔ بظاہر قیاس غضائری کے دس پانچ برس بعد ہی مرے ہوں گے تو پھر جب غضائری کی روایت سابق ابن جریر سے مستبعد ہے تو غضائری کے ایک شاگرد کی روایت سابق ابن جریر سے کس طرح ممکن ہوگی۔ فَرَّ مِنَ المطرِ وقرَّ فی المیزاب جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو اور اُن کو صحیح ثابت کرنے والوں کو اس قسم کی دشواریوں کا سامنا اکثر کرنا پڑتا ہے، غرض دونوں ابن جریر ابن رستم بتقاضاءِ مصلحت تصنیف کر لئے گئے تھے۔ ایک کو اگلوں نے تصنیف کیا تھا۔ اور دوسرے کو صاحب تنقیح المقال علامہ شیخ عبداللہ المامقانی نے جو ۱۳۵۰ھ تک یعنی آج سے چوبیس سال

قبل تک تو ضرور زندہ تھے۔ اس لئے میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ اس وقت بھی زندہ ہوں گے۔ خدا کرے کہ زندہ ہوں اور میری یہ تنقید ان کی نظر سے گذر جائے۔

(۳)

ابن جریر کے پر دادا

ایک ترکیب دو ابن جریر بنانے کی اَور بھی سوچی گئی تھی۔ وہ یہ کہ ابن جریر کے دادا جن کا نام رُستم تھا۔ اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا اسلامی نام یزید رکھا گیا۔ تو فقط رستم اور یزید کا فرق دکھا کر دو ابن جریر پیدا کرنے سے ایک کے ڈبل ہونے کا یقین دوسروں کو نہیں پیدا کرایا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ لوگ حقیقت حال سمجھ جاتے کہ رستم ہی کا اسلامی نام یزید تھا رستم و یزید دو شخص نہ تھے بلکہ ایک ہی تھے۔ اور یہی اصل واقعہ بھی ہے۔ اس لئے یزید کے بعد بھی دو ایک اسلامی نام تصنیف کر دیئے جائیں تاکہ یہ سمجھا جائے کہ یزید کوئی نو مسلم نہ تھا۔ بلکہ اس کے اُوپر کے لوگ بھی مسلمان تھے۔ اس پہلو پر محمد بن اسحٰق بن الندیم نے بھی غور کیا۔ اور دوسروں نے بھی غور کیا۔ مگر باہمی مشوروں سے ان پر غور نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے غور کرنے والوں کے نتیجہ غور میں اختلاف ہو کر رہا۔

ابن اسحٰق ندیم نے یزید کے باپ کا نام خالد تجویز کر کے اپنی کتاب الفہرست میں ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد البصری لکھا۔ مگر ان کو اس کی خبر نہ تھی کہ نجاشی وغیرہ نے بھی اس پہلو پر غور کیا تھا۔ اور ابن جریر کے پر دادا ہی نہیں سر دادا کا نام بھی تصنیف کر رکھا ہے۔ اور انہوں نے ابوجعفر محمد بن جریر ابن یزید بن کثیر بن غالب لکھا ہے۔ جیسا کہ شیخ عبداللہ المامقانی نے تنقیح المقال میں اس کو نقل کیا ہے۔ اور پھر ندیم نے جو اپنی فہرست میں یزید بن خالد لکھا ہے۔ اس کو بھی نقل کر دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ابن اسحٰق ندیم نے ابن جریر بن یزید بن خالد جو لکھا ہے۔ وہ ابن جریر بن یزید کے خلیفہ راشد ابوالفرج المعافا بن زکریا والنہروانی کی روایت سے لکھا ہے۔ محمد بن اسحٰق الندیم کا سالِ ولادت تو معلوم نہ ہو سکا۔ مگر انہوں نے اپنی کتاب الفہرست

میں ایک جگہ ۴۱۲ھ میں لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان جلد ۵ صہ ۲۷ میں لکھا ہے اور معافا بن زکریا النہروانی ابن جریر مفسر متوفی ۳۱۰ھ کے پیرؤوں میں تو ضرور تھے۔ مگر ان کی وفات ۳۹۰ھ میں ہوئی۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صہ ۲۰۴)

یعنی ابن جریر کی وفات کے پورے اسّی برس کے بعد۔ یقین ہے کہ انہوں نے ابن جریر کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ اور یہ خود بھی متشیّع ہی تھے۔ اسی لئے انہوں نے خود بھی وضوء میں مسح رجلین کی فرضیت پر ایک کتاب لکھی تھی (جس کی بنیاد صرف کوفی شیعوں کی من گھڑت روایتوں ہی پر تھی) اس لئے یوں بھی ان کی روایت مشتبہ ہے۔ پھر جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ معافا کو یہ کس سے معلوم ہوا کہ ابن جریر کے پردادا کا نام خالد تھا۔ اس وقت تک صرف ابنِ ندیم کا لکھ دینا ہرگز قابل وثوق نہیں۔ ابن ندیم کا سال ولادت و وفات معلوم نہیں۔ مگر ابن حجر لسان المیزان میں ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب "الفہرست" میں ایک جگہ ۴۱۲ھ کا ذکر کیا ہے۔ یعنی اس طرح جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت الفہرست لکھ رہے تھے۔ مگر بقول ذہبی یہ ۳۷۷ھ سے فہرست لکھ رہے تھے۔ معافا بن ذکریا سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں نے باہمی مشورے سے ابن جریر کے پردادا کا نام خالد تصنیف کیا ہو۔ اور ابن یزید بن کثیر بن غالب تو اس کے مَن گھڑت ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کی کوئی سند ہی اس کے لکھنے والوں میں سے کسی نے نہیں پیش کی ہے کہ یہ کس ذریعے سے معلوم ہوا۔ اور بالفرض ایسا ہو بھی تو ممکن ہے۔ رستم کمسن ہوں اور ان کے باپ جوان ہوں اور ان کے دادا بوڑھے ہوں۔ اور تینوں نے ساتھ ساتھ اسلام قبول کیا ہو۔ رستم کا نام یزید رکھا گیا۔ رستم کے باپ کا نام کثیر اور کثیر کے باپ کا نام غالب رکھا گیا ہو۔ اس لئے اس سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یزید ہی رستم نہ تھے۔ اگر یزید کے باپ کا نام کثیر اور دادا کا نام غالب تھا۔ جب بھی ہوسکتا ہے کہ یزید کا پہلا نام رستم ہی ہو اور اسلامی نام یزید رکھا گیا ہو اور کثیر و غالب کے نام بھی پہلے کچھ اور رہوں اور یہ اسلامی نام ہوں۔ شاید کثیر کا نام زال ہو اور غالب کا

کا جاہلی نام سام ہو، جبھی تو پوتے کا نام رستم تھا۔

ایک نیا شگوفہ

عبداللہ المامقانی نے ایک نئی بات سوچ کر یہ نکالی کہ ممکن ہے کہ ابن جریر مفسر کی ماں بنی جریہ سے ہوں۔

یعنے ابو جعفر جو ابن جریر کہے جاتے ہیں۔ وہ ننہالی تعلق کی وجہ سے ہو۔ جریہ کے یہ بیٹے نہ ہوں بلکہ نواسے ہوں۔ کیونکہ یہ آمل کے رہنے والے جب تھے تو آمل تو خاص شیعوں کا مرکز تھا۔ ان کو بھی شیعہ ہی ہونا چاہیئے تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ ان کا مولد آمل ہی میں ہے۔ یہ شیعہ نہیں ہیں۔ کیونکہ نجاشی، طوسی، بہاؤ الدین عاملی وغیرہم اکابر محدثین شیعہ ان کو سنی ہی کہتے آئے ہیں۔ اور سنی علماء رجال بھی سنی ہی کہتے ہیں۔ صرف ہلکا پھلکا شیعہ لکھتے ہیں۔ اور آمل کا رہنے والا ہلکا پھلکا شیعہ کیوں ہونے لگا۔ اس کو تو بھاری بھر کم شیعہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آمل میں ابن جریر بن یزید کی صرف ننہال تھی۔ مگر یہ دادھیال کے اثر سے سُنّی بنے رہے۔ جب یہاں تک بات بنا سکتے تھے تو علامہ مامقانی کو لازم تھا کہ ان کی ایک دادھیال بھی تصنیف فرما دیتے اور پھر باپ کا نام بھی کوئی گھڑ دیتے۔ کیونکہ اب تو وہ یزید وکثیر وغالب سب کے سب اجداد فاسدہ ہی میں داخل ہو گئے۔ یہ پہلی مثال مامقانی صاحب نے پیدا کی ہے کہ ایک اتنا بڑا مشہور ومعروف امام تفسیر وتاریخ صرف اپنے ننہالی ہی اجداد فاسدہ کیطرف منسوب ہو کر کئی پشت تک متعارف ہو۔ اور اسکے باپ دادا، پردادا کا کوئی ذکر اسکے نام کے ساتھ نہ کیا جائے۔ اور نہ کسی کو اسکے باپ دادا، پردادا کا نام معلوم ہو۔

ایک زبردست شہادت

معجم البلدان جلد اول ۶۳ میں شہر آمل کا ذکر کرتے ہوئے یاقوت حموی صاحب معجم نے ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا مولد آمل ہی میں تھا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اسی لئے ابوبکر محمد بن العباس الخوارزمی نے کہا ہے۔ جو املی الاصل تھے (جن کی وفات کتاب مرأۃ الجنان جلد ۲ ص ۴۱۶ میں ۳۸۳ھ میں لکھی ہے اور ۷۶ برس کی عمر پائی تھی۔ یہ ابن جریر کے شاگرد بھی تھے۔

بِآمُلَ مَولِدِیْ وبنُو جَرِیرٍ — فاخوالی ویحکی المرءُ خالہٗ
فہا انا رافضیٌّ عَن تُراثٍ — وغیری رافضی عن کلالہ

یعنے "آمُل میرا مَولد ہے اور جریر کے بیٹے میرے ماموں ہیں اور ہر شخص ماموں کے مشابہ ہوتا ہے۔ تو سُن رکھو کہ میں وراثتاً رافضی ہوں۔ اور میرے سوا جو رافضی ہے کلالتًا یعنے دُور کے لگاؤ سے رافضی ہے"

اس کے بعد یاقوت حموی صاحب معجم البُلدان نے فرمایا کہ وہ جھوٹا تھا۔ ابن جریر ہرگز رافضی نہ تھے۔ اگرچہ حنبلیوں نے اُن کے ساتھ حسد کر کے ان کو رافضی مشہور کر دیا اس اتہام کو خوارزمی نے غنیمت سمجھا اور لگا اس پر فخر کرنے، حقیقت یہ ہے کہ وہ خود رافضی بدزبان و بدکلام تھا۔

یاقوت حموی صاحب کی پیدائش کا سال تو معلوم نہیں۔ مگر سال وفات ۶۲۶ھ ہے۔ ابن جریر کا وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ یعنے حموی کی وفات سے ۳۱۶ برس پہلے اور محمد بن العباس الخوارزمی، ابن جریر کا خود بھانجا ہے اور شاگرد بھی۔ وہ اپنے ماموں اور اُستاد کے عقیدہ و مذہب سے حموی سے زیادہ واقف ہو سکتا ہے۔ یاقوت حموی جو ۳۱۶ برس کا فاصلہ ابن جریر سے رکھتے تھے۔ جن کو ابنِ جریر سے دور کا بھی کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ کیا حق رکھتے ہیں کہ ابن جریر کے بھانجے کو ابن جریر کے حالات بیان کرنے میں جھوٹا کہیں خصوصًا جب وہ بھانجا بھی ہوا ور شاگرد بھی ہو۔

اسی طرح علامہ حافظ ابوحیان محمد بن یوسف کی ولادت ۶۵۴ھ اور وفات ۷۴۵ھ میں ہے۔ یہ ابن حجر کے شیخ الشیوخ تھے اور ابن حجر کی ولادت ۷۷۳ھ میں اور وفات ۸۵۲ھ میں تھی۔ اسلئے ابن حجر رح کے شیخ الشیوخ نے جو ابن جریر کے متعلق اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ امام من ائمۃ الإمامیۃ یعنے یہ مذہب امامیہ کے اماموں میں سے ایک امام تھے تو بلا وجہ محض حنبلیوں کے پروپگنڈے سے متاثر ہو کر یا علامہ سلیمانی کے مغالطے میں آکر نہیں لکھ گئے تھے۔ بلکہ علیٰ وجہ البصیرت اُنہوں نے لکھا تھا۔ ابن حجر رح کو کوئی حق نہ تھا کہ اپنے شیخ الشیوخ پر غلط فہمی وغیرہ کا الزام دیں۔

اور اسی طرح علامہ سلیمانی حافظ احمد بن علی کی ولادت ۳۲۱ھ میں اور وفات ۴۱۲ھ میں ہوئی تھی۔ یعنے ابن جریر کی وفات کے صرف گیارہ برس کے بعد یہ پیدا ہوئے تھے سلیمانی کے والد نے تو یقیناً ابن جریر کا کافی زمانہ پایا ہوگا۔ ابن جریر کے کتنے تلامذہ کو علامہ سلیمانی نے دیکھا ہوگا۔ بلکہ ان سے ملے ہوں گے اور ابن جریر کے حالات سنے ہونگے علامہ سلیمانی میں ابن جریر سے معاصرت بھی نہ تھی۔ کہ معاصرانہ چشمک ان کے ساتھ رکھتے ہوں۔ اسلئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ علامہ سلیمانی کی محققانہ رائے کو کسی غلط فہمی کا نتیجہ کہا جائے۔ خصوصاً جب اُن کی رائے کی تصدیق خود ابن جریر کا بھانجا کر رہا ہو اور پھر ابن جریر کی تصنیفات سے بھی ہو رہی ہو۔

مگر ذہبی جن کی ولادت ۶۷۳ھ میں اور وفات ۷۴۸ھ میں ہوئی۔ یعنے ابن جریر کی وفات کے تین سو تریسٹھ برس کے بعد جو پیدا ہوئے تھے اور ابن حجر رح جن کی ولادت ۷۷۳ھ اور وفات ۸۵۲ھ میں ہوئی۔ یعنے جو ابن جریر کے وفات کے چار سو تریسٹھ برس کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ علامہ سلیمانی کی شہادت صادقہ اپنے شیخ الشیوخ حافظ ابن حبان کی شہادت واضحہ اور پھر خود ابن جریر کے بھانجے کی زبردست گواہی سب کو بلا دلیل ٹھکرا دیتے ہیں اور اپنی روایت پرستی کی کھوکھلی دیوار پر غلط حسن ظن کا پشتہ لگائے جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ خود ابن جریر کے ذاتی حالات جن کا ذکر یہ لوگ خود کرتے ہیں۔ ان کے حسن ظن کے پشتے پر کلہاڑیاں چلائے جا رہے ہیں۔ یعنی ابن جریر کے حمایت کرنے والے ائمہ رجال خود ان باتوں کا اعتراف کر رہے ہیں کہ :۔

۱۔ وضو میں پاؤں پر مسح کرنے کے ابن جریر قائل تھے۔ اس موضوع پر انہوں نے ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔

۲۔ طلاق کا فتویٰ شیعہ مذہب کے مطابق انہوں نے دیا تھا۔

۳۔ خم غدیر والی حدیث (جو شیعوں کی من گھڑت ہے۔ اس) کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔

۴۔ امامت کے منصوص من اللہ ہونے کا عقیدہ خاص شیعوں کا ہے۔ اسی عقیدہ

پر مذہب امامیہ کی بنیاد ہے۔

ابن جریر نے اس (خلافِ قرآن) عقیدہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مسترشد نام کی ایک کتاب لکھی تھی۔

یہ چاروں باتیں ایسی ہیں جن کا اعتراف فریقین کے متعدد ائمہ رجال کو ہے اور ان میں سے ہر بات ایسی ہے جو ان تین شہادتوں کے ساتھ جو علامہ سلیمانی، شیخ الشیوخ حافظ ابن حبان اور ابن جریر کے بھانجے محمد بن العباس الخوارزمی نے دیں۔ ابن جریر کو شیعہ امامیہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ چہ جائیکہ ان تین شہادتوں کے ساتھ ساتھ وہ چاروں باتیں جب پائی جا رہی ہوں تو پھر ابن جریر کے شیعہ امامیہ ہونے میں کون سی کسر باقی رہ جاتی ہے۔

چونکہ اس وقت ابن جریر پر کوئی مستقل مضمون نہیں لکھ رہا ہوں اور جتنا لکھ گیا ہوں۔ وہی بہت طول ہو گیا۔ اور اہل انصاف کے لئے اتنی تفصیل ابن جریر کے شیعہ تسلیم کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ اب اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگرچہ میرے پاس ابھی ابن جریر کے متعلق اور بھی کچھ باتیں ہیں جنھیں میں پیش کر سکتا ہوں۔

ایک شبہے کا ازالہ

البتہ ایک دوست نے مدت ہوئی۔ یہ لکھا تھا کہ ابن جریر کی توثیق سلف سے خلف تک تمام اکابر اہل سنت کرتے رہے ہیں۔ صرف علامہ سلیمانی اور شیخ الشیوخ حافظ ابن حبان کی جرح تمام اکابر اہل سنت کے مقابلہ میں قابل تسلیم نہیں۔ اس کے متعلق میں نے اسی وقت لکھا تھا۔ جس کو یہاں بھی نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں مگر اختصاراً۔

ابن جریر کی توثیق ان کے ہمعصر ائمہ حدیث میں سے یا ان کے کچھ بعد والے اکابر محدثین میں سے کسی نے بھی نہیں کی۔ صحاح ستہ کے جامعین سب کے سب ان کے معاصر تھے۔ امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ کی وفات کے وقت ابنِ جریر ۳۲ برس کے تھے امام مسلم رحمۃ متوفی ۲۶۱ھ کے وفات کے وقت ابن جریر ۳۷ برس کے تھے۔ ابو عبداللہ

بن ماجہ القزوینی رح متوفی ۲۷۳ھ کی وفات کے وقت ۶۴ برس کے تھے۔ ابوداؤد سلیمان بن الاشعث رح متوفی ۲۷۵ھ کی وفات کے وقت ۷۱ برس کے تھے! اور محمد بن عیسٰی ابوعیسٰی الترمذی متوفی ۲۷۹ھ کی وفات کے وقت ۵۵ برس کے تھے۔ اور عبدالرحمٰن بن اشعث النسائی متوفی ۳۰۳ھ کی وفات کے وقت ۷۹ برس کے تھے۔ کیا ان اکابر محدثین میں سے کسی نے ان کو صرف "ثقہ" بھی لکھا۔ یکتب حدیثہ بھی کسی نے لکھا

اب یہ ہے خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ مولدہ ۳۹۲ھ سو انہوں نے نہ ابن جریر کو دیکھا۔ نہ ابن جریر کے شاگردوں کو دیکھا۔ صرف ابن جریر کی تصنیفات کو دیکھ کر اگر ابن جریر کو بہت بڑا عالم، ماہر اختلافات، قراءت، واقف ناسخ ومنسوخ اور حافظ احادیث وغیرہ لکھا۔ تو صحیح لکھا ان باتوں سے تو کسی کو بھی انکار نہیں مگر ان کے بہت بڑے عالم بہت بڑے ادیب اور بہت بڑے مؤرخ وحافظ احادیث وغیرہ ہونے سے ان کی وثاقت کہاں سے ثابت ہوگئی۔ خطیب نے ان کو حجت اور سند اور ثقہ ثبت وغیرہ تو لکھا نہیں۔ اسلئے خطیب بغدادی کی تحریر سے ابن جریر سند وحجت اور ثقہ وثبت نہیں ثابت ہوسکتے۔

باقی رہا ابن خالویہ حسین بن احمد کا یہ کہنا کہ مجھ سے ابن خزیمہ[۱] نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے تفسیر ابن جریر لکھی ہے؟ تو میں نے کہا کہ میں نے ابن جریر سے املاءً لکھی ہے۔ یعنی وہ بتاتے گئے اور میں لکھتا گیا۔ سات برس میں اس کی تکمیل کی تو مجھ سے ابن خزیمہ نے وہ تفسیر مستعار لی اور کئی سال بعد واپس کی اور کہا میں نے اول سے آخر تک دیکھی۔ روئے زمین پر ابن جریر سے بڑا عالم میں کسی کو نہیں سمجھتا۔

---

[۱] ابوبکر محمد اسحٰق بن خزیمہ کی ولادت ۲۲۳ھ میں ہوئی تھی۔ یعنے ابن خزیمہ ابن جریر سے ایک برس بڑے تھے اور ابن خزیمہ کی وفات ۳۱۱ھ میں یعنے ابن جریر کی وفات کے ایک برس بعد ہوئی اور ابن خالویہ کی وفات ۳۷۰ھ میں ہوئی۔ ولادت کا سال اور عمر معلوم نہیں۔ ابن خزیمہ نیشاپوری تھے۔ اس لئے یہ بھی عجمی ہی تھے۔ اگر یہ ابن جریر کو ثقہ وحجت سمجھتے تو ضرور ابن جریر سے حدیثیں سنتے۔ دونوں ہمسن ہی تھے اور ابن خالویہ ہمدانی وحلبی سے زیادہ ابن خزیمہ کو ابن جریر سے ملنے ملانے کے مواقع حاصل تھے۔

اور حنابلہ نے بے شک ان پر ظلم کیا۔ (یہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ حنبلیوں نے ابن جریر کو شیعہ اور گمراہ اور کذاب مشہور کر رکھا تھا اور دوسروں کو ابن جریر سے ملنے سے منع کرتے تھے۔ واللہ اعلم

تو یہ روایت ابن خالویہ حسین بن احمد سے ہے اور ابن خالویہ کے متعلق خود ابن حجرؒ لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۲۶۷ میں لکھتے ہیں۔ کان اماميًا عالمًا بالمذهب ... وقد قرء ابوالحسين النصيبي وهو من الامامية عليه كتابة في الامامة يعني ابن خالويہ شیعہ امامیہ تھے۔ اس مذہب کے عالم تھے۔ اور ابوالحسین النصیبی نے جو شیعہ امامیہ تھے ان سے ان کی وہ کتاب پڑھی تھی جس کو انہوں نے مسئلہ امامت پر لکھا تھا۔ ۳۷۱ھ یا ۳۷۰ھ میں وفات پائی۔ اس لئے اگر ابن خالویہ شیعہ نے ابن جریر شیعہ کی حمایت میں ایک روایت ابن خزیمہ کیطرف جھوٹی منسوب کر دی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ شیعہ راویوں کا تو یہ ہمیشہ معمول رہا ہے۔

ابن خالویہ شیعہ کے ایک اُستاد ابوبکر بن مجاہد جو ایک مشہور قاری تھے۔ ان کے متعلق جو ابو علی الطوماری سے ایک روایت ابن حجر نے لکھی ہے کہ ابوبکر بن مجاہد نے کہا کہ "میرا ایمان ہے کہ اس قرأت سے قرآن پڑھنے والا اللہ نے ابن جریر سے اچھا نہیں پیدا کیا۔ تو یہ بھی ابن جریر کی توثیق نہیں ہوئی۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ ابن جریر کی خود ساختہ من گھڑت جو خاص قرأت تھی۔ اس کے مطابق کوئی دوسرا قرآن کا پڑھنے والا ان سے اچھا نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہی تو اپنی خاص قرأت کے مصنف تھے۔ اور

؎ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

جو قرأت خاص ابن جریر کی تصنیف تھی۔ اس کو بیشک ابن جریر دوسروں سے بہتر ہی ادا کرتے ہوں گے۔

مگر اس روایت کے راوی ابو علی الطوماری ہیں۔ جن کے متعلق کسی نے یہ تو نہیں لکھا ہے کہ شیعہ تھے۔ مگر انداز ان کے شیعہ راویوں کی طرح ضرور تھے۔ خود ابن حجر لسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۴ میں ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ائمہ رجال .... نے ان کے متعلق کلام کیا ہے۔ چونکہ یہ بغیر کسی اصل کے روایت کیا کرتے تھے۔ مگر ابن حجر نے اُن

کی بے اصل روایتوں کی کوئی مثال نہیں پیش کی۔ میں نے اس کی ایک مثال پیش کر کے ابن حجر کی تصدیق کیئے دیتا ہوں کہ یہ طوماری بشر بن موسیٰ سے روایت کرتے ہیں مگر دنیاءِ رجال میں بشر بن موسیٰ کوئی بھی نہیں ہے۔ البتہ بشار بن موسیٰ ضرور تھے مگر وہ نہایت مجروح تھے۔ اس لیئے ان سے روایت کرنے والے ہمیشہ ان کا نام چھپانے کے لیئے ان کو بشر بن موسیٰ ہی کہتے ہیں اور لکھتے رہے ہے۔ تو اگر یہ دیکھ کر کہ امام احمد بن حنبل رح اور ابو حاتم الرازی و ابوالقاسم البغوی جیسے اکابر محدثین ان سے روایت کرتے ہیں اور سب ان کو بشر بن موسیٰ ہی کہتے ہیں۔ غریب طوماری نے بھی ان سے روایت کرنی شروع کر دی۔ بشر بن موسیٰ ہی کہہ کر تو ابو علی طوماری پر کوئی الزام نہیں یہ وہ حمّام ہے جس میں سب ننگے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بشار بن موسیٰ جن کو بشر بن موسیٰ کہتے ہیں۔ ان کی وفات ۲۲۸ھ میں ہے اور ابو علی طوماری کی ولادت بقول ابن حجر ۲۶۰ھ میں ہوئی تھی۔ یعنے بشر بن موسیٰ کی وفات کے ۳۲ برس کے بعد یہ مشکل کسی طرح آسان ہوتی نظر نہیں آتی۔ بیچارے طوماری کو معلوم نہ تھا کہ بشر بن موسیٰ ان کی ولادت سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔ دیکھا کہ میرے بعض اہم عصر ان سے روایت کر رہے ہیں تو انہوں نے بھی کچھ حدیثیں ان کیطرف منسوب کرکے روایت کر دیں۔ بس انہیں طوماری صاحب سے ابوبکر بن مجاہد کا وہ قول مروی ہے۔ اگر صحیح مانئے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ابن مجاہدؒ نے طنز یہ انداز میں کہہ دیا ہوگا۔ ابن جریر کی مخصوص قرات کی طرف اشارہ کر کے کہ اُس قرادت سے تو قرآن کا پڑھنے والا ابن جریر سے اچھا اللہ تعالےٰ نے پیدا ہی نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ بخوبی ممکن ہے کہ یہ بھی طوماری کے طومار کذب و افتراء میں سے ایک ہو۔ مگر اس سے بھی تو ابن جریر ثقہ و ثبت اور سند و حجّت نہیں ثابت ہوتے۔

غرض شیعہ حضرات نے یا بعض مجروح و مُشتبہ اشخاص نے ابن جریر کی کچھ محض معمولی سی تعریف کر دی تو اس سے وہ ثقہ و حجّت و سند نہیں ثابت ہو سکتے۔

اور نہ علم و فضل و وسعت علم و مہارت ادب و تاریخ سے وہ حجّت و سند ثابت

ہو سکتے ہیں۔

یہاں بحث ابن جریر کے علم و فضل و مہارت ادب و تاریخ سے نہیں ہے بلکہ ان کی دیانت و امانت اور ان کی صداقت و وثاقت یہاں زیر بحث ہے اور اس کے متعلق علامہ حافظ سلیمانی و شیخ الشیوخ ابن حبّان اور خود ابن جریر کے بھانجے اور شاگرد محمد بن العباس الخوارزمی کی شہادت کے مقابل ذہبی اور ابن حجر یا اُن کے جیسے متأخر محدّثین کے بلا دلیل غلو لغیر الحق کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی جا سکتی۔

اور حافظ ابن حجر رح کا یہ لکھنا کہ ان کا ترجمہ ان کے ہمعصر اور بعد والے ائمہ نقل نے لکھا ہے کسی نے بھی ان کو رفض سے متصف نہیں کیا۔ بالکل خلاف واقعہ ہے ابن جریر رح نے ان کے کسی ہمعصر کی تحریر نہیں پیش کی۔ ائمہ صحاح ستہ میں سے کسی کا قول نہیں لکھا۔ لے دے کے ابن خزیمہ کا قول پیش کیا۔ تو ایک شیعہ ہی کی روایت سے۔ ابن عساکر ہرگز ان کے ہمعصر نہ تھے۔ ان کا بھانجا ضرور ہمعصر تھا۔ وَاَھلُ البَیتِ ادرٰی بما فیہ

اور سب سے زیادہ مکمل تصدیق حافظ سلیمانی و شیخ ابن حبان کی ابن جریر کی تفسیر اور تاریخ ہی سے مل سکتی ہے۔ کیونکہ مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطّار بگوید۔ بشرطیکہ غلو اور تعصب کی عینک اُتار کر ان کتابوں کو دیکھا جائے اور خلفاءِ راشدین کی تعریف اور ان کے فضائل کی حدیثیں جو ان میں کچھ مروی ہیں۔ ان سے دھوکہ نہ کھایا جائے کہ یہ کتاب زمانہ اجمال کی تصنیفیں ہیں جب کہ شیعوں نے اپنے فرقہ کو اہل سنّت سے علانیہ طور پر بالکل الگ نہیں کر لیا تھا۔ اس وقت شیعی تقیّہ و کتمان کا برقعہ اوڑھے رہتے تھے۔ اور اپنے تشیّع کو چھپانے کے لئے حضرت صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض ہی نہیں بلکہ حضرت عثمان رض کے بھی فضائل و مناقب اہل سنت کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اس لئے اہل سنّت محدّثین ان کو بے تعصب اور سچا سمجھ کر ان کی وہ من گھڑت حدیثیں بھی قبول کر لیتے تھے۔ جن کے شہد میں زہر ملا ہوا ہوتا تھا اور حسنِ ظن کی وجہ سے اس شہد کی اہمیّت محسوس نہیں کرتے تھے۔

غرض یہی ابن جریر طبری ہیں جن کی تفسیر ہمارے تمام مفسّرین کا ماخذ ہے اس لئے ہماری تفسیروں میں اگر قرآنی آیات کے سیاق و سباق کے خلاف بھی بعض باتیں نظر آئیں۔ تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً جب تفسیری حدیثوں کے راوی زیادہ تر ایسے ہی اشخاص ہیں۔ جن کے کذب و افتراء کا اعتراف خود محدّثین کر رہے ہیں۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی رح تہذیب التہذیب جلد ۲ ص۱۲۴ ترجمہ جویبر بن سعید البلخی الکوفی میں لکھتے ہیں۔ قال ابو قدامۃ السرخسی قال یحیی القطان تساھلوا فی اخذ التفسیر عن قوم لا یوثقونھم فی الحدیث ثمّ ذکر الضّحاک وجویبرًا ومحمد بن السائب وقال ھٰؤلاءِ لا یحمل حدیثھم ویکتب التفسیر عنھم۔ یعنے ابو قدامہ سرخسی رح نے کہا کہ یحیٰی بن سعید القطان (امام فن رجال و حدیث) نے کہا کہ لوگوں نے تفسیری روایتیں قبول کرنے میں تساہل سے کام لیا کہ ایسی جماعت سے (تفسیری روایتیں) لیتے رہے۔ جن کو حدیثوں کے قبول کرنے کے وقت قابلِ وثوق نہیں سمجھتے تھے۔ پھر انہوں نے ذکر کیا کہ ضحاک بن مزاحم، جویبر بن سعید، اور محمد بن السّائب الکلبی کا۔ اور کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کی حدیثیں برداشت نہیں کی جاتیں۔ مگر ان کی تفسیری روایتیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ جویبر بن سعید الکوفی وہ ہیں جن کے متعلق ابن حجر رح ائمۂ فن رجال و حدیث کے اقوال نقل کرتے ہیں کہ گئی گذری حدیثوں والے تھے۔ غیر ثقہ تھے۔ الٹی پلٹی حدیثیں روایت کرتے تھے۔ متروک الحدیث تھے وغیر ذالک سنہ ۱۴۰ھ اور سنہ ۱۵۰ھ کے درمیان دنیا سے سدھارے۔

ضحاک بن مزاحم الخراسانی الکوفی۔ یہ کوفیوں کے سوا اور کسی سے کچھ روایت نہیں کرتے تھے۔ الا ما شاءاللہ۔ البتہ متعدد صحابہ کرام رض سے بلا واسطہ روایت کرتے تھے حالانکہ کسی صحابی کو کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رض سے تفسیری حدیثیں بہت روایت کرتے تھے۔ کوئی واقف کار پوچھتا تھا کہ تم نے یہ حدیثیں ابن عباس رض سے خود سنی ہیں؟ تو کہتے تھے نہیں۔ بلکہ ہم نے فلاں فلاں سے سنیں۔ مگر اپنے کوئی تلامذہ ابو جناب الکلبی الکوفی جیسوں سے کہتے تھے کہ میں ابن عباس رض کے

ساٹھ سات برس تک رہا ہوں ۱۰۵ھ میں ان کی وفات ہے۔

محمد بن السائب الکلبی الکوفی: ان کے اوصاف جمیلہ کا کیا پوچھنا ہے۔ بہت مشہور و معروف بزرگ تھے۔ مختصر یہ کہ شیعہ تھے اور بالکل ہی متروک الحدیث تھے۔ مگر ان کی تفسیری روایتوں سے تفسیر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

یہی تین نہیں بلکہ ایک جماعت اسی طرح کی آپ کو ملے گی۔ تفسیری روایات کے راویوں کے حالات میں میری ایک مستقل کتاب ہے۔ جس کا نام ہے "اسفار المسوّرین فی تراجم المفسّرین" جس میں کم و بیش دو سو راویان روایت تفسیر کے حالات مذکور ہیں۔ ان میں سے تین کے حالات تو آپ کو معلوم ہو چکے تین چار کے حالات اور بھی سُن لیجئے۔

اسمٰعیل بن عبدُالرحمٰن بن ابی کریمۃ السدّی الکوفی۔ یہ قریشی خاندان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ تفسیری روایتیں ان سے بہت مروی ہیں۔ امام شعبیؒ کے سامنے کسی نے کہا کہ سُدّی کو علم قرآن کا ایک بڑا حصّہ ملا ہے تو شعبیؒ نے فرمایا کہ سدّی کو جہل از قرآن کا بہت بڑا حِصّہ ملا ہے۔ امام رجال و حدیث جوزجانی نے انکو کذاب اور اسلاف کو گالیاں دینے والا کہا ہے۔ لیث بن ابی سلیمؒ نے کہا ہے کہ کوفہ میں دو مشہور کذّاب ہیں جن میں سے ایک تو مر گیا اور ایک ابھی زندہ ہے اور کلبی و سدّی کا نام لیا۔ یہ حضرت صدّیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کی شان میں گستاخیاں کرتا تھا۔ امام احمد نے فرمایا کہ یہ جو تفسیریں بیان کرتا ہے۔ ان کے لئے سلسلۂ اسناد خود بنا لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اوّل درجے کا کذاب تھا۔ ۱۲۷ھ میں اسکی وفات ہوئی۔ مگر محدثین کے اس اعتراف کے باوجود آپ تفسیری روایتیں اسّی فیصدی ضحاک اور سُدّی یا کلبی ہی سے پائیں گے۔

بعض راویانِ تفسیر بذات خود ثقہ سمجھے گئے ہیں۔ مگر ان سے روایت کرنے والے مجروح ہیں مگر مفسّرین ان تفسیروں کو انہیں ثقہ لوگوں کے نام سے لکھتے ہیں اور جو مجروحین ان سے روایت کرتے ہیں۔ جن سے ان مفسّرین کو وہ تفسیر ملی

ان کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً محمد بن کعب القرظی [1] کہ اگرچہ یہ آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے باپ یہود بنی قریظہ میں سے تھے۔ جو قیدیوں میں آئے تھے۔ مگر ان کو محدثین نے ثقہ و حجت لکھا ہے اور ان پر کسی نے کوئی جرح نہیں کی ہے۔ ان سے بھی تفسیری روایتیں بہت ہیں۔ مگر اُن سے جو لوگ روایت کرتے ہیں۔ ان میں اکثریت مجروحین کی ہے۔ جیسے کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف ان کا مفصّل ترجمہ تہذیب التہذیب جلد ۸ صفحہ ۴۲۲ میں دیکھیئے۔ منکرُ الحدیث ضعیف الحدیث غیر ثقہ لیس بشیٍٔ احدَ الکذّابین احد ارکان الکذب۔ رجُلٌ بطّال۔ مَتروکُ الحدیث وغیرہ سب لکھا ہے محمد بن کعب القرظی سے یہ بہت زیادہ روایت کرتے تھے۔ بعض تفسیر میں گھڑتے تھے اور ان کی طرف منسوب کر کے روایت کیا کرتے تھے۔

موسیٰ بن عبیدہ بن نشیط الربذی [2] ان کا بھی مفصّل حال تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۳۵۶ سے صفحہ ۳۶۳ تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کو لوگ "مدنی" لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ "ربذہ" کے رہنے والے تھے اور وہیں مرے۔ وہیں مدفون ہوئے۔ بہت دنوں تک کوفے میں بھی آکر رہے تھے۔ "ربذہ" ایک بستی تھی۔ مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلے پر مکہ معظمہ کے راستے پر۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ ان سے کسی حدیث کا روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ تو کسی نے کہا کہ امام شعبی نے تو ان سے روایت کی ہے۔ تو امام احمد نے فرمایا کہ ان کی جو باتیں دوسروں پر ظاہر ہو گئی ہیں۔ اگر شعبہ پر بھی ظاہر ہو جاتیں۔ تو وہ کبھی ان سے روایت نہیں کرتے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا کہ چار شخصوں کی حدیثیں نہ لکھی جائیں۔ (۱) موسیٰ بن عبیدہ (۲) اسحاق بن ابی فروہ (۳) جویبر

---

[1] یہ ایک مسجد میں کچھ قصے بیان کر رہے تھے اور ایک جماعت سن رہی تھی کہ مسجد کی چھت بیٹھ گئی اور یہ اپنی جماعت کے ساتھ دب کر جان بحق تسلیم ہو گئے۔ یہ واقعہ بقول صحیح ۱۰۸ھ کا ہے۔ [2] "ربذہ" مدینہ طیبہ کے قریب مکہ معظمہ کے راستے پر ایک بستی تھی۔ وہیں کے رہنے والے تھے۔ اس لئے انہیں ربذی کہتے ہیں۔ ان کے بھائی عبد اللہ بن عبیدہ بھی انہی جیسے منکر الحدیث تھے۔ جن سے ان کے بھائی موسیٰ کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا تھا۔

بن سعید (۴) اور عبدالرحمٰن بن زیاد

امام بخاری رحہ نے موسیٰ بن عبیدہ کو منکر الحدیث لکھا ہے۔ اثرم نے کہا کہ ان کی حدیثیں جو عبداللہ بن دینار سے مَروی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی اور ہی عبداللہ بن دینار ہیں اور پھر کسی نے لیس بشئی ؕ اور کسی نے اضرب علیٰ حدیثہٖ کسی نے منکر الحدیث اور کسی نے لایحتج بحدیثہٖ کسی نے غیر ثقہ اور کسی نے لایحدث عنہ وغیرہ بہت کچھ کہا ہے۔ سنہ ۲۵۲ھ میں مَرے۔ یہ بھی محمد بن کعب القرضی سے روایت کرتے ہیں

ہشام بن زیاد بن ابی زید ابو المقدام: حضرت عثمان رضہ کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھے۔ لکھا یہی ہے۔ مگر غالباً آلِ عثمان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ بہرحال یہ محمد بن کعب القرضی سے تفسیری حدیثیں بہت روایت کرتے تھے۔ ائمہ رجال وحدیث میں سے ان کو کسی نے ضعیف کسی نے لایحتج بحدیثہٖ وغیرہ لکھا ہے۔ اور ابن حبان نے کھل کر لکھ دیا کہ یروی الموضوعات عن الثقات لایجوز الاحتجاج بہٖ یہ ثقہ لوگوں سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں۔ ان کو سند لینا جائز نہیں ہے۔ ان کا سال وفات وغیرہ مذکور نہیں۔

اسی طرح مجاہد بن جبر ہیں جو مشہور راوی تفسیر ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضہ سے تفسیر بہت روایت کیا کرتے ہیں۔ سنہ ۲۱ھ میں بزمانہ خلافت حضرت فاروق اعظم رضہ پیدا ہوئے تھے۔ اور سنہ ۱۰۲ھ میں وفات پائی۔ سلیمان بن مہران الاعمش جو کوفے میں مشہور شیعہ مُحدّث تھے۔ جن کے متعلق ائمۂ حدیث کا قول ہے کہ اہل کوفہ کی حدیثوں کو اعمش الکوفی اور ابو اسحٰق السبیعی الکوفی نے برباد کیا۔ اور یہ دونوں شیعہ تھے۔ مگر اہلِ سنّت نے بھی ان دونوں سے بہت حدیثیں لی ہیں۔ انہیں اعمش صاحب کا قول ہے کہ مجاہد بن جبر کہتے تھے کہ اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ کی قراءت کے مطابق ہم قرآن پڑھتے ہوتے۔ تو ہمیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ سے قرآن کی اکثر آیتوں کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ غالباً یہ قول اعمش کوفی کا بہتان ہے۔ مجاہد نے کبھی نہیں کہا ہوگا۔ ورنہ بقول اہلِ کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ

نے تو اپنے مصحف کو محفوظ رکھا تھا۔ اور جب حضرت عثمان رضؓ نے بقول محدثین و مؤرخین قرآن کریم کا ایک نسخہ کوفہ بھیج کر اہل کوفہ کو حکم دیا کہ ہر شخص اپنے مصحف کے مطابق صحیح کرلے اور جو مصحف اس نسخہ سے اختلاف رکھتا ہو، اس کو ضائع کر دے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ نے انکار کر دیا اور اہل کوفہ سے کہا کہ تم لوگ اپنے مصاحف کو ضائع نہ کرو اپنی حالت پر رہنے دو۔ چنانچہ اہل کوفہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کے پاس انہیں کی قراءت کے مطابق مصاحف رہ گئے تھے اور ہر جگہ مصحف عثمانی کا رواج ہو گیا تھا۔ اگر مجاہد بن جبیر کو مصحف ابن مسعود رضؓ کی تلاش تھی۔ تو وہ کوفہ چلے آتے اور ابن مسعود رضؓ کے کسی شاگرد سے لے لیتے۔ اس میں دشواری کیا تھی اور پھر اعمش تو کوفی ہی تھے۔ ان کے پاس تو ضرور ہی مصحف ہو گا۔ جو حضرت ابن مسعود کی قراءت کے مطابق ہو گا۔ اور یہ مجاہد ہی کے شاگرد تھے جس وقت اُستاد سے یہ بات سنی تھی۔ اپنے پاس سے نکال کر حضرت ابن مسعُود رضؓ کا قرآن مجاہد کے سامنے پیش کر دیتے کہ لیجیے حاضر ہے۔ اب تو دا دبلا نہ مچائیے۔

مجاہد بن جبیرہ سائب بن ابی السائب کے غلام تھے۔ مگر سائب بن ابی سائب کو کوئی تو صحابی لکھتا ہے۔ اور کوئی تو لکھتا ہے کہ کافر تھے۔ جنگِ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ممکن ہے کہ مجاہد عبداللہ بن السائب بن ابی السائب کے غلام آزاد کردہ ہوں۔ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں ابتداء میں رہے۔ مگر بعد کو کوفے میں بہت دنوں تک رہے اور ان سے بہت سے کوفیوں نے تفسیری روایتیں منسوب کیں۔ ان کو ائمہ رجال بہت سخت مُدلّس لکھتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ تدلیس خود انہیں نے کیں۔ یا ان کے شاگردوں نے کیں اور وہ اُن کے سر پڑ گئیں۔ ان کی کتاب تفسیر بھی جو پوری کی پوری حضرت ابن عباس رضؓ سے مروی تو نہ تھی۔ بلکہ اسرائیلی قیدیوں کی اولاد سے پوچھ پوچھ کے بہت سی باتیں اسرائیلیات کی بھی ان میں بھری تھیں اس پوری کتاب کے راوی ان سے صرف قاسم بن ابی بزہ ہمدانی ہی تنہا بلا شرکت غیرے تھے۔ اور ہم نے نزولِ عیسیٰؑ کی حدیثوں کی تنقید میں اُس کا ذکر کیا ہے کہ ہمدانیوں

میں عام طور سے تشیّع تھا۔ اسی لئے قاسم بن ابی بزّہ کے شاگردوں میں سے فطر بن خلیفہ الکوفی جو ابو بکر الحنّاط کے غلام آزاد کردہ تھے۔ وہی سب سے زیادہ مجاہد بن جبر کی تفسیر کی حدیثیں ان سے روایت کیا کرتے تھے۔ اور فطر بن خلیفہ مشہور و معروف شیعہ تھے۔ مگر بہر حال جو بھی مجاہد کی تفسیری حدیثیں روایت کرتا ہے۔ وہ قاسم بن ابی بزّہ ہی کی کتاب سے روایت کرتا ہے۔ کیونکہ مجاہدؒ سے تفسیری حدیثوں کی روایت قاسم بن ابی بزّہ کے سوا اور کوئی نہیں کرتا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۳۱)

مقاتل بن سلیمان الخُراسانی

یہ بہت بڑے مفسّر ہیں۔ اس حد تک کہ بعض لوگوں نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

اَلنَّاسُ عَیَالٌ عَلٰی مُقَاتِلٍ فِی التَّفْسِیْرِ یعنی لوگ تفسیر میں مقاتل کے محتاج ہیں۔ جس طرح صاحبِ خانہ کے محتاج نان و نفقہ میں اس کے اہل و عیال ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کسی مفسّر کی اور کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ یہ ضحاک بن مزاحم اور مجاہد بن جبر دونوں کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی تفسیر کو دیکھ کر نعیم بن حماد اور عبداللہ بن مبارک کہتے تھے کہ کاش یہ ان کی تفسیروں کی کوئی سند بھی رکھتے۔ یعنی محض اپنی رائے سے بلا سند اور بلا دلیل تفسیریں لکھتے تھے۔ ابن مبارک نے ایک بار یہ بھی کہا کہ اگر یہ ثقہ ہوتے تو ان کی تفسیر بہت اچھی ہوتی۔ جس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ نہ تھے۔ ان کا خود یہ بیان تھا کہ ضحاک بن مزاحم کے یہاں تفسیر سننے کے لئے جاتے تھے تو حجرے کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ اور دونوں کے درمیان تخلیہ میں تفسیری باتیں ہوئی تھیں۔ ایک بار سفیان بن عیینہ کے سامنے مقاتل کا یہ بیان نقل کیا گیا کہ میں مزاحم کے یہاں جاتا تھا۔ تو دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ تو ابن عیینہ نے کہا کہ ضرور بند کر دیا جاتا تھا۔ مگر مدینے کا دروازہ یعنی فیضانِ نبوی کی آمد موقوف ہو جاتی تھی۔

مگر جویبر بن سعید ان کے اس بیان کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ جویبر نے مقاتل کا یہ دعویٰ سنا تو کہا کہ جس وقت ضحاکؒ کی وفات ہوئی ہے۔ اس وقت مقاتل کمسن بچے ہوں گے اور ابراہیم حربی کا بیان ہے۔ کہ ضحاک کی وفات تو مقاتل کی پیدائش سے پہلے

سال پہلے ہوئی تھی۔ ابراہیم حربی نے کہا کہ کلبی کی تفسیر اور مقاتل کی تفسیر دونوں برابر ہیں اور کلبی تو ایک مشہور کذاب تھے۔ ان کی تفسیر کے برابر ان کی تفسیر ہونے کے کیا معنے ہو سکتے ہیں۔ سمجھئے۔

اب یہ بھی سن لیجئے کہ مقاتل بن سلیمان کے متعلق ائمہ رجال و حدیث کی کیا رائے ہیں۔ وکیع بن جراح اور دارقطنی نے اُن کو جھوٹا کہا۔ اور متروک الحدیث شمار کیا۔ یعقوب بن سفیان نے ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جن سے روایت کرنا جائز نہیں۔ عجلی نے بھی ان کو متروک الحدیث لکھا ہے۔ یہ سب تو ابن حجر رح نے انہیں کے ترجمے میں تہذیبُ التہذیب جلد ۱۰ صد ۲۷۹ سے صد ۲۸۵ تک اور حالات کے ساتھ لکھا ہے اور جلالُ الدین سُیُوطی نے اتقان صد ۲ ۵۵ میں لکھا ہے کہ فی المقاتل مِنَ المذاہبِ الردّیہ " یعنے مقاتل میں مذہبی حیثیت سے خرابیاں تھیں۔ اور ابن حجر رح تہذیبُ التہذیب جلد ۹ صد ۳۶۶ ترجمہ محمد بن عمر الواقدی میں امام نسائی کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ جو لوگ جناب رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم پر جھوٹی باتیں لگاتے ہیں۔ ان میں سے چار شخص بہت مشہور ہیں۔ مدینہ میں واقدی، خراسان میں مقاتل بن سلیمان۔ شام میں محمد بن سعید المصلوُب اور چوتھے کا ذکر نہ کیا۔ یا امام نسائی سے روایت کرنا والے بھُول گئے۔ مگر دوسری جگہ نسائی کا یہ قول یوں نقل کیا ہے کہ ابراہیم بن ابی یحییٰ مدینہ میں۔ واقدی بغداد میں۔ مقاتل خراسان میں اور محمد بن سعید المصلوب شام میں۔ مقاتل کی وفات ۱۵۰ھ میں لکھی ہے۔

اور پھر مقاتل صاحب بڑے سیاسی داؤ پیچ کے تھے۔ آخر خراسانی ہی تھے دعوت عباسیہ کے فتنے میں یہ بڑے سرگرم کارکن تھے اور عمّال حکومت کے خلاف سازشوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ابن خلدون جلد ۲ صد ۱۱۵ سے صد ۱۱۶ تک دیکھ جائیے۔

ابن جریر بحیثیت مورخ

از

علامہ تمنا عمادی

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری تاریخ و تفسیر کے امام سمجھے جاتے ہیں ۔ یوں تو بعض مفسرین کے نام ان سے قبل کے لوگوں میں بھی ملتے ہیں ۔ مگر ان کا صرف ذکر ہی کتابوں میں ہے جن کی تفاسیر کتابی شکل میں مدون اہل علم کے ہاتھوں میں موجود ہیں ان میں سب سے متقدم یہی ہیں ۔

تاریخ میں ان سے پہلے واقدی و ابن اسحاق وغیرہ بھی گزرے ہیں ۔ محمد بن اسحاق کی تو صرف "کتاب المغازی" ہے مکمل تاریخ اسلام بھی نہیں ۔ اور واقدی کذب و افترا میں ضرب المثل ہو چکا ہے اس لئے اس کتاب کی کوئی وقعت اہل علم کی نظروں میں باقی نہیں ہے ۔ لے دے کر اب ابن جریر طبری کی کتاب "**تاریخ الامم والملوک**" سب سے متقدم صحیح تاریخ سمجھی جاتی ہے ۔ ان کی تاریخ کی اہمیت کی بڑی وجہ اس کے شرف تقدم کے علاوہ یہ ہے کہ یہ ہر روایت کے راویوں کے نام بھی بتا دیتے ہیں اور ماخذ کا ذکر بھی وہیں پر کر دیتے ہیں ۔ اسی لئے ان کی تاریخ بہت معتبر سمجھی جاتی ہے ۔ بعد والے مورخین بہت حد تک انہیں کے خوشہ چیں ہیں ۔ غلو اور تعصب بعد کے بعض مورخین میں بہت زیادہ ہے ۔ یہ بھی (یعنے امام طبری) اگرچہ شیعہ تھے مگر متقدم شیعہ تھے ۔ بعد والوں میں جتنا غلو اور تعصب ہے ان میں نہیں ۔ اس لئے اہل سنت بھی ان کی کتاب کو معتبر سمجھتے ہیں ۔ پھر بھی ان کی کتاب کذب و افترا سے خالی نہیں ۔ خصوصاً صحابہؓ کے مشاجرات سے متعلق تو واقعات تصنیف کر کے اور راویوں کی طرف منسوب کر کے ، یہ عنعنے کے ساتھ لکھتے ہیں ۔

اس مضمون میں طبری کی تاریخ کے شیوخ کا تذکرہ کر کے اس سرچشمہ تاریخ اسلامی کے قارئین کے لئے سرمۂ چشم کشا مہیا کر دینا چاہتا ہوں ۔

امام ذہبی و ابن حجر وغیرہما نے جو دو ابو جعفر محمد بن جریر طبری فرض کر دیئے ہیں اور ایران کے ہمارے ہمعصر محدث و مجتہد علامہ عبداللہ الماماقانی نے ایک اور کا اضافہ کر کے تین ابو جعفر محمد بن جریر طبری بنا ڈالے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت ایک ہی ابو جعفر محمد بن جریر الطبری تھے۔ رستم ان کے دادا کا نام تھا۔ مسلمان ہوئے تو یزید ان کا نام رکھا گیا۔ یزید اور رستم کا فرق قائم کر کے دو شخصیتیں بنا دینا غلط ہے۔

اب عربی تاریخ طبری جس کا نام "تاریخ الامم والملوک" ہے اس کو دیکھئے۔ اس میں کئی جگہ آپ قال ابو جعفر دیکھیں گے (یعنی ابو جعفر نے کہا) یہ ابو جعفر خود ابن جریر طبری ہیں۔ کیا وہ اپنی کتاب میں قال ابو جعفر خود اپنے متعلق لکھیں گے؟ وہ تو خود مصنف ہیں۔ جہاں قال ابو جعفر کا لفظ نہیں ہے وہاں صرف کتب اِلَیَّ السَّرِیّ لکھا ہے۔ کیا اِلَیَّ سے ابو جعفر طبری کے سوا کسی دوسرے کو سمجھا جا سکتا ہے؟ قال ابو جعفر کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ ابو جعفر طبری کے تلامذہ نے اس کتاب کو مدون کیا ہے۔ وہ کون لوگ ہیں، اس کا پتہ کون بتا سکتا ہے۔

اس کتاب میں ہر دو چار صفحے کے بعد آپ دیکھیں گے کتب اِلَیَّ السَّرِیّ عَنْ شُعَیْب عَنْ سَیْف لکھا ہے، یہ سری، یہ شعیب اور یہ سیف کون کون ہیں، بغیر اظہار ولدیت و نسبت کے تو بہت زیادہ ہے لیکن کہیں کہیں سیف بن عمر بھی لکھا ہے۔ جلد سوم صفحہ ۲۴۱ میں ہے۔ **قال ابو جعفر فیما کتب الی السری بن یحییٰ یذکر عن شعیب بن ابراهیم انه حدثه عن سیف بن عمر عن خزیمة بن شجرة المعقفا عن عثمان بن سوید عن سوید بن المثعبة الریاحی** اس جگہ ہر راوی کے تعارف کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ خزیمہ بن شجرہ، عثمان بن سوید اور سوید بن المثعبۃ الریاحی باوجود تعارف کے دنیائے رجال میں مجہول بلکہ مفقود الخبر ہی ہیں۔ مگر ان کے سلسلہ اسناد کی جو تین اصلی کڑیاں ہیں وہ یہاں متعارف ہو گئی ہیں۔ ان میں سیف بن عمر الکوفی اور شعیب بن ابراہیم الکوفی کا تعارف تو صحیح ہے۔ سری یحییٰ کا تعارف محل نظر ہے۔ سری بن یحییٰ البصری ایک محدث تھے۔ اخباری تاریخی خبروں کے راوی کی حیثیت سے یہ متعارف نہیں ہیں۔ نہ ان کی عظمت شان سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ بصرہ سے کوفی راویوں سے وقائع کی خبریں حاصل کر کے طبرستان کے

رہنے والے ابو جعفر طبری کے پاس مسلسل لکھ لکھ کر بھیجا کریں، جیسے سفراء کسی ملک میں بیٹھ کر وہاں سے جو معلومات حاصل کرتے تھے۔ اپنے ملک کے بادشاہ کے پاس اس کی رپورٹ بھیجا کرتے ہیں۔ سری بن یحییٰ تو بصرہ ہی میں بیٹھ کر کوفے سے خبریں منگوا کر بقول ابو جعفر طبری ان کے پاس بھیجتے تھے۔ وہ بھی کیا اس دنیا میں رہ کر؟ جی نہیں بلکہ عالم برزخ سے۔ اس لئے کے سری بن یحییٰ کی وفات ۱۶۷ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی ابن جریر کی پیدائش سے ستاون برس پہلے۔ ابن جریر کی ولادت ۲۲۴ھ میں ہوئی تھی، بقولے ۲۲۵ھ میں۔ اور ان سری بن یحییٰ بصری متوفی ۱۶۷ھ کے سوا کوئی دوسرا سری بن یحییٰ دنیائے رجال میں نہیں ہیں۔ اس لئے یقیناً ان کا نام غلط اور بالکل غلط استعمال کیا گیا ہے۔

اب ذرا شعیب بن ابراہیم اور سیف بن عمر کو دیکھ لیا جائے کہ ان دونوں کا تعلق سری بن یحییٰ سے کبھی رہا ہے یا نہیں، اور خود ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق ہے یا نہیں؟

شعیب بن ابراہیم الکوفی: امام ذہبی نے اپنی کتاب "الضعفا۔ میزان الاعتدال" اور ابن حجر نے اپنی کتاب "الضعفا لسان المیزان" میں ان کا ذکر مختصر طور پر کیا ہے۔ ذہبی نے بس اس قدر لکھا ہے کہ۔ **روایته کتب سیف عنه۔ وبه جهالة۔** یعنی یہ سیف کی کتابوں کے راوی تھے۔ ان میں جہالت ہے یعنی مجہول الحال آدمی ہیں۔ ابن حجر، ذہبی کی اتنی عبارت لکھ کر ابن عدی کی "کتاب الکامل" کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ **لیس بالمعروف له اخبار و احادیث**۔ یہ جانے پہچانے نہیں ہیں، کچھ خبریں (تاریخی روایتیں) اور کچھ حدیثیں ان کی ہیں۔ **وفیه بعض النکرة وفیها مافیه تحامل علی السلف** (فیہ کی ضمیر مذکر ان کی ذات کی طرف پھرتی ہے) اور ان میں بعض ناروا باتیں ہیں۔ (فیھا کی ضمیر مؤنث ان کی اخبار و احادیث کی طرف) اور ان کی تاریخی روایتوں اور حدیثوں میں اسلاف پر حملے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اسلاف پر حملے کرنا کس فرقہ کا شیوہ ہے اور خاص کر کے کوفے میں کس جماعت کا شیوہ رہا ہے۔ اسی جماعت سے ان کا تعلق تھا۔ اس کے بعد ابن حجر ایک دوسرے شعیب بن ابراہیم کا ابن حبان کی کتاب "الثقات" سے نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ابن حبان نے ان کا ذکر کر کے لکھا ہے۔ **لعله هو**۔ یعنی شاید یہ وہی ہوں۔ مگر ابن حجر لکھتے ہیں **والظاهر انه غیره**۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ یہ ان کے سوا کوئی اور ہیں۔ کیسے ظاہر ہے؟ یہ نہیں لکھا مجھ

سے سنئے ۔ یہ ابن حبان والے شعیب بن ابراہیم، سیف بن عمر سے روایت کرتے ہیں اور ان شعیب سے سری بن یحییٰ بقول ابن جریر روایت کرتے ہیں جو ۱۹۷ھ میں وفات یاب ہوئے ۔ یعنی ابن حبان کے شعیب بن ابراہیم کے استاد سے ابن جریر کے شعیب بن ابراہیم کے شاگرد، ستر (۷۰) برس پہلے گزرے تو خود ابن جریر والے شعیب، ابن حبان کے شعیب سے کتنا متقدم ہوں گے ۔ اسی سے اندازہ کرلیجئے ۔

تو ابن جریر کے شعیب بن ابراہیم الکوفی یعنی ان کے استاد الاستاد بالکل مجہول الحال شخص تھے، اور ان میں کچھ ناروا باتیں بھی تھیں اور اسلاف پر حملے بھی ان کی روایتوں میں ہوتے تھے ۔ اس سے زیادہ ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا اور نہ معلوم ہوسکتا ہے ۔ مگر ان میں سے لے لے کے جو خبریں سری عالم برزخ سے ابن جریر کے پاس بھیجتے تھے ان خبروں میں اسلاف پر حملے ظاہر یا پوشیدہ آپ دیکھتے ضرور ہیں ۔

اب سیف بن عمر کو بھی پہچان لیجئے ۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۱۹۵ سے ۱۹۶ تک ان کا ترجمہ لکھا ہے اور ان کی شان میں جو کچھ ائمہ رجال و حدیث نے گراں بہا کلمات ارشاد فرمائے ہیں ۔ مثلاً ساقط، ضعیف الحدیث، متروک الحدیث، ذاھب لیس بشیئی، غیر ثقہ، منکر الحدیث، وغیرہ لکھنے کے بعد یہاں تک لکھ دیا ہے کہ **یروی الموضوعات** اور **یضع الحدیث** ۔ یعنی من گھڑت حدیثیں روایت کرتے تھے اور خود حدیثیں گھڑا کرتے تھے ۔ پھر یہ بھی لکھا ہے **انھم بالذندقۃ** ۔ ان پر زندیق ہونے کا بھی الزام ہے ۔ ان فضائل اور مناقب کے بعد سیف بن عمر کے متعلق کچھ پوچھنا اور کچھ دریافت کرنا ہی فضول ہے ۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر رسول اللہ کی طرف منسوب کرسکتا ہے اور آخرت کی باز پرس سے مطلق نہیں ڈرتا وہ تاریخی واقعات گھڑ گھڑ کر ان کو جھوٹی روایتیں بنا بنا کر کیا اسلامی تاریخ کو مسخ نہیں کرسکتا ؟ اصل یہ ہے کہ قاتلین حضرت عثمانؓ و قاتلین حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے ذریات کوفے میں بہت حد تک باقی تھے جنہوں نے حدیثیں اور تاریخی روایتیں اپنے جی سے گھڑ گھڑ کر پھیلانا اپنا مقصد زندگی بنا لیا تھا ۔ آپ جو دین کے ہر رکن اور ہر مسئلے میں مختلف و متضاد حدیثیں دیکھتے ہیں ان کے راوی آپ کو کوفہ و بصرہ و مصر کے نوے فیصد ملیں گے حجاز کے جو راوی ملیں گے ان میں نوے فیصد اولاد اسبایا (جنگی قیدیوں کی اولاد) یا آزاد کردہ غلام یا غلام ہی ملیں گے ۔ کوفہ تو حدیثوں کے گھڑنے کی سب سے بڑی ٹکسال تھی ۔

اس کے بعد بصرہ پھر مصر وغیرہ ۔ غرض یہ سیف ابن عمر صاحب اسی کوفی ٹکسال میں تاریخی روایات گھڑا کرتے تھے اور شعیب بن ابراہیم دوسری جگہ کے لوگوں سے بالمشافہ یا بذریعہ مراسلات سیف کے مکذوبات کی اشاعت کیا کرتے تھے ۔ ان لوگوں کو محدثین کوفہ نظروں میں نہیں لگاتے تھے مگر روایات پرست مؤرخین ان کے شیدائی تھے ۔

تو شعیب بن ابراہیم اور سیف بن عمر کو تو آپ اچھی طرح پہچان گئے ۔ مگر ان کی صرف شخصیتیں پہچانی گئیں ۔ سالِ ولادت و وفات ان دونوں میں سے کسی کا بھی معلوم نہ ہوا ۔ سری بن یحییٰ کا سال وفات ۱۶۷ھ تھا تو یہ دونوں ضرور کچھ اس سے متقدم ہوں گے خصوصاً سیف بن عمر ۔ مگر ابن حجر سیف بن عمر کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ہارون رشید کے زمانے میں ان کی وفات ہوئی ۔ ہارون رشید ۱۷۰ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۱۹۳ھ میں راہی جنت ہو گئے ۔ سیف بن عمر کی وفات ۱۷۰ھ کے بعد اور ۱۹۳ھ سے پہلے ہوئی ۔ اسی درمیان میں غالباً شعیب بن ابراہیم نے بھی وفات پائی ہوگی غالباً سیف بن عمر کے بعد ۔ اور سری بن یحییٰ کی وفات تو تہذیب التہذیب میں ہی مذکور ہے جس کو میں لکھ چکا ہوں ۔ یعنی ۱۶۷ھ یعنی اپنے استاذ الاستاذ سے تین برس پہلے ۔ اگر سیف نے اسی سال وفات پائی جس سال ہارون رشید نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ شعیب اور سیف دونوں کی وفات ایک سال ہی ہوئی ہو ۔ شاگرد کا استاد و استاد الاستاد سے تین برس پہلے وفات پا جانا کچھ مستبعد نہیں ہے ۔ مگر سیف اور شعیب کی وفات تو ابن جریر کی ولادت سے چون (۵۴) پچپن (۵۵) برس پہلے ہوتی ہے اور جنہوں نے بلاواسطہ خود ابن جریر کو برسوں لکھ لکھ کر سیف کے اخبار کوفے سے منگوا منگوا کر بصرے سے طبرستان بھیجتے رہے ۔ ان کی وفات ابن جریر کی پیدائش سے ستاون اٹھاون برس پہلے ہوئی ع

این عجب تر ز ہر عجب باشد!

اس سے بھی عجب تر : تو یہ ہے کہ امام ذہبی و ابن حجر اور دوسرے آئمہ رجال کے نزدیک شعیب بن ابراہیم و سیف بن عمر سے تعلق سری بن یحییٰ البصری کا نہیں بلکہ سری بن اسماعیل الہمدانی الکوفی کا بتاتے ہیں اور یہ بات قرین عقل معلوم ہوتی ہے کہ تینوں کوفی ایک ہی جماعت کے افراد معلوم ہوتے ہیں ۔ جبھی تو سیف بن عمر الکوفی جیسے زندیق حدیثیں اور روایتیں گھڑنے والے کی من گھڑت روایتوں کو شائع کرتے رہتے ہیں ۔

سری بن اسماعیل الکوفی ہی کے ترجمے میں ابن حجر لکھتے ہیں ۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۴۵۹ سے ۴۶۰ تک پڑھ جائیے) یہ شعبی (عامر بن شراعیل محدث کوفہ) کے چچیرے بھائی تھے ۔ ان سے حدیثیں بھی روایت کرتے تھے ۔ جب شعبی قاضی تھے تو سری بن اسماعیل ان کے کاتب تھے پھر شعبی کے بعد یہی سیف ان کی جگہ قاضی مقرر ہوگئے ۔ قیس بن ابی حازم اور سعید بن وہب سے بھی حدیثیں روایت کرتے تھے اور خود ان سری بن اسماعیل سے روایت کرنے والوں میں ابن شہاب زہری کا نام بھی لیا گیا ہے ۔ سری بن اسماعیل کے بارے میں محدث و امام فن رجال یحییٰ بن سعید نے کہا کہ ایک مجلس میں مجھ پر ان کا کذب واضح ہوگیا ۔ اس لئے پھر وہ ان سے بیزار ہوگئے اور عبدالرحمان بن مہدی تو کبھی ان کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے ۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے تھے کہ جریر بن عبدالحمید جب سری بن اسماعیل ، محمد بن سالم ، اور عبیدہ کی حدیثیں روایت کریں تو ہرگز نہ لکھو ۔ ابوداؤد ۔ امام احمد بن حنبل ، ابن معین ، امام نسائی وغیرہ نے ان کو متروک الحدیث قرار دیا ہے ۔ شعبی سے ناقابل قبول حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں ۔ وغیرہ ذالک ۔ سری بن اسماعیل خود جیسے بھی ہوں ، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ان کی وفات کس سن میں ہوئی ۔

شعبی کی ولادت ابن حجر تہذیب التہذیب صفحہ ۵ صفحہ ۶۸ میں ۲۰ ھ (۱) اور وفات ۱۰۹ ھ میں لکھتے ہیں ۔ سری بن اسماعیل ان کے کاتب تھے جب شعبی قاضی تھے ۔ تو شعبی ۷۰ ھ میں قاضی ہوئے تھے پچاس برس کی عمر میں ، سری اس وقت کم از کم بیس (۲۰) برس کے تو ہوں گے ۔ ورنہ محکمہ قضاۃ کے محرر کیا طفولیت میں ہوئے ہوں گے ۔ تو یہ شعبی سے تیس برس چھوٹے ٹھہرے ۔ اس حساب سے ان کی پیدائش ۵۰ ھ میں ٹھرتی ہے ۔ ابن شہاب زہری سے دو تین برس بڑے ہوئے ۔ جب تو زہری کو بعضوں نے ان کا شاگرد بھی کہا ہے ۔ سال ولادت تو ایک حد تک متعین ہوگیا ۔ شعبی کی عمر ۸۹ برس تھی ۔ ان کی عمر پورے سو (۱۰۰) برس مان لیجئے تو آپ سری بن اسماعیل کا سال وفات ۱۵۰ ھ قرار دیں گے جو قریب الی الصحتہ تخمینہ کہا جاسکتا ہے ۔ اگر ڈیڑھ سو برس کی عمر بھی فرض کر لیجئے تو ابن جریر کی ولادت سے چوبیس پچیس برس پہلے سری کی وفات ٹھہرے گی ۔ غرض سری بن یحییٰ ہوں حسب اقرار ابن جریر بقلم خود ، یا سری بن اسماعیل ہوں حسب تصریح امام ذہبی و حافظ ابن حجر ۔ دونوں کی وفات ابن جریر کی ولادت سے بہت پہلے ہے ۔ ابن یحییٰ ستاون اٹھاون برس پہلے مرے اور ابن اسماعیل تقریباً پچھتر برس پہلے ۔ ابن

جریر کو حسب عادت تدلیس نام بدلنے کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ سری بن اسماعیل بہت مجروح اور کوفے میں بہت بدنام تھے اور سری بن یحییٰ بصری تھے اور بصرے میں نیک نام تھے اور ثقہ سمجھے جاتے تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ راویوں کے سال ولادت و وفات کون یاد رکھتا ہے ۔ اس وقت تک رجال کی کتابیں مدون نہیں ہوئی تھیں ۔ امام بخاری کی تاریخ کبیر و تاریخ اوسط و تاریخ صغیر کی عام اشاعت نہیں ہوئی تھی ۔ صرف صحیح بخاری کی نقلیں ان کے تلامذہ نے بہت کیں اور امام بخاری کے کچھ ہی دنوں کے بعد یعنی چند برسوں میں ہر شہر میں تقریباً اس کی نقلیں پہنچ گئیں ۔ اور ناقلوں نے کمی بیشی اور ردو بدل سے بھی کام لیا جس کے باعث صحیح بخاری کے نسخوں میں بہت اختلافات ہیں ۔ ابن جریر کو بھی غالباً صحیح بخاری کا ایک نسخہ مل گیا تھا اسی لئے امام بخاری کے شیوخ سے خود بھی روایت کرنے لگے سمجھے کہ جب امام بخاری میرے ہمعصر تھے تو ان کے شیوخ سے میں روایت کیوں نہیں کرسکتا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر دھوکا کھایا ۔ سعید بن الربیع الوشی متوفی ۲۱۱ھ امام بخاری کے اقدم اساتذہ میں سے تھے ۔ ان سے بھی اپنی تفسیر میں روایت کرنے لگے حالانکہ وہ ان کی ولادت سے تیرہ برس پہلے وفات پا چکے تھے ۔ انداز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریر کو مردوں سے روایت کرنے کی کچھ عادت سی ہوگئی تھی ۔ چنانچہ وہ اپنی تاریخ میں عمر بن شبہ سے بہت زیادہ روایت کرتے ہیں خصوصاً مشاجرات صحابہ کے واقعات جو یقیناً ابن جریر کے خود گھڑے ہوئے ہوتے ہیں ، زیادہ تر عمر بن شبہ ہی سے ابن جریر روایت کرتے ہیں کہیں ولدیت ظاہر کر دیتے ہیں لیکن صرف نام لکھ دیتے ہیں حدثنا عمر کہہ کے ۔

عمر بن شبہ کی وفات ۲۰۲ھ میں ہے وہ ابن جریر کی ولادت سے بائیس برس پہلے وفات پا چکے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریر نے کسی صوفی سے کشف قبور کی مشق حاصل کر لی تھی ۔ اس کے بغیر تو مردوں سے روایت ممکن نہیں ہے ۔ مگر کشف قبور کے ذریعے مردوں سے حضرات صوفیہ صرف کچھ باتیں کر لیتے ہیں ۔ پوری داستان ، داستان ہی نہیں بلکہ داستانیں نہیں سن سکتے ۔ میں نے خود کشف قبور کی مشق حاصل کی تھی ۔ آخر میں بھی تو تقریباً چالیس (۴۰) کی عمر تک صوفی رہ چکا ہوں ۔ کشف قبور کی حقیقت سے خوب واقف ہوں ۔ شیطانی وسواس کے سوا کچھ نہیں ۔ جو خود اپنا ضمیر کہتا ہو صوفی سمجھتا ہے کہ مردہ کہہ رہا ہے ۔ اسی لئے دو مختلف الخیال صوفی جب کسی قبر پر مراقب بیٹھتے ہیں اور ایک ہی سوال دونوں کرتے ہیں تو دونوں میں سے ہر ایک کو اس کے خیال کے مطابق

جواب ملتا ہے ۔

لیکن ابن جریر کو تو مردے عالم برزخ سے لکھ لکھ کر تاریخی واقعات بھیجا کرتے تھے ۔ دیکھئے ۔ ان کی ولادت سے پچھتر (۷۵) برس قبل مرنے والے سری بن اسماعیل الکوفی حسب بیان ذہبی و ابن حجر اور خود ان کے بیان کے مطابق ان کی ولادت سے ستر اٹھتر برس قبل وفات پانے والے سری بن یحییٰ البصری عالم برزخ سے اخبار وقائع برسوں لکھ لکھ کر بھیجتے رہے اور یہ اپنی کتاب میں درج کرتے رہے ۔ جنت کی ڈاک کا سلسلہ ، مدت ہوئی ، ادھ بیچ میں تو دونوں جاری رہا تھا ۔ اب معلوم ہوا ہے کہ اس سے بہت پہلے ابن جریر کے گھر پر جنت سے ڈاک آتی رہتی تھی ۔

سری بن اسماعیل کے دوسرے شیوخ : سعید بن الوہب الکوفی متوفی ۷۵ ھ یا ۷۶ ھ سے جنہوں نے زمانہ نبوی پایا تھا ۔ اور دوسرے قیس بن ابی حازم الکوفی جنہوں نے زمانہ جاہلیت پایا تھا ، آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی خدمت میں بیعت کے لئے گھر سے چلے تھے کہ آنحضرتؐ کی وفات ہو گئی ۔ یہ وفات نبوی کے بعد پہنچے اور حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ کے دست حق پرست پر بیعت کی ۔ ان کی وفات ۵۴ ھ یا ۵۵ ھ میں ہوئی اور ایک روایت میں ہے کہ ۹۴ ھ میں ہوئی ۔ یعنی دونوں شعبی سے بھی متقدم تھے مگر ابن جریر تو سری بن اسماعیل نہیں کہتے سری بن یحییٰ کہتے ہیں ۔ مگر وہ بھی ان کی ولادت سے ستاون برس پہلے وفات پا چکے تھے ۔

یہ تو ایک سرسری مطالعہ سے پتہ لگا ہے ۔ اگر پوری طرح جریر کے راویوں کی پڑتال کی جائے تو ایسے کتنے عمر بن شبہ اور سری بن یحییٰ اور سعید بن ربیع نکلیں گے ۔ مگر کون اتنی کاوش کرے ۔ اور کرے بھی تو اس کو اس محنت کی کیا داد ملے گی ؟ وہی تاریخ جس میں اکابر صحابہ و اساطین دین پر حملے ہیں ۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن پاک خلق عظیم کو اتہامات سے آلودہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اسی تاریخ کو تاریخ اسلام کے نام سے تعلیم گاہوں میں پڑھایا جائے گا ۔ اور اس دور آزاد خیالی میں نوجوانوں کو اپنے اکابر اسلاف سے یہاں تک کہ اپنے رسولؐ کی طرف سے بدظن کیا جائے گا ۔

اگر کوئی تاریخی ریسرچ کے لئے اٹھے گا اور قرآنی آیات و درایت کی روشنی میں تاریخ کی کذب بافیوں کا پردہ چاک کرے گا اور صحیح واقعات کی نشاندہی کرے گا تو فوراً

ایک طبقہ کے چند اشخاص اٹھیں گے ،کہ یہ کتاب ہمارے عقائد کے خلاف اور فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارنے والی ہے اس لئے ضبط کر لی جاتے ۔

محمد و طلحہ : ابن جریر کتب الی السری عن شعیب عن سیف کے بعد عن محمد و طلحہ ۔ عموماً لکھا کرتے ہیں ۔ یہ محمد اور یہ طلحہ کون ہیں ؟ ان دونوں کا پتہ لگانا بھی ضروری ہے ۔ خصوصاً مشاجرات صحابہ کے واقعات اکثر وہ " محمد و طلحہ " کی مشترکہ روایت سے لکھتے ہیں سیف بن عمر کے شیوخ میں " محمد و طلحہ " دو نام ضرور ملتے ہیں ۔ محمد بن السائب الکلبی الکوفی جو مشہور کذاب و کٹر رافضی ہے ۔ جو اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کر فخر سے کہا کرتا تھا کہ **انا سبائی** ۔ میں عبداللہ بن سبا (یہودی منافق قاتل حضرت عثمانؓ و حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ) کا پیرو ہوں ۔ اس کے سوا کوئی دوسرا شخص " محمد " نام کا جس سے سیف بن عمر الکوفی روایت کرتے ہیں کہیں مذکور نہیں ۔ مگر بعض جگہ ابن جریر تدلیس کی نیت سے یعنی نام پر کذب کا پردہ ڈالنے کے لئے عن محمد بن راشد لکھ دیتے ہیں حالانکہ نہ کوئی محمد بن راشد سیف کے شیوخ میں مذکور ہے نہ کسی محمد بن راشد کے ترجمے میں یہ مذکور ہے کہ ان سے سیف بن عمر یا کوئی سیف بھی روایت کرتا ہے ۔ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۱۶۰ ترجمہ محمد بن راشد الشامی میں لکھتے ہیں :۔

وفی الرواۃ محمد بن راشد ثلثۃ (بغدادی) یروی عن بقیہ بن الولید (البصری) یروی عن یونس بن عبید (واخر) یروی عن الحسن و اظنہ الذی قبلہ وفوق بینھما الذھبی فقال فی الاول تکلم فیہ و فی الاخر لا یدری من ھو ۔

یعنی راویوں میں تین محمد بن راشد ہیں ۔ ایک بغدادی ہے جو روایت کرتا ہے بقیہ بن الولید (۱) سے ۔ دوسرا بصری ہے جو روایت کرتا ہے یونس بن عبید (۲) سے ۔ اور ایک اور ہے جو روایت کرتا ہے حسن (۳) سے ۔ میں گمان کرتا ہوں کہ تیسرا وہی ہے جو اس سے پہلے مذکور ہوا ، یعنی بصری جس کو کہا ، کیوں کہ وہ حسن بصری سے روایت کر رہا ہے ۔ ذہبی نے اول یعنی بغدادی کے بارے میں کہا کہ لوگوں نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے ۔ یعنی کچھ جرحیں لوگوں کی اس پر ہیں ، اور دوسرے کے بارے میں کہا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے یعنی ذہبی کے نزدیک دو ہی محمد بن راشد ہیں ۔ مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو صحابہ سے روایت کرتا ہو اور کسی سے بھی سیف بن عمر روایت

کرتے ہیں ۔ درحقیقت محمد بن السائب کو چھپانے کے لئے ایک نیا نام گھڑ کر لکھ دیا ۔ درحقیقت وہ محمد بن السائب الکلبی الکذاب ہی ہے اس کے سوا کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا ۔ غرض کوئی محمد بن راشد کسی صحابی سے روایت نہیں کرتا تو پھر وہ مشاجرات صحابہ کے چشم دید حالات کس طرح روایت کر سکتا ہے ؟

اور " طلحہ بن الاعلم " ایک نام شیخ بن عمر کے شیوخ میں ضرور ہے ۔ مگر دنیائے رجال میں کہیں بھی طلحہ بن الاعلم کا پتہ نہیں ملتا اور نہ ابن جریر نے طلحہ کی ولدیت کا کوئی ذکر کیا ہے ۔ ممکن ہے کہیں ذکر کیا ہو ، ضعف بصارت کی وجہ سے میری نظر نہیں پڑ سکی ۔ اس لئے طلحہ بن الاعلم کو **لا اعلم یا واللہ اعلم** کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے ۔ ۔۔۔۔

امام طبری ، نصر بن مزاحم سے بھی روایت کرتے ہیں ، اور بلاواسطہ روایت کرتے ہیں ۔ حالانکہ ، نصر بن مزاحم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی تھی ۔ اور ابن جریر طبری ، ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے تھے یعنی ابن جریر اس شخص سے بلاواسطہ روایت کرتے ہیں جو ان کی پیدائش سے بھی بارا تیرہ برس قبل وفات پا چکا تھا ۔ لسان المیزان میں اسے کذاب اور غالی رافضی کہا گیا ہے ۔ (میزان جلد ۶ صفحہ ۱۵۷)

نیز ابن جریر ، ابو مخنف لوط بن یحیی الکوفی سے بھی بہت زیادہ روایت کرتے ہیں بالخصوص واقعات کربلا وغیرہ کے سلسلے میں ، لسان المیزان (جلد ۴ ص ۴۹۲) میں ، ابو مخنف کی وفات ۱۷۰ھ سے پہلے لکھی ہے ۔ بعض نے اس کا سن وفات ۱۵۴ھ بتایا ہے لیکن اگر ۱۷۰ھ کو بھی صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کی وفات ، ابن جریر کی پیدائش سے قریب (۵۴) چون برس پہلے کی ہوئی ۔ یہ ہے ابن جریر کی روایتی ثقاہت کا علم ۔

(۱) سال ولادت و وفات میں مختلف اقوال ہیں ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ خود ان سے ۱۹ھ کی روایت ہے ۔

بقیہ بن الولید ۔ مات ۱۹۷ھ ، اور ۱۹۸ھ ، اور ۱۱۵ھ

(۲) یونس بن عبید البصری ۔ مات ۱۳۹ھ او ۱۴۰ھ و او قبیل الجارف و موالعام الذی افنی اہل البصرہ بالطاعون وھی ۱۳۶ھ ستہ ویتفق فلعل یونس ولد ۶۵ھ او ۶۴ھ واللہ اعلم ۔

(۳) الحسن بصری ہوالحسن بن یسار ابو سعید البصری مات فی رجب ۱۱۰ھ

(۲)

طبری بحیثیت مؤرخ

مجھ کو اس کا اعتراف ہے کہ علامہ ابنِ جریر طبری بہت بڑے علامہ دہر، بہت بڑے محدث، بہت بڑے مفسر، بہت بڑے مؤرخ اور بے مثل ادیب تھے مگر وہ عجمی تھے۔ اسلئے عجمی تعصب سے خالی نہ تھے۔ بلکہ اُن کے دل میں فاتحین عجم صحابۂ کرام رضؓ سے کچھ کینہ بھی تھا۔ منافقینِ عجم نے جو اپنا بغض نکالنے کے لئے باہم متخالف و متضاد، من گھڑت روایات کے ذریعے قرآنی احکام کو غتر بود اور مشتبہ کر دینے کی، مسلمانوں کو روایات میں الجھا کر قرآن مجید سے دور تر کر دینے کی، اور تاریخ اسلام کو بالکل مسخ کر دینے کی کوشش کی تھی۔ ان کی ناشکور کوششوں کو کامیاب بنانے والوں میں سب سے زیادہ حصّہ لینے والے یہی ابن جریر طبری تھے۔ تفسیر اور ضخیم ترین تفسیر لکھی تو ہر آیت کی تفسیر میں مختلف اور کہیں کہیں متضاد روایتیں انہیں منافقین عجم کی گھڑی ہوئی یا خود گھڑ کر درج کیں کہ ایک خالی الذہن انسان فیصلہ نہ کر سکے۔ کہ آخر کون سی تفسیر اس آیت کی صحیح ہے۔

تاریخ میں ایسی ایسی روایتیں انہیں منافقین کی بھریں یا خود گھڑیں۔ اور ایسے ایسے واقعات خلاف واقعہ بنا بنا کر لکھے کہ وہ صحابہ رضؓ سابقون الاولون جن کو رضوانِ الٰہی کی بشارت دی گئی۔ بلکہ جن کے اتباعِ بالاحسان پر دوسروں کے لئے رضاءِ الٰہی موقوف ہے۔ جن کو اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا فرمایا گیا۔ جن کے ایمان کو ایسا معیاری ایمان قرار دیا گیا کہ دوسرے لوگ انہیں جیسا ایمان لائیں گے جبھی ہدایت پائیں گے۔ جن کے جانی و مالی جہاد کی بدولت اسلام دُنیا میں پھیلا۔ ایسے اساطینِ اسلام کے اخلاق حسنہ کے پاک و صاف دامن کو خود غرضی، نفس پرستی، اتباع ہوا، جاہ طلبی، اقتدار پسندی، بے انصافی اور مکاری و عیاری جیسے صفاتِ رذیلہ و خبیثہ کے غبار سے اُنہیں خبیث روایتوں کے ذریعے آلودہ دکھایا۔ تاکہ تاریخِ اسلام پڑھنے والے، اُن اصحاب رسولؐ کو جن

کے بارے میں قرآن مجید شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا ہے۔ (بلکہ نگینے کی طرح) تمہارے دلوں میں ایمان کو مزین کر دیا ہے اور کفر سے، بدکاری سے، اور نافرمانی سے تمہیں نفرت دلا دی ہے (حجرات) ان بزرگواروں کو آج ہی کل جیسے سیاستدانوں کی جماعت سمجھنے لگیں۔ یہاں تک کہ اُمہات المومنین جن کی شان میں آیت تطہیر اُتری۔ بلکہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق پر بھی چھپے چھپے حملے کئے۔ اس مختصر مضمون میں مثالیں دینے کی گنجائش نہیں ہے اس کے لئے ایک پوری کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ابوجعفر ابن جریر طبری کی تفسیر و تاریخ نے مجھ کو اس پر مجبور کیا کہ میں ان کے شیوخ کو ذرا دیکھوں اور ان کی روایتوں کی تنقید کر کے ان کے صدق و کذب کا پتہ لگاؤں۔

اتنا تو میں پہلے سے جانتا تھا کہ ابن جریر شیعہ تھے اور یہ بھی جانتا تھا کہ اُن کے ہمعصر اور قریبُ العصر سارے محدثین ابن جریر کو شیعہ اور جھوٹی حدیثیں اور جھوٹی روایتیں گھڑنے والا سمجھتے تھے۔ مگر الحمدُ لِلّٰہ کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے تعصّب اور غلو سے محفوظ رکھا ہے مجھ کو شیعوں سے دینی اختلاف ہے۔ تعصّب و عناد نہیں۔ ابُو اسحٰق السّبیعی۔ سلیمان بن مہرانَ الاعمش۔ منصور بن المعتمر۔ زبید الیامی۔ فطر بن خلیفہ وغیرہم تو مشہور شیعے تھے۔

عوف اعرابی کو شیطان خبیث لکھنے پر بھی ائمہ رجال جانتے تھے کہ اس کی حدیثیں بخاری و مسلم وغیرہ میں ہیں۔ صحاح کی اور غیر صحاح کی کون سی کتاب حدیث ہے جس میں شیعے راویوں کی ایک بڑی جماعت نہیں ہے۔ حدیث کی کوئی کتاب خالص اہلِ سنّت کی کتاب نہیں ہے۔ ہر کتاب میں شیعوں کا حصّہ رسدی بھی موجود ہے۔ ابن جریر کے شیعہ ہونے کی شہادت انہی لوگوں نے پیش کر دی ہے جن کو ابن جریر کے شیعہ ہونے سے انکار ہے۔ یعنے حافظ ذہبی متولد ۶۷۳ھ و متوفی ۷۴۸ھ میزانُ الاعتدال میں فیہِ تشیع لکھتے ہیں۔ ابن حجر لسان المیزان میں ذہبی رح کی عبارت نقل کرتے ہیں تو تشیّع کے بعد یسیر کا لفظ بڑھا دیتے

ہیں ۔مطلب یہ ہے کہ ہلکے پھلکے شیعہ ہیں ۔کٹّر شیعہ نہیں ہیں ۔ لہ

ابنِ حجر رحؒ خود لسان المیزان میں لکھتے ہیں ۔کہ امام احمد بن علی السّلیمانی (متولد ۳۲۱ھ اور متوفی ۴۱۲ھ) نے صاف فرما دیا تھا کہ کَانَ یضعُ لِلرّوافضِ یعنی ابن جریر رافضیوں کی موافقت میں حدیثیں گھڑا کرتے تھے ۔ابن حجر رحؒ کا پہلے تو اس پر خفیف سی برہمی دکھانا پھر کہنا کہ اگر میں قسم کھا کر کہوں کہ سُلیمانی نے اس ابن جریر طبری مفسّر و مؤرخ کے بارے میں ایسا نہیں کہا ہے ۔ بلکہ دوسرے ابن جریر کے بارے میں کہا ہے تو میری قسم غلط نہ ہوگی ۔محض ان کی حمایت بیجا ہے ۔ اس لئے کہ دوسرا ابن جریر اول تو کوئی تھا ہی نہیں ۔ اور اگر واقعی ہو تو اس کو تو خود شیعہ ہونے کا اقرار تھا ۔اس کو شیعہ بھی شیعہ مانتے ہیں ۔ اور ابن حجر رحؒ اور ذہبیؒ بھی ۔جو خود شیعہ ہونے کا اعلان کرتا ہے جس کو سب شیعہ جانتے ہیں ۔ وہ اگر شیعوں کے مطابق حدیثیں گھڑے گا ۔ تو کہا جائے گا کہ یہ اپنے مذہب کے مطابق حدیثیں گھڑتا ہے جو اپنے کو سنّی ثابت کرتا ہو اور عام لوگ اُس کو سنّی سمجھتے ہوں ۔ وہ اگر شیعوں کے مطابق حدیثیں گھڑے گا ۔ جب کہیں گے کہ یہ شیعوں کے موافق حدیثیں گھڑتا ہے ۔امام سُلیمانی ایسے نہ تھے کہ بغیر تحقیق اور قطعی ثبوت کے ایک مشہور مفسّر و مؤرخ کے بارے میں ایسا کہہ دیتے ۔

لہ ابن جریر شہر آمل کے قدیم رہنے والے تھے ۔ یہیں پیدا ہوئے ۔یہیں پرورش پائی اور یہیں سے تحصیل علم کے لئے باہر نکلے ۔بغداد و بصرہ و مصر و کوفہ میں ۴۲ برس تک تحصیل علم میں سرگرداں رہے تو از روئے تقیہ سنّی ہی بنے رہے اور سنّی ہی بن کر رہنے میں یہ شہرت عامہ حاصل کر سکتے تھے ۔اُن کے دادا کا اصل نام رستم تھا ۔اسلام قبول کرنے کے بعد یزید نام رکھا گیا ۔ابن جریر خالص شیعوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے ۔اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن رُستم لکھتے تھے اور سارے مسلمانوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے ۔اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن یزید لکھتے تھے کئی صدیوں کے بعد لوگوں نے دو ابن جریر بنا ڈالے ایک کو کٹر شیعہ قرار دیا ۔دوسرے کو ہلکا پھلکا شیعہ ۔مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کسی مفتری نے ابن جریر بن رُستم کے نام سے خالص شیعہ مذہب کی کتابیں تصنیف کر کے منسوب کر دیں اور متعدد کتابیں ابن جریر کے نام سے اور متعدد واقعات منسوب کئے گئے ۔ دروغ گو را حافظہ نباشد کی بنا پر زمانے کا فرق محسوس نہ کیا تو عبداللہ المامقانی شیعہ امام فن رجال نے اپنی کتاب تنقیح المقال میں تین محمد بن جریر طبری قرار دیئے ۔

ابن جریر کی وفات کے صرف گیارہ برس بعد امام سلیمانی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد نے ابن جریر کا زمانہ ضرور پایا تھا۔ امام سلیمانی کے نانا احمد بن سلیمان السکندی بہت بڑے محدث تھے۔ جن سے یہ روایت بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے ابن جریر کو دیکھا ہوگا۔ ان سے ابن جریر کے حالات معلوم ہوئے ہوں گے۔ اور کتنے ہمعصر ابن جریر محدثین سے بلکہ تلامذہ ابن جریر سے خود سلیمانی ملے ہوں گے۔ ابن جریر کوفے میں بیس سال سے زیادہ رہے تھے۔ سلیمانی کوفے کے محدثین سے بہت روایت کرتے ہیں۔ ان کو کوفی محدثین سے بھی ابن جریر کے حالات معلوم ہوئے ہوں گے۔ ابن جریر کے حقیقی بھانجے ابوبکر محمد بن عباس الخوارزمی سے ملے ہوں گے۔ جن کی وفات ۳۸۲ھ میں ۹۶ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ خوارزمی کی وفات کے وقت سلیمانی ۲۱ برس کے تھے۔ پھر ابن جریر کی تفسیر اور تاریخ بھی ضرور پڑھی ہوگی۔ غرض امام سلیمانی نے ابن جریر کے متعلق جو رائے قائم کی تھی۔ وہ سمجھ بوجھ کر علیٰ وجہ البصیرت قائم کی تھی۔ سمعانی اپنی کتاب الانساب ورق ۳۰۵ کے صفحہ اوّل پر ان کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے۔ لم یکن لہ نظیر فی زمانہ اسناداً وحفظاً ودرایتاً بالحدیث وضبطاً وایقاناً۔ یعنے یہ اپنے وقت میں ایک بے نظیر محدث تھے ہر حیثیت سے، اس لئے ممکن نہیں ہے کہ اتنے بڑے مفسر و مورخ پر اتنا بڑا الزام محض اٹکل پچو لگا دیں اور قیامت کی باز پرس سے مطلق نہ ڈریں۔

اور سب سے بڑی شہادت ابن جریر کے شیعہ ہونے کی تو خود ان کے بھانجے خوارزمی مذکور نے دیدی ہے۔ یاقوت حموی معجم الادباء میں ابن جریر کا مفصّل ترجمہ لکھتے ہیں۔ اس میں ابن جریر پر تشیع کے الزام کا ذکر کرتے ہوئے ابن جریر کے بھانجے خوارزمی مذکور کے دو شعر نقل کرتے ہیں۔

بآمل مولدی، وبنو جریر   لاخوالی ویحکی المرء خالہ

آمل میں میری پیدائش ہے اور جریر کے بیٹے میرے ماموں ہیں اور ہر شخص اپنے ماموں کے مشابہ ہوتا ہے۔

فیہا انا رافضی عن تراثٍ — وغیری رافضیٌ عن کلالۃٍ

توسن لو کہ میں وراثتاً رافضی ہوں۔ اور میرے سوا جو رافضی ہے وہ دور کے لگاؤ سے

فبای حدیثٍ بعدہٗ یؤمنون؟ خاص ابن جریر کے گھر کی اس شہادت کے بعد بھی جو ابن جریر کو شیعہ نہ مانے، اس سے بڑھ کر کون ہٹ دھرم اور ضدی ہو سکتا ہے۔ مگر یاقوت حموی بھی ابن حجر رح ذہبی اور خطیب بغدادی کیطرح ابن جریر کے عاشقوں میں تھے۔ وہ اتنی یقینی الصحت شہادت کو خود پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ خوارزمی جھوٹا ہے۔ ابن جریر ہرگز شیعہ نہ تھے۔

اور امام سلیمانی نے جو ابن جریر پر شیعوں کی حمایت میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا الزام عائد کیا ہے۔ اس کی شہادت ان کی ہر تصنیف دے رہی ہے۔ تفسیر کو دیکھئے تو سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ امام سلیمانی کی تصدیق کر رہی ہے۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت ۵۵ کو دیکھیئے تو ابن جریر کی دروغ بافیوں کی شہادت دے رہی ہے اور اس کے علاوہ بھی بعض مقامات امام سلیمانی کے الزام کی صحت پر دلالت کر رہے ہیں

ایک اور زبردست شہادت

علامہ عبداللہ الماممقانی ایرانی شیعہ مذہب کے بہت بڑے محدّث اور فنّ رجال کے امام اپنی کتاب تنقیح المقال میں (مطبوعہ ایران) شیعہ مذہب کی مشہور کتاب "روضات الجنات" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مصنّف نے ابن جریر مفسّر و مؤرخ کو شیعہ ہی تسلیم کیا ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ لکھی ہے کہ یہ ایسے شہر کے رہنے والے تھے۔ جو شیعوں کا خاص مسکن تھا۔ خصوصاً آلِ بویہ کی حکومت کے زمانے میں (کہ اس وقت وہاں کوئی سنّی نہیں رہ سکتا تھا) دوسری دلیل یہ ہے کہ اہل سنّت کے چاروں مذاہب میں سے کسی مذہب کو انہوں نے قبول نہیں کیا۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ حدیث غدیر خم کا اثبات کیا ہے۔ ولا یفعلہ الّا شیعۃ اور یہ شیعے کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ یہ تو ایک شیعے مصنّف کی شہادت ہے جس کو دوسرے شیعے مصنّف نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے مگر روضات

الجنات کے مصنّف نے تین ہی باتیں لکھی ہیں۔ تین دلیلیں ان کے علاوہ مجھ سے بھی لے لیجیئے۔ (۱) ابن جریر پاؤں پر مسح کو فرض سمجھتے تھے (۲) ابن جریر طلاق کے مسئلے میں شیعہ مذہب کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ (۳) سب سے زبردست دلیل یہ ہے کہ ابن جریر نے مسئلہ امامت پر ایک کتاب لکھی تھی۔ جس میں امامت کو منصوص من اللہ ثابت کیا تھا۔ اس کتاب کا نام ابن جریر نے المسترشد رکھا تھا۔

بغداد کے جس محلے میں ابن جریر رہتے تھے۔ اس محلے میں حنبلی مذہب کے متعدد علماء بھی رہتے تھے۔ ان لوگوں نے ان کے شیعہ ہونے کا اعلان کیا۔ اسی کتاب کے سبب سے جس کا ذکر ابن حجر وغیرہ کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ حنبلیوں نے ان پر ظلم کیا کہ ان کو شیعہ مشہور کر دیا۔ مگر حنفیوں نے شافعیوں نے اور مالکیوں نے اس مظلوم کی مطلق حمایت نہ کی بلکہ انہیں ظالموں کا ساتھ دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ سارے علماءِ اہلِ سنت نے ابن جریر کا بائیکاٹ کیوں کیا۔

ابن جریر کی ولادت ۲۲۴ھ کی ہے۔ امام بخاری کی وفات کے وقت یعنی ۲۵۶ھ میں ابن جریر ۳۲ برس کے تھے۔ امام مسلم رح کی وفات کے وقت یعنی ۲۶۱ھ میں ابن جریر ۳۷ برس کے تھے۔ امام ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی متوفی ۲۷۵ھ کی وفات کے وقت ۵۱ برس کے تھے۔ امام ابن ماجہ کی وفات کے وقت یعنی ۲۷۳ھ میں ۴۹ برس کے تھے۔ اور امام ابو عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ کی وفات کے وقت ابن جریر ۵۵ برس کے تھے اور امام نسائی متوفی ۳۰۳ھ کی وفات کے وقت ۷۹ برس کے تھے۔ امام نسائی تو خراسانی تھے۔ ابو داؤد بھی سجستانی تھے۔ ابن جریر سے تعلقات اور حدیثوں کی لین دین کا بہت اچھا موقع تھا۔ مگر آخر کیا وجہ ہے کہ صحاح کی کسی کتاب میں ان کی ایک روایت بھی نہیں ہے۔ نہ ابن جریر اُن میں سے کسی سے بھی روایت کرتے ہیں۔ صحاح سے باہر بھی اہل سنت جامعین حدیث کی کسی کتاب میں ان کی روایت سے کوئی حدیث نہیں ملتی۔ اگر عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی سمرقند میں تھے۔ (متوفی ۲۵۵ھ) ان کی وفات کے وقت ابن جریر ۳۱ برس

کے تھے اور بغداد و کوفہ و بصرہ و فسطاط و مصر کے دورے میں تھے ۔ سمرقند نہیں گئے تھے کہ امام دارمی سے کوئی حدیث لیتے یا اُن کو کچھ دیتے ۔ تو ابوالحسن الدارقطنی تو بہت متأخر ہیں ۔ ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے ۔ ابن جریر کی وفات کے وقت چار برس کے تھے ۔ ۳۸۵ھ میں وفات پائی ۔ ان کی کتاب سُنن دارقطنی میں تو ابن جریر کی کوئی روایت ان کے کسی شاگرد کے ذریعے پہنچتی ۔ یہاں تک کہ ابوعبداللہ الحاکم صاحب مستدرک کو تو خود ابن حجر رح رافضی خبیث لسان المیزان میں لکھتے ہیں ۔ دارقطنی کے تلامذہ میں سے تھے متوفی ۴۰۵ھ باوجود شیعہ ہونے کے ابن جریر کی کوئی روایت بھی ان کی کتاب میں کسی کے ذریعے نہیں پہنچ سکی ۔ آخر سارے محدثین نے ان کا بائیکاٹ اور مکمل بائیکاٹ کیوں کر رکھا تھا؟ صرف حنبلیوں کا ظلم تو ان پر نہ تھا ۔ اگر ظلم تھا تو سارے محدثین کا تھا ۔ بلکہ یہ ایسے غالی سخت قسم کے شیعے تھے کہ اس وقت کے ان کے ہمعصر شیعوں نے بھی ان کا بائیکاٹ کر لیا تھا ۔ اسی وجہ سے کہ ان کے سابقے وضاعوں کذابوں ہی سے زیادہ تھے ۔ جہاں گئے چُن چُن کے جھوٹی حدیثیں گھڑنے والوں سے ملے ۔ کذابوں سے ملے اور انہیں سے حدیثیں اور روایتیں لیں یا خود گھڑ گھڑ کے لکھیں ۔ ان کو مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ سے تو کوئی دلچسپی تھی نہیں خدا جانے حج بھی کیا تھا یا نہیں ۔ نو برس کی عمر میں فراغت اور حفظ قرآن کے بعد کتابت حدیث شروع کر دی ۔ جیساکہ یاقوت حموی معجم الادباء میں لکھتے ہیں ۔ جو مبالغے سے خالی نہیں ہے ۔ حسب تصریح یاقوت حموی، طبری نے پہلے اپنے شہر کے محدثین سے حدیثیں لیں کن کن حضرات سے حدیثیں لیں ۔ اس کا ذکر یاقوت حموی نے نہیں کیا ہے ۔ اپنے شہر کے محدثین سے فارغ ہوئے تو بقول ابن حجر بارہ برس کی عمر میں گھر سے باہر نکلے[1] اور رَے پہنچے ۔ وہاں مشہور محدث محمد بن ادریس ابوحاتم الرازی[2] متوفی ۲۷۷ھ سے ملاقات کی ۔ ان سے ابن جریر کو طبرستان

---

[1] بارہ برس کی عمر میں انجان اور اجنبی جگہوں کا تنہا سفر وہ بھی مستقل سفر برسوں کا سفر قرین قیاس نہیں ہے ۔ یقیناً بیس برس سے کم عمر میں وطن سے باہر نہ نکلے ہوں گے ۔ [2] متولد ۱۹۵ھ

کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوئی اور ایک حدیث قیاس کے متعلق جو امام شعبہ سے مروی ہے وہ بھی حاصل کی جس کے بعد یہ وہاں سے اٹھے تو ان کو اپنے مزاج کے مطابق نہ پاکر پھر ان سے کچھ ربط رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ ابو حاتم بھی عجمی تھے، مائل بہ تشیع تھے لیکن وضاع وکذاب نہ تھے۔ نہ جان بوجھ کر جھوٹی حدیثیں روایت کرتے تھے۔ ابن جریر نے دیکھا کہ یہ میرے کام کے نہیں ہیں۔ اسلئے ان کو چھوڑ دیا اور گئے تو کس کے پاس محمدؐ بن حمید الرازی کے پاس جن کو تہذیب التہذیب صـ۹ صـ۱۲۹ ابن کثیر المناکیر و ردّی المذہب لکھا ہے اور لکھا ہے کہ دو شخصوں سے زیادہ کذب میں مہارت رکھنے والا میں نے نہیں دیکھا ہے۔

ایک تو سلیمان الشاذکونی دوسرے محمد بن حمید الرازی اور بھی بہت کچھ صـ۱۳۱ تک لکھا ہے اور میزانؐ الاعتدال میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے۔ کان کذّابًا لم یکن یحفظ القراٰن یہ کذاب تھا۔ اس کو قرآن حفظ نہ تھا۔ مگر ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ کان یحفظ حدیثہ کلّہ۔ یہ اپنی (گھڑی ہوئی) حدیثیں سب کی سب یاد رکھتا تھا۔ یعنے حافظے کی کمزوری نہ تھی۔ مگر قرآن مجید یاد رکھنے کی اس کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ اپنی من گھڑت حدیثیں روایت کرنے کے لئے ضرور یاد رکھنا تھا۔ غرض ابن جریر کو ایسے ہی استاد کی ضرورت تھی۔ گھر سے باہر نکلے اور رَے پہنچے تو اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق اپنا ایک اُستاد ڈھونڈھ نکالا۔

دوسرے صاحب جو وہاں ابن جریر کو ملے۔ وہ حسب بیان یاقوت حموی مثنیٰ بن ابراہیم الاَبلی تھے۔ یہ ایسے گمنام مفقود الخبر شخص ہیں جن کا ذکر تذکرۃ الحفّاظ میں ہے نہ تہذیبُ التہذیب میں، نہ میزانُ الاعتدال میں، نہ لسانُ المیزان میں، نہ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال میں، نہ تاریخ صغیر میں۔ ابن ابی حاتم کی کتابُ الجرح والتعدیل میرے پاس نہیں ہے اور نہ تاریخ بغداد ہے، نہ طبقات ابن سعد ہے۔ مگر مجھ کو یقین ہے کہ ان کتابوں میں بھی ان کا ذکر نہ ہوگا۔ سری بن یحییٰ التّمیمی کا ذکر بھی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ مگر عطاردی کی توثیق کے طفیل میں تاریخ بغداد میں

کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوئی اور ایک حدیث قیاس کے متعلق جو امام شعبہ سے مروی ہے وہ بھی حاصل کی۔ جس کے بعد یہ وہاں سے اٹھے تو ان کو اپنے مزاج کے مطابق نہ پاکر پھر ان سے کچھ ربط رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ ابو حاتم بھی عجمی تھے۔ مائل بہ تشیع تھے لیکن وضاع و کذاب نہ تھے۔ نہ جان بوجھ کر جھوٹی حدیثیں روایت کرتے تھے۔ ابن جریر نے دیکھا کہ یہ میرے کام کے نہیں ہیں۔ اسلئے ان کو چھوڑ دیا اور گئے تو کس کے پاس محمدؐ بن حمید الرازی کے پاس جن کو تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۱۲۹ میں کثیر المناکیر ردی المذہب لکھا ہے اور لکھا ہے کہ دو شخصوں سے زیادہ کذب میں مہارت رکھنے والا میں نے نہیں دیکھا ہے۔

ایک تو سلیمان الشاذ کوفی دوسرے محمد بن حمید الرازی اور بھی بہت کچھ ص۱۳۱ تک لکھا ہے اور میزانُ الاعتدال میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے۔ کان کذابًا لم یکن یحفظ القرآن یہ کذاب تھا۔ اس کو قرآن حفظ نہ تھا۔ مگر ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ کان یحفظ حدیثہ کلہ۔ یہ اپنی (گھڑی ہوئی) حدیثیں سب کی سب یاد رکھتا تھا۔ یعنی حافظے کی کمزوری نہ تھی۔ مگر قرآن مجید یاد رکھنے کی اس کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ اپنی من گھڑت حدیثیں روایت کرنے کے لئے ضرور یاد رکھتا تھا۔ غرض ابن جریر کو ایسے ہی استاد کی ضرورت تھی۔ گھر سے باہر نکلے اور رے پہنچے تو اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق اپنا ایک اُستاد ڈھونڈھ نکالا۔

دوسرے صاحب جو وہاں ابن جریر کو ملے۔ وہ حسب بیان یاقوت حموی مثنیٰ بن ابراہیم الآبلی تھے۔ یہ ایسے گمنام مفقود الخبر شخص ہیں جن کا ذکر تذکرۃ الحفاظ میں ہے نہ تہذیبُ التہذیب میں، نہ میزانُ الاعتدال میں، نہ لسانُ المیزان میں، نہ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال میں، نہ تاریخ صغیر میں۔ ابن ابی حاتم کی کتابُ الجرح والتعدیل میرے پاس نہیں ہے اور نہ تاریخ بغداد ہے، نہ طبقات ابن سعد ہے۔ مگر مجھ کو یقین ہے کہ ان کتابوں میں بھی ان کا ذکر نہ ہوگا۔ سری بن یحییٰ التمیمی کا ذکر بھی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ مگر عطاردی کی توثیق کے طفیل میں تاریخ بغداد میں

کہا تھا جس کو ایک کذّاب شیعے نے نقل کیا تھا۔ مگر اینٹیں اور مسالے کہاں کہاں سے لائے گئے۔ اس کو بھی سُن لیجیئے۔ ایک مشہور کذّاب جو حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ علی بن مجاہد اس نے بھی ایک کتاب المغازی لکھی تھی۔ یہ بھی کندیوں اور عبدیوں کا آزاد کردہ غلام تھا (تہذیب التہذیب جلد ۷ صہ ۳۷۷ صہ ۳۷۸ میں اس کا ترجمہ ہے۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

کان یضع الحدیث وکان صنف کتاب المغازی فکان یضع لِکلٍ اَسنادًا

یہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا اور کتابُ المغازی تصنیف کی تھی۔ ہر بیان کے لئے اسناد گھڑتا تھا۔ ۱۸۱ھ یا اس سے دو ایک سال بعد مرا۔ اس کی کتاب بھی ابن جریر نے حاصل کر لی۔ پھر واقدی، کلبی، ہشام، بن کلبی، ابُو مخنّف، سُدّی، کوفے کے شہرۂ آفاق رافضیوں، کذّابوں اور جھوٹی حدیثیں اور تاریخی روایتیں گھڑنے والوں کے ذخیرے بھی حاصل کئے۔ کتب الیَّ السری عن شعیب عن سیف بن عُمر۔

جو برابر ابن جریر لکھتے ہیں۔ یہ سیف بن عُمر کیسے ہیں اس کو بھی سُن لیجیئے ابن حجرؒ تہذیبُ التہذیب جلد ۴ صہ ۲۹۵ سے صہ ۲۹۶ تک ان کا ترجمہ لکھتے ہیں ابن حجرؒ اور حافظ ذہبی دونوں ان کو واقدی کے مثل گویا واقدی ثانی لکھتے ہیں۔ ضعیفُ الحدیث، متروکُ الحدیث، منکرالحدیث، راوی موضوعات اور خود جھوٹی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والا زندیق یعنی مُلحد، بے دین لکھا ہے جو شخص رسُولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی طرف جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر منسوب کر سکتا ہے۔ وہ کیا جھوٹے تاریخی واقعے نہیں گھڑ سکتا ہے؟ ایسے بے دین کذّاب کے بیان کردہ تاریخی واقعے کب قابل اعتبار ہو سکتے ہیں؟ انُہیں کذّابوں اور مُلحدوں کی روایتوں کا ذخیرہ تاریخ ابن جریر طبری ہے۔ ؏

قیاس کُن زگلستان او بہارش را

بعض ثقہ راویوں سے بھی ابن جریر نے ضرور حدیثیں اور خبریں لی ہوں گی۔ اس سے کون انکار کرتا ہے۔ مگر ان میں بھی کتنے ایسے ہیں کہ بغیر لقاء و سماع کے اُن کی

طرف بعض روایتیں منسوب کر دی گئی ہیں۔ شہاب الدین یاقوت حموی نے معجم الادباء میں (حسب تحریر[1] بعض اہلِ علم اعزہ سلّمہمُ اللہُ) لکھا ہے کہ ابنِ جریر رَے سے بصرہ پہنچے اور پھر ۲۵۳ھ میں فسطاط اور ۲۵۶ھ میں مصر پہنچے اور پھر بغداد گئے اور ۲۹۰ھ میں طبرستان اپنے وطن واپس گئے۔ میرے پاس معجم الادباء نہیں ہے اور باوجود کوشش کے نہ مل سکی۔ نورِ چشم مولانا قاری شاہ جعفر صاحب سلّمہُ اللہ کے خط سے اسی قدر معلوم ہوا جو لکھا۔ ایک دوسرے عزیز کو ہندوستان بھی خط لکھا تھا۔ ان کے خط سے بھی اسی قدر پتہ لگا۔ مگر ان کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ ابنِ جریر رَے سے پہلے مدینۃ الاسلام بغداد گئے۔ اور بغداد سے بصرہ آئے اور ہر جگہ موجود الوقت محدثین سے حدیثیں لیں۔ جیسے محمد بن موسیٰ الحرشی، محمد بن معن[2]۔ حماد بن موسیٰ القراز، بشر بن معاذ اور ابو الاشعث وغیرہم۔ اور محمد بن نشبان بن یزید القراز البصری سے بھی حدیثیں لیں۔ پھر کوفے کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا۔ ابو کریب محمد بن العلاء الہمدانی، ہناد بن السّری وغیرہم سے حدیثیں لیں۔ ابن جریر نے خود یہ بھی کہا تھا کہ میں نے مسند یعقوب بن ابراہیم الدَّورقی بھی لکھ ڈالی تھی۔ مگر اس کا کچھ حصّہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد ابنِ جریر مصر کیطرف گئے۔ فسطاط ہوتے ہوئے یہاں ابو الحسن بن السراج الطغری اس وقت موجود تھے اور ابو ابراہیم اسمٰعیل بن ابراہیم المزاقی[3] متوفی ۲۶۴ھ بھی موجود تھے۔ ان سے ان کی کتابُ الشّافعی لے کر نقل کی جس کو وہ حسن بن محمد بن الصّباح الزّعفرانی سے اور وہ امام شافعی سے روایت کرتے تھے اور ابن جریر نے اس کتاب کو ایک جماعت کے سامنے عراق میں پڑھا۔ ابنِ جریر ۲۵۶ھ میں مصر پہنچے تھے اور فسطاط کیطرف اس سے تین برس پہلے ۲۵۳ھ میں

---

[1] میرے پاس معجم الادباء نہیں ہے اور باوجود جستجو کے نہ مل سکی تو بعض اعزہ کو خط لکھا کہ اسکے خلاں خلاں مضامین نوٹ کر کے بھیجدیں۔ دو عزیزوں نے جو نوٹ بھیجے ہیں اُنہیں پر اعتماد کر کے لکھ رہا ہوں۔ [2] خط میں یہ نام اسی طرح پڑھا گیا۔ غالباً صحیح محمد بن مثنیٰ ہے۔ [3] خط میں جس طرح لکھا ہے میں نے نقل کر دیا مگر یہ لفظ میری

گئے تھے۔

ہندوستان والے اس خط میں بالتصریح حالات زیادہ ہیں۔ مگر دونوں خطوط سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ ابن جریر ۲۵۳ھ میں یعنے ۲۹ برس کی عمر میں فسطاط پہنچے تھے اور ۳۲ برس کی عمر میں مصر۔ وہ کوفے کس سنہ میں پہنچے تھے۔ اس کا پتہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ مولانا قاری شاہ جعفر سلمہ اللہ تعالے کے خط میں کوفے کا ذکر نہیں ہے۔ ہندوستان کے خط میں جو کچھ ہے۔ اس سے صاف پتہ ملتا ہے کہ ابن جریر بصرہ فسطاط اور مصر سے فارغ ہو کر کوفے پہنچے تھے۔ مصر سے امام شافعی کی کتاب لے کر عراق یعنے کوفے پہنچے تھے۔ اور وہاں لوگوں کو پڑھ کر سنائی تھی۔ اس لئے ۲۵۶ھ کے کئی برس بعد وہ کوفے پہنچے تھے۔ کیونکہ ۲۵۶ھ میں تو وہ مصر پہنچنے ہی تھے۔ مصر کے محدثین سے ملنے میں، ان سے حدیثیں لینے میں، امام شافعی والی پوری کتاب نقل کرنے میں یقیناً کافی وقت صرف ہوا ہوگا۔ قرینہ غالب ہے کہ وہ ۲۶۰ھ یا اس سے قبل یا بعد کوفے پہنچے تھے۔ اس کے بعد تیس برس کی طویل مدت انھوں نے کوفے میں گذار کر اور یہاں سے واقدی وابو مخنف وکلبی وسُدی وہشام بن کلبی اور سیف بن عمر کی من گھڑت تاریخی روایتوں کے ذخیرے نقل کر کر کے جمع کر لئے تو ۲۹۰ھ میں بغداد میں بیٹھ کر تفسیر بھی لکھنے لگے اور تاریخ بھی مدوّن کرنے لگے مگر اس کے لئے پھر کم سے کم تیس برس کی اور ضرورت تھی۔ مگر موت نے بیس برس سے زیادہ مہلت نہ دی۔ اور ۳۱۰ھ میں ۸۶ برس کی عمر پا کر وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہاں ان کے ساتھ کچھ تلامذہ بھی ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے ان کے ناتمام کام کو مکمل کر کے تفسیر ابن جریر کو ان کے منشاء کے مطابق مرتّب و مدوّن کر ڈالا۔ اس لئے تاریخ میں خصوصاً قال ابو جعفر اور بعض جگہ قال ابو جعفر رحمۃ اللہ اور صـ ۲۳۶ جلد چہارم تاریخ میں ہے۔ قال ابو جعفر الطبری رحمہ اللہ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کم سے کم تاریخ کو ضرور ان کے بعد ان کے شاگردوں نے مرتب و مدوّن کیا، وہ کون لوگ تھے کس قماش کے تھے۔ عالم الغیب ہی اس کو جانتا ہے۔

تاریخ ابن جریر

وفات ابن جریر کی وفات و دفن کے بارے میں خطیب بغدادی نے عجیب متضاد اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اس کو بھی لکھ دینا ضروری تھا جو اس مقالے میں درج نہ ہو سکا۔ خطیب کی "تاریخ بغداد" میرے پاس نہیں ہے مگر معجم الادباء میں بہ ضمن ترجمہ ابن جریر جو کچھ اسکے متعلق لکھا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔

قال غیر الخطیب و دُفن لیلاً خوفاً من العامّة لانہ کان یتّھم بالتشیع واَمّا الخطیب فانہٗ قال ولم یؤذن بہٖ احداً فاجتمع علیٰ جنازہٖ مَن لا یحصی عددہ الّا اللہ تعالیٰ وصلّی علیٰ قبرہٖ عدۃ شھوٍ لیلاً و نھاراً۔ ورثاہُ خلق کثیر من اھل الدّین والأدب

(مُعجمُ الأدباء ص۶۱)

خطیب کے سوا اساتذہ اہل سیر نے کہا ہے کہ ابن جریر عوام[1] کے خوف سے رات کے وقت (چپ چاپ) دفن کر دئے گئے۔ کیونکہ وہ تشیع کی وجہ سے بدنام تھے۔ مگر خطیب بغدادی نے کہا ہے کہ باوجود اس کے کہ کسی کو ان کی وفات کی خبر نہیں دی گئی۔ کوئی عام اعلان نہیں کیا گیا۔ پھر بھی ان کے جنازے پر اتنے لوگ جمع ہو گئے جن کی گنتی اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اور ان کی قبر پر مہینوں تک نماز جنازہ رات دن پڑھی گئی اور اہل دین و اہل ادب میں سے بہتروں نے ان کے مرثیے لکھے۔

خطیب بغدادی کی ولادت ۳۹۲ھ و وفات ۴۶۳ھ۔ وفات ابن جریر کے ۸۲ برس کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریر کے کسی دیکھنے والے کو بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ابن جریر کے جنازے میں کسی شریک ہونے والے کو کب دیکھا ہوگا۔ خطیب کی اس روایت کو ابن حجر نے بھی لسانُ المیزان جلد ۵ ص۱۰۲ میں بعبارتہ نقل کر دیا ہے۔ بروایت احمد بن کامل۔ غالباً خطیب نے بھی بروایت احمد بن کامل ہی بہ خلاف عقل جھوٹی داستان لکھی ہوگی۔

احمد بن کامل ابن جریر کے اہم شاگردوں میں سے ایک تھے ۲۶۰ھ میں پیدا

[1] شیعہ علماء اپنی کتابوں میں اہلسنت کو عامہ اور شیعوں کو خاصہ لکھا کرتے ہیں۔ ۱۰ ملئے ممکن ہے کہ یعقوب نے

ہوئے تھے۔ اور ۳۵۰ھ کے محرم میں وفات پائی۔ ابن جریر کے ارشد تلامذہ میں سمجھے
جاتے ہیں۔ انہیں سے ابن جریر کے حالات لوگ روایت کرتے ہیں۔ احمد بن کامل
کی وفات کے ۴۲ برس بعد خطیب پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے اگر خطیب نے بروایت
احمد بن کامل ہی ابن جریر کے جنازے و دفن کی داستان اپنی تاریخ میں لکھی ہے تو
خطیب اور احمد بن کامل کے درمیان کون تھا۔ اور ابن حجر تو سب سے متأخر ہیں۔
۷۷۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریر کی وفات کے ۴۶۳ برس بعد اور احمد
بن کامل کی وفات کے ۴۲۳ برس بعد اور وفات خطیب کے ۳۱۰ برس کے بعد
اس لئے ابن حجرؒ کا بغیر اسناد کے صرف بروایت احمد بن کامل لکھ دینا کوئی وزن
نہیں رکھتا۔ جب کہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ خطیبِ بغدادی کی
طرح یہ بھی ابن جریر کے عاشقوں میں سے ہیں۔ البتہ خطیب بیک واسطہ یا بہ دو
واسطہ احمد بن کامل سے روایت کر سکتے ہیں۔ مگر جب تک اس درمیانی راوی کا
نام سامنے نہ آئے۔ یہ روایت کی صداقت از رُوئے روایت تسلیم نہیں کی جا سکتی
اگرچہ احمد بن کامل ابن جریر کے شاگردِ رشید تھے۔ تو پھر ابن جریر ہی جیسے ہوں گے۔
مگر درایت کی رُو سے دیکھئے تو کس قدر خلاف عقل بات معلوم ہوتی ہے
ابن جریر بیشک بہت بڑے ادیب تھے۔ صحیح یا غلط تفسیر بھی متعدّد جلدوں
میں لکھ ڈالی اور متعدّد جلدوں میں تاریخ بھی مگر اُن کی زندگی میں اہل بغداد نے ان
کی کیا قدر کی؟ جو اُن کے مَرنے کے بعد سارے اہل شہر نے وہ عقیدت مندی
دکھائی جو نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم
کے ساتھ دکھلائی۔ نہ شیعوں نے حضرت علی رضؓ کے ساتھ دکھائی، نہ اپنے کسی اور
امام کے ساتھ۔ کیا محدثین بغداد نے ابن جریر سے حدیثیں سنیں اور ان سے روایت
کیں۔ کیا ان کی تفسیر محدثین و اکابر علماءِ بغداد میں ان کے وقت میں شرف قبول حاصل
کر سکی؟ کیا ان کی تاریخ کو ان کے وقت میں اکابر بغداد نے معتمد علیہ سمجھ کر ہاتھوں
ہاتھ لیا۔ جب تک وہ بغداد میں زندہ رہے۔ اُن کے تعلقات تو انہیں بغدادیوں

سے رہے۔ جو بغداد میں کذب وافتراء میں بدنام تھے۔ جہاں گئے ایسے ہی لوگوں سے تعلقات رکھے۔ بغداد میں کون سی ہر دلعزیزی ان کو جیتے جی حاصل تھی کہ مرنے کے بعد سارے شہر نے وہ عقیدتمندی دکھائی کہ صحابہ رضؓ کو اپنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ان کی وفات کے بعد دکھانے کی نہ سوجھی تھی [1] امام ابو حنیفہؒ امام مالک، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے معتقدین ان بزرگوں کی زندگی میں جس قدر تھے۔ اہلِ سِیَر کو معلوم ہے۔ ان بزرگوں کی ہر دلعزیزی کا عشرِ عشیر حصہ بھی ہر دلعزیزی میں سے ابن جریر کو اپنی زندگی میں نہ مل سکا۔ مرتے ہی یکا یک ہر دلعزیزی کا عام طوفان کس طرح اُمنڈ آیا؟ میں تو سمجھتا ہوں خطیب بغدادی کی تاریخ میں کسی نے ان کے بعد یہ الحاق کر دیا ہے۔ ورنہ خطیب جیسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ اسقدر مبالغہ آمیز روایت جس کے ہر جملے سے دروغ بافی نمایاں ہو رہی ہو۔ وہ خود کبھی لکھتے اور اگر لکھتے تو اس روایت کو لکھ کر اس کی تکذیب بھی ضرور کرتے۔

اور بالفرض تنہا خطیب نے ایسا لکھ دیا تو جب اسکے بالکل برعکس دوسرے اہلِ سیر لکھ رہے ہیں تو ایک جماعت کے قول کے مقابل ایک شخص واحد کا قول جماعت کے قول کے بالکل برعکس کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

باقی رہا خطیب کے ماسوا دوسرے اہلِ سِیَر نے جو کہا ہے۔ وہ واقعہ تو صحیح لکھا ہے۔ مگر محض مختصر اور جو وجہ اس کی لکھی ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ واقعہ مختصر اس اعتبار سے کہ ابن جریر کو ان کے اعزّہ و تلامذہ نے رات کے وقت ان کے مکان میں ہی دفن کر دیا تھا جیساکہ بعض اہل سیر نے لکھا ہے۔ اس کا ذکر خطیب نے نہیں کیا۔ مگر یہ بھی غلط ہی معلوم ہوتا ہے۔ غالباً غلط ہی سمجھ کر خطیب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور عوام کا خوف ان کے تشیّع کی وجہ سے بھی غلط ہے۔ بغداد میں متعدد شیعے محدّث تھے۔ جو کھلم کھلا شیعے تھے مگر کسی کے مرنے کے بعد عوام نے ان کے جنازے کے ساتھ کسی قسم کی نامناسب حرکت نہیں کی۔ ابن جریر تو

---

[1] یعنی مہینوں قبر پر نماز جنازہ دن رات پڑھنا۔

اپنے کو سنّی ظاہر کرتے تھے۔ صرف "تشیع قلیل" کی وجہ سے عوام ان کے جنازے کی بےحرمتی کیوں کرتے؟ اُن کی زندگی میں راہ چلتے جب کسی نے ان کے ساتھ کسی قسم کی شرارت نہ کی تو مرنے کے بعد ان کے جنازے کے ساتھ بُرا برتاؤ کرنا اس وقت کے مسلمانوں سے بعید از عقل ہے۔ اسی بغداد میں عباد بن العوام بن عمر الغلابی ابو سہل الواسطی ثم البغدادی (ولادت ۱۱۸ھ وفات ۱۸۵ھ) شیعہ محدث ابن جریر سے متقدم گذر چکے تھے اور علی بن جعد الجوہری البغدادی جو بنی ہاشم کے آزاد کردہ غلام اور کٹر شیعہ تھے۔ بغداد ہی میں رہتے تھے۔ جن کی ولادت ۱۳۶ھ کی اور وفات ۲۳۰ھ میں تھی۔ یہ بھی ابن جریر سے متقدم ہی تھے۔ ان کی وفات کے وقت ابن جریر چھ برس کے تھے۔ اسی طرح عبدالرحمٰن بن صالح العتکی الازدی الکوفی بغداد میں آ کر بس گئے تھے۔ متوفی ۲۳۵ھ جن کی وفات کے وقت ابن جریر گیارہ برس کے تھے۔ یہ بہت متعصب شیعہ تھے اُمّہات المؤمنین اور بعض صحابہ کرام رض کی تنقیص میں ایک کتاب لکھی تھی۔ ابن جریر کی ولادت کے قبل سے شیعہ محدثین بغداد میں اپنے وطن سے آ آ کر اقامت گزین ہوتے تھے۔ اگر بغداد کے عوام کے لئے ابن جریر پہلے شیعہ ہوتے جو بغداد میں آ کر بسے تھے یا سب شیعوں سے زیادہ بدزبان و تبرّا باز ہوتے تو کہا جا سکتا تھا۔ عوام کو ان سے چڑ سی تھی۔ ایسا ہوتا تو یقیناً عوام اُن کو ان کی زندگی ہی میں اتنا پریشان کرتے کہ ان کو بغداد چھوڑنا پڑتا۔ مگر نہ یہ پہلے شیعہ تھے۔ بغداد میں آ کر بسنے والے نہ کھلّم کھلّا بدزبان و تبرّا باز تھے۔ نہ ان کی زندگی میں کسی نے کبھی ان سے تعرّض کیا۔ تو پھر ان کے مرنے کے بعد ان کے جنازے کی بےحرمتی لوگ کیوں کرتے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ یہ چُپ چاپ رات کو دفن کر دیئے گئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ دن کو ان کا جنازہ لے کر قبرستان جاتے تو ان کے خاص اعزّہ و تلامذہ کے سوا شہر کا کوئی ممتاز شخص ان کے جنازے میں شریک نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ان کی تفسیر و تاریخ جن لوگوں نے دیکھی تھی ان کو محسوس کر لیا تھا۔ کہ یہ مشہور کذّابوں وضّاعوں سے روایت کرتے ہیں اور ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہیں جو ان کی ولادت سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے اور

جو روایتیں خود گھڑ گھڑ کے اسناد بنا بنا کر اپنی کتابوں میں لکھتے تھے۔ ایسی باتیں لکھتے ہیں جو ان کے سوا کوئی نہیں لکھتا۔ اسی لئے سارے محدثین نے ان کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ کوئی ثقہ محدث ان سے روایت نہیں کرتا تھا۔ اس کے سوا کوئی وجہ اُن کو رات کے وقت چپ چاپ دفن کر دینے کی نہیں ہو سکتی۔ اور گھر میں دفن کرنے کی بات بھی غلط ہے۔ دفن کئے گئے مقبرے ہی میں۔ مگر چپ چاپ رات کے وقت۔

البتہ ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ اکابر محدثین و مفسرین اس وقت بغداد میں جمع تھے۔ ابن جریر نے وضاعین و کذابین کی من گھڑت باتیں اپنی تفسیر و تاریخ میں اگر جھوٹی قصص اور ان کی تفسیر و تاریخ۔ اگر قابلِ اعتماد ان لوگوں کے نزدیک نہ تھی تو ان لوگوں نے خود کوئی صحیح تفسیر صحیح روایات و عالی اسناد سے اور صحیح تاریخ بھی لکھ کر ابن جریر کی تردید کیوں نہ کی۔ اور بعد والوں کو ابن جریر کے دام تزویر سے بچانے کی کوشش کیوں نہ کی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اکابر علماءِ بغداد نے ضرور ایسا کیا۔ چالیس جلدوں میں اور اسّی جلدوں میں تفسیر لکھی۔ تاریخ کی بھی کتابیں لکھیں۔ مگر مستعصم باللہ خلیفۂ بغداد نے جہاں ابن علقمی اور نصیر الدین طوسی کو اپنا معتمد علیہ وزیر مشیر بنا کر خلافتِ اسلامیہ کا خاتمہ کیا اور خود ہلاک ہوا۔ وہاں بغداد کے کتب خانوں کو بھی برباد کیا۔ ابن علقمی اور نصیر الدین طوسی نے تو پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ بغداد کو لٹوا کر یہاں کے کتب خانوں کو بھی دریا بُرد کرائیں گے۔ اس لئے اپنے مسلک کی کتابوں کو اپنے پسندیدہ نسخوں کو جن کتب خانوں سے پہلے نکلوا لے سکے۔ ان کو پہلے ہی نکلوا لیا۔ اور جن کو پہلے نہ نکلوا سکے ان کو جب علماء و محدثین کے گھروں سے کتابیں نکلوائی جانے لگیں۔ تو ان میں سے اپنے ہم خیالوں اور ہم مذہبوں کی تصنیفات کو چھانٹ کر رکھ لیا۔ اور باقی سب کتابوں کو دریا بُرد کرا دیا۔ جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اتنی کتابیں دریا میں ڈالی گئیں کہ بیچ دریا میں ایک سڑک بن گئی۔ جن پر اُدھر کا آدمی اِدھر اور اِدھر کا آدمی اُدھر جانے لگا۔ کیا صرف حکومت کے کتب خانے میں اسقدر کتابیں تھیں؟ محدثین و مفسرین

وفقہاء ذاتی کے کتب خانوں کی کتابیں بھی ان کے گھروں سے نکلوا کر دریا میں ڈالی گئیں۔ علماء رجال وسیر بعض مفسرین کی تفسیروں کا ذکر اپنی کتابوں میں کرتے ہیں۔ مگر وہ کتابیں دنیا سے مفقود ہیں۔ میری کتاب تراجم المفسرین میں ان کا ذکر ہے۔ مگر افسوس کہ وہ اب تک شائع نہ ہو سکی۔ اس لئے یہ کہنا کہ دوسرے لوگوں نے صحیح تفسیر اور صحیح تاریخ کیوں نہیں لکھی صحیح نہیں ہے۔ دوسروں نے ابن جریر سے متقدمین ومعاصرین ومتاخرین نے فتنۂ ہلاکو سے قبل تک بغداد میں کیا کیا کچھ نہ لکھا تھا۔ آخر اتنی کتابیں جن سے دریا پٹ جائے کہاں سے آئیں؟ اور کیا ان میں زیادہ تر کتابیں احادیث وتفسیر وتاریخ وسیر ہی کی نہ ہوں گی؟ اس وقت کے لوگ تو علم تفسیر وعلم حدیث ہی کو اصل علم سمجھتے تھے اور تاریخ وسیر تو ان کی روزمرہ کی چیز تھی۔ مگر ابن علقمی ونصیر الدین طوسی کی کورنمکی وغداری کی بدولت جہاں خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہوا۔ وہاں سارا اسلامی علمی ذخیرہ بھی دریا برد ہو کر رہ گیا۔ بغداد کے علمی ذخیروں میں وہی کتابیں رہ گئیں۔ جن کو ابن علقمی ونصیر الدین طوسی نے محفوظ رکھ لیا تھا جن میں ابن جریر کی تفسیر وتاریخ بھی تھی۔ یا چند ایسی کتابیں جو بعض غیر معروف لوگوں کے یہاں ہوں گی۔

ہلاکو خان کو ملک گیری سے غرض تھی نہ کہ کتابوں کے برباد کرنے سے کتابیں برباد کی گئیں صرف ابن علقمی ونصیر الدین طوسی کے اصرار سے ورنہ چنگیز خانی لشکر اور ہلاکو خان کو کتابوں سے اتنی عداوت کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

افشائے راز اللہ تعالےٰ بھلا کرے یاقوت حموی کا کہ انہوں نے اپنی کتاب معجم الادباء میں ابن جریر طبری کا مفصل حال لکھ کر اس راز کو فاش کر دیا۔ کہ ۲۵۶ھ سے پہلے جو بصری محدثین وفات پا چکے تھے اور ۲۶۰ھ سے پہلے جو کوفی محدثین وفات پا چکے تھے۔ ان سے ابن جریر کی روایتیں متصل نہیں ہو سکتی ہیں۔ ہنّاد بن السری، ابو ہمام ولید بن شجاع دونوں کی وفات ۲۴۳ھ میں ہے۔ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے ۱۷ برس پہلے جب ابن جریر صرف ۱۹ برس کے تھے۔ شاید اس وقت اپنے وطن سے باہر نکلے بھی نہ ہوں گے اور بقول ابن حجرؒ

باہر نکلے بھی ہوں گے تو محمد بن حمید الرازی سے رَے میں حدیثیں گھڑنے کا فن سیکھ رہے ہوں گے۔ اس وقت تو وہ احمد بن حماد الدُّولابی سے بھی نہ ملے ہوں گے اسی طرح بوین یعنے محمد بن سلیمان بن حبیب ابو عبداللہ المقتصی الکوفی متوفی ۲۴۵ھ ابُوالحسن علی بن محمد بن اسحٰق الطنافسی الکوفی، سفیان بن وکیع الکوفی متوفی ۲۴۷ھ وغیرہم ابن جریر کے بہت سے کوفی شیُوخ ایسے ملیں گے۔ جو ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے اور ان سے ابن جریر نے ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ بلکہ ان کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح ان کے بصری شیُوخ، ان کے مصری شیُوخ اور اُن کے بغدادی شیُوخ بھی ایسے کتنے ہوں گے جو ان کے پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے ہوں گے۔ ابن جریر نے ان کی صُورت تک دیکھی نہ ہوگی۔ مگر ابن جریر ان کے تلامذہ سے کچھ حدیثیں لے کر تلامذہ کے نام اُڑا کر بلا واسطہ ان سے روایت کرنے لگے اور بعض باتیں حسب ضرورت گھڑ کر ان سے روایت کرنے لگے۔

(۳)

آمدم برسرِ مقصد

یہاں تک جو کچھ میں نے لکھا اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ ناظرین اور ان کے ذریعے دوسرے لوگ خصوصًا ابنِ جریر کو اپنا امام ماننے والے حضرات ابن جریر کو پوری طرح جان لیں اور پہچان لیں۔ اسکے بعد میں اصل موضوع بحث پر آتا ہوں۔

میرا ایک دعوٰی تو یہ تھا کہ ابن جریر طبری مفسّر، مؤرخ شیعہ تھے۔ اس کو میں قطعی دلائل سے ثابت کرچکا۔ اور منکرین کے بے دلیل انکار کا بے دلیل ہونا بھی ثابت کرچکا۔ اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ منکرین کے دلائل کی تردید میں اپنے مفصّل مقالے میں کرچکا ہوں جو البیان امرتسر میں شائع ہو چکا ہے۔ دو ابن جریر تھے۔ اور عبد اللہ المامقانی کے نزدیک تین ابنِ جریر تھے۔ ہر ایک کا نام محمد، ہر ایک کی کنیت ابوجعفر، ہر ایک کے باپ کا نام جریر، ہر ایک طبرستان کے شہر آمل کا رہنے والا تھا اور تینوں ایک ہی زمانے میں ایک ہی ملک میں تھے۔ غالبًا شکل و صورت بھی تینوں کی ایک ہی تھی۔ اور تینوں بڑے عالم و ادیب تھے۔ دو ابن جریر کہنے والوں نے مفسّر و مؤرخ ابن جریر کے دادا کا نام یزید بتا کر لکھا کہ اس میں تھوڑا سا تشیع تھا اور دوسرے کے دادا کا نام رستم تھا۔ وہ پکّا شیعہ تھا۔ سنّی شیعہ دونوں فرقوں کے محدّثین جو ابن جریر کی وفات کے کئی سو برسوں بعد پیدا ہوئے تھے یہ کہنے لگے تھے۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخص تھا جس کا سابق مجوسی نام رستم تھا مسلمان ہوا تو اسلامی نام یزید رکھا گیا۔ مگر بعد کو چودھویں صدی کے شیعہ محدّث ایرانی نے تین ابن جریر قرار دیدیئے۔ میں نے اس کی پوری بحث بھی اپنے اسی مقالے میں کی ہے۔ اس وقت اس بحث کو دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس وقت میرا دوسرا سب سے اہم دعوٰی یہ ہے کہ ابن جریر جو اپنی تاریخ میں کتب الیّ السری عن شعیب عن سیف بن عمر لکھتے ہیں۔ یہ قطعًا جھوٹ ہے کسی سری نے ان کے پاس سیف کی من گھڑت باتیں شعیب کے واسطے سے روایت کر کے لکھ

لکھ کر نہیں بھیجی تھیں۔ میں نے دو ہی سری کا ذکر کیا تھا۔ چونکہ ابن جریر نے کہیں کہیں سری بن یحییٰ بھی لکھا تھا۔ اور تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، تقریب، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال، میزانُ الاعتدال، لسان المیزان، تعجیل المنفعۃ، انساب سمعانی اور تاریخ صغیر کسی میں بھی سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی کا دو لفظی ترجمہ بھی نہ تھا۔ ابن یحییٰ کی قید کے ساتھ سری بن یحییٰ البصری ہی کا ذکر تہذیبُ التہذیب و خلاصہ وغیرہ میں ہے۔ دو سری ولدیتوں کے ساتھ سری بن مسکین اور سری بن نعیم میں سے کسی کو کوئی تعلق شعیب بن ابراہیم یا سیف بن عمر سے نہ تھا۔ صرف سری بن اسمٰعیل الکوفی ہی تھے جو سَیف بن عُمر سے روایتی تعلق رکھتے تھے اس لئے میں نے لکھا کہ سری بن یحییٰ کہیئے تو وہ بصری تھے اور ایک محدث تھے۔ ان کو تاریخ و سیرت سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ صرف سری کہیئے تو سری بن اسمٰعیل ہی سیف بن عمر سے روایت بھی کرتے تھے۔ اس لئے سیف بن عمر کی روایتیں لکھ لکھ کر اگر کوئی سری بھیجتا تو یہی بھیجتے۔ مگر یہ دونوں سری ابن جریر کی پیدائش سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔

اب جب سری بن یحییٰ التمیمی کا نام سامنے آگیا ہے تو مناسب یہ ہے کہ پہلے ان کے خاندان سے ناظرین کو واقف کرا دوں۔ سری بن یحییٰ التمیمی الدارمی الکوفی کا شجرۂ نسب پہلے ملاحظہ فرمائیے۔

سری بن مصعب بن ابی بکر بن شبر بن صعفوق بن عمرو بن زرارہ بن عدس بن زائد بن عبد اللہ بن دارم التمیمی۔

ابو سری ہناد بن السری بن مصعب ہناد اکبر متوفی ۲۴۳ھ | یحییٰ بن السری بن مصعب

ابو عبیدہ سری بن یحییٰ التمیمی

ابو دارم محمد بن السری بن ابی عبیدہ سری بن یحییٰ یہ اپنے والد سے ان کے تشیع کے باعث الگ رہے۔ وہ اپنے چچیرے دادا ہناد کبیر سے روایت کرتے تھے مگر جوانمرگ مرے۔

ابو سری ہناد بن ابی عبیدہ سری بن یحییٰ ہناد اصغر یہ اپنے باپ کے ہم مسلک تھے۔ اپنے چچیرے دادا ہناد اکبر سے روایت نہیں کرتے تھے۔ متوفی ۳۳۲ھ

ابو بکر احمد بن محمد بن ابی عبیدہ سری بن یحییٰ متوفی ۳۵۷ھ۔ ان کو باپ شیر خوار چھوڑ کر وفات

پا گئے۔ دادا اور پھر چچا کی گودوں میں پلے تو پھر نہایت غالی شیعہ ہو کر مرے۔

یہ تو ابو عبیدہ سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی کا مختصر سا خاندانی شجرہ ہوا۔ یہ ابو عبیدہ اپنے کاروبار تجارت میں مصروف رہے مگر اپنے چچا ہناد اکبر سے مذہبی اختلاف کی وجہ سے ان کے دیکھا دیکھی کبھی کبھی کوفی شیعوں سے سُن سُن کر کچھ روایت بھی بعض عوام کے سامنے کیا کرتے تھے۔ مگر ان کے بیٹے ہناد اصغر کے سوا کسی نے کبھی ان کی روایتوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ اسلئے یہ گم نام ہی رہے اور چونکہ جو حدیثیں یہ روایت کرتے تھے۔ وہ شیعوں ہی سے سن کر۔ اس لئے اہل سنت کی نظروں سے بالکل گرے رہے۔ ان کو باہر کے لوگ جانتے بھی تھے۔ تو ان کے چچا ہناد کی وجہ سے۔ کتابوں میں بھی ان کا ذکر کہیں آگیا ہے تو "ابن اخی ہناد" کے لفظ کے ساتھ۔ یعنی ہناد کے بھتیجے" ائمہ رجال میں سے کسی نے بھی ان کا ترجمہ اپنی کتاب میں نہیں لکھا۔ ان کا ذکر ضمناً آگیا ہے اُن کے شیعے بیٹے یا ان کے سنی بیٹے یا ان کے شیعہ پوتے کے ذکر میں ان کا نام ضرور مذکور ہو گیا ہے۔ مگر خود ان کا ترجمہ مطلق کسی کتاب میں مذکور نہیں۔ چونکہ یہ بھی تمیمی تھے اور ابن ابی حاتم رازی بھی تمیمی تھے۔ دونوں کے درمیان کچھ قرابت بھی ہو تو کیا عجب ہے۔

جب ابن ابی حاتم کتاب الجرح والتعدیل لکھنے لگے تو محدثین کوفہ کا حال بھی لکھنا ضروری تھا۔ ابو عبیدہ سری بن یحییٰ کے چچا ہناد بن سری مشہور محدث تھے۔ ان کے حالات بھی ان کو لکھنا تھے۔ ابو عبیدہ کو جو خبر ملی تو ان کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ کہ کاش کسی طرح میرا ذکر بھی اس کتاب میں آجاتا تو انہوں نے کچھ حدیثیں اہل سنت کی اِدھر اُدھر سے لے کر اپنی روایت سے ابن ابی حاتم کے پاس بھیج دیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر بلا طلب محض تحفتاً یا رشوۃً جو حدیثیں بھیجی ہوں گی۔ منتخب اور صحیح حدیثیں ہی بھیجی ہوں گی یا ممکن ہے کہ اپنے چچا ہناد بن سری ہی کی حدیثوں میں سے کچھ حدیثیں بھیج دی ہوں اپنے نام سے۔ ابن ابی حاتم نے اس تحفے کا شکریہ اس طرح ادا کر دیا کہ ان کا نام اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں درج کر لیا۔ اس لئے بھی کہ انہوں نے اپنا تعارف ضرور کرایا ہو گا۔ ہناد بن السری کا ذکر کر کے کہ میں ان کا بھتیجا ہوں۔ مگر نہ ان حدیثوں کو انہوں نے اپنی

کتاب میں درج کیا نہ ان حدیثوں کی وہ وجادۃً اپنے تلامذہ سے روایت کرنے لگے۔
ابن ابی حاتم خود لکھتے ہیں کہ مجھ کو ان سے بگوش خود کچھ سننے کا موقع نہ ملا۔ یعنی دونوں میں لقاء بھی نہ تھی۔ صرف ہناد بن السّری کے بھتیجے ہونے کے باعث اور جو حدیثیں بھیجی تھیں۔ وہ بھی سچی ہی نظر آرہی تھیں۔ اسلئے اتنا لکھ کر کہ ان سے کچھ سننے کا موقع تو نہیں ملا۔ مگر انہوں نے خود میرے پاس کچھ اپنی حدیثیں بھیج دی تھیں۔ اس لئے صدوق یعنے سچے ہیں۔ کوئی اس کی مدح سمجھے تو سمجھے، میں تو اس کو قدح ہی سمجھتا ہوں یہ تعدیل نہیں ہے بلکہ جرح ہے۔ کیا کوئی مثال ایسی پیش کی جا سکتی ہے کہ بلا طلب کسی نے کسی ایسے شخص کے پاس اپنی حدیثیں بھیج دی ہوں جس سے ملاقات تک نہ ہو؟ اگر پہلے کی ملاقات ہوتی تو یقیناً ابن ابی حاتم اس کا ذکر کرتے۔ ابن ابی حاتم نے یہ لکھ کر کہ انہوں نے اپنی کچھ حدیثیں میرے پاس بھیج دی تھیں۔ ان سے کچھ سننے کا اتفاق مجھ کو نہیں ہوا۔ یہ ظاہر کر دیا کہ یہ شہرت طلب تھے۔ محدثین کے حالات پر مشتمل کتاب لکھی جا رہی ہے۔ یہ سن کر انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ کسی طرح ان کا نام بھی کتاب میں درج ہو جائے۔ جو حدیثیں بھیجی تھیں وہ ان کے نزدیک سچی تھیں۔ اس لئے ان کے لئے آخر میں صدوق لکھ دیا۔ بس صرف ایک ابن حاتم کے صدوق لکھ دینے سے وہ بھی بغیر سماع و لقا کے سری بن یحییٰ التمیمی الکوفی ثقۃٌ و ثبتٌ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ لکھ کر کہ ان سے کچھ سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ابن ابی حاتم نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ صدوق بھی محض رعانتی ہے

غرض ابن ابی حاتم کا اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں ان کا اس حقیر طرح سے ذکر۔ نہ ان کے لئے باعث فخر ہے۔ نہ اس کو پیش کرنے والے اس ذکر سے ان کی کوئی امتیازی حیثیت ثابت کر سکتے ہیں۔ باقی رہا تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی نے جو ان کا ذکر عطاردی کی وثاقت کی شہادت میں پیش کیا ہے۔ وہ ایک ضمنی ذکر ہے۔
احمد بن عبدالجبار العطاردی الکوفی ایک مجروح راوی تھے۔ ان پر محدثین ہمعصر کا الزام تھا کہ یہ ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہیں جن سے ان کی لقاء وسماع ثابت نہیں ہے

بلکہ متقدمین سے بلا واسطہ روایت کرتے ہیں. جن کو انہوں نے عقل وشعور کی عمر میں دیکھا بھی نہیں۔ اس الزام کی تردید میں ایک شہادت تو ابوکریب محمد بن العلا الکوفی الہمدانی کی پیش کی ہے کہ ابوبکر بن عیاش سے عطاردی نے حدیثیں سنی ہیں. ابوکریب الکوفی ایک مشہور محدّث ہیں. بخاری ومسلم وغیرہ ساری کتب حدیث میں ان سے روائتیں ہیں. مگر صرف ایک وہ بھی فقط سماع کی شہادت کافی نہ تھی۔ وثاقت وعدالت کی بھی شہادت کی ضرورت تھی اور کسی مشہور محدّث کی شہادت تو نہ مل سکی. مگر ایک مشہور محدث ہناد بن السری کے بھتیجے یعنی سری بن یحییٰ ابوعبیدہ ہی کی شہادت پیش کر دی۔ کہ یہ عطاردی کے ہم طبقہ، ہم سن، ہم وطن بھی تھے۔ اور دونوں میں تعلقات یارانہ بھی تھے۔ ابوکریب کو تو سب جانتے ہیں کہ وہ ایک مشہور محدث ہیں. مگر ابوعبیدہ سری بن یحییٰ کو تو جو بھی جانتا ہے۔ اسی قدر جانتا ہے کہ یہ ہناد بن سری کے بھتیجے ہیں. خود کیا ہیں؟ خود تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ پھر ان کی شہادت کی کیا اہمیت ہو گی. اسی لئے ان کے بارے میں بھی خطیب نے لکھ دیا ہے کہ ابوکریب ہی بڑے محدّث نہیں ہیں. شیخ جلیل ثقہ یہ بھی ایک بزرگ شیخ اور ثقہ ہیں۔ تاکہ ان کی شہادت عطاردی کے حق میں مفید سمجھی جائے تو ان کی شہادت سے عطاردی ثقہ ثابت کئے گئے اور عطاردی کے حق میں شہادت دینے کی بدولت یہ ابوعبیدہ سری بن یحییٰ الشیخ جلیل ثقہ بن گئے۔ اگر دو سو برس کے بعد یعنی خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ تھے. اور یہ ابوعبیدہ سری بن یحییٰ بقول خطیب عطاردی کے ہم طبقہ تھے۔ عطاردی کی سماعت کی شہادت ابوکریب نے دی ہے کہ ابوبکر بن عیاش سے عطاردی نے حدیثیں سُنی ہیں۔ ابوکریب متوفی ۲۴۸ھ اور ابوبکر بن عیاش متوفی ۱۹۳ھ خود عطاردی متولد ۱۷۷ھ اور متوفی ۲۷۲ھ

ابوعبیدہ سری بن یحییٰ عطاردی سے کچھ بڑے یا کچھ چھوٹے تھے یا ہم سن تھے ۲۷۰ھ سے ۲۷۵ھ کے درمیان ان کی وفات کا تخمینہ[1] ہے۔ غور کیجئے۔ ابوعبیدہ سری بن یحییٰ

---

[1] ایک معترض صاحب نے سری بن یحییٰ الکوفی کا سال وفات تقریباً ۲۸۰ھ بلا دلیل لکھا ہے۔ جب وہ عطاردی کے ہم طبقہ تھے۔ تو اس سے دونوں کی پیدائش کا سال ایک یا کچھ آگے یا کچھ پیچھے ہو سکتا ہے

تو خطیب سے پہلے کسی نے رعایتہً صرف ثقہ بلکہ لاباس بہ بھی نہیں کہا۔ جو ایک ہلکی سی جرح ہے کسی نے ان کو منہ تک نہیں لگایا۔ اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ محدثین کے زمرے میں ان کا ذکر کیا جائے۔ ان کے بعد سو برس تک کسی نے ابن ابی حاتم کے سوا کبھی ان کا نام تک نہ لیا دو سو برس کے بعد عطاردی کے ثقہ کہہ دینے کی بدولت خطیب کی زبان قلم سے شیخ جلیل ثقہ بن گئے۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

یہ تو ابوعبیدہ سری بن یحییٰ التیمی الکوفی کا تعارف ہوا[1] تو اب اصل بحث یہ ہے کہ ابن جریر جو اپنی تاریخ میں کتب الی السری لکھتے رہے ہیں۔ وہ سری یہ ابوعبیدہ سری بن یحییٰ التیمی ہی ہیں۔ یا یہ بھی نہیں ہو سکتے۔ ؟

ابن جریر ۲۵۳ھ میں مصر پہنچے تھے۔ وہاں کئی برس رہے۔ وہاں کے محدثین سے ملے ان سے حدیثیں حاصل کیں۔ جو محدثین ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وفات ممکن ہے کہ دس برس پہلے ہو یا بعد۔ سری بن یحییٰ کے تین ہی شیخ ابن ابی حاتم نے لکھے ہیں۔ تینوں کی وفات ۲۲۰ھ سے پہلے ہے۔ ان کے تلامذہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس سے تو قرینہ اس کا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۲۴۰ھ کے اندر ہی وفات پا گئے۔ ورنہ ۲۲۰ھ کے بعد وفات پانے والے ان کے کچھ شیخ اور ضرور ہوتے اگر ابن ابی حاتم یہ نہ لکھتے کہ انہوں نے کچھ حدیثیں اپنی میرے پاس بھیج دی تھیں۔ تو میں ان کا سال وفات ۲۴۰ھ ہی قرار دیتا۔ ابن ابی حاتم متولد ۲۴۰ھ متوفی ۳۲۷ھ کے پاس غالباً ۲۶۵ھ ۲۶۸ھ میں سری بن یحییٰ نے اپنی کچھ حدیثیں بھیجی ہوں گی اور ۲۷۰ھ کے بعد ۲۷۵ھ سے پہلے سری بن یحییٰ کی وفات ہوئی۔ ۲۸۰ھ کا تو کوئی قرینہ ہی نہیں ہے (علامہ صاحب کا یہ مختصر مقالہ ابتداء میں شائع ہوا تھا اس پر کسی صاحب نے تنقید کی تھی۔ جو ہفت وار "الاعتصام" میں شائع ہوئی تھی۔ اس مقالہ میں معترض سے مراد وہی صاحب ہے۔ (ناشر)

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) اس تعارف سے ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ ابن ابی حاتم کے سوا سارے ائمہ رجال نے ان کو مرفوع القلم کیوں سمجھا اور میرا ذہن ان کی طرف کیوں نہ گیا۔

ان کے تلامذہ سے ملے اور ان سے حدیثیں لیں۔ ابراہیم بن اسمٰعیل المرانی متوفی ۲۶۴ھ سے ملے۔ ان سے کتاب الشافعی پڑھی۔ پھر پوری کتاب کی نقل حاصل کی۔ کیا اس میں تین چار برس نہیں صرف ہوئے ہوں گے۔ اس بناء پر بگمان غالب ابن جریر مصر سے کوفہ ۲۷۰ھ میں یا اس سے کچھ قبل یا بعد پہنچے ہوں گے۔ مصر کے بعد کوفہ پہنچے تھے۔ اس کی دلیل یاقوت حموی کے بیان سے میں لکھ چکا کہ مصر سے ابن جریر کتاب الشافعی کی نقل کوفے لائے تھے۔ اور اس کتاب کو عراق یعنی کوفے میں انہوں نے کچھ محدثین کے سامنے پڑھا تھا۔

یعقوب بن ابراہیم الدورقی کی وفات ۲۵۲ھ میں ہوئی تھی۔ وہ بغدادی تھے ابن جریر اگر رَے سے چل کر پہلے بغداد پہنچے ہیں تو ممکن ہے کہ ان سے ملے ہوں اور ان سے ان کی مُسند کی نقل لی ہے۔ ورنہ اگر کوفے سے فارغ ہو کر وہ بغداد پہنچے اور بغداد سے اپنے وطن طبرستان ۲۹۰ھ میں واپس گئے تھے۔ تو یعقوب بن ابراہیم الدورقی سے ان کی ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔ انہوں نے الدورقی کی مسند کی صرف نقل حاصل کر لی تھی اور اس مسند سے حدیثیں نقل کر کر کے حدثنا یعقوب بن ابراہیم اپنی کتابوں میں لکھتے رہے ہے۔ ان کی مسند ان کو اُن کے کسی شاگرد سے مل گئی ہوگی۔

تو کوفے میں جب ۲۷۰ھ میں یا اس کے کچھ قبل یا کچھ بعد ابن جریر پہنچے تھے۔ تو عطاردی متوفی ۲۷۲ھ سے اور سری بن یحییٰ تقریباً متوفی ۲۷۱ھ سے ضرور ملاقات کر سکے ہوں گے۔ دو برس کا وقت کافی وقت ہے۔ مگر صرف عطاردی اور سری بن یحییٰ التیمی ہی سے تو ان کی ہوس پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ وہاں کے بہت سے محدثین سے ان کو ملنا تھا۔ اور جو محدثین ان کی تشریف آوری سے پہلے وفات پا چکے تھے ان کے تلامذہ سے مل مل کر ان لوگوں سے حدیثیں لینی تھیں۔

غرض بعض حدیثیں یا بعض تاریخی روایتیں جو ابن جریر حدثنا کر کے عطاردی سے یا سری بن یحییٰ التیمی سے تفسیر یا اپنی تاریخ میں روایت کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح ہوں۔ عطاردی تو بُرے یا بھلے ایک محدث تھے بھی۔ سری بن یحییٰ کا تو

نہ محدثین میں شمار تھا نہ مؤرخین میں۔ مگر محدثین کے ماحول میں ضرور رہے تھے۔ اپنے چچا ہناد بن سری سے مذہبی اختلاف تھا۔ مگر قرابت کے تعلقات تو قائم تھے۔ اسلئے محدثین کی صحبت میں برابر حدیثیں سنا کرتے تھے۔ جو بادرہ جاتی تھیں۔ ان کو روایت بھی کرتے تھے۔ مگر ان کی روایت پر کسی کو اعتماد نہ تھا۔ اس لئے ان کے ایک بیٹے ہناد اصغر کے سوا جوان کا ہم مسلک تھا کسی نے بھی ان سے سنی ہوئی حدیث ان کی وساطت سے کہیں روایت نہیں کی۔ ابن جریر بڑے ذہین و ذکی اور مردم شناس تھے۔
انہوں نے سری بن یحییٰ کی کسمپرسی کا اندازہ بھی ضرور کر لیا ہوگا اور جس وقت ابن جریر کوفے پہنچے تھے۔ اس وقت سری بن یحییٰ ابو عبیدہ کی عمر نوّے برس سے زیادہ ہو چکی تھی وہ تو روایت کے بھی کام کے اس وقت نہ رہے ہوں گے۔ اگر واقعی اس وقت تک زندہ ہوں گے۔ یعنی سری بن یحییٰ ابو عبیدہ خود تو ایک مجہول الحال شخص ہیں عطاردی کے طفیل میں ان کا ذکر خطیب نے کر دیا۔ اور ان کو عطاردی کا ہم طبقہ لکھ دیا۔ تو بس صرف اس "ہم طبقہ" کے لفظ سے ان کو عطاردی کا ہمسن سمجھ لیا گیا۔ جس سے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ عطاردی کی ولادت ۱۸۲ھ میں ہوئی تھی۔ تو ان کی ولادت بھی عطاردی کے کچھ قبل یا کچھ بعد ہوئی ہو۔[۲] یہ تو ہم طبقہ ہونے کے لئے ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ عطاردی سے دس بارہ برس پہلے ہی سری بن یحییٰ کی وفات ہو گئی ہو[۳] اور ابن جریر سری بن یحییٰ کی وفات کے بعد کوفے پہنچے ہوں۔ اس کا امکان کہ عطاردی کی وفات سے کم و بیش قبل سری بن یحییٰ کی وفات ہوئی۔ زیادہ ہے۔ بخلاف اسکے کہ سری بن یحییٰ عطاردی کی وفات کے آٹھ دس برس کے بعد مرے ہوں۔ اسلئے کہ عطاردی نے تو ۹۵ برس کی عمر پا کر وفات پائی تھی۔ اور سری بن یحییٰ عطاردی کے تقریباً ہم عمر تھے۔ تو اب ۹۵ برس کے بعد آٹھ دس برس اور زندہ رہتے ہوں۔ اس کی بہت کم امید ہے اگر ایسا ہوتا تو ان کی طویل العمری ایک ذریعہ اس کا ہو جاتی کہ ان کا سال وفات لوگ لکھ دیتے۔ یا کم سے کم اتنا لکھتے کہ یہ سو برس سے زیادہ عمر پا کر مرے۔ جیسا کہ اکثر طویل العمر راویوں کے بارے میں ائمہ رجال لکھ دیتے ہیں

---

[۲] ۱۸۲ھ ہی میں یا کچھ قبل یا بعد ہوئی ہو۔

[۳] یا دونوں شاید ایک سن کے پیدا ہوں۔ مگر دونوں کی وفات بھی ایک ہی

غرض دو ہی باتوں کا امکان ہے کہ یا تو سری بن یحییٰ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے جس کا قرینہ زیادہ ہے۔ دوسری ممکن بات یہ ہے کہ جس وقت ابن جریر کوفہ پہنچے تھے۔ سری بن یحییٰ اس وقت زندہ تو ہوں۔ مگر نوّے برس سے زیادہ عمر کے شیخ فانی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ۹۰، ۹۵ بلکہ کسی سو برس سے زیادہ عمر کے محدث سے کچھ حدیثیں کچھ روایتیں کوئی سن لے۔ اس لئے جو روایتیں تاریخ یا تفسیر میں ابن جریر نے سری بن یحییٰ التمیمی سے مروی لکھی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان سے سنی ہوں وہ حدیثیں اور وہ روایتیں درحقیقت صحیح ہوں یا غلط۔ مگر اس کا امکان ضرور ہے کہ ابن جریر کے کوفے پہنچنے کے وقت سری بن یحییٰ زندہ ہوں اور ابن جریر نے ان سے کچھ حدیثیں سُنی ہوں اور شاید کچھ تاریخی خبریں بھی۔ مجھ کو اس سے انکار پر اصرار نہیں ہے اور نہ یہ میرا موضوع بحث ہے۔ میں نے یہ کہاں لکھا ہے کہ کسی سری سے ابن جریر روایت نہیں کر سکتے۔

میرا دعویٰ تو اسی قدر ہے کہ ابن جریر جو کتب الی السری لکھتے ہیں۔ غلط لکھتے ہیں۔ جھوٹ لکھتے ہیں۔ ابن جریر جب کوفہ پہنچے تھے اس وقت سری بن یحییٰ زندہ بھی تھے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر زندہ بھی تھے۔ تو جب وہ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے کے وقت یعنی ۲۷۰ھ کے لگ بھگ نوّے برس سے کچھ زیادہ ہی عمر کے تھے تو جب ابن جریر ۲۹۰ھ میں طبرستان واپس پہنچے تھے۔ کیا اس بیس برس کی مدت کے درمیان بھی سری بن یحییٰ التمیمی زندہ ہی تھے؟ اگر زندہ رہ گئے تھے تو ۲۹۰ھ میں جس وقت ابن جریر طبرستان واپس جا رہے تھے۔ سری بن یحییٰ ایک سو دس برس کے ہو چکے ہوں گے۔ کیا ایک سو دس برس کے شیخ فانی سے یہ توقع کوئی صاحب عقل کر سکتا ہے کہ وہ شعیب بن ابراہیم الکوفی سے لے لے کر سیف بن عمر کذاب زندیق کی من گھڑت تاریخی روایتیں کوفے سے لکھ لکھ کر کئی برس تک ابن جریر کے پاس طبرستان بھیجتا رہے؟

سری بن یحییٰ اور شعیب و سیف روایت بھی مقولہ اضافت سے

سے ہے۔ اہلِ علم اس علمی اصطلاح سے واقف ہیں۔ روایت کا تعلق تین شخصوں سے ہوتا ہے۔ ایک راوی ہے۔ دوسرا مروی لہٗ ہے۔ یعنی راوی جس کے سامنے روایت کر رہا ہے۔ تیسرا مروی عنہ ہے۔ یعنی راوی جس سے روایت کر رہا ہے ابن جریر کا دعویٰ ہے کہ سری بن یحییٰ التیمی الکوفی راوی بالکتابت تھے۔ یعنی روایتیں لکھ لکھ کر ان کے پاس کوفے سے طبرستان بھیجا کرتے تھے۔ ابن جریر ان کے مروی لہٗ تھے کہ وہ ان کے پاس لکھ لکھ کر بھیجتے تھے اور شعیب بن ابراہیم الکوفی التیمی مروی عنہ تھے کہ سری بن یحییٰ التیمی شعیب بن ابراہیم ہی سے سیف کی گھڑی ہوئی تاریخی کہانیاں لکھ لکھ کر ابن جریر کے پاس بھیجتے تھے۔ یا شعیب سے جو کچھ انہوں نے کسی زمانے میں سنا تھا اس کو لکھ لکھ کر بھیج رہے تھے تو مروی لہٗ ہونے کا دعویٰ ابن جریر کو ہے۔ اور سری بن یحییٰ کا وجود بھی ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل سے اور تاریخ بغداد سے ثابت ہو رہا ہے۔ مگر غور کیجئے کہ ابن ابی حاتم کیا یہ لکھتے ہیں کہ جس طرح شعیب بن ابراہیم الکوفی کو ائمۂ رجال نے سیف بن عمر کا راوی اخبار و حدیث اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ اسی طرح شعیب کے راوی اخبار سری بن یحییٰ التیمی تھے؟ انہوں نے سری بن یحییٰ التیمی کا شاگرد یا راوی اخبار ابن جریر کو لکھا؟ ابن ابی حاتم متولد ۲۴۰ھ متوفی ۳۲۷ھ اور ابو حاتم اور ابن ابی حاتم الرازی یہ دونوں باپ بیٹے مائل بہ تشیع بھی تھے ابن ابی حاتم نے مشہور شیعہ محدث و قاری فضل بن شاذان سے خاص طور سے قرآن مجید پڑھا تھا۔ جس کا ذکر ابن حجر نے ان کے ترجمے میں کیا ہے۔ دیکھئے تہذیب التہذیب و لسان المیزان مگر یہ لوگ خود جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے اور جھوٹی حدیثیں قصداً روایت کرنے والے نہ تھے۔ اس لئے ابن جریر کے تعلقات ان دونوں باپ بیٹے سے نہ رہے۔ باوجود اس کے کہ ابن جریر برسوں ان کے وطن رے میں اُن کے پڑوس میں رہے ہیں۔ غرض ابن ابی حاتم ابن جریر سے ناواقف ہوں۔ ممکن نہیں۔ وہ ابن جریر سے ۱۶ برس چھوٹے تھے۔ جب ابن جریر رے میں محمد بن حمید الرازی

وغیرہ کی صحبت میں تھے۔ اسی زمانے میں یہ پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریر کی وفات سے ۷ برس بعد وفات پائی۔ اس لئے ابن جریر کی تفسیر و تاریخ ضرور دیکھی ہوگی۔ ابن جریر کے شاگردوں سے خصوصًا احمد بن کامل سے ان کے تعلقات ضرور رہوں گے ابن جریر کے کتب الی السری لکھنے کی ان کو ضرور خبر مل گئی ہوگی۔ اگر وہ یہ سمجھتے یا ابن جریر کے تلامذہ میں سے کسی سے بھی سُن لیتے کہ یہ سری وہی سری بن یحیٰی التمیمی الکوفی ہیں جن کا ذکر ہم نے اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں کیا ہے تو وہ ضرور اپنی کتاب میں اس کا ذکر کر دیتے۔

تعجب اور سخت تعجب تو خطیب بغدادی متولد ۳۹۲ھ ومتوفی ۴۶۳ھ پر ہے کہ انہوں نے سری بن یحیٰی کو جو دو سو برس کے بعد شیخ جلیل ثقہ کی سرٹیفکیٹ عطا فرمائی۔ اسکے ثبوت میں وکان من تلامذتہ ابن جریر الطبری بھی کیوں نہ لکھ دیا؟ اس سے تو عطاردی کے حق میں ان کی گواہی اور بھی معتبر تر ہو جاتی۔ اس لئے ابن جریر کا ان کا مروی نہ ہونا فقط ابن جریر ہی کی تحریر سے دعوٰی بلا دلیل و بلا گواہ ہے۔ خود مدعی خود گواہ ہے۔ اپنے دعوٰی کی دلیل خود اپنا بیان۔

سب سے تعجب تو یہ ہے کہ نہ ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں ان کو شعیب بن ابراہیم کا راوی یا تلمیذ لکھا اور نہ خطیب نے لکھا خطیب کے کتب خانے میں تو ابن جریر کی تفسیر و تاریخ دونوں ہی ہوں گی اور یقینًا خطیب نے دونوں کتابوں کا خوب سیر کی ہوگی۔ سری بن یحیٰی التمیمی کا ذکر تو کرنا۔ مگر نہ ان کے شاگرد رشید بلکہ اکلوتے بیٹے ابن جریر کا ان کے نام کے ساتھ ذکر کرنا، نہ ان کے اتنے بڑے شیخ التاریخ شعیب بن ابراہیم کا ان کیساتھ ذکر کرنا۔ چہ معنے دارد۔؟

ابن ابی حاتم نے فقط ان کا ذکر کر کے چھوڑ دیا ہوتا تو سمجھا جاتا کہ مقصود فقط انہیں کا ذکر تھا۔ اسلئے ان کے شیوخ و تلامذہ کا ذکر چھوڑ دیا۔ ابن ابی حاتم نے ان کے شیوخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ روی عن قبیصۃ وابی غسان وعثمان بن زفر

قبیصۃ بن عقبۃ السُّوائی الکوفی متوفی ۲۱۳ھ یا ۲۱۵ھ۔ ابوغسان الہندی

مالک بن اسمٰعیل الکوفی متوفی ۲۱۹ھ یہ شیعہ تھے۔ اور عثمان بن زفر بن مزاحم التیمی الکوفی متوفی ۲۱۸ھ سے روایت کرتے تھے۔ مگر شعیب بن ابراہیم کا نام نہیں لکھا حالانکہ وہ بھی کوفی ہی تھے۔ اور ابن ابی حاتم کے ہم قبیلہ تمیمی تھے۔ اگر سری بن یحییٰ تنہا کوفے میں شعیب بن ابراہیم کے شاگرد تھے اور جو کچھ تاریخی ذخیرہ سیف بن عمر کا تھا۔ صرف شعیب بن ابراہیم ہی کے پاس جمع تھا۔ اوروں کے پاس کچھ تھا تو وہ بہت کم تھا۔ مگر شعیب کا سارا ذخیرہ شعیب سے تنہا سری بن یحییٰ التیمی ہی نے حاصل کرلیا تھا اور وہ سب لکھ لکھ کر اور کچھ روایت زُود رُو کرکے ابن جریر طبری کو سری بن یحییٰ نے دیدیا تھا۔ تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ سری بن یحییٰ کے ترجمہ میں ابن ابی حاتم نے نہ شعیب بن ابراہیم کا کچھ ذکر کیا، نہ ابن جریر کا نہ خطیب نے سری بن یحییٰ کو جو شیخ جلیل ثقہ لکھا۔ تو اسکے ثبوت میں ان کے شیخ شعیب بن ابراہیم کا ذکر کیا۔ نہ ان کے اکلوتے شاگرد رشید ابن جریر کا ذکر کیا۔ فقط سری بن یحییٰ التیمی کا نام تو کسی کتاب میں دکھا دینا کافی نہیں۔ یہ ثابت کرو کہ شعیب بن ابراہیم کے یہ شاگرد اور ابن جریر کے یہ استاد تھے۔

حقیقت الامر درحقیقت ابن ابی حاتم اور خطیب دونوں ہی خوب جانتے تھے۔ کہ ابن جریر کو کسی سری نے کبھی ایک حرف بھی لکھ کر کبھی نہیں بھیجا۔ سری بن یحییٰ کو کوئی تعلق روایت حدیث یا اخبار کا شعیب بن ابراہیم یا سیف بن عمر سے کبھی نہیں رہا۔ ابن جریر کے کوفے سے نکلنے سے پہلے سری بن یحییٰ التیمی وفات پاچکے تھے۔ صرف ابن جریر کا بھرم رکھنے کے لئے غالباً ابن ابی حاتم نے سری بن یحییٰ التیمی کا سالِ وفات نہیں لکھا۔ حالانکہ یقیناً ابن ابی حاتم کی وفات سے تقریباً بیالیس برس پہلے سری بن یحییٰ التیمی کی وفات ہوچکی ہوگی جس طرح عبید بن سباق راوئ حدیث جمع قرآن کا سال وفات آئمہ رجال نے امام بخاری، ترمذی ونسائی کا بھرم رکھنے کے لئے چھپا دیا۔ باوجود اس کے کہ خود امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں لکھا تھا۔ مگر میرے رسالہ جمع قرآن کی اشاعت کے بعد میرا اعتراض روایت

جمع قرآن پر دیکھ لینے کے بعد جب تاریخ کبیر شائع کی گئی تو عبید بن سباق کا ذکر جو اس میں ہے۔ اس میں سے سال وفات حذف کر کے چھاپا۔ اپنی طرف سے ۱۱۸ھ سے قبل کا کوئی سنہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ چونکہ تذکرۃ الحفاظ میں شائع ہو چکا ہے کہ ۱۱۵ھ میں جو عبید بن سباق زندہ تھے تو اس سے پہلے ان کی وفات کیسے قرار دیتے

المختصر جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ سری بن یحیٰی التمیمی الکوفی کا روایاتی تعلق شعیب بن ابراہیم سے تھا۔ اس وقت تک ابن جریر کا کتب الی السری لکھنا کبھی صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ابن جریر کا سری سے، سری کا شعیب سے تعلق، دونوں میں سے ایک بات کا ذکر بھی نہ ابن ابی حاتم کرتے ہیں نہ خطیب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابن حجرؒ اور حافظ ذہبی بھی شعیب بن ابراہیم کو صرف سیف بن عمر کا راوی اخبار تو لکھتے ہیں مگر شعیب کا راوی سری بن یحیٰی کو نہیں لکھتے۔ ابن جریر کے دعوے کے ثبوت میں خود ابن جریر کے اسی دعوٰی کو پیش کرنا مصادرہ علے المطلوب کی بدترین مثال ہے جو اہل علم کے لئے ننگ کی بات ہے۔

—— (۴) ——

سیف بن عمر سیف بن عمر سے روایاتی تعلق اگر کسی سری کو تھا تو وہ سری بن اسمٰعیل الکوفی ہی تھے۔ شعیب سیف بن عمر کے مستقل راوی اخبار تھے اور سری بن اسمٰعیل سیف بن عمر سے حدیثیں روایت کرتے تھے جو ولادت ابن جریر سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔ شعیب بن ابراہیم کا سال وفات ائمۂ رجال نے لکھا نہیں ہے۔ سیف بن عمر کے بارے میں بھی اسی قدر لکھا ہے کہ بہ زمانہ خلافت ہارون الرشید سیف نے وفات پائی۔ ہارون الرشید کی خلافت ۱۷۰ھ سے ۱۹۳ھ تک رہی۔ انہی ۲۳ برس کے اندر کسی سال سیف بن عمر نے وفات پائی۔ تقریب میں جو ان کو گیارہویں طبقے کے محدثین میں شمار کیا

جاتا ہے معلوم نہیں کس حساب سے ؟ اس لئے کہ گیارہویں طبقے کے محدثین کی وفات عموماً چوتھی صدی کے نصف اول میں ہوتی ہے۔ اس لئے ہارون الرشید کی خلافت میں ان کی وفات تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہارون الرشید کی خلافت میں سیف بن عمر کی ولادت کہی جاتی تو گیارہویں طبقے میں ان کا شمار صحیح ہو سکتا تھا! ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کے بارہ شیوخ لکھ کر ان کے اثنا عشری ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ جن میں سے ایک تو طلحہ بن اعلم ہیں۔ دوسرے بکر بن وائل جن کے وفات کا پتہ نہ مل سکا۔ باقی دس میں سے ابو الزبیر المکی متوفی ۱۲۶ھ ہیں اور عبد اللہ بن عمر العمری متوفی ۱۷۱ھ یا ۱۷۲ھ ہیں۔ باقی آٹھ ان دونوں کے درمیان ہیں۔ ان دونوں کے درمیان پچاس برس کا فاصلہ ہے۔ اس سے اتنا پتہ ملتا ہے کہ سیف بن عمر نے عنفوان شباب میں ابو الزبیر سے حدیثیں سنی ہوں گی اور اواخر عمر میں عبد اللہ بن عمر العمری سے۔ یعنے تقریباً بیس اکیس برس کی عمر میں ابو الزبیر سے سنی ہوں اور تقریباً ستر برس کی عمر تک عبد اللہ العمری سے حدیثیں سنی ہوں۔ اور ان کی وفات کے بعد بھی چند سال زندہ رہے ہوں۔ تو ان کی یعنے سیف بن عمر کی ولادت ۱۰۵ھ کی۔ دو یا ایک برس کم یا بیش تصور کیجئے اور وفات ۱۸۰ھ میں تو ابو الزبیر اور عبد اللہ العمری سے ان کی روایت بھی صحیح ٹھہرتی ہے اور ۱۸۵ھ میں ان کی وفات بزمانہ خلافت ہارون الرشید بھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

اور گیارہویں طبقے کا محدث یعنی ۳۰۰ھ یا اس کے بعد ان کی وفات تسلیم کرنے میں ان کی روایت ابو الزبیر المکی سے صحیح مانی نہیں جا سکے گی۔ اس لئے کہ ابو الزبیر کی وفات ۱۲۶ھ میں ہے۔ اگر اسی سال ان سے سیف بن عمر کا حدیثیں سننا فرض کر لیجئے۔ جب بھی سیف کی عمر پونے دو سو برس کی ماننی ہوگی جو یقیناً غلط ہوگی مختصر یہ کہ ۱۰۰ھ سے ۱۰۶ھ تک کے اندر سیف بن عمر کی ولادت اور ۱۸۰ھ سے لے کر ۱۹۲ھ تک کے اندر ان کی وفات تسلیم کی جائے تو کسی قسم کا اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ اب اس تخمین کی تعیین یوں کر لیجئے کہ ۱۰۵ھ میں سیف بن عمر کی ولادت اور

اور ۱۹۰ھ میں ان کی وفات سمجھ لیجائے تو یہ تخمینہ دیانت قبول کرسکتی ہے۔

شعیب بن ابراہیم

کے بارے میں تو ابن حجر رحنے اسی قدر لکھا ہے کہ یہ سیف بن عمر کے راوی تھے۔ یعنی سیف کی من گھڑت روایتوں کو یہاں وہاں پھیلایا کرتے تھے۔ جو روایتیں یہ کرتے تھے ان میں اسلاف پر حملے بھی ہوا کرتے تھے۔ مگر حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں (جلد اول ص ۴۴۷) لکھتے ہیں۔ روی سیف " یعنی سیف ہی ان سے روایت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سیف ان سے حدیثیں روایت کرتے ہوں اور یہ سیف کی تاریخی روایتیں دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قریب العمر ہم سن ہوں گے۔ مگر شعیب کس محدث سے روایت کرتے تھے۔ اس کا ذکر نہیں شعیب سے کون روایت کرتا تھا۔ اس کا بھی مطلق ذکر نہیں۔ اگر سری بن یحییٰ التمیمی شعیب سے روایت کرتے تو کیا امام ذہبی رح اور ابن حجر اس کا ذکر نہ کرتے۔ اور ابن عدی اور ابن حبان اس کو نہ لکھتے؟ یہ سب سمجھتے تھے کہ ابن جریر نے کوفے میں آکر کوفی کذابوں وضاعوں اور رافضیوں سے سیف بن عمر وغیرہ کی گھڑی ہوئی روایتیں حاصل کیں اور یہ معلوم کرکے کہ سیف بن عمر کی روایتوں کے راوی شعیب بن ابراہیم تھے اور سیف کے ایک شاگرد سری بن اسمٰعیل بھی تھے۔ سری بن اسمٰعیل الکوفی کے بارے میں ابن جریر کو اتنا ہی کوفے میں معلوم ہوا کہ وہ مر چکے۔ سمجھے تھے کہ آٹھ دس برس ان کی موت کو ہوئے ہوں گے۔ گھر آکر جب تاریخ مرتب کرنے لگے۔ کتب الی السری عن شعیب عن سیف لکھ لکھ کر روایتیں اپنی کتاب میں بھرنے لگے۔ بعد کو جب معلوم ہوا کہ سری بن اسمٰعیل تو ان کی ولادت سے پچاس ساٹھ برس قبل وفات پاچکے تھے۔ تو اسمٰعیل کے لفظ چھیل کر اس کی جگہ سری بن یحییٰ بنا دیا۔ سری بن یحییٰ محدث جن سے لوگ واقف تھے، وہ بصرے کے رہنے والے تھے۔ جن کو تاریخی روایات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور معلوم ہوا کہ وہ بھی ان کی ولادت سے پچاس برس سے بھی زیادہ قبل وفات پاچکے تھے تو اس نام کے بعد التمیمی کا لفظ بڑھا دیا۔ یہ اگرچہ شعیب اور سیف

سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے نہ تاریخ و سیرت سے کچھ دلچسپی رکھتے تھے۔ کوئی محدث بھی نہ تھے۔ کچھ حدیثیں اِدھر اُدھر سے لے کر یا اپنے چچا ہناد کے ذخیروں میں سے لے کر شیخ کا نام بدل کر اپنی طرف سے بلا طلب ابن ابی حاتم کے پاس انہوں نے بھیج دی تھیں۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی تعلق ان کو حدیثوں سے بھی کبھی نہیں رہا۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور پھر اپنی تاریخ میں بھی حدثنی السری بن یحییٰ التمیمی لکھ کر بعض اقوال ان کی طرف منسوب کر دئیے ہیں۔ ابن جریر کے سوا تو ان سے کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔ غرض ابن جریر نے تو درحقیقت ان کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے پہلے یہ انتقال کر چکے ہوں گے۔ مگر سری بن اسمٰعیل کی جگہ ابن جریر نے کتب الی السری بن یحییٰ التمیمی عن شعیب عن سیف بن عمر اپنی تفسیر اور تاریخ میں لکھ مارا۔ اگرچہ ابن جریر کے کوفہ پہنچنے سے پہلے سری بن یحییٰ التمیمی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

مختصر یہ کہ کسی سری نے بھی ابن جریر کو لکھ لکھ کر شعیب کی روایت سے سیف بن عمر ملحد کذاب کی مَن گھڑت تاریخی روایتیں نہیں بھیجی تھیں۔ ابن جریر کا یہ دعویٰ یقیناً جھوٹا ہے کہ سری بن یحییٰ التمیمی ان کو شعیب سے سن سن کر یا لے لے کر سیف بن عمر کے بیان کردہ تاریخی واقعات بھیجتے رہے تھے۔

محمد بن راشد السلمی

سیف بن عمر محمد اور طلحہ دو راویوں سے روایت کرتے ہیں مگر کبھی محمد بن راشد السلمی بقید ولدیت ونسبت بھی روایت کرتے ہیں۔ محمد بن راشد تو اسماء الرّجال کی کتابوں میں بیشک بہت سے ملیں گے۔ صرف "محمد بن راشد" کی فہرست میں پیش کر دینا تو جاہلانہ خود فریبی یا جاہلوں کے لئے آبلہ فریبی ہے۔ جب محمد بن راشد السلمی کسی کتاب میں نہیں ملتا تو سیف کے شیخ ہوں یا نہ ہوں۔ کتب رجال سے "محمد بن راشد" نام والوں کی فہرست پیش کر دینے کے باوجود سیف کا شیخ "محمد بن راشد السلمی" کو بتانے والا تو فی ضلال بعید ہی رہا۔

محمد بن نویرہ

کہیں کہیں محمد بن نویرہ بھی ابن جریر لکھ مارتے ہیں۔ کتب

* در حقیقت سری بن یحییٰ التمیمی

رجال میں محمد بن نویرہ کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ البتہ خود ابن جریر نے تاریخ کی جلد۔۴ صد۔ ۸۱ میں اس طرح ہر ہر راوی کا تعارف فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

کتب الی السّری عن شعیب عن سیف عن محمّدٍ بن عبد اللہ بن سواد بن نویرہ عن عزیز عن مکنف التمیمی ثم الأُسیدی و طلحہ بن الأعلم الحنفی عن المغیرۃ بن عتیبۃ بن النہاس العَجلی و زیاد بن سرجس الاحمَری عن عبد الرحمٰن بن سا باط الاحمری۔ قالُوا جمیعًا۔ قال۔ اھل فارس لرُستم والفیرزان وھُما علیٰ اھلِ فارس این یذھب بکما؟ لم یبرح بکما الاختلاف حتی وھنتما اھل فارس۔ واطعتما فیھم عدوھم۔ الخ یعنی مجھ کو سری نے لکھا شعیب سے سُن کر اس نے سیف سے اس نے محمد سے جو عبدُاللہ کا بیٹا وہ سواد کا بیٹا وہ نویرہ کا بیٹا تھا۔ اس محمد نے عزیز بن مکنف التیمی سے جو پھر اُسیدی ہو گئے۔ ان سے سنا تھا اور سیف سے طلحہ بن الاعلم الحنفی نے بھی کہا۔ مغیرہ بن عتیبہ بن النہاس العجلی سے سن کر اور سیف سے زیادہ بن سرجس الاحمری نے بھی کہا۔ عبدالرحمٰن بن سا باط الاحمری سے سن کر۔ ان سبھوں نے مل کر (بیک آواز سر ملا کر) کہا کہ اہل فارس نے رستم اور فیرزان سے کہا درانحالیکہ وہ دونوں اہل فارس پر (بادشاہِ فارس کی طرف سے سربراہ مقرر کئے ہوئے) تھے۔ تم دونوں کو کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ تم دونوں کو اختلاف کبھی نہ چھوڑے گا۔ یہاں تک کہ تم دونوں نے اہل فارس کو پست ہمّت بنا دیا۔ اور ان کے بارے میں پُرا مید تم دونوں نے بنا دیا ان کے دشمن کو۔" الخ

دیکھئے اہل فارس کے جذبات، وطن پرستی کا ذکر کرنے کا موقع آیا تو ابن جریر جوش میں آکر کس طرح ہر راوی کی ولدیت و نسبت سب کچھ بیان کر گئے۔ صرف باپ

ہی نہیں۔ دادا پَردادا تک کے نام بتا گئے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ابن جریر تدلیس کی نیت سے راویوں کے ناموں کو مبہم رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ تعریف المجہول بالمجہول یا تعارف المجہول بالمجہول کر کے عام ناظرین کے ساتھ ابلہ فریبی ہی سے کام لیا ہے۔ جب امام کا یہ حال ہو تو مقتدی بھی یہی طریقہ کیوں نہ اختیار کریں۔ تلاش ہو محمد بن راشد السلمی کی۔ مگر صرف محمد بن راشد یا بعض دوسری نسبتوں والوں کی فہرست پیش کر دی کہ تم کو محمد بن راشد ملے ہی نہیں ہیں؟! دیکھو اتنے محمد بن راشد کتابوں میں موجود ہیں۔ حالانکہ جس کی تلاش ہے وہ محمد بن راشد السلمی کہیں نظر نہیں آتا۔ اسی طرح عن محمد طلحہ میں کون محمدؐ مُراد ہیں۔ اس کو متعین کر کے دکھانا چاہیئے تھا۔

پندرہ محمد نام کے راوی مختلف ولدیتیں اور نسبتوں والوں کی فہرست پیش کر دینا کم علم ناظرین کو دھوکہ دینا ہے۔ اگر صرف ایک ولدیت و نسبت سے محمد دو ایک جگہ مذکور ہوتے؎ وہی ان جگہوں میں بھی مُراد ہیں۔ جہاں صرف نام ہے۔ فہرست تو پندرہ ولدیتوں کی پیش کی گئی۔ ان پندرہ میں سے کس کو معین کیا جائے جہاں صرف محمد ہے وہاں ان کو محمد بن مرزوق سمجھا جائے۔ یا محمد بن نویرہ یا محمد بن راشد السلمی یا اور کوئی، ان پندرہ میں سے وہاں سمجھے جائیں؟

غرض ابن جریر نے اس تصریح میں جتنے نام بھی بتائے ہیں۔ ان میں سے ایک نام بھی متعارف نہیں۔ اور نہ رجال کی کسی کتاب میں کوئی نام طلحہ بن الاعلم اور عبدالرحمٰن کے سوا مل سکتا ہے۔ عبدالرحمٰن بھی ابن سابط کتاب میں نہیں ملے گا۔ "ابن سابط" اور "احمری" انہی کتابوں میں ہے۔ عبدالرحمٰن بن سابط کو جمحی لکھا ہے

مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت فاروق اعظمؓ کے مبارک عہد میں ایرانیوں سے پہلے پہل جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ تو ایرانی فوجیوں نے اپنے سپہ سالار رستم اور فیرزان سے جو باتیں کی تھیں۔ ان کا ذکر ہے تو مجاہدین اسلام کو اس کی کیا خبر ہو سکتی تھی کہ وہاں ایرانی فوج میں کیا گفتگو ہو رہی ہے؟ فتح ایران

؎ اور باقی جگہوں میں صرف نام، تو سمجھا جاتا ہے کہ یہی محمد جن کی ولدیت و نسبت فلاں جگہ مذکور ہے۔

کے بعد جو قیدی ہاتھ آئے اور وہ پھر مسلمان ہو گئے۔ ان سے یہ باتیں معلوم ہوئی ہوں گی۔ ان قیدیوں کے نام اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلمانوں جیسے ہو گئے اور جس قبیلے میں وہ بسے ہے۔ اس قبیلے کی طرف منسوب ہو گئے۔ ان کے ذریات سے جو روایت ہو گی ان راویوں کے نام اسماء الرجال کی کتابوں میں کہاں سے ملیں گے۔ اس لئے اگر ان میں سے کوئی نام بھی ہماری کتابوں میں نہ ملے تو کوئی تعجّب کی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ راویانِ احادیث نہ تھے کہ ان کے نام کتب اسماء الرجال میں ہوتے۔ واللہ اعلم

طلحہ بن الاعلم

جن کی کنیت ابو الہیثم امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھی ہے اور لکھا ہے کہ شعبہ سے انہوں نے حدیثیں سُنیں اور سفیان ثوری ان سے روایت کرتے تھے اور مروان بن معاویہ بھی اور ابن ابی حاتم نے بھی طلحہ بن الاعلم ابو الہیثم الحنض الکوفی سے ان کا تعارف کرایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ رَے میں نازل ہو گئے تھے۔ شعبی سے حدیثیں سنی تھیں۔ ثوری، جریر اور مروان بن معاویہ نے ان سے حدیثیں سنی تھیں۔ ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا فرمایا کہ شیخٌ ایک شیخ ہیں۔

میرے پاس امام بخاری کی تاریخ کبیر اور ابن ابی حاتم کی کتابُ الجرح والتعدیل نہیں ہے۔ اس لئے مجھ کو یہ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ تہذیبُ التہذیب میں مصنفین صحاح ستّہ کے راویوں کا ذکر ہے۔ مگر تمیز کے لئے اور ضمناً دوسرے راویوں کا ذکر بھی اس میں کیا ہے۔

میزان الاعتدال ولسان المیزان، تذکرۃ الحفاظ، تعجیل المنفعہ خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال، انساب سمعانی اور امام بخاری کی تاریخ صغیر۔ یہ کتابیں میرے پاس ہیں طبقات ابنِ سعد بھی میرے پاس نہیں ہے۔ مگر جتنی کتابیں میرے پاس ہیں۔ ان میں طلحہ بن الاعلم کا ترجمہ نہیں ہے۔ تاریخ کبیر و کتابُ الجرح والتعدیل سے جو کچھ پیش کیا گیا ہے۔ اب اس پر غور کرنا ہے۔ طلحہ بن الاعلم الکوفی فقط شعبہ بن الحجّاج الواسطی ثم البصری سے ہی روایت کرتے ہیں۔ خود کوفی تھے۔ کوفے کے کسی محدث سے روایت نہیں کرتے۔ رَے پہنچ گئے تھے تو کسی رازی سے روایت نہیں کرتے۔

آخر کیوں؟ شعبہ کی ولادت ۸۲ھ میں اور وفات ۱۶۰ھ میں ہوئی تھی۔ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں (جلد۴ ص۳۴۵) کوفے میں اس وقت تو ابو اسحٰق السبیعی اور سلیمان الاعمش جیسے محدثین شعبہ بن الحجاج کی ٹکر کے موجود تھے۔ کوفی ہو کر کوفے کے محدثین کو چھوڑ کر بصرہ پہنچ گئے اور وہاں بھی صرف شعبہ ہی کو منتخب کیا۔ پھر رَے کیا پہنچے تھے۔ اس وقت تو رَے کا میدان خالی تھا۔ کوئی اور بڑا محدث وہاں ایسا نہ تھا جس سے تحصیل علم کرتے اگر وہاں اشاعت علم کے لئے گئے تھے۔ تو وہاں کس کو محدث بنایا؟ جریر بن الحمید تو انہیں کی طرح کوفی تھے۔ اور انہی کی طرح کوفے سے ہی رَے گئے تھے۔ عجب کیا ہے کہ دونوں ساتھ گئے ہوں۔ جریر ان سے زیادہ پاپولر محدث تھے۔ ان کے اساتذہ بھی ان سے زیادہ اور تلامذہ بھی ان سے زیادہ ممکن ہے کہ "ایں ہم بر سرِ علم" کہہ کر ان سے بھی دو ایک حدیثیں لے لی ہوں ۱۸۸ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

مَروان بن معاویہ کوفی ہی تھے ۱۹۳ھ میں وفات پائی۔ راہ چلتوں سے پکڑ پکڑ کر حدیث لیا کرتے تھے۔ ان سے بھی لے لی ہوگی۔ اسی لئے ائمۂ رجال نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ معروف و مشہور لوگوں سے جو روایت یہ کریں۔ اس میں ثقہ ہیں اور مجہول اور غیر معروف لوگوں سے جو روایت کریں۔ اس میں ضعیف ہیں۔

سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ تو ہر کس و ناکس سے حدیثیں لینے کے خوگر تھے۔ جابر جعفی جیسے مشہور کذاب رافضی سے بھی حدیثیں سنی تھیں۔ جابر ہی کے ترجمے میں تہذیب التہذیب ص۲ ص۵ میں لکھا ہے۔ الثوری لیس من مذہبہ ترک الروایۃ عن الضعفاءِ ثوری کے مذہب میں ضعیف راویوں سے روایت کر دینا نہیں ہے تو جب جابر جعفی سے وہ روایت کرتے ہیں تو طلحہ بن الاعلم جیسے مجہول الحال سے بھی روایت کریں۔ تو کیا تعجب ہے اور طلحہ کے لئے کونسی فخر کی بات ہے۔

مگر امام بخاری نے تاریخ میں لکھا کہ طلحہ بن الاعلم سے سیف بن عمر روایت کرتے تھے نہ ابن ابی حاتم نے لکھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ طلحہ بن الاعلم کوئی دوسرے ہوں جن سے

ثوری۔ جریربن الحمید اور مروان معاویہ روایت کرتے تھے۔ اور جو خود شعبہ سے روایت کرتے تھے۔ اور سیف کے شیخ کوئی دوسرے گمنام مفقود الخبر ہوں۔ جس طرح کہہ دیا گیا۔ کہ وہ سعید بن ربیع جن سے ابن جریر روایت کرتے ہیں۔ وہ دوسرے ہیں۔ وہ سعید بن الربیع الرازی ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ جن سے سیف بن عمر[1] روایت کرتے ہیں۔ وہ طلحہ بن الاعلم البصری ہیں اور ثوری وغیرہ نے جن سے حدیث سنی تھی وہ طلحہ بن الاعلم الکوفی تھے۔ یہ صرف ایک معارضہ بالمثل نہیں ہے بلکہ قرینہ واضحہ میرے اس معارضے کی واقعیت کا پتہ دے رہا ہے۔ بنظرِ انصاف دیکھئے جب دو میں سے کسی نے بھی ان طلحہ بن الاعلم کو سیف بن عمر کا شیخ نہیں لکھا ہے تو یقیناً یہ طلحہ بن الاعلم جن کا ذکر امام بخاری نے تاریخ کبیر میں اور ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں کیا ہے۔ جو شعبہ متوفی سنہ ۱۶۰ھ کے شاگرد تھے۔ غالباً سنہ ۲۰۰ھ یا اس سے کچھ قبل یا بعد جن کی وفات ہوگی۔ وہ طلحہ بن الاعلم سیف بن عمر کے شیخ نہیں تھے۔ اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ سیف بن عمر کے شیخ جو طلحہ بن الاعلم تھے وہ ماہان سے روایت کرتے تھے اور ماہان کو حجاج نے سنہ ۸۳ھ میں قتل کیا تھا۔ ماہان سے روایت کرنے والے کی عمر سنہ ۸۳ھ میں کم سے کم تیس برس[2] کی تو ہونی چاہیئے جس سے کہنے والا واقعات بیان کر سکے۔ تو ماہان سے روایت کرنے والے طلحہ کی ولادت سنہ ۵۳ھ میں کم وبیش ہونی چاہیئے اور شعبہ بن الحجاج کی ولادت سنہ ۸۲ھ کی تھی جبکہ طلحہ بن الاعلم سیف بن عمر کے شیخ ۱۹ - ۲۰ برس کے ہوں گے۔ شعبہ کو ان سے روایت کرنا تھی۔ نہ کہ وہ شعبہ سے روایت کرتے۔ ماہان متوفی سنہ ۸۳ھ سے تاریخی واقعات سننے والے سے جریر بن عبدالحمید متولد سنہ ۱۱۰ھ کا روایتیں سننا ضرور مستبعد ہے

---

[1] تاریخ طبری جلد چہارم صفحہ ۸ مطبوعہ مطبع حسینیہ مصریہ (الطبعۃ الاولیٰ) [2] محدثین سننے کے لئے زیادہ عمر کی ضرورت نہیں مگر تاریخی واقعے کمسنوں سے کوئی کیا بیان کریگا اس کے لئے پختہ سن والے مخاطب ہوتے ہیں۔

اس لئے یقیناً سیف بن عمر والے طلحہ بن الاعلم وہ نہیں ہیں جس کا ذکر امام بخاری نے اور ابن ابی حاتم نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ اگر وہی ہوتے تو ثوری و جریر و مروان بن معاویہ کے ساتھ سیف بن عمر کا نام بھی دونوں نہیں تو دو میں سے ایک ضرور لکھتا۔

عمر بن شبّہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہو، قیامت کی بازپرس کا خوف نہ ہو۔ وہ دیانت سے کبھی کام نہیں لے سکتا وہ ہمیشہ جذبات سے کام لیتا ہے۔ معترض نے تہذیب التہذیب کے حوالے اپنے تعاقب میں دیئے ہیں۔ جس طرح تقریب و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں عمر بن شبہ کا ترجمہ دیکھا۔ اسی طرح ضرور تہذیب التہذیب میں بھی عمر بن شبّہ کا ترجمہ دیکھا ہوگا اور اس میں ہندسے میں نہیں۔ لفظوں میں صاف طور سے چھپا ہوا دیکھا ہوگا۔

مات فی جمادیٰ الآخرۃ سنۃ اثنتین ومائتین وکان قد جاوز التسعین یعنی ماہ جمادی الاُخریٰ سن دو سو دو (۲۰۲ھ) میں وفات پائی اور نوے سے تجاوز کر گئے تھے۔ یعنے کچھ دن یا کچھ مہینے ورنہ سنہ بدل جاتا۔ یہ دیکھ کر بھی مجھ پر کذب و افتراء کا بہتان باندھنا اور اپنے امام کی تقلید میں سب و شتم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا۔ کیا کسی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے کا شیوہ ہو سکتا ہے ؟ انسان کسی مضمون کو ایک کتاب میں دیکھ لینے کے بعد سمجھ لیتا ہے کہ اور کتابوں میں بھی یہی ہوگا۔ مَیں نے تہذیبُ التّہذیب پر اعتماد کیا اور دوسری کتابیں ضعف بصارت کی وجہ سے نہیں دیکھیں۔ مجھ کو شبہ صرف سال ولادت دیکھ کر ہوا تھا اسی صفحے میں سال ولادت (۸۳) لکھا ہے۔ مَیں گھبرایا کہ (۷۳ھ) میں ولادت ہوئی اور نوّے برس کی عمر پائی۔ تو وفات ۱۶۳ھ میں ہونی چاہیئے اور یہاں وفات ۲۰۲ھ میں لکھی ہے تو ذہن میں آیا کہ (۱۱) کے جو دو الف ہیں۔ ممکن ہے کہ قلمی منقول عنہ نسخے میں دونوں الف کی ٹانگیں کتابت میں مل گئی ہوں اور اس کی صورت (۷) سات کی ہوگئی ہو۔ اسلیئے طباعت میں (۱۱۳) کی جگہ (۷۳) چھپ

گیا۔ نوّے برس کی عمر پائی تھی۔ ۱۱۳ میں ۹۰ ملا دینے سے ۲۰۳ ہو جاتے ہیں۔ مہینوں کے فرق کی وجہ سے وفات ۲۰۳ھ میں نہیں واقع ہوئی۔ چنانچہ اپنی کتاب کے حاشیے پر یہ مضمون لکھ بھی دیا۔ اس کا مطلق خیال نہ رہا کہ ابن حجر عموماً ہندسہ لکھنے میں سیکڑے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ خصوصاً اگر سیکڑا ایک ہی ہو (۱۷۳) کی جگہ انہوں نے صرف (۷۳) لکھ دیا ہے۔ یہ غلط فہمی تو سال ولادت کا پورا ہندسہ کتاب میں چھپا ہوا نہ ہونے کے باعث ہوئی۔ مگر سال وفات تو صاف لفظوں میں تھا۔ اسکے بارے میں کوئی شبہ کیوں ہوتا؟ اگر تعاقب کرنے والے میں دیانت ہوتی تو وہ لکھتے کہ تہذیبُ التہذیب میں سال وفات غلط چھپا ہے۔ جس سے تم غلطی میں پڑے۔ دیکھو فلاں فلاں کتابوں میں تو عمر بن شبہ کا سال وفات ۲۶۲ھ صاف لکھا ہے۔ فصبرٌ جمیل والی اللہ المشتکی

نصر بن مزاحم اور ابُو مخنف

مجھ کو اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے کہ حدثنا عن نصر بن مزاحم اور حدثنا عن ابی مخنف کو ضعف بصارت کی وجہ سے میں نے حدثنا پڑھ لیا اور عن کا خیال نہ کیا یا اُس پر نظر نہ پڑی۔ اسلئے یہ گرفت بہت صحیح گرفت ہے ؎

خدا بھلا کرے اے شاؔد نکتہ چینوں کا
بتا دیا مجھے پیچ کے راستہ چلنا

اس لئے نظر کی اس چوک سے متنبّہ کر دینے کا شکر گذار ہوں۔

تدلیس کا مقصد

تدلیس کے مقصد کو تو اہل تدلیس ہی جانتے ہیں کہ ان کو عملی تجربہ ہو سکتا ہے۔ مدرّس اور مُدلّس میں ایک ہی حرف کا تو فرق ہے ؎

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اور ابن جریر تو امام المُدلّسین تھے۔

ضَعفِ بَصارت و ضَعفِ بَصیرت

ضعف بصارت تو جس کو ہو وہی نہیں محسُوس کرتا۔

دوسرے دیکھنے والے بھی اس کی اداؤں کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس کو کم معلوم ہوتا ہے اور وہ کبھی اپنے ضعف بصارت کا انکار کر کے دوسرے لوگوں پہ ضعف بصارت کا الزام نہیں عائد کرتا۔ مگر ضعف بصیرت والا اپنے آپ کو ضعیف البصیرت کبھی نہیں سمجھتا۔ ہمیشہ اپنے کو قویّ البصیرت ہی سمجھتا ہے اور دوسروں ہی کو ضعیف البصیرۃ قرار دیتا ہے۔ اس کا اصل فیصلہ تو مرنے کے بعد ہی ہوگا۔ مَن مَّاتَ فقد قامت قیامتہ۔ حدیث نبوی صلے اللہ علیہ وسلّم لیکن اہل دیانت امیال وعواطف اور مساعی وموافقت کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں۔ ایک ایسی کتاب جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے مکارم اخلاق پر خلفاء راشدین، امہات المؤمنین، مہاجرین وانصار اور عامۂ صحابہ کے اخلاق حسنہ پر چھپے چھپے حملے ہوں۔ اکابر صحابہ رضؓ کو آج کل کے سیاستدانوں کیطرح ہوا پرست خودغرض، جاہ طلب اور اقتدار پسند ثابت کیا گیا ہو۔ محض چھوٹی چھوٹی روایتوں کے ذریعے اب ایک شخص اپنی غیرت ایمانی کے جذبے کے ماتحت ذبًّا عن النبی صَلّی اللہ علیہ وسلّم وعن اہل بیتہ واصحابہ رضی اللہ عنہم اس کتاب کے کذب وافتراء سے دنیا کو باخبر کر دینا چاہتا ہے۔ دوسرا محض روایت پرستی وروایت پرستی کے جذبے کے ماتحت اس کتاب کی ہر روایت کو صحیح ثابت کرنے اور اس کے راویوں کو ثقہ، اسکے مصنّف کو امام قرار دینے پر تلا ہوا ہے۔ ان دونوں میں سے ایمانی بصیرت رکھنے والا کون ہے؟ ہر سچا مسلمان بآسانی سمجھ سکتا ہے اور دونوں فریق خود اپنے دل میں سوچیں کہ اَیُّ الفریقین اَحَقُّ بالامن

جہالت واجہلیت

مجھ کو اپنی جہالت بلکہ اجہلیت کا اعتراف ہے وَمَا اُوتِیتُم مِنَ العِلمِ اِلّا قَلِیلًا۔ جب تھوڑا ہی علم ملا ہے تو یقیناً جہالت بہت زیادہ ہے مگر الحمدللہ علیٰ احسانہٖ کہ میں جہل مرکب میں مبتلا نہیں ہوں۔ اللہ تعالےٰ نے مجھ کو جہل مرکب سے، ہٹ دھرمی سے روایت پرستی سے اور کورانہ تقلید سے محفوظ رکھا ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک

(۵)

میرا اصل دعویٰ تو یہ ہے کہ ابن جریر بعض ایسے لوگوں سے بھی روایت کرتے تھے جو ان کی ولادت سے پہلے وفات پا چکے تھے یا جب وہ شیر خوار تھے یا تین چار برس کے تھے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں مجھ سے مطالبہ ہے کہ حدثنی یا حدثنا کہہ کے ابن جریر نے ایسے کسی سے روایت کی ہو تو دکھاؤ۔ بیشک یہ مطالبہ بہت صحیح ہے۔

(۱) سب سے پہلا نام تو وہی ہے جو پہلے مضمون میں لکھ چکا ہوں۔ حدثنا سعید بن الربیع کہہ کر یکے بعد دیگرے دو دو روایتیں تفسیر جلد اول صـ۲۱ میں موجود ہیں۔ اور سعید بن الربیع ایک ہی راوی ہیں جن کا سال وفات ۲۱۱ھ ہے۔ ولادت ابن جریر سے تیرہ برس پہلے یہ کہنا کہ یہ سعید بن الربیع دوسرے ہیں۔ یہ رازی ہیں اور جن کی وفات ۲۱۱ھ میں ہوئی تھی وہ حرشی " تھے۔ صحیح نہیں حرشی سے قبیلے کا پتہ ملا۔ اور اگر وہ رازی تھے تو وطن کا پتہ ملا۔ مگر سعید بن الربیع الرازی کوئی شخص تھا ہی نہیں اور نہ سعید بن الربیع المرادی کوئی راوی تھا۔ اگر سچے ہو تو کسی کتاب میں دکھاؤ۔

(۲) حدثنا ابو الاحوص عن ابی اسحاق عن عامر بن سعد الخ (تاریخ جلد ۴ صـ ۴۷) ابو الاحوص تو بہتیرے ہیں۔ ابو اسحاق السبیعی کے شیوخ میں بھی ایک ابو الاحوص تھے۔ مگر ابو اسحٰق کے تلامذہ میں ایک ہی ابو الاحوص ہیں۔ جن کا نام سلام بن سلیم ہے۔ متوفی ۱۷۹ھ ولادت ابن جریر سے ۴۵ برس پہلے کہہ دیجئے کہ یہ ابو الاحوص دوسرے ہیں خراسانی اور ابو اسحٰق بھی دوسرے ہیں نیشاپوری۔

(۳) تاریخ جلد ۳ مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر صـ۲۰ حدثنی ہشام بن محمد عن ابی مخنف الخ ابو مخنّف سے روایت کرنے والے ہشام بن محمد۔ ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور اس ہشام کی وفات ۲۰۴ھ میں ولادت ابن جریر سے بیس برس پہلے ہوئی تھی

(۴) حدّثنی عمران بن بکّار الکلاعی عن یحییٰ بن صالح (تفسیر ابن جریر مطبوعہ

مصر جلد اول صـ۳۴ و جلد ۶ صـ۲ ۵ صـ۳ ۶ ۲) عمران بن بکار الکلاعی کی وفات تہذیب التہذیب جلد ۸ صـ۱۲۴ میں ۲۷۱ھ لکھی ہے۔ مات بحمص سنۃ احدی و سبعین و مائتہ یعنی ولادت ابن جریر سے ۵۳ برس پہلے۔

(۵) حدثنا موسٰی بن ھارون قال حدثنا عمرو بن حماد قال ثنا اسباط عن السدی الخ تفسیر جلد اول صـ۴۰ تاریخ جلد ۲ صـ۲۴۳، صـ۲۲۳ و صـ۱۲ وغیرہ مقامات کثیرہ

دو موسٰی بن ہارون ہیں۔ ایک تو موسٰی بن ہارون بن عبداللہ الحمال متوفی ۲۹۴ھ ابن جریر ان سے روایت کر سکتے ہیں مگر یہ عمرو بن حماد متوفی ۲۲۲ھ سے روایت نہیں کرتے اور نہ کر سکتے تھے۔ دونوں کی وفات میں ۷۲ برس کا فاصلہ ہے۔ دوسرے موسٰی بن ہارون البردی ہیں۔ متوفی ۲۲۴ھ۔ یہ عمر بن حماد البردی متوفی ۲۲۲ھ سے روایت کر سکتے ہیں۔ دونوں ہم عصر ہیں۔ اور ایک ہی قبیلے کے ہیں۔ مگر ان کی وفات اسی سال ہے۔ جس سال ابن جریر پیدا ہوئے تھے۔ کچھ دن یا کچھ مہینے قبل یا بعد۔ اس لئے ابن جریر کا ان سے روایت کرنا غیر ممکن ہے۔

(۶/۷) حدثنا زکریا ابی زائدہ و محمد بن عمرو قالا حدثنا ابو عاصم الخ تفسیر جلد اول صـ۱۳۷ و تاریخ جلد ۲ صـ۲۵۶، تہذیب التہذیب صـ۳ صـ۳۳ و تاریخ صغیر امام بخاری صـ۱۷۲ میں زکریا ابن ابی زائدہ کا سال وفات ۱۴۸ھ لکھا ہے۔ ولادت ابن جریر سے ۷۶ برس پہلے تہذیب التہذیب باختلاف اقوال ۱۴۷ھ اور ۱۴۹ھ بھی لکھا ہے اور دوسرے محمد بن عمر الواقدی ہیں۔ متوفی ۲۰۷ھ۔ ولادت ابن جریر سے سترہ برس پہلے "عمر" کے بعد واؤ غلط ہے۔ ورنہ محمد بن عمرو بن علقمہ اللیثی ہیں۔ متوفی ۱۴۴ھ۔ زکریا ابن ابی زائدہ اس کے ہم عصر

(۸) حدثنا وکیع عن ابیہ عن سفیان عن خصیف عن مجاھد الخ تفسیر جلد اول صـ۱۶۲ جلد ۴ صـ۱۴۱ و جلد پنجم صـ۱۳۰۔ وکیع بن الجراح متوفی ۱۹۶ھ یعنی ولادت ابن جریر سے ۲۸ برس پہلے۔ ابن جریر سفیان بن وکیع سے

بھی بہت روایت کرتے ہیں۔ باپ اور بیٹے دونوں سے روایت کرنا مستبعد نہیں۔ سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ ابو اسحٰق السبیعی سے بھی روایت کرتے ہیں۔ اور ابو اسحٰق کے بیٹے یونس سے بھی۔ یہاں وفات وکیع و ولادت ابن جریر کے درمیان ۲۸ برس کا فاصلہ اس کے لئے وجہ استبعاد نہیں کہ ابن جریر وکیع سے روایت نہ کر سکیں۔ ۲۸ برس کیا ہے۔ ابن جریر تو ان لوگوں سے روایت کرتے ہیں۔ جو ان کی ولادت سے ساٹھ برس پہلے وفات پا چکے تھے۔ یہ تو ان کے لئے "بارہا کردم و شدہ" کا مصداق ہے۔ عالم برزخ کی سیر کی مشق ان کو حاصل تھی۔ شاید کوئی یہ کہے کہ ممکن ہے کہ طباعت میں "ابن" کا لفظ چھوٹ گیا ہو۔ ابن وکیع کو طابع نے "وکیع" بنا دیا ہو۔ سفیان اپنے والد وکیع سے روایت بھی کرتے ہیں۔

یہ گمان پہلی روایت جلد اول والی دیکھنے کے بعد مجھ کو ہوا تھا مگر جب جلد دوم میں بھی دیکھا اور پھر جلد پنجم میں بھی تو یقین ہو گیا۔ کہ یہ طباعت کی غلطی نہیں ہے پھر دیکھا کہ جلد پنجم میں ابن جریر لکھتے ہیں۔ حدثنا وکیع ثنا جریر عن محمدؐ بن اسحٰق الخ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۶۹) میں جریر بن حازم کے شیوخ میں محمد بن اسحٰق کا نام اور ان کے تلامذہ میں وکیع کا نام موجود ہے۔ مگر سفیان بن وکیع کا نام جریر بن حازم کے تلامذہ میں نہیں ہے۔ جریر بن حازم کی وفات ۱۷۵ھ میں لکھی ہے اور سفیان بن وکیع کی وفات ۲۴۷ھ میں۔ جریر و سفیان کی وفات کے درمیان ۷۲ برس کا فاصلہ ہے۔ وفات جریر کے وقت ۷۲ سے زیادہ سفیان بن وکیع کی عمر اگر ہو گی بھی تو دو چار ہی برس کے ہوں گے۔ وہ کیا جریر بن حازم سے روایت کریں گے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ جریر بن حازم نہیں ہیں۔ جریر بن عبد الحمید متوفی ۱۸۸ھ ہیں تو نہ ان کے شیوخ کی فہرست میں ابن اسحٰق کا نام ہے، نہ ان کے تلامذہ کی فہرست میں وکیع کا نہ سفیان بن وکیع کا

(۹) حدثنا ابن المبارک قال ثنا عبد الأعلیٰ قال ثنا داؤد عن سعید بن

المسیب (تفسیر جلد ۴ صـ ۱۶۴) ابن المبارک کا مرکب اضافی حدیث کی، جس کتاب میں بھی ہوگا۔ عبداللہ بن مبارک بن واضح الحنظلی التمیمی المروزی المتوفی ۱۸۱ھ ہی سمجھے جائیں گے۔ کوئی دوسرا شخص ابن المبارک کہنے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ مگر یہ عبدالاعلی بن محمد متوفی ۱۹۸ھ سے روایت نہیں کرتے۔ مگر یہ عبدالاعلی داؤد بن ابی ہند سے اور یہ داؤد سعید بن المسیب سے ضرور روایت کرتے ہیں۔ اگر ابن جریر کی مراد "ابن المبارک" سے وہی عبداللہ بن المبارک ہیں تو ان کی وفات ابن جریر کی پیدائش سے ۴۳ برس قبل ہو چکی تھی اور اگر کوئی اور ہے لامعلوم مجہول الحال شخص تو یہ ابن جریر کی بدترین تدلیس اور خبیث تر تلبیس ہے۔[1]

(۱۰) حدثنی زکریا بن عدی قال حدثنی عُبید اللہ بن عمرو عن ابن عقیل (تاریخ جلد ۵ صـ ۱۴۵) زکریا ابن عدی بن زریق التیمی ابو یحیی الکوفی نزیل بغداد کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی تھی۔ ولادت ابن جریر سے بارہ برس پہلے یا تیرہ برس پہلے یعنی ۲۱۱ھ میں دیکھیے تہذیب التہذیب جلد ۳ صـ ۳۳۲

(۱۱) حدثنا اسحٰق بن یحیٰی قال اخبرنا عبدُالرزاق قال اخبرنا معمر عن قتادۃ ومجاھدٍ الخ (تفسیر جلد ۴ صـ ۸) تہذیب التہذیب جلد اول صـ ۲۵۴ میں اسحٰق بن یحیٰی بن طلحہ بن عبیداللہ التیمی کا ترجمہ مذکور ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن جعفر طیار اور ان کے صاحبزادے حضرت معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار رضؓ سے روایت کرتے تھے اور مجاہد اور زہری سے بھی۔ مگر منکر الحدیث غیر ثقہ

[1] اور اگر محمد بن المبارک بن واضح الحنظلی التمیمی مراد ہوں۔ عبداللہ کے بھائی تو ان کی وفات ۱۸۱ھ میں ہے ولادت ابن جریر سے ۴۳ برس قبل۔ اور اگر عبدالرحمٰن بن المبارک بن عبداللہ المحیش مراد ہوں تو تہذیب التہذیب میں تو ان کی وفات ۱۹۲ھ میں ولادت ابن جریر سے ۳۲ برس پہلے لکھی ہے۔ مگر محشی خلاصہ کے حوالہ سے ۲۲۸ھ لکھتے ہیں۔ بنی خلاصہ کا قول صحیح ہے تو ابن المبارک کی وفات کے وقت ابن جریر تین چار برس کے ہوں گے۔

وغیرہ تھے۔ اس لئے ابن جریر کے شیخ ہونے کے قابل ضرور تھے مگر ان کی وفات ۱۶۴ھ میں لکھی ہے۔ ولادت ابن جریر سے ساٹھ برس پہلے۔

پھر دوسرے کا ذکر یوں کیا ہے۔ اسحٰق بن یحیٰی بن علقمہ الکلبی الحمصی المعروف بالعوصی مگر یہ صرف ابن شہاب زہری سے روایت کرتے تھے۔ عبدالرزاق وغیرہ سے روایت نہیں کرتے تھے۔ اور ان سے فقط یحیٰی بن صالح الوحاظی روایت کرتے تھے۔ مگر مجہول الحال ہیں۔ ان کا سال ولادت و وفات وغیرہ کسی نے نہیں لکھا ہے۔ زہری کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی تھی۔ یہ یحیٰی بن اسحٰق العوصی جب زہری کے خاص راوی تھے تو زہری کی وفات کے وقت چوبیس برس کے تو ہوں گے۔ یعنی کم و بیش ۱۰۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی ہوگی۔ یعنی ابن جریر کی ولادت سے تقریباً سوا سو برس قبل۔ عوصی کے شاگرد وحاظیؒ کی وفات کے وقت نوجوان تھے۔ ان کی وفات ابن جریر کی پیدائش سے دو برس پہلے ۲۲۲ھ میں ہوئی تھی۔

ایک تیسرے اسحٰق بن یحیی بن الولید بھی تھے۔ جن کے دادا ولید کو ابن حضرت عبادہ بن صامت الانصاری لکھا ہے اور بعضوں نے ولید کو ابن اخی عبادہ بن صامت لکھا ہے۔ انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت کا بہت کم وقت پایا تھا۔ مگر روایت صرف انہیں سے کرتے تھے اور ان سے صرف موسیٰ بن عقبہ روایت کرتے تھے یہ کسی وجہ سے ۱۳۱ھ میں قتل کر دیے گئے تھے۔ ولادت ابن جریر سے ۹۳ برس پہلے۔ کوئی چوتھا اسحٰق بن یحیٰی تو کہیں نظر نہیں آتا۔

(۱۲) حدثنی ھیثم بن عدی الخ (تاریخ جلد ۲ ص۱۷ کی آخری سطر) ہیثم بن عدی کا ترجمہ میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۶۵ میں ہے۔ متروک الحدیث، کذاب غیر ثقہ وغیرہ تھے ابن جریر کے شیخ ہونے کے قابل۔ اور خیر سے صاحب الاخبار یعنی مؤرخ بھی تھے۔ مگر ان کی وفات حافظ ذہبی نے ۲۰۷ھ میں لکھی ہے۔ یعنی ابن جریر کی پیدائش سے سترہ برس پہلے

(۱۳) حدثنا زکریا ابن یحیی الضریر الخ (تاریخ جلد ۲ ص۱۸ و ص۲۱) زکریا ابن یحیی الضریر

تہذیب التہذیب تذکرۃ الحفاظ خلاصہ تذہیب اور تاریخ صغیر میں کوئی نہیں
میزان الاعتدال میں امام ذہبی رح بصفحہ ۳۵۰ جلد اول میں لکھتے ہیں ذکریا بن یحیی الکندی عن
الشعبی قال یحیٰی لیس بشیء قلت وکان ضریرًا یعنی زکریا بن یحییٰ
الکندی عامر بن شراحیل الشعبی سے روایت کرتے تھے۔ یحییٰ بن سعید نے کہا
کہ یہ کچھ بھی نہ تھے۔ (ذہبی فرماتے ہیں) میں نے کہا کہ یہ ضریر یعنی نابینا تھے بس
ایک زکریا بن یحیی الضریر ملتے ہیں۔ مگر یہ شعبی متوفی ۱۰۹ھ سے روایت کرتے
تھے۔ تو وفات شعبی کے وقت یہ اٹھارہ انیس برس کے تو ہوں گے! ان کی
پیدائش ۹۰ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ زکریا بن یحیی الضریر کی ولادت
اور ابن جریر کی ولادت کے درمیان ۱۳۴ھ برس کا فاصلہ ہوگا۔ سو برس
کی عمر بھی پائی ہوگی تو ابن جریر کی پیدائش سے ۳۴ برس قبل وفات پائی ہوگی۔

(۱۴) حدثنی علی ابن ابی طلحۃ عن یزید عن جویبر الخ (تفسیر جلد ۳ صہ ۶۶) علی ابن ابی طلحہ کے والد ابو طلحہ کا نام سالم بن المخارق الہاشمی تھا۔ علی بن ابی
طلحہ کی کنیت ابو الحسن تھی۔ جزیرے کے رہنے والے تھے جمص میں آبسے تھے
اسلئے حمصی کہلاتے جاتے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضہ سے روایت کرتے ہیں
اگرچہ ان سے ان کا سماع ثابت نہیں۔ علی بن ابی طلحہ کی وفات تہذیب التہذیب
اور خلاصہ تذہیب میں ۱۴۳ھ میں لکھی ہے۔ ابن جریر کی ولادت سے اکاسی
برس قبل۔

(۱۵) حدثنا یزید ثنا سعید عن قتادہ الخ (تفسیر جلد ۳ صہ ۱) قتادہ بن دعامہ متوفی
۱۱۷ھ مشہور محدث تھے۔ ان سے کئی سعید روایت کرتے ہیں۔ سب سے مشہور
سعید بن ابی عروبہ ہیں۔ متوفی ۱۵۶ھ جن سے مشہور محدث یزید بن زریع متوفی ۱۸۲ھ
روایت کرتے تھے۔ اگر یہی یزید بن زریع مراد ہیں تو ان کی وفات ولادت ابن
جریر سے ۴۲ برس پہلے ہوئی تھی۔ دوسرے سعید بن ابی ہلال الیثی تھے۔ جو قتادہ سے
روایت کرتے تھے۔ متوفی ۱۴۹ھ۔ ان سے روایت کرنے والے یزید بن ابی حبیب

المصری متوفی ۱۲۸ھ تھے ۔ ولادت ابن جریر سے ۹۶ برس پہلے ۔ قتادہ کے تلامذہ میں سعید نام کا اور کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس سے یزید نام کا کوئی راوی روایت کرتا ہو ۔

(۱۶) حدثنا عمرو بن عثمان العثمانی ۔ قال حدثنا ابن ابی اویس الخ (تفسیر جلد اول ص۴۵) عمرو بن عثمان حضرت عثمان رضہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے ۔ حضرت معاویہ رضہ کے داماد تھے ۔ ان کی وفات ۱۵۰ھ سے پہلے ہے ۔ اگر وہی مراد ہیں تو یہ ابن جریر سے کچھ بعید نہیں کہ اپنی ولادت سے ۲۴۰ برس پہلے وفات پانے والے سے وہ روایت کریں ۔

اور اگر عمرو بن عثمان بن ہانی مراد ہیں ۔ ہانی حضرت عثمان رضہ کے آزاد کردہ غلام تھے اس نسبت سے اور پھر ان کے والد کا نام بھی عثمان تھا ۔ ان کو عثمانی لکھا ہے تو یہ بدترین تدلیس ہے ۔ آزاد کردہ غلام آزاد کرنے والے کے قبیلے کی طرف منسوب ہوتے ہیں نہ کہ اشخاص کیطرف ۔

ابن ابی اویس یعنے اسمٰعیل بن عبداللہ بن عبداللہ بن اویس مشہور کذّاب تھا ۔ حدیثیں گھڑتا تھا مگر بخاری و مسلم وغیرہ میں اس کی حدیثیں ہیں ۔ اس لئے ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں ۔ ولعلّ ھٰذا کان من اسمٰعیل فی شبیبتہ ثمّ انصلح واَمّا الشیخان فلا یظنّ بھما انھما اخرجا عنہ الا الصّحیح شاید اسمٰعیل میں یہ بات ہوگی تو ان کی جوانی میں ۔ پھر وہ اصلاح پذیر ہو گئے ہوں گے ۔ اور بخاری و مسلم نے ان کی حدیثوں میں سے صحیح ہی حدیثیں نکالی ہوں گی ۔ یہ ابن حجر کا حسنِ ظن ہے مگر یہاں بات ابن ابی اویس کی نہیں ہے ۔ ابن جریر کی ہے ۔ سو عمرو بن عثمان العثمانی سے روایت کر رہے ہیں ۔

اور اگر ابن جریر کی اس تدلیس سے چشم پوشی کر کے یہی تسلیم کر لیا جائے کہ ابن جریر حضرت عثمان رضہ کے صاحبزادے سے نہیں ۔ ان کے آزاد کردہ غلام ہی سے روایت کر رہے ہیں تو ان کی وفات کا سال اگرچہ کسی نے لکھا نہیں ہے ۔ مگر ان کے تلامذہ کے

نام تو لکھے ہیں۔ ان سے محمد بن عمر الواقدی متوفی ۲۰۷ھ۔ محمد بن اسمٰعیل بن ابی فدیک متوفی ۲۰۰ھ اور ہشام بن سعد متوفی ۲۱۶ھ روایت کرتے ہیں تو جب ان کے تلامذہ ابن جریر کی ولادت سے سترہ برس ۲۴ برس اور ۲۶ برس پہلے وفات پا چکے تھے۔ تو خود یہ ابن جریر کی پیدائش سے کتنا پہلے وفات پا چکے ہوں گے۔ یہ تو سمجھا جا سکتا ہے۔

فاعتبروا یا اُولی الابصار

(۱۸) حدثنا ابو عبید الوصّابی قال حدّثنا محمد بن حفصٍ قال انبأنا ابُوحمید حدّثنا الفزاری عن لیث بن ابی سلیمٍ عن ابی بردۃ

مقدمہ تفسیر جلد اول طبع جدید دمشق)

ابن جریر کی خود ساختہ گھڑی ہوئی یہ اسناد ابن جریر کی کذابیت کی واضح دلیل ہے۔ ابن جریر نے کسی ہمعصر محدث کی کتاب میں حدثنا ابو عبید الوصّابی دیکھ لیا تھا اور اسی کتاب میں یا کسی دوسرے ہم عصر کی کتاب میں حدّثنا محمد بن حفص بھی دیکھ لیا تھا پہلے ہمعصر ہمسن تھے۔ اسلئے سمجھے کہ جس سے یہ روایت کرتے ہیں۔ میں بھی اس سے روایت کروں تو کوئی مجھ کو جھوٹا نہیں کہہ سکتا۔ اور دوسرے ہم عصر ابن جریر سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ اس لئے ابن جریر نے خیال کیا کہ یہ جس سے روایت کر رہے ہیں۔ اس کو میں اپنے شیخ کا شیخ قرار دے سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر حدثنا ابو عبید الوصّابی قال حَدَّثَنَا محمّد بن حفصٍ کہہ کر روایت کی اسناد درست کر لی۔ ابن جریر کو اس کی خبر نہ تھی کہ محمد بن حفص ہی کی کنیت ابو عبید ہے اور وہی وصّابی کہے جاتے تھے۔ محمد بن حفصٍ ابُوعبید الوصّابی کا ترجمہ میزان الاعتدال میں جلد ۳ ص۴۸ میں مختصراً موجود ہے۔ لَیسَ بِصَدُوقٍ (یہ سچے نہ تھے) ان کو لکھا ہے۔ لسان المیزان میں کسی قدر تفصیل ہے۔ یہ وصّابی حمص کے رہنے والے تھے۔ ابن جریر کو حمص جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ایک شخص کو دو شخص قرار دے کر ابو عبید الوصّابی کو شاگرد اور محمد بن حفص کو ان کا شیخ قرار دے کر اسناد درست کر ڈالی اور ابو حمید الفزاری کو سمجھ نہ سکا کہ یہ ایک ہے یا دو [illegible] دونوں کے نام ہیں۔ لیث بن ابی سلیم کے تلامذہ میں کسی فزاری

کا ذکر نہیں۔ یہ لیث بن سلیم کوفی تھے۔ منکر الحدیث، ضعیف الحدیث لا یحتج بہ وغیرہ سب کچھ تھے۔ یعنی ابن جریر کے شیوخ یا شیوخ کے شیوخ میں داخل ہونے کے قابل تھے۔ مگر ابو بردہ بن حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ضرور کرتے تھے۔ جیسا کہ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔

۱۸۔ حدثنی محمد بن عمارۃ قال حدثنی عبید اللہ بن موسیٰ الخ (تاریخ جلد ۵ صـ ۲۰۵) محمد بن عمارہ دو تہذیب التہذیب میں مذکور ہیں اور دو میزان الاعتدال میں۔ میزان میں محمد بن عمارہ بن عمرو بن حزم کا مختصر سا ذکر ہے جو امام مالک متوفی ۱۷۹ھ کے شیوخ میں سے تھے۔ امام مالک ولادتِ ابن جریر سے ۴۵ برس قبل وفات پا چکے تھے۔ ان کے شیخ اور کتنا قبل متوفی ہو چکے ہوں گے۔

دوسرے محمد بن عمارۃ اللیثی کا ذکر کیا ہے کہ یہ ۳۰۰ھ کے بعد یعنی چوتھی صدی کے اوائل میں بمقام دمشق حدیثیں روایت کرتے تھے۔ مگر اُن سے ان کے بیٹے احمد کے سوا اور کسی نے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ اسلئے یہ بھی ابن جریر کے شیخ الروایۃ نہیں ہو سکتے۔ ایک تو یہ کہ یہ ابن جریر سے متأخر ہیں۔ دوسرے یہ دمشق میں رہتے تھے۔ اور ابن جریر کے دمشق پہنچنے کا ذکر سوانح ابن جریر لکھنے والوں نے نہیں کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان محمد بن عمارہ سے ان کے بیٹے احمد کے سوا کوئی دوسرا شخص کچھ روایت نہیں کرتا۔ چوتھے وہ تاریخ و سیر کے آدمی نہ تھے۔ حدیثیں ہی روایت کیا کرتے تھے

تہذیب التہذیب میں ایک بہت متقدم محمد بن عمارہ کا ذکر تمیز کے لئے کیا ہے چونکہ یہ مصنفین صحاح ستہ کے راوی نہ تھے۔ مگر وہ تابعی تھے حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیثیں روایت کرتے تھے۔ ابن جریر کا یہ منہ نہ تھا کہ وہ کسی تابعی سے روایت کریں اور نہ یہ ہمت تھی کہ عالم برزخ میں پہنچ کر ان سے روایت حاصل کرنے کا دعویٰ کریں۔

البتہ انہیں محمد بن عمارہ کے پوتوں میں بھی ایک محمد بن عمارہ تھے جو صحاح کے راویوں میں تھے۔ ان کا سال وفات مذکور نہیں۔ مگر تلامذہ میں سے ہر ایک کی وفات ولادت

ابن جریر سے پہلے ہوئی ہے۔ امام مالک متوفی ۱۷۹ھ ولادت ابن جریر سے ۴۵ برس قبل۔ عبداللہ بن ادریس متوفی ۱۹۲ھ ۳۲ برس پہلے ۔عامر بن عبدالعزیز الاشجعی متوفی ۱۸۹ھ ۳۵ برس پہلے۔ حاتم بن اسمٰعیل متوفی ۱۸۲ھ، ۴۲ برس پہلے صفوان بن عیسٰی متوفی ۱۹۸ھ، ۲۶ برس پہلے۔ ابو عاصم متوفی ۲۱۱ھ ۱۳ برس پہلے ولادت ابن جریر سے وفات پا چکے تھے۔ ابو عاصم کے سوا محمد بن عمارہ کے سب تلامذہ دوسری صدی ختم ہونے سے پہلے وفات پاتے گئے۔ صرف ابو عاصم ہی نے دوسری صدی ختم کی اور پھر بھی ابن جریر کی پیدائش سے ۱۳ برس قبل متوفی ہو چکے تھے کسی پانچویں محمد بن عمارہ کا تو کہیں پتہ نہیں ملتا۔

(۱۹) حدثنی ابو العالیۃ العبدی اسمٰعیل بن الہیثم حدثنا ابو قتیبہ

اور اس کے بعد ہی ہے دوسری روایت حدثنی ابو العالیۃ عن ابی قتیبۃ الخ

(تفسیر طبع قدیم جلد ۳ صد۷۹)

تہذیب التہذیب جلد ۱۲ باب الکنی میں دو ابو العالیہ کا ذکر ہے۔ اور میزان الاعتدال جلد ۳ میں تین ابو العالیہ کا۔ ابو العالیہ ریاحی رفیع بن مہران کا ذکر دونوں کتابوں میں ہے جو بہت متقدم زمانہ جاہلیت دیکھے ہوئے تھے۔ عہد صدیقی میں مشرف باسلام ہوئے ۹۳ھ میں بقول صحیح ان کی وفات ہوئی۔ قول ضعیف ۱۰۶ھ کا بھی ہے۔ ابن جریر ان سے بھی روایت کرتے ہیں مگر پانچ واسطوں سے حدیث ۸۴۳ تفسیر جلد دوم میں حدثنی المثنیٰ قال حدثنا اسحٰق قال حدثنا ابن ابی جعفر عن ابیہ عن الربیع عن ابی العالیۃ (طبع جدید محشی)

دوسرے ابو العالیہ کا نام ابن حجر البراء لکھتے ہیں کسی قریشی کے آزاد کردہ غلام تھے براء ان کا لقب تھا۔ نام زیاد بن فیروز تھا اور بھی بعض اقوال ان کے نام سے متعلق ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن الزبیرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ یعنی تابعی تھے۔ ۹۰ھ میں وفات پائی۔ اگر عالم برزخ والا ذریعہ نہ ہو تو ابن جریر ان دونوں میں کسی سے بھی روایت نہیں کر سکتے

مگر ان دونوں کا ذکر ہی یہاں بے سود ہے۔ اسلئے کہ ابن جریر تو اپنے شیخ ابوالعالیہ کا اسم گرامی یہاں خود بتا رہے ہیں۔ اسمٰعیل بن الہیثم۔ اسلئے ان دونوں کی طرف تو وہم بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن کسی ابوالعالیہ کا نام اسمٰعیل بن الہیثم کہیں ملتا نہیں ہے۔ بلکہ اسمٰعیل بن الہیثم ہی کوئی راوی کہیں نظر نہیں آتا۔ میزانُ الاعتدال میں ابوالعالیہ ریاحی ابوالعالیہ البراقفی کا مختصر سا ذکر کیا ہے۔ جن کا نام نہیں لکھا ہے۔ اسمہٗ قال" کا فقرہ بھی محل نظر ہے میرے نزدیک یہ طباعت کی غلطی ہے صحیح عبارت یوں ہے۔ ابوالعالیۃ البراء فی اسمہ اقوال طباعت میں البراء فی" البراقفی ہو گیا اور اسمہ قال ایک مہمل جملہ بن کر رہ گیا۔ نوان کا ذکر بھی گذر چکا۔ یہاں میزان میں سمع ابن عباس لکھا۔

اب صرف ایک ابوالعالیہ رہ گئے۔ میزان میں جن کا ذکر آخر میں کیا ہے۔ ان کا نام مذکور نہیں۔ شاید انہیں کا نام اسمٰعیل بن الہیثم ہو اور یہی ابن جریر کے شیخ ہوں۔ مگر یہ حسن بصری سے روایت کرتے ہیں حسن بصری کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی تھی۔ جو شخص ان سے روایت کرے۔ اس کی ولادت ۱۰۰ھ سے تو یقیناً کچھ پہلے ہونی چاہیئے اور وہ سو برس کی عمر بھی پائے تو اس کی وفات ابن جریر کی ولادت سے کم از کم ۲۴ برس تو ضرور پہلے ہوگی اور ان سے تو صرف شریک القاضی الکوفی متوفی ۱۸۷ھ ہی روایت کرتے تھے۔ ان کی ولادت بھی وفات ابن جریر سے ۳۷ برس پہلے ہوئی تھی۔ شریک کے شیخ ابوالعالیہ تو ۱۸۷ھ سے بھی پہلے وفات پا چکے ہوں گے۔ طبری کی پیدائش سے تقریباً پچاس برس پہلے۔

(۲۰) حدثنا موسٰی بن سہل الرازی قال حدثنا یحیٰی بن عوف عن الفرات بن السائب (تفسیر جلد اول جدید ص۱۴۲ حدیث ۱۸۰)

موسٰی بن سہل بن ہارون الرازی کا مختصر ترجمہ میزانُ الاعتدال جلد ۳ ص۲۱۱ میں موجود ہے لکھا ہے۔ انی عن اسحٰق الازرق بخبر باطل عن الثوری عن ابی اسحٰق عن ابی الاحوص عن عبد اللہ (بن مسعود) مرفوعاً "خُلِقتُ انا وابوبکر و عُمر من تربۃ واحدۃ وفیھا ندفن" یعنے یہ ایک غلط خبر روایت کرتے

ہیں۔ اسحٰق ارزق سے وہ سفیان ثوری سے وہ ابو اسحٰق السبیعی سے وہ ابوالاحوص سے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں اور ابوبکر و عمر ایک مٹی سے پیدا کئے گئے اور ہم سب اس (ایک مٹی) میں دفن کئے جائیں گے"

اسحٰق الازرق کا ترجمہ تہذیب التہذیب جلد اول ص۲۵۷ میں مذکور ہے۔ اسحٰق بن مرعاس المخزومی ولادت ۱۱۷ھ وفات ۱۹۵ھ متفق علیہ صدوق و ثقہ تھے۔

مولانا شمس الحق العظیم آبادی شارح سنن ابی داؤد نے اپنے رسالہ فضائل شیخین میں اس حدیث پر بحث کی ہے اور اس حدیث کو اُصول حدیث کے مطابق غریب و حسن ثابت کیا ہے۔ موسیٰ بن سہل الرازی کو ثقہ ثابت کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضہ نے کوفے میں اس حدیث کو بیان فرمایا تھا۔ غالباً کوفے میں فضاء تشیع کو دیکھ کر۔ مگر کوفیوں نے اس حدیث کی عام روایت نہیں کی۔ ابوالاحوص عوف بن مالک بن فضلہ اکابر تابعین سے اور مالک بن فضلہ صحابی کے بیٹے تھے۔ ابو اسحٰق السبیعی کے شیخ تھے۔ ابو اسحٰق السبیعی میں تشیع کا رنگ دیکھ کر ہی۔ یہ حدیث انہوں نے ابو اسحٰق سے بیان کی تھی۔ ابو اسحٰق متقدمین شیعہ سے تھے۔ شیخین سے ان کو عناد نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ حدیث روایت کی۔ مگر کوفے کی فضا نے اس کو دبا دیا۔ دوسرے محدثین بھی اس حدیث سے ضرور واقف تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ موسیٰ بن سہل سے اس کی روایت سہل بن بکار بن بشر الدارمی نے کی ہے جو ایک ثقہ راوی تھے۔

موسیٰ بن سہل الرازی سے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ یہ سفیان ثوری اور اسحٰق الازرق دونوں سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں اور اس حدیث کی اسناد میں عن اسحٰق بن یوسف الازرق و سفیان الثوری کلاھما عن ابی اسحٰق کہہ کر روایت لکھی ہے۔ موسیٰ بن سہل الرازی کے بارے میں لکھا ہے کہ امام بخاری نے ان کی وفات ۲۶۰ھ سے قبل لکھی ہے۔

میرا گمان یہ ہے کہ جس مطبع میں کتاب میزان الاعتدال[۱] چھپی تھی۔ اسکے کارکنوں میں کوئی

---

[۱] یا جس مخطوطے سے کتاب چھاپی گئی اس کا کاتب شیعہ ہو جو اس تحریف کا ذمہ دار ہوا

صاحب ایسے تھے جو تحریف کے خوگر بھی تھے۔ بخوبی ممکن ہے کہ بجز کے بعد باطل کا اضافہ انہوں نے اپنی طرف سے کر دیا ہو۔ اس کی مثال اس کتاب میں اور بھی ملتی ہے مگر ان جگہوں میں گرفت مشکل ہے۔ تحریف کو تحریف ثابت کرنا آسان نہیں۔ اسی جلد کے صفحہ ۲۰۸ میں موسیٰ بن اسمٰعیل ابوسلمہ المنقری البتوذکی کا ترجمہ ہے۔ اسکے آخر میں مصنف امام ذہبیؒ نے ابن خراش کا قول ان کے بارے میں لکھا ہے کہ صدوق وتکلم الناس فیہ اس کے بعد محرف صاحب نے اپنی طرف سے اضافہ فرمایا ہے کہ قلت نعم تکلموا فیہ بانہ ثقۃ ثبت یا رافضی ؟ "یارافضی" کا فقرہ استفہامیہ جس بے ساختگی کے ساتھ محرف کے قلم سے نکل گیا ہے۔ اس کی عجمیت اور غصّہ دونوں کو ظاہر کر رہا ہے۔ کلمہ یا حرف تردید فارسی زبان کا لفظ ہے جو ہماری اُردو میں بھی فارسی سے آگیا ہے۔ امام ذہبی رح سے کیا ممکن ہے کہ وہ فارسی حرف تردید عربی عبارت میں لے آئیں ؟ چونکہ یہ ان کے بھی راوی حدیث ہیں۔ اسلئے حمایت میں قلم چل گیا۔ یہ لکھنا کہ رواہ عنہ نکرۃ مثلہ تعصّب کا نتیجہ ہے۔ سہل بن بکار کو نکرۃ کہنا ظلم ہے۔ بخاری وابوداؤد وابو حاتم وغیرہم ان سے روایت کرتے ہیں ۲۲۷ھ یا ۲۲۸ھ میں ان کی وفات ہوئی تھی۔

مختصر یہ کہ موسیٰ بن سہل الرازی جس کی وفات ۲۰۰ھ سے پہلے ہوئی تھی ابن جریر ان کی وفات کے کم از کم پچیس برس پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ ان کے تلمیذ سہیل بن بکار کی وفات بھی ولادت ابن جریر سے تین چار ہی برس بعد ہوئی تھی۔ اور ابن جریر کی خود ساختہ اس اسناد میں یحییٰ بن عوف ایک اسم فرضی ہے۔ اس نام و ولدیت کا کوئی راوی دنیائے رجال میں نہیں نظر آتا۔

۲۱۔ امّا الخبر الذی حدّثنا بہ اسمٰعیل بن عیاش عن اسمٰعیل بن یحییٰ الخ التفسیر جلد ا ول طبع سابق صفحہ ۷۲، اسمٰعیل بن عیاش کی وفات ۱۸۱ھ یا ۱۸۲ھ میں ہوئی تھی۔ ولادتِ ابن جریر سے ۴۲ یا ۴۳ برس پہلے

مگر اسکے بعد تقریبًا اسی مضمون کی دو روایتیں دو ایک صفحہ کے بعد آگے آئی ہیں۔ ان میں اسناد یوں ہے۔ حدّثنا اسمٰعیل بن الفضل قال حدّثنا ابراھیم

بن العلاء قال حدثنا اسمٰعیل بن عیاش الخ اسلئے یہ گمان ہوسکتا ہے کہ یہاں کتابت میں ابتداءِ اسناد سے دو نام چھوٹ گئے ہوں۔ اسی لئے طبع جدید محشی میں یہاں پر وہ دو نام جوڑ کر اسناد پوری کر دی گئی ہے۔ (دیکھئے جلد اول طبع جدید محشی صفحہ ۲۲۱ حدیث نمبر ۱۴۰)

میں اس کو تسلیم کر لیتا ہوں مگر حدیث ۱۴۰، ۱۴۵، ۱۴۷ میں ہر جگہ ابن جریر اسمٰعیل بن الفضل سے تو ضرور روایت کر رہے ہیں؟ اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا؟ محشی راویوں کا تعارف ہر جگہ کرا دیتے ہیں۔ اس روایت پر بھی لمبی چوڑی بحث کی ہے اور بعد کے بعض راویوں پر خوب اچھی طرح جی کھول کے جرح کی ہے اور ان تینوں روایتوں کو کذب و افتراء قرار دیا ہے۔ مگر جہاں ابن جریر کے بلاواسطہ شیخ کو دیکھتے ہیں، کہ ان کی وفات ولادت ابن جریر سے قبل ہے۔ وہاں بالکل خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔ صرف شیخ الطبری لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ سعید بن الربیع سے دو دو روایتیں جلد اوّل صفحہ ۶۳ میں روایت ۶۳، ۶۴ موجود ہے۔ مگر محشی حاشیے میں ان روایتوں پر بحث کرتے ہیں؎ بعض راویوں کا تعارف کراتے ہیں۔ ناتمام ہی سہی۔ مگر سعید بن الربیع جو ابن جریر کے شیخ ہیں۔ ان کا تعارف نہیں کراتے۔ یہاں تک کہ فہرست اشخاص میں ان کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اسی طرح یہاں تین تین روایتیں اسمٰعیل بن الفضل سے ابن جریر روایت کر رہے ہیں۔ مگر محشی صاحب اسمٰعیل بن الفضل کا حاشیے میں مطلق ذکر نہیں کرتے کہ یہ کون ہیں۔ نہ فہرست اعلام میں ان کا نام لکھا ہے کیونکہ نام تو فہرست میں ان کا لکھا گیا ہے؎ جن کا حال ہی نہیں بتایا۔ ان کا نام فہرست میں کیوں رہے؟

تو اب مجھ سے سنئے کہ یہ اسمٰعیل بن الفضل کون صاحب ہیں۔ ان کا ترجمہ لسان المیزان جلد اول صفحہ ۴۲۶ میں موجود ہے۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ طوسی (یعنی محمد بن الحسن بن علی الطوسی متولد ۳۸۵ھ و متوفی ۴۶۰ھ محدث مذہب امامیہ) نے ان کا ذکر رجال شیعہ میں کیا ہے۔ یہ حضرت جعفر صادق سے روایت کرتے تھے۔ طوسی نے ان کو ثقہ

؎ الفاظ میں ترمیم کرتے ہیں

؎ جس کا کچھ حال بتایا گیا ہے۔

اور صاحب بصیرت و استقامت لکھا ہے۔ حضرت جعفر صادق کی ولادت ۸۰ھ میں اور وفات ۱۴۸ھ میں ہوئی تھی۔ شیعہ محدث شیخ مجلسی نے بھی اپنی مختصر کتاب رجال وجیزہ میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ ص ۵ پر۔ اور ان کو ثقہ لکھا ہے تو جب یہ حضرت جعفر صادق کی خدمت میں برابر آتے جاتے تھے۔ تو اس وقت ان کی عمر ۲۵، ۳۰ برس کی ضرور رہو گی۔ کیونکہ یہ اپنے لڑکے محمد کو اپنے ساتھ لے کر حضرت جعفر کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں یہ صاحب اولاد تھے۔ اس قرینے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اسمٰعیل بن فضل کی ولادت ۱۱۵ھ یا ۱۲۰ھ کی ہو گی۔ اگر ۱۲۰ھ ہی سمجھئے تو ابن جریر کی پیدائش کے وقت اگر یہ زندہ بھی رہ گئے ہوں گے تو اس وقت اسمٰعیل بن فضل کی عمر ایک سو چار برس کی ہو گی۔ کسی نے اسمٰعیل بن فضل کو معمر نہیں لکھا ہے۔ اس لئے یقیناً ابن جریر کی پیدائش سے پہلے یہ وفات پا چکے ہوں گے۔ ورنہ کوئی بتائے کہ کس طرح اسمٰعیل بن الفضل سے ابن جریر کی روایت صحیح ہو سکتی۔ اور کوئی دوسرا راوی اسمٰعیل بن الفضل نام کا کوئی نہیں دکھا سکتا۔ شیعہ راویوں سے جیتے جی نہیں۔ تو عالم برزخ میں پہنچ کر روایت کرنا ابن جریر کا دستور تھا۔ اس لئے اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ ان تینوں روایتوں میں بغیر علامت تحویل لکھے ہوئے ابن جریر نے تحویل بھی پیش کی ہے۔ یعنی پہلے تو اسمٰعیل بن الفضل سے سلسلۂ اسناد چلا اور عمن حدثہ عن ابن مسعود پر آ کر ختم ہو ا ہے۔ یعنی ابن ابی ملیکہ سے ایک نامعلوم شخص نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ سے سن کر بیان کیا تھا۔ اس کے بعد ہر روایت میں یہ دم گزا بھی لگا ہوا ہے۔ د مسعر بن کدام عن عطیۃ العوفی عن ابی سعید پہلی دونوں روایتیں یعنی ۱۴۰، ۱۴۵ میں اسی قدر ہے۔ مگر تیسری روایت ۱۴۷ میں عن ابی سعید کے بعد ابن جریر نے یعنی الخدری لکھ کر بتا بھی دیا ہے کہ ابو سعید سے یہاں کون ابو سعید مراد ہیں۔ بیحد افسوس ہے کہ محترم شارح نے اس تحویل کی شرح میں دو دو مداہنتیں کیں۔ ایک جگہ حقیقت پر پردہ ڈالا۔ اور دوسری جگہ حقیقت کو جانتے بوجھتے مخفی چھوڑ دیا۔ تفسیر دیکھنے کی صلاحیت تو ہر عربی داں

کو ہوتی ہے مگر رجال حدیث کے حال سے تو ہر شخص کو واقفیت نہیں ہوتی۔ شارح محترم کی وُسعتِ نظر ان کے حواشی سے ظاہر ہے۔ ان کے پاس رجال و تاریخ کی جتنی کتب موجود ہیں۔ ان کے حوالوں سے معلوم ہو رہی ہیں۔ کون سی بات احوال رجال حدیث سے متعلق ہو سکتی ہے جس سے مَیں واقف ہوں اور وہ نہ واقف ہوں۔ عربی زبان اسکے ادب و قواعد و نحو صرف و نحو سے وہ مجھ سے بہت زیادہ واقف ہو سکتے ہیں خصوصًا اسلئے کہ اہل زبان ہیں اور اسی کام میں رات دن لگے ہوئے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مسعر بن کدام کا عطف کس پر ہو گا۔ اسناد پوری یہ ہے۔ قال حدثنا اسمٰعیل بن الفضل قال حدثنا ابراھیم بن العلاء قال حدّثنا اسمٰعیل بن عیّاش عن اسمٰعیل بن یحیٰی عن ابن ابی ملیکۃ عمّن حدّثہ عن ابن مسعود اسکے بعد ہے مِسعر بن کدام عطف بقاعدہ ادب قریب تر ہی پر ہونا چاہیئے۔ اسلئے یا تو یوں کہئے۔ عمّن حدّثہ، عن ابن مسعود و مسعر بن کدام جو یقینًا غلط ہے۔ تو پھر بقاعدہ تحویل سب سے اُوپر عطف کو لے جائیے۔ یعنی یوں سمجھئے کہ ابن جریر کہہ رہے ہیں۔ حدّثنا اسمٰعیل بن الفضل و مسعر بن کُدام مگر ابن جریر کی ولادت ۲۲۴ھ کی ہے اور مسعر بن کدام کی وفات ۱۵۵ھ میں ابن جریر کی ولادت سے ۹۰ برس قبل تھی کس طرح اسمٰعیل بن الفضل پر اس عطف کا بار ڈالا جائے۔ حالانکہ یہ بار اسمٰعیل بن الفضل پر نہیں۔ ابن جریر پر آتا ہے اور ابن جریر ایسے ایسے کتنے بار اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے ہیں۔ اس لئے بقاعدہ تحویل اسمٰعیل بن الفضل ہی پر عطف صحیح ہے جس طرح اسمٰعیل بن الفضل سے ابن جریر روایت کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسعر بن کدام سے روایت کر رہے ہیں۔ دونوں کی وفات ولادت ابن جریر سے پہلے ہے۔ عالم برزخ میں جا کر جس طرح اسمٰعیل بن الفضل سے ملے۔ اسی طرح مسعر بن کدام سے ملے۔

مگر محشیٔ صاحب سمجھے کہ اسمٰعیل بن الفضل تو شیعہ راوی ہے۔ اس کے سالِ وفات سے کون واقف ہے، اس کا مطلق ذکر ہی نہ کیا جائے۔ اور و مسعر کا عطف درمیان

کے کسی راوی پر کر دیا جائے کیونکہ مسعر کی وفات کا سال جس کو معلوم نہ ہو وہ بآسانی معلوم کر سکتا ہے تو ابنِ جریر کا عالم برزخ سے روایت کرنے کا راز افشا ہو جائے گا۔

تو اب مسعر کا عطف کس پر کیا جائے۔ اگر پہلے حدّثنا پر نہیں کرتے تو دوسرے حدّثنا پر یعنے ابراہیم بن العلاء پر کیا جائے۔ جن کی وفات ۲۳۵ھ میں ہے۔ تو ابراہیم بن العلاء اور مسعر کی وفات کے درمیان اسی برس کا فاصلہ ہے۔ ابن العلاء کی ولادت ۱۵۲ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی مسعر کی وفات کے وقت ابراہیم بن العلاء صرف تین برس کے تھے۔ تو تیسرے حدثنا کے بعد اسمٰعیل بن عیاش متوفی ۱۸۱ھ ہیں۔ تو ہو سکتا ہے مگر سابق مطبوعہ نسخوں میں پہلی حدیث یعنی ۴۰ کو ابن جریر بلا واسطہ اسمٰعیل بن عیاس ہی سے روایت کر رہے ہیں۔ حدّثنا کی ضمیر متکلم خود ابن جریر ہی ہیں تو مسعر سے ابن جریر کا روایت کرنا کم سے کم مطبوعات سابقہ کے رُو سے تو ثابت ہو گا اور ابنِ جریر کا راز فاش ہو کر رہے گا۔ اس کے علاوہ یہ روایت ہے جھوٹی۔ اس نسبت سے ابن عیاش جیسے ثقہ راوی کی طرف مناسب نہیں۔ اس لئے کسی ایسے نام پر مسعر کا عطف نہ کیا جائے جو کسی حدثنا کے بعد آیا ہو۔ صرف عن کے بعد جو نام مناسب نظر آئے۔ اسی پر مسعر کا عطف کر دیا جائے تو محشی صاحب نے اسمٰعیل بن یحییٰ کو دھر لیا اور اسی غریب پر اس عطف کا بار ڈال دیا چونکہ وہ دروغ بافی میں شہرت بھی رکھتے تھے مگر سلسلۂ اسناد میں تحویل کا عطف عن پر عموماً نہیں ہوتا۔ حدثنا ہی پر ہوتا ہے۔ حدثنا پر عطف کا امکان از رُوئے سیاق عبارت ہوتے ہوئے اس کو چھوڑ کر صرف عن پر۔ وہ بھی جو درمیان سلسلہ اسناد ہو، عطف نہیں کرتے۔

دوسری مداہنت شارح صاحب نے یہ فرمائی۔ عطیہ کوفی کے ذکر میں۔ وہ خوب جانتے تھے۔ تہذیبُ التہذیب وغیرہ میں ضرور دیکھ چکے تھے کہ عطیہ کلبی سے تفسیری روایتیں لیتا ہے۔ اور کلبی رافضی کذاب کی کنیت اپنی طرف سے اس نے ابوسعید رکھ دی تھی۔ حالانکہ کلبی کی صحیح کنیّت ابُوالنضر تھی۔ مگر یہ کلبی کی من گھڑت حدیثیں حدّثنی ابوسعید کہہ کر روایت کیا کرتا تھا۔ اور اس کے تلامذہ اس کو ابوسعید خدری کہہ کر دوسروں

سے روایت کرتے تھے۔ عطیہ کی موت ۱۲۷ھ میں ہوئی تھی۔ مجد والوں نے اس کا سال مرگ ۱۱۱ھ بنا ڈالا تاکہ حضرت ابوسعید خدری سے کسی طرح کذاب عطیہ کی روایت صحیح ہوسکے اور اس کے لئے حضرت ابُوسعید خدری کا سال وفات جو ۷۴ھ ہے اس کو ۹۴ھ بنا دیا۔ مگر تہذیبُ التہذیب میں امام احمد بن حنبل کا قول اور خود کلبی کا قول اس کے متعلق موجود ہے۔ یقیناً شارح صاحب نے دیکھا ہوگا۔ مگر ابن جریر کے یعنی الخدری لکھنے پر کوئی نوٹ نہ لکھا۔ شارح صاحب نے خود لکھا ہے کہ الرّوایۃ امانۃ۔ اسی طرح شرح وتنقید بھی امانت ہی ہے۔ بہرحال اللہ تعالےٰ معاف فرمائے میاں پھر بھی جناب شارح کا شکر گذار ہوں اور مداح کہ انہوں نے روایات کی تنقید ابن جریر کا پوزیشن بچاتے ہوئے ہی سہی مگر بہت خوب کی ہے۔ فلِلّٰہ درّہٗ ثم للّٰہ درّہٗ

افسوس کہ ضعف بصارت اور سفر کی وجہ سے مستعار کتاب کی بہت کم سیر کرسکا وہ بھی صرف دو ہی جلدیں مِل سکیں۔ بہت دیر کے بعد مَیں نے باوجود ضعف بصارت کے یہ بیس نام پیش کردیئے۔ کثرت مشاغل و ضُعف پیری و ضعف بصارت کے علاوہ اپنے پاس بعض کتابوں کے موجود نہ ہونے کے باعث اتنی دیر ہوئی۔ کتابیں موجود ہوتیں اور دوسرے مشاغل نہ ہوتے اور ضعف بصارت نہ ہوتا تو اس بڑھاپے میں بھی یہ کام زیادہ سے زیادہ دو تین ہفتے میں کر لیتا۔ اگر تھوڑی کوشش کی جائے تو کم سے کم اتنے ہی نام اور بھی ایسے ہی مل سکتے ہیں۔

باقی رہے ابن جریر کے وہ شیوخ جن سے واقعی روایت کرتے ہیں اور ان کے شیوخ کے شیوخ تو ان میں فیصدی نوے وضاع و کذّاب اور روافض ہی ملیں گے۔ یہ کام ہر صاحب نظر تھوڑی توجہ سے کرسکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کسی صاحب نظر کو شیوخ ابن جریر پر قلم اٹھانے کی توفیق دیدے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز

والسلام علی من اتّبع الھُدیٰ۔

کیا امام اعظم رحمہ شیعہ تھے؟

مولانا محمد عباس ——— طالب صفوی

(ابن جریر کے تشیع کے متعلق مولانا تمنا کے مضمون سے تلملا کر ایک شیعہ عالم کا جوابی مضمون)

خداوند عالم و عالمیان جزائے خیر کرامت فرمائے۔ سرسید علیہ الرحمۃ، خواجہ احمد الدین علیہ الرحمۃ اور دوسرے عاشقانِ قرآن حکیم کو جن کی سعئ بیہم کا یہ نتیجہ ہوا کہ جمہور کا ایک حصہ تو بلا خوف لومۃ لائم یہ کہنے لگا کہ قرآن مجید ہدایت کے لئے کافی ہے اور روایات بہر نہج مطیع قرآن ہیں نہ کہ مطاع اور دوسرے لوگ بھی جو کسی مصلحت یا فسادِ طبع کی وجہ سے قرآن مجید کو ہدایت کے لئے ناکافی سمجھ کر روایات کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، کم از کم اتنے روشن خیال ضرور ہو گئے ہیں کہ مؤطا شریف کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ کی تقلید میں مَا علیٰ وجہِ ادیم الارضِ[1] بعد کتاب اللہِ اصحّ مِن مؤطا (روئے زمین پہ کتاب اللہ کے بعد مؤطا صحیح ترین کتاب ہے۔) نہیں کہتے۔ نہ رئیس المحدثین ابوزرعہ کی طرح یہ فتوے دیتے ہیں کہ اگر شخصے بطلانِ زن خود سوگند خورد کہ آنچہ در مؤطا است بلاشک و شبہ صحیح است، حانث نشود" (بستان المحدثین مصنفہ مولانا شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ، مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۳) نہ علامہ ابو علی نیشاپوری کی طرح یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آسمان کے نیچے امام مسلم کی کتاب سے زیادہ صحیح کوئی (کیا قرآن بھی نہیں؟

---

[1] معلوم نہیں ان بزرگوں کا ادیم الارض "کیا تھا جس کو چاہتے تھے۔ آسمان پر چڑھا دیتے تھے۔ بخاری تو من اوّلہٖ الیٰ آخرہٖ ہے ہی کتاب رسول۔ مسلم کا پایہ بھی کچھ کم نہیں۔ جس کے گھر میں ابو داؤد ہے۔ اسکے گھر میں گویا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں۔ حد ہے کہ فصوص الحکم الہٰی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(طالب) کتاب نہیں۔ تاریخ الحدیث مصنفہ عبدالصمد ص ۱۴۷) نہ صحیح بخاری شریف کو عوام کی طرح ازاول تا آخر صحیح مانتے ہیں بلکہ سلف صالح کی تقلید سے کلیتاً آزاد ہو کر فرماتے ہیں۔ کہ بدعقیدہ اور خصوصاً شیعہ راویوں نے اپنے مکر و فریب سے کام لے کر احادیث وضع کرلیں اور نہ حقیقتاً احادیث میں قرآن مجید کیطرح ہادی مطلق اور اصل مطاع بننے کی صلاحیت ہے۔ لیکن وہ اپنے جوش میں یہ بھول جاتے ہیں کہ تمام فاسد العقیدہ راویوں کا کیا ذکر اگر صرف شیعہ راویوں کی روایات نکال دی جائیں تو بقول علامہ ذہبی رح سارے آثار نبویہ جاتے رہیں گے اور یہ مفسدہ عظیمہ ہے۔" ملاحظہ ہو، البیان بابت اکتوبر ۱۹۴۲ء) ۴۵

اور بعض لوگوں کو معاصرین کی جرح سے شیعہ ثابت کرنے کی دھن میں یہ بات فراموش کر جاتے ہیں کہ حضرات اہلحدیث کے یہاں یہ عجیب و غریب اصول موجود ہے کہ ایک محدّث کی جرح معاصر محدّث پر قابل قبول نہیں۔

(تاریخ الحدیث ص ۱۶۳)

اکتوبر کے البیان میں، البیان کے فاضل نامہ نگار مولانا تمنا عمادی مجیبی نے تفسیری روایات سے گھبرا کر ابن جریر طبری کو شیعہ ثابت کرنا چاہا ہے اور اپنے والہانہ جوش میں یہ امر بھی نظر انداز فرما دیا ہے کہ تعدیل کرنے والوں کی تعداد جرح کرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ حالانکہ جرح اور تعدیل کرنے والوں

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) غیر متعلق کتاب بھی گفتۂ رسول وحی خفی بن گئی۔ کہاں تک گنائیں۔ دینیات میں اتنا مبالغہ! الاماں (البیان) ۲؎ بلکہ بنا بر بعض روایات امام شافعی علیہ الرحمۃ نے بعد کتاب اللہ کی قید بھی اُٹھا دی اور صاف صاف فرمایا ہے۔ ما تحت ادیم السماء اصح من مؤطا مؤطا یعنے آسمان کے نیچے مؤطا شریف سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو المؤطا امام مالک مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ص ۳۹۲) طالب۔ ۳؎ یہ امر تعجب کا باعث ہے کہ اصحاب حدیث اب تک یہ فیصلہ نہ فرما سکے کہ صحاح ستہ میں صحیح ترین کونسی کتاب ہے اور کیوں؟ (طالب)

کی تعداد پر بھی نظر کی جاتی ہے۔ یہی علامہ سبکی رح نے طبقات شافعیہ میں لکھا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ امر علاوہ اس کے کہ عقل و انصاف کے خلاف ہے کہ اس کی زد سے کوئی امام بھی نہیں بچ سکتا۔ نہ امام مالک نہ امام اعظم نہ امام بخاری رح

(تاریخ الحدیث صہ ۱۶۴)

حضرت مولانا تمنا نے ابن جریر طبری کا تشیع مندرجہ ذیل امور سے ثابت فرمانا چاہا ہے۔

۱۔ امام ذہبی رح کی میزان الاعتدال اور ابن حجر کی لسان المیزان ضعفاء و مجروحین ہی کے حالات میں تالیف کی گئی ہے اور دونوں ہی ابن جریر کا ترجمہ ضعفاء و مجروحین ہی کے ساتھ تحریر کرتے ہیں۔

۲۔ علاوہ اس تذکرے کے امام ذہبی رح اور ابن حجر رح نے ابن جریر طبری کے رفض سے تو انکار کیا مگر شیعہ ہونے سے انکار نہ کر سکے۔

۳۔ ابن جریر طبری نے شیعوں کے مسلک توریہ (اخفاءِ حقیقت) پر عمل کرتے ہوئے حضرات شیخین کے حق میں دو معنے الفاظ استعمال کئے۔

امر اول تو اسلئے قابل اعتناء نہیں ہے کہ خود مولانا تمنا عمادی کو اعتراف ہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر رح کو ابن جریر طبری سے اتنی عقیدت تھی کہ حالانکہ دونوں کو لکھتے ہیں۔ کہ علامہ حافظ سلیمانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ابن جریر روافض کے لئے جھوٹی حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ مگر اس کو نقل کرنے کے بعد حافظ سلیمانی کے علم و فضل و اتقان کے تسلیم کرنے کے باوجود بھی (کذا فی الاصل) اس الزام کو اتہام قرار دیتے ہیں۔ پھر ابن حجر کے شیخ الشیوخ ابو حیان اپنی تفسیر میں ان کو مذہب امامیہ کا ایک امام لکھتے ہیں اور انہوں نے کوئی حوالہ علامہ سلیمانی کا نہیں دیا ہے مگر ابن حجر رح اپنے شیخ الشیوخ پر بھی رجماً بالغیب الزام دیتے ہیں کہ ان کو علامہ سلیمانی کے قول سے دھوکا ہوا جو ایسا لکھ دیا۔

(البیان بابت اکتوبر ۱۹۴۲ء صہ ۴۸)

خود غور فرمائیے۔ کہ ایک شخص کی توثیق دنیائے اسلام کرتی ہے اور اُس شخص پر صرف دو عالم جرح کرتے ہیں اور ان میں دو عالموں کی جرح کو خود ان کے شاگرد ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں تو اس شخص کی جلالت قدر میں کیا فرق آسکتا ہے۔

امر ثانی اسلیئے محتاج توجہ نہیں ہے کہ خود مولانا تمنّا تسلیم فرماتے ہیں کہ امام ذہبیؒ فیہ تشیّع کے بعد وموالاۃ لاتضر تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ان میں تشیّع تھا۔ اور حضرت علی رض اور ان کے اہل بیبت[1] (کذا فی الاصل) رضی اللہ عنہ کے ساتھ (غیر معمولی) (یہ لفظ مولانا تمنّا نے بڑھایا ہے۔ طالب) موالات تھی جو ضرر رساں نہیں ہے۔ ابن حجر عسقلانی رح اپنی کتاب میں امام ذہبی رح کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ تو فیہ تشیع کے بعد اپنی طرف سے "یسیر" کا لفظ بڑھا دیتے ہیں۔ یعنے ایک ہلکا سا تشیع ان میں تھا۔" (البیان اکتوبر ۱۹۴۲ء ص ۴۱-۴۲)

یہ بھی واضح رہے کہ مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کی تحقیق کے مطابق کتب قدیمہ میں "من الشیعۃ ومن شیعۃ علی" تحریر ہونے کا یہ مطلب تھا کہ وہ شیعہ اُولیٰ تھا۔

فرض کیجیئے کہ مولانا تمنا شیعہ اولیٰ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تو اب راویوں کے تین طبقے ہو جائیں گے۔ ایک وہ رافضی یا شیعہ کہا گیا ہے۔ ایک وہ جنہیں اہل سنت سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایک وہ ——————— جنہیں ناصبی یا خارجی بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا تمنّا کے عقیدے کے مطابق پہلے طبقے کی روایات تو تسلیم کی ہی کی جا سکتیں۔ رہا دوسرا اور تیسرا طبقہ تو بقول مولانا تمنّا وہ (یعنی شیعہ) اپنے مسلک کتمان (تقیہ) کے مطابق شیعہ اپنے عقائد فاسدہ کو پوشیدہ ہی رکھتے تھے۔" (البیان ص۴۲) بلکہ کبھی کبھی فضیلت شیخین کا راگ بھی از دل الاپتے رہے۔ یہاں تک کہ بعضوں نے حضرت علی رض کی شان میں گستاخیاں علانیہ طور سے کر کے اپنے کو خارجی بھی مشہور کرایا۔ مگر تھے وہ درحقیقت شیعہ۔

(البیان اکتوبر ۱۹۴۲ء ص ۴۴)

---

[1] یہ کتابت کی غلطی تھی، اصل مسودہ میں بیت لکھا ہے۔ (البیان)

غرض روایات کا راوی کھلا ہوا شیعہ ہو یا سنی یا ناصبی یا خارجی، یقین کے طور نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی روایت شیعوں کی دست برد سے محفوظ رہی ہیں اس صورت میں کیا یہ مخلصانہ مشورہ بے جا ہوگا کہ مولانا تمنا عمادی ایسی غیر یقینی شئے کو چھوڑ کر کلیتاً قرآن کریم کے ہو رہیں۔

ممکن ہے کہ حضرت مولانا یہ ارشاد فرمائیں کہ اکثر روایات میں شیعوں کے تغلب و تصرف کا امکان ہے لیکن بعض روایات ایسی بھی ہیں جن میں شیعوں کی دست برد کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اگر اس طرح کی کچھ روایات ملتی بھی ہیں تو ان میں شیعوں کی روایات سے بڑھ کر ندرت ہوتی ہے۔ مثلاً مؤطا شریف مطبوعہ مجتبائی دہلی ص۴۲ پر ارشاد ہوتا ہے۔

مالك انه سأل ابن شهاب عن قول الله تبارك و تعالیٰ: یاایها الذین امنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر الله فقال ابن شهاب کان عمر بن الخطاب یقرأها اذا نودی للصلوٰۃ فامضوا الی ذکر الله۔ انتهی بلفظه

مالک نے ابن شہاب سے اللہ تبارک و تعالیٰ کے ارشاد یاایها الذین امنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر الله کے متعلق سوال کیا۔ تو ابن شہاب نے فرمایا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تو اسے یوں پڑھتے تھے۔ اذا نودی للصلوٰۃ فامضوا الی ذکر الله۔

کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ قرآن مجید سات قراءتوں پر نازل ہوا تھا۔ اسلئے حضرت عمر رض کی قراءت بھی انہی سات قراءتوں میں سے ایک قراءت ہوگی لیکن اول تو سات قراءتوں کا مسئلہ خود ہی محتاج تامل ہے۔ دوسرے یہ کہ فرق صرف فاسعوا اور فامضوا کا نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کی موجودہ قراءت سے نماز جمعہ کا وجوب

ثابت ہوتا ہے اور حضرت عمرؓ ایسے جلیل القدر صحابی کی قرأت سے (یعنی مِن یَوۡمِ الجُمُعَۃِ کی عدم موجودگی کی وجہ سے) نمازِ جمعہ تشریف لے جاتی ہے۔ دل بے اختیار چاہتا ہے کہ امام مالک رحؒ یا حضرت ابنِ شہاب کو شیعہ ثابت کرکے اس روایت سے نجات حاصل کی جائے مگر مشکل یہ ہے کہ علم رجال کی کسی کتاب میں ان دونوں بزرگوں کے متعلق رفض کیسا، تشیّع کا بھی الزام نہیں لگایا گیا ہے۔ ہاں ایک صورت ہوسکتی ہے کہ چونکہ مالکی حضرات روافض کیطرح ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں، اسلئے یہ فرض کرلیا جائے کہ ان کے امام بھی شیعہ یا کم ازکم مائل بتشیّع ہوں گے۔

امرِ ثالث یعنی حضرات شیخین کی بدگوئی کو مولانا تمنا نے ابن جریر طبری کی ایک عبارت کو استفہامیہ صورت میں پیش کرکے ثابت فرمایا ہے لیکن اول تو بعض اصحاب کو حضرت مولانا تمنا کے اس تصرف سے اختلاف ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ کس دلیل سے امام اعظم رحؒ حضرت امام ابوحنیفہ رحؒ سب سے بڑے رافضی بن جائیں گے۔ مولانا محمد صاحب مرحوم بانیٔ اخبار محمدی دہلی نے "تاریخ بغداد للامام العلّامۃ المحدث ابی بکر الخطیب[۱] البغدادی المتوفی ۴۶۳ھ کے ایک حصے کا ترجمہ کرکے "امام محمدی" کے نام سے باردوم ۱۳۴۵ھ میں جید برقی پریس دہلی میں چھپوایا ہے۔ اسکے بعض اقتباس مولانا تمنا کے ملاحظہ کے لیئے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ ذکر لہ قضاء من قضاء عمر	ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضؓ کا
او قول من قول عمر فی	ایک فیصلہ اور ان کا ایک قول ابوحنیفہ
الولاء فقال ھذا قول شیطان	کے سامنے ولاء (دوستی) کے بارے میں
(امام محمدی ص۱۰۲)	پیش کیا گیا تو کہنے لگے، یہ شیطان کا قول ہے۔ (امام محمدی ص۱۰۲)

---

[۱] خطیب بغدادی کی جلالت قدر اسی سے ظاہر ہے کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (جو بقول مولانا تمنا ثقہ رواۃ کے لیئے مختص ہے) میں ان کے متعلق ارشاد فرمایا ہے، الخطیب الحافظ الکبیر الامام محدث الشام والعراق خطیب بغدادی بڑے حافظ امام اور شام و عراق کے محدث تھے۔ (امام محمدی ص۳) طالب

یقین فرمائیے کہ اس دور میں ہر کس و ناکس اس گستاخی کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور اگر سبّ شیخینؓ ہی معیارِ رفض ہے تو یقیناً حضرت امام اعظمؒ سب سے بڑے شیعہ تھے۔

۲۔ ابراہیم بن محمد فزاری کہتے ہیں کہ میرے بھائی ابراہیم فاطمی کے ہمراہ بصرے میں قتل کئے گئے، میں ان کے ترکہ کو لینے کی غرض سے چلا، امام صاحب سے ملاقات کی تو کہنے لگے۔ کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے ان سے واقعہ بیان کیا تو کہنے لگے۔ کیا اچھا ہوتا کہ تو بھی اس کے ساتھ قتل کیا جاتا۔ تیرے لئے بھی وہی بہتر تھا [1] اس مکان سے جس سے تو آ رہا ہے میں نے کہا، حضرت! پھر آپ کو کس چیز نے روکا ہوا ہے۔ کہنے لگے، اگر میرے پاس لوگوں کی امانتیں نہ ہوتیں تو مجھے اس میں کوئی تامل نہ تھا۔"

(امام محمدی صہ ۱۰۳، ۱۰۴)

اگر خلیفۂ وقت کے مقابلے میں ایک فاطمی کو ترجیح دینا بھی دلیل تشیّع نہ بن سکے۔ تو آئینہ مذہب امامیہ ترجمہ اُردو تحفہ اثنا عشریہ مصنّفہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی مطبوعہ مطبع رفیق عام لاہور کے مندرجہ ذیل دو اقتباسات بہر حال حضرت امام اعظمؒ کو شیعہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

(الف) جب ابو حنیفہ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو آپ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے روضہ کی زیارت کی۔ پھر صادقؑ کے گھر کو آئے۔ ان کا خورد سال بیٹا آیا۔ پھر اُٹھے اور تعظیم کی۔ پھر کہا کہ مسافر تمہارے شہر میں اپنی حاجت کا کہاں قصد کرتے ہیں۔ پس اسے وہی جواب دیا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ پھر ابو حنیفہ نے کہا۔ خدا اس جگہ کو بہتر جانتا ہے جو اپنی رسالت کے لئے مقرر کرتا ہے۔" (صہ ۱۰۴)

---

[1] کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت امام اس قول کو امیر المؤمنین عمرؓ سے منسوب کرنا [illegible] گوارا [illegible] [illegible] کہ شہدا کا قول ہے۔ حضرت [illegible] رضی اللہ عنہ کا نہیں۔ [illegible]

[2] [illegible] صادقؑ (الیاں)

(ب) ابوحنیفہ رحمہ ہمیشہ حضرت صادق علیہ السلام کی صحبت و خدمت پر فخر کرتے اور لولا السنتان لھلک نعمان اگر دو سال نہ ہوتے تو نعمان ضائع ہوجاتا یہ کلمہ ان کی طرف سے مشہور ہے۔" (ص ۱۰۳، ۱۰۲)

ہم حقیقتاً حضرت مولانا تمنّا کے ممنون ہوں گے۔ اگر وہ کوئی ایسا محدّث یا ایسا سلسلہ رُواۃ پیش فرمائیں جو ہر طرح کی جرح سے محفوظ ہو۔ فانتظروا وانا معکم من المُنتظرین۔

(اس مضمون کا جواب تو اگلے مضمون میں مولانا تمنّا خود دے رہے ہیں۔ مگر یہی مضمون مختلف شیعہ حضرات اپنے اپنے انداز میں اب تک پیش کرتے رہتے ہیں کچھ عرصہ پہلے رضویہ سوسائٹی کراچی کے ایک شیعہ اہل قلم نے بھی اس مضمون پر ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس کے جواب میں مولانا علی العبّاسی نے دو سو سے زیادہ صفحات میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ کے نام سے ایک محققانہ کتاب لکھی جس کا ہر صاحب علم کو مطالعہ کرنا چاہیئے، کیونکہ مناقب کی کتابوں کیطرف لوگوں کی توجہ رہتی ہے اور تحقیق کی سنگلاخ وادی میں آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اسی کمزوری کا اثر ہے جو مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "امام ابوحنیفہ رحمہ کی سیاسی زندگی" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب خلافت وملوکیت کے امام ابوحنیفہ رحمہ سے متعلق باب میں اور ان دونوں کتابوں سے استفادہ کرنے والے مولانا عبدالقیوم حقانی کی کتاب "دفاع امام ابوحنیفہ رحمہ" کے سیاسی نظریات والے باب میں جھلکتا ہے۔" اللّٰھم ارنا الحق حقًّا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ (طاہر)

لہ امام ابوحنیفہ رحمہ دو سال امام صادق کی صحبت میں رہے ہوں گے نہیں تو صادق اور ان کے بزرگوار حضرت علی اور ان کی اولاد میں بھی کوئی شیعہ نظر نہیں آتا۔ پھر امام ابوحنیفہ رحمہ ان کی صحبت میں رہ کر کس طرح شیعہ بن گئے حقیقت یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار اپنے عنوان مضمون کو نباہنے میں کامیاب نہیں ہو سکے

ان کان رفضاً حب آل محمد فلیشھد الثقلان انی رافض

(امام شافعی [illegible])

کیا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس خارجی تھے

(مولانا تمنا عمادی)

میں ایک دوست سے ملنے چھپرہ (صوبہ بہار) گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو ماہِ نومبر کا البیان جو آیا ہوا تھا۔ ملا۔ پہلا ہی مضمون مولانا محمد عباس صاحب طالب صفوی کا بعنوان "کیا امام اعظم شیعہ تھے؟" نظر سے گذرا۔ نہایت غور و تامّل کے ساتھ پڑھ گیا۔ چونکہ یہ مضمون درحقیقت میرے اس مضمون سے متعلق ہے جو ابوجعفر بن جریر الطبری پر ماہِ اکتوبر سال رواں کے البیان میں شائع ہوا تھا۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ مختصراً ہی مگر بخیال رفع غلط فہمی کچھ لکھ دوں اسلئے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

میرے فاضل دوست حضرت طالب صفوی نے میرے متعلق لکھا ہے کہ میں صرف تین ہی باتوں سے ابن جریر طبری کا تشیّع ثابت کرتا ہوں۔

۱۔ میزان الاعتدال اور لسان المیزان میں ضعفا و مجروحین ہی کا حال ہے اور انہیں دونوں میں ابن جریر کا ترجمہ ہے۔ اس لئے ابن جریر ضعیف اور مجروح تھے۔ اور چونکہ ضعیف و مجروح تھے اسلئے شیعہ تھے۔

۲۔ امام ذہبی رح اور ابن حجر رح نے ابن جریر کے رفض سے تو انکار کیا ہے۔ مگر تشیع سے انکار نہ کر سکے۔

۳۔ ابن جریر نے (بقول صفوی) شیعوں کے مسلک توریہ (اخفاءِ حقیقت) پر عمل کرتے ہوئے حضرات شیخین رض کے حق میں ذومعنی الفاظ استعمال کئے۔

اس کے بعد مولانا صفوی نمبر اول کا جو جواب لکھتے ہیں۔ اس کا خلاصہ خود ہی آخر جواب میں یوں لکھتے ہیں۔ ایک شخص کی توثیق دنیائے اسلام کرتی ہے اور اس شخص پر صرف دو عالم جرح کرتے ہیں اور ان دو عالموں کی جرح کو خود ان کے شاگرد ناقابل اعتناء سمجھتے ہیں تو اس شخص کی جلالت قدر میں کیا فرق آسکتا

ہے۔ (انتہیٰ العبارۃ)

تمنا عفی عنہ باادب عرض کرتا ہے کہ دنیائے اسلام نے کہاں ابن جریر کی توثیق کی ہے؟ برائے خدا اگر اسلام میں کوئی نئی دنیا پیدا ہوئی ہے تو ذرا اس دنیا کے لوگوں کے نام تو گنائیے؟ ائمہ حدیث میں سے کس کس نے اپنی کتابوں میں ان سے روایتیں لی ہیں؟ صرف تفسیری روایتیں تو سدی اور کلبی تک سے تمام مفسرین نے لیں یہاں تک کہ خود ابن جریر نے، مگر سنن میں بھی کسی نے ابن جریر سے کوئی روایت لی۔؟

خود ابن حجر نے آخر تہذیب التہذیب میں اور امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ کیوں نہیں درج فرمایا۔ حالانکہ ان دونوں کتابوں میں بھی وضّاعین وکذابین کے ترجمے بھی موجود ہیں۔ لسان المیزان میں باوجود مدح سرائی اور التزام کے ان کی توثیق کی کتنی سندیں نقل کی ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے خطیب بغدادی کا یہ لکھنا کہ بڑے عالم تھے، حافظ تھے، قراءات اور ناسخ ومنسوخ سے واقف تھے اور ایسے تھے ویسے تھے۔ اس کی تو دلیل نہیں۔ بہت بڑا عالم اور بہت بڑا ماہر ہونا اور بات ہے اور حجّت وسند ہونا اور بات ہے۔ صاحب تصنیف ہونے سے کوئی بھی ثقہ نہیں ہو جاتا۔

ابن خالویہ حسین ابن احمد کا قول جو سند میں ابن حجر نے پیش کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھ سے ابن خزیمہ نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے تفسیر ابن جریر لکھ لی ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے ان سے (ابن جریر سے) املاء کیا ہے۔ (یعنی وہ بتاتے گئے میں لکھتا گیا) سات برس میں۔ تو مجھ سے ابن خزیمہ نے وہ تفسیر مستعار لی اور کئی سال کے بعد واپس کی اور کہا کہ میں نے اول سے آخر تک دیکھی۔ روئے زمین پر ابن جریر سے زیادہ عالم کسی کو میں نہیں جانتا۔ اور حنابلہ نے البتہ ان پر ظلم کیا (یہ اسلئے کہ علمائے حنابلہ عام مسلمانوں کو ابن جریر سے ملنے نہیں دیتے تھے اور روکتے تھے کہ یہ شخص گمراہ ہے، کذاب ہے تم کو بھی گمراہ کر دے گا۔) تو یہ قول

جو ابن خالویہ کا سند میں پیش کیا ہے تو ابن خالویہ تو خود شیعہ تھے۔ ابن حجرؒ ہی اسی لسان المیزان کی جلد ۲ صـ ۲۶۷ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں :-

کان اماميًا عالمًا بالمذهب .... وقد قرأ ابو الحسين النصيبي وهو من الامامية عليه كتابة في الامامة۔ مات ۳۷۰ھ۔

اور ابن خالویہ ہی کے ایک استاد ابوبکر بن مجاہد ہیں۔ ان کا بھی ایک قول بروایت ابو علی الطوماری نقل کیا ہے جس میں اسی قدر ہے کہ میرا گمان ہے کہ ابن جریر سے اچھا قرآن پڑھنے والا اسی قراءت سے (کسی خاص قراءت کی طرف غالباً اشارہ ہے) اللہ تعالیٰ نے نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ ابوبکر مجاہد بھی شیعہ ہی ہیں۔ اور ابو علی طوماری تھرڈ کلاس لوگوں میں ہیں۔ ابن حجرؒ نے لسان المیزان ہی میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ :-

تكلموا فيه لانه روى عن غير اصل۔ وقال ابن ماكولا۔ لم يكن بمرضي۔ (لسان الميزان جلد ۴ صـ ۲۴۰)

غرض اس قسم کے لوگوں یا خود شیعوں ہی نے اگر ابن جریر کی مدح و توثیق کر دی تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دنیائے اسلام ان کی توثیق کر رہی ہے چونکہ ابن جریر نے ہر طرح رطب و یابس روایتیں جمع کر دی ہیں اور ہر فرقے والا اپنے مطلب کی روایت اس میں سے چن لیتا ہے۔ اسلئے یہ تفسیر ہر فرقے کے کام آجاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر فرقے میں مستعمل ہے اور فرقہ پرستوں کا کام اس سے خوب

لہ یعنی وہ امامیہ (شیعے) تھے اور اس مذہب کے عالم تھے۔ مسئلہ امامت پر ان کی ایک کتاب تھی جس کو ان سے ابو الحسین النصیبی شیعہ امامیہ نے پڑھا تھا۔ ٢ہ ان کے متعلق لوگوں میں چہ میگوئیاں رہی ہیں کیونکہ وہ بے اصل روایت کیا کرتے تھے۔ علامہ علی بن ہبۃ اللہ ماکولا نے فرمایا ہے کہ یہ لوگوں کے نزدیک ناپسندیدہ تھے۔ علامہ ابن حجرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ اس مصرف کے نہ تھے۔

چلتا ہے۔ باوجود اس کے کہ جہاں ہر فرقے کی تائید ہو رہی ہے۔ وہاں ہر فرقے کی تردید بھی ہو رہی ہے۔ مگر ہر شخص اپنے مطلب ہی کی ہر روایت لے لیتا ہے۔ اور مخالف روایتوں کو چھوڑ دیتا ہے تو درحقیقت یہ تفسیر یا ان کی تاریخ کوئی سند نہیں ہے مگر تفرق و اختلاف کی دیوار کا پشتہ ضرور ہے۔

میں یہ بھی نہیں کہتا کہ ان کی پیش کردہ ہر روایت غلط ہے۔ اسی ذخیرے میں بعض روایتیں صحیح بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر ان کی صحت و عدم صحت کا پتہ "عرض علے القرآن" ہی سے مل سکتا ہے۔ جو روایتیں قرآن کے مطابق ہیں۔ وہی صحیح کہی جا سکتی ہے۔

دوسرے امر کے متعلق مولانا طالب صفوی نے وہی پرانا راگ الاپا ہے اور شیعہ اولیٰ و شیعہ اُخریٰ کا فرق دکھا کر موالاۃ لاتضر اور تشیّع یسیر کو نمایاں کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اسکے متعلق میں عرض کروں گا۔ کہ میرا مضمون اکتوبر کے البیان میں ص ۴۳ زیر عنوان "شیعوں کا ایک دستور" ملاحظہ فرمایئے۔ وَلَا اِعَادَۃَ فِی الاِعَادَۃِ (دُہرانے میں کوئی فائدہ نہیں) موالاۃ کا ترجمہ میں نے "غیر معمولی موالات" جو کیا ہے۔ اس کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ غیر معمولی کا لفظ تمنا نے بڑھایا ہے۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہٗ اور ان کے اہل بیت و احفاد کے ساتھ سارے اہل سنت مَوالات رکھتے ہیں۔ یہ خصوصیت ابن جریر کی نہ تھی۔ پھر لَا تضر (غیر مضر) کی قید بھی کچھ اشارہ کر رہی ہے کہ ان کی موالات حدِّ اعتدال سے ضرور بڑھی ہوئی تھی۔ مگر وہ اس حد تک امام ذہبی رح کے نزدیک نہیں پہنچی تھی جو مضر سمجھی جا سکے۔ پھر وہ موالات "غیر معمولی" ہی ہوئی۔ مضر اور غیر مضر کا فرق تو اسکے بعد فیصلہ طلب ہے مگر "غیر معمولی" ہونا تو اسی موالات کا اہل سنت کے نظریہ کے مطابق ضرور حق ہے۔

باقی رہا مولانا طالب صفوی کا یہ فرمانا کہ تمنا کے نزدیک تین ہی قسم کے راوی ہیں (۱) رافضی یا شیعہ (۲) ناصبی یا خارجی اور وہ بھی بقول تمنا چھپے ہوئے

روافض ہی ہیں ــــــــــــــــــــــــ۔ اسلئے یہ دونوں طبقے بالکل ہی تمنا کے نزدیک ناقابل اعتبار ہیں۔

(۳) باقی رہ گئے محض گنتے چند "وہ النادر کالمعدوم" ہونے کے علاوہ ان کی روایتوں کے متعلق بھی شبہ کیا جاسکتا ہے کہ شیعوں کی دست بُرد سے محفوظ نہ ہوں، اسلئے تمنا کو چاہیئے کہ سرے سے جنس حدیث ہی سے انکار کرکے کلیتاً قرآن حکیم کا ہو رہے۔

تمنا عفرلہٗ عرض کرتا ہے کہ بتوفیقہٖ تعالےٰ پندرہ برسوں سے زیادہ ہوئے کہ میں نے شعوری طور پر ائمۂ حدیث کے جمع کردہ سارے ذخائر حدیث کے مثلہ معہ ہونے سے قطعی انکار کر دیا ہے اور کسی کو بھی قرآن کریم کیطرح حجّت فی الدین نہیں سمجھتا اور صرف قرآن حکیم کو بے مثل تسلیم کرتا ہوں۔ کلیتاً بھی اور جزئیتاً فالحمدُ للہ علےٰ ذالک۔

مگر ذات رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کو ضرور حجت فی الدین سمجھتا ہوں۔ آپ کی تعلیم و تبیین کو عین دین مانتا ہوں، اس پر ایمان رکھتا ہوں کہ آپ کی کوئی تعلیم و تبیین بلکہ کوئی قول یا فعل قرآن کے خلاف بلکہ قرآن سے باہر نہ ہوا اور نہ ہوسکتا ہے۔ اسلئے جب کوئی آواز کان میں پڑی کہ رسولُ اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے یوں فرمایا ہے یا اس طرح عمل کیا ہے تو لاترفعُوا اصواتکم فوق صوت النبی کے فرمان کے مطابق یہ سنتے ہی انکار اور رد انسلم کی آواز بلند نہیں کر دیتا بلکہ اذا جاءکم فاسق بنباءٍ فتبیّنُوا کے حکم قرآن کے ماتحت اس کی تحقیق شروع کر دیتا ہوں کہ اس قول یا فعل کی نسبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی طرف واقعتاً صحیح ہے یا نہیں۔ اور اس کے لیے قطعی معیار صرف ایک ہی ہے اور وہ قرآن حکیم کے سامنے پیش کرنا۔ اگر وہ روایت قرآن کے مطابق ہوتی ہے تو تسلیم کر لیتا ہوں، ورنہ انکار کر دیتا ہوں، چاہے اسکے راوی کسی قسم کے ہوں۔ باقی رہی تنقید زواہ، تو یہ صرف روایت پرستوں کو خاموش کرنے کے لئے

ہے اوران پر اتمام حجّت ہے اور بس۔

اسی سلسلے میں مولانا طالب صفوی نے موطاءِ امام مالک رحمۃ اللہ کی ایک روایت نقل فرمائی ہے جس کو امام مالک رحمۃ اللہ ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ ابن شہاب نے فرمایا کہ حضرت عمر رضؓ بن خطاب تو لسے یوں پڑھتے تھے الخ۔ یعنی سورہ جمعہ میں اذا نودیَ للصّلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعَوا الیٰ ذکر اللہ میں بجائے فاسعَوا کے فامضوا پڑھتے تھے۔ اس کے بعد مولانا طالب صفوی لکھتے ہیں کہ دل بے اختیار چاہتا ہے کہ امام مالکؒ یا حضرت ابن شہابؒ کو شیعہ ثابت کرکے اس روایت سے نجات حاصل کی جائے مگر مشکل یہ ہے کہ علم رجال کی کسی کتاب میں ان دونوں بزرگوں کے متعلق رفض کیسا تشیع کا بھی الزام نہیں لگایا گیا ہے ...... الخ

تمنا عُفرلہٗ عرض کرتا ہے۔ ؎

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے۔

مولانا صفوی نے دنیاءِ رجال کی خاک ابھی میری طرح نہیں چھانی ہے۔ دوسروں کی شہادت پیش نہیں کرتا۔ خود شیعوں کی کتب رجال کی شہادت لیجئے "منتہی المقال فی اسماءِ الرّجال" راویانِ شیعہ کے حالات میں نہایت مستند اور مشہور کتاب ہے۔ اس میں محمد بن مسلم بن شہاب الزہری کا نام پڑھیئے اور یہ عبارت بھی دیکھ لیجئے کہ ذکرنا ھنالک[1] لہ مایشیر الیٰ کونہٖ من الشیعۃ اسلیئے اب تو آپ بہت آسانی کے ساتھ اس روایت مکذوبہ سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر آپ تو اتنا ضرور جانتے ہوں گے۔ کہ ابن شہاب کی ولادت حسب اختلاف اقوال سنہ ۵۰ھ یا سنہ ۵۱ھ یا سنہ ۵۶ھ یا سنہ ۵۸ھ میں ہے جن میں سے اصح قول میرے نزدیک سنہ ۵۱ھ ہی ہے۔ اور حضرت امیر المؤمنین فاروق

---

[1] میں نے وہاں ذکر کیا ہے جو اشارہ کرتا ہے اس امر کیطرف کہ ابن شہاب شیعہ تھے۔

رضی اللہ عنہ کی وفات یکم محرم ۲۴ھ میں ہے۔ اسلئے ابن شہاب نے حضرت فاروق اعظم رضہ سے بسمع خود تو یہ قراءت سنی نہیں ہوگی۔ یقیناً وہ کسی دوسرے ہی سے سن کر یہ روایت کر رہے ہوں گے تو جب تک اس درمیانی راوی کا حال معلوم نہ ہو، اس روایت کی حقیقت کس طرح معلوم ہو سکتی ہے؟ ابن شہاب مرسل روایت کرنے کے بے حد خوگر تھے۔ اسی لئے یحییٰ بن سعید جوان کے شاگرد تھے۔ قتادہ اور ابن شہاب کی مرسل روایتوں کو کہا کرتے تھے کہ بمنزلۃ الریح۔ دیکھئے تہذیب التہذیب ترجمہ ابن شہاب۔ تو یہ روایت بھی بمنزلۃ الریح ہی ہے۔ اب تو اس وضعی وجعلی روایت سے آپ کو مکمل نجات مل گئی اور آپ کی منہ مانگی مراد مل گئی؟ اب تو یہ کہئے کہ،

لِلّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر مے خواست
آخر آمد زپس پردہ تقدیر پدید

اب ذرا امام مالک رحہ کی روایات کا حال بھی سُن لیجئے۔ بلا شبہ امام مالک رحہ بزرگ اور ثقہ وحجت وسند تھے۔ مگر ان کے پرائیویٹ سیکرٹری ان کے کاتب احادیث اور صاحب السّر کا حال امام ذہبی رحہ کی میزان الاعتدال ص ۲۱۰ ج ۱ اور ابن حجر عسقلانی کی تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۸۱ میں مفصّل موجود ہے اور دونوں نے ان کو کاتب مالک رحہ ہی لکھا ہے۔ ان کو بالاتفاق تمام محدّثین نے کذاب اور راوی موضوعات لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یدخل علیہم مالیس من حدیثہم۔ یعنی ائمہ حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو داخل کر دیا کرتا تھا۔ جو ان کی حدیثیں نہیں ہوتی تھیں۔ اسلئے مؤطا میں یہ حدیث اگر اسی کی داخل کردہ ہو تو کیا تعجّب ہے ان کا تب مالک صاحب کا نام نامی واسم گرامی حبیب بن ابی حبیب ابو محمد البصری ہے۔ مؤطا کا جو نسخہ دائر وسائر ہے اور جن کی شرحیں عام طور سے ملتی ہیں۔ وہ یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر المصمودی الاندلسی القرطبی کا نسخہ ہے۔ انہوں نے مؤطا کا پورا نسخہ امام مالک رحہ سے نہیں سنا تھا۔ اسکے بعض حصّے زیاد بن عبد اللہ شبطون سے سنے تھے جو فرقہ زیدیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی شیعہ تھے اور ان کو خود فن حدیث

لہ ایسے لوگوں سے روایت کیا کرتے تھے جن کو نہ کبھی دیکھا نہ کہیں سے سنا۔

میں کوئی بصیرت نہ تھی۔ پھر وہم و تصحیف میں مبتلا تھے پس۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا۔

امرِ سوم: کا جواب دیتے ہوئے مولانا صفوی نے بطور معارضہ خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کے ترجمے سے ایک قول بلا سلسلۂ رُوات پیش کیا ہے جو حضرت امام اعظم کی طرف منسوب ہے جس سے ہرگز وہ مفہوم نہیں نکلتا۔ جو مولانا صفوی نکالتے ہیں۔ جیسا کہ محترم ایڈیٹر "البیان" نے فٹ نوٹ میں تحریر فرمایا ہے۔ پھر بھی مولانا صفوی لکھتے ہیں کہ۔ "اور اگر سبِّ شیخین رضہ ہی معیارِ رفض ہے" الخ میں پوچھتا ہوں کہ "سبِّ شیخین" اگر معیار رفض نہ ہوگا تو پھر کیا ہوگا؟ میں تو اس کو معیارِ رفض ہی نہیں بلکہ معیار نفاق سمجھتا ہوں۔

مولانا صفوی کے اس غیر معقول معارضہ کا جواب شافی محترم ایڈیٹر البیان لکھ چکے ہیں۔ اسلئے مجھے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ معارضہ کے جواب میں معارضہ ہی پیش کر دوں تو بہتر ہے۔ صفوی صاحب نے اسناد میں ایک قول پیش کر دیا ہے جو باوجود ان کے غیر مفید ہونے کے مشتبہ ہے کہ معلوم نہیں کہ یہ قول امام اعظم رحہ کا ہے بھی یا نہیں۔ میں معارضہ میں اسناد کے ساتھ صحیح مسلم کی روایت پیش کرتا ہوں۔ لیجئے سُنئیے۔ مقدمہ صحیح مسلم صہ ۱۰ مولوی مطبوعہ مطبع علوی دہلی میں ہے:۔

حدثنا داؤد بن عمرو الضبي قال نافع بن عمر عن ابن ابي مليكة قال كتبت الى ابن عباس رضہ اسئلة ان يكتب لى كتابًا ويخفى عني. فقال وَلَد ناصح انا اختار الأمور اختيارًا واخفي عنه. قال فدعى بقضاء على فجعل يكتب منه اشياء ويمرّ بالشيء فيقول والله ما قضى بهذا على الا ان يكون ضلّ

لیعنی: امام مسلم رحہ کہتے ہیں کہ داؤد بن عمرو الضبی نے ہم سے کہا کہ ہم سے نافع بن عمر نے ابن ابی ملیکہ (عبد اللہ بن عبید اللہ بن ابی ملیکہ زہیر بن عبد اللہ بن محمد التیمی المکی التابعی المتوفی ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ) سے سن کے کہا کہ ابن ابی ملیکہ فرماتے تھے کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضہ کو لکھا (اور) ان سے یہ درخواست کی کہ وہ میرے لئے ایک کتاب

۱ـه خطیب بغدادی [illegible] مسلم [illegible]

لکھ دیں اور مجھ سے پوشیدہ رکھیں تو حضرت عبداللہ بن عباس رض نے فرمایا کہ مخلص لڑکا ہے۔ میں اسکے لئے مناسب طور سے اُمور کا انتخاب کروں گا۔ اور اس سے پوشیدہ رکھوں گا۔ ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ تو حضرت عبداللہ بن عباس رض نے حضرت علی رض کے فیصلے منگولئے اور ان میں سے بعض چیزیں لکھنے لگے اور (اس سلسلے میں) بعض چیز ان کے سامنے سے گذرتی تھی تو وہ فرماتے تھے کہ اللہ کی قسم! علی نے نہیں فیصلہ کیا ہوگا۔ یا یں طور۔ مگر یہ کہ وہ گمراہ ہوگئے ہوں۔

فرمایئے حضرت عبداللہ بن عباس رض حضرت علی رض کے چچیرے بھائی ہیں۔ اور بقول ائمہ رجال مذہب شیعہ حضرت علی رض کے شاگرد رشید ہیں۔ اور بلا واسطہ راویانِ حدیث حضرت کے لکھے ہوئے فیصلے دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حضرت علی رض نے یہ فیصلے نہیں کئے مگر یہ کہ وہ گمراہ ہوگئے تھے۔ تو کیا نعوذ باللہ حضرت عبداللہ بن عباس رض نے حضرت علی رض کو گمراہ قرار دیا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس فیصلے کی نسبت جو حضرت علی رض کی طرف تھی۔ اس سے انکار کیا جس طرح امام اعظم رح نے اس قول یا فیصلے کو جسے حضرت فاروق اعظم کی طرف منسوب کرکے کسی نے ان کے سامنے پیش کیا تھا، حضرت فاروق اعظم رض کا قول نہیں تسلیم کیا اور کہا کہ یہ تو کسی شیطان کا قول ہے۔ اگر یہ طریقہ انکار ایسا ہے جس سے امام اعظم رح شیعہ ہو سکتے ہیں تو حضرت عبداللہ بن عباس رض کو ان سے پہلے خارجی بن جانا چاہیئے۔

اس روایت کے راویوں کو بھی سُن لیجئے۔ نافع بن عمر بن جمیل بن عامر الحافظ المکی بالاتفاق ثقہ ہیں۔ کان من اثبت الناس ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں۔ (متوفی ۱۶۹ھ) اور داؤد بن عمرو بن زہیر الضبی ابو سلیمانی البغدادی ایسے جلیل القدر تھے کہ امام احمد بن حنبل رح ان کی رکاب تھام کر چلا کرتے تھے۔ اور ابن ابی ملیکہ تو کبار تابعین میں سے تیس تیس صحابیوں کے دیکھنے والے ہیں اور بعضوں نے لکھا ہے کہ اسّی صحابیوں کو دیکھا اور تیس سے روایت کرتے ہیں۔ اسکے بعد مولانا صفوی اس قول کو جو امام اعظم رح کیطرف منسوب فرماتے ہیں۔ اسی طرح تصحیح اسناد کے

ساتھ ثابت فرمائیں تو تحقیق کا حق ادا ہو، ورنہ ہر گری پڑی روایت سے استدلال کرنا تو اہل علم کے شایان شان نہیں ہوتا۔ اسی طرح خطیب بغدادی متوفی ۴۶۳ھ کی اور بھی چند روایتیں مولانا صفوی نے امام اعظم رحؒ متوفی ۱۵۰ھ کے متعلق ہیں جب تک ان کے اسناد کی صحت اور روات کی وثاقت نہ دکھادی جائے کبھی قابل وثوق نہیں ہوسکتیں۔

باقی رہا محترم ایڈیٹر البیان نے جو مولانا صفوی کے جواب میں (فٹ نوٹ میں) تحریر فرمایا ہے کہ "ہمیں تو صادق علیہ السلام اور ان بزرگوں (حضرت علی اور ان کی اولاد علیہم السلام) میں بھی کوئی شیعہ نظر نہیں آتا۔ پھر امام ابوحنیفہ رحؒ ان کی صحبت میں رہ کر کس طرح شیعہ بن گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار اپنے مضمون کو نباہنے میں کامیاب نہیں ہوسکے" تو اس سے بہتر جواب مولانا صفوی کے ناکام عنوان مضمون کا اور کیا ہوسکتا ہے۔ وکفی بہ جواباً

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا ہے کہ مولانا صفوی نے میرے متعلق لکھا ہے کہ میں نے انہیں تین باتوں کو ابن جریر کی شیعیت کی دلیل میں پیش کیا ہے جن کو انہوں نے جواب دینے کے لئے منتخب فرمایا۔ حالانکہ کسی کا بھی جواب نہ ہوسکا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان تین باتوں کے علاوہ اور بھی دلیلیں ان کی شیعیت کی لکھی ہیں مثلاً:۔

۱۔ وہ غدیر خم والی جھوٹی حدیث اس کد کے ساتھ صحیح قرار دیتے تھے کہ اس کی تصحیح کے لئے ایک مستقل کتاب ہی لکھ ڈالی۔ حالانکہ یہ حدیث محدثین متقدمین کے نزدیک بالاتفاق اعتماد کے لائق نہیں ہے۔

۲۔ ابن حجر لسان المیزان میں طلاق کے ایک فتویٰ کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے مذہب شیعہ ہی کے مطابق دیا تھا۔

۳۔ حضرت علی رضا اور ان کے اہل بیت کے فضائل میں خصوصیت کے ساتھ ایک ایسی کتاب لکھی جس میں وضّاعین وکذابین کوفہ کے تمام مزخرفات

بھر دیئے۔

۴۔ ان کی تفسیر میں ایسی بہت سی موضوع روایتیں ہیں جو شیعوں کے موافق ہیں اور ان کو صرف یہی روایت کرتے ہیں۔ دوسرے محدثین ان روایتوں سے بالکل بے خبر نظر آتے ہیں جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جو علامہ حافظ سلیمانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ شیعوں کی حمایت میں روایتیں گھڑا کرتے ہیں۔

۵۔ میں نے ثبوت میں سورۂ احزاب کی آیۂ تطہیر کو پیش کیا تھا جس کی تفسیر میں انہوں نے تقریباً دس روایتیں خود وضع کر کے لکھی ہیں۔ ان کے سوا کسی اور محدث کے پاس وہ روایت نہیں دکھائی جا سکتی۔

مگر مولانا صفوی نے ان سب باتوں کو تو بالکل نظر انداز کر دیا کہ ان کے علاوہ جو تین باتیں تھیں۔ صرف انہیں کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش ناکام فرمائی کہ تمنا نے انہیں تین باتوں کی بناء پر ابن جریر کو شیعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجھ کو تو یقین ہے کہ ابوجعفر بن جریر الطبری کے مسمّیٰ ہرگز دو نہیں ہیں "ابن یزید اور ابن رستم" کا فرق بھی لایعنی ہے۔ محمد بن جریر کے دادا کا نام رستم" تھا۔ یہ طبرستان کے رہنے والے تھے۔ اور مجوسی تھے۔ مسلمان ہوئے اور ان کا اسلامی نام "یزید" رکھا گیا۔ محمد بن جریر اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری الکوفی کے شاگرد رشید تھے۔ اور اسمٰعیل بن موسیٰ شاگرد تھے۔ شریک بن عبداللہ ابن ابی شریک النخعی الکوفی کے اور یہ دونوں استاد شاگرد تھے۔ محمد بن جریر بھی شیعہ ہو گئے۔ اہل کوفہ سے راہ و رسم بہت تھی۔ کچھ دنوں کے بعد علماء شیعہ نے "یزید" کے نام سے بے زاری کی وجہ سے بھی اور پھر اپنے لئے ایک نئے" ابوجعفر محمد بن جریر الطبری" پیدا کرنے کے لئے بھی اپنی کتابوں میں ان کے دادا کا اصلی نام "رستم" رکھا۔ اور اہل سنت نے اسلامی نام "یزید" ہی لکھا۔ اس طرح شیعوں کے مقصد کے مطابق دو شخصیتیں

الگ الگ ہو گئیں۔ اہل سنت نے ان کی وہ کتابیں جو اجمالی مضامین کی تھیں۔ ان کو تو ابن یزید کی تصنیف سمجھ لیا گیا اور جو خالص شیعیت کی تھیں۔ ان کو ابن رستم کی تصنیف قرار دے کر شیعوں کے سر ڈال دیا۔

اور یہ بھی بخوبی ممکن ہے کہ خود ابن جریر ہی نے اپنی بعض تصنیفوں میں اپنے دادا کا نام 'رستم' لکھا۔ اور بعض میں اپنے دادا کا نام 'یزید' تاکہ دونوں طبقوں میں ان کی تصنیفات پھیلیں [1] کہیں کھل کر تشیّع ثابت کی جائے اور کہیں چھپ کر۔ وماذالک عن مثلہ ببعید۔ واللّٰہُ المستعانُ علیٰ ما تصفون۔

---

[1] کہ رستم سے عجمی خوش ہوں اور یزید سے سنّی۔ (طاہر)

ابنِ جریر طبری کا تشیّع

از: مولانا مفتی محمد اسحٰق صدّیقی ندوی۔ سابق مہتمم و شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنو۔ مولانا موصوف کے یہ دونوں مضامین ان کی کتاب "اظہار حقیقت" جلد اول ص۹۱ تا ص۱۰۱ سے اور جلد دوم ص۴۶۶ تا ص۴۷۹ سے لئے گئے ہیں (طاہر)

(۱)

ابن جریر طبری کا سنہ وفات ۳۱۰ھ ہے اور ان سے پہلے تاریخ کے عنوان سے اس طرز پر کسی تالیف کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر کسی نے کچھ لکھا بھی تھا تو وہ بھی مفقود ہو گیا۔ اس موضوع پر یہی جامع اور قدیم ترین تالیف ہے اور مابعد کی جتنی کتابیں تاریخ اسلام پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں تیسری ہجری تک کے واقعات اسی کتاب سے یا اول الذکر تینوں میں سے کسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ابن خلدون وغیرہ جس کتاب کو بھی آپ دیکھیں گے۔ تیسری صدی تک کے متعلق جو مواد ان میں ملے گا۔ اس کا سرچشمہ انہیں میں سے کسی میں پائیں گے۔ اور زیادہ تر طبری کو اس کا ماخذ پائیں گے۔ طبری کا تذکرہ کرتے ہوئے خود مودودی صاحب، ابن کثیر اور ابن خلدون کا قول نقل فرماتے ہیں۔

> "ابن کثیر بھی اس دور کی تاریخ میں انہی کیطرف رجوع کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شیعی[1] روایات سے بچتے ہوئے زیادہ تر ابن جریر طبری پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ میں نے واقعات کا ملخص دوسرے

[1] علامہ ابن کثیر کا یہ کہنا بس دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان کی کتاب میں کثیر تعداد شیعی روایات کی ہے۔

مؤرخین کو چھوڑ کر طبری کی تاریخ سے نکالا ہے۔ کیونکہ وہ زیادہ قابل اعتماد ہے۔ اور ان خرابیوں سے پاک ہے۔ جو ابن قتیبہ اور دوسرے مؤرخین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔
ابن خلدون کے الفاظ یہ ہیں۔ :

اعتمدناہ بالموثوق بہ السلامۃ من الاھواء الموجودۃ فی کتب ابن قتیبۃ وغیرہ من المؤرخین۔ ص۳۱۳)

مشہور مؤرخ علامہ شبلی نعمانی مرحوم طبری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔
تمام مستند و مفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابو الفدا وغیرہ انہیں کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں۔ یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔ (مقدمہ سیرۃ النبی)
محمد بن جریر طبری کون ہیں اور ان کی کتاب کا کیا درجہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

محمد بن جریر بن یزید الطبری مات سنۃ عشر وثلاث ماۃ ثقۃ صادق فیہ تشیع یسیر لہ وموالاۃ لا تضر

محمد بن جریر بن یزید طبری جن کی وفات سنہ ۳۱۰ میں ہوئی۔ ثقہ اور صادق ہیں ان میں تھوڑی سی شیعیت اور موالاۃ ہے جو مضر نہیں ہے۔"
(لسان المیزان جلد ۵ ص۱۰۰)

شیعہ مذہب کی ابتدا ایک خفیہ تحریک کے طرز پر ہوئی اور صدیوں تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ تقیہ اور کتمان اس کا اہم اصول رہا۔ اس لئے اس زمانہ کے علماء اس مذہب کی حقیقت اور اس کی گہرائیوں سے ناواقف تھے۔ جیسے کہ آج بھی علماء اہل سنت میں بہت کم ایسے حضرات ہیں جو اس مذہب سے پورے طور پر واقف ہوں۔ ان بزرگوں کو کیا خبر تھی کہ جس کو وہ "تشیع یسیرا" تھوڑی سی شیعیت سمجھ رہے ہیں۔ وہ کس قدر خطرناک اور مضرت رساں ہے۔ "لا تضر" کا فقرہ طبری کی توثیق نہیں کرتا ہے بلکہ شیعہ مذہب سے مصنف کی ناواقفیت کی نشاندہی کر رہا ہے جو شخص غور کے ساتھ طبری کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا وہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس شیعہ مصنف

نے اس کتاب میں کیسا زہر بھرا ہے؟ اور اسے شیریں بنا کر کس طرح اہل سنت کے حلق سے اُتارنے کی کوشش کی ہے۔

مولاۃ " کا لفظ بھی قابل غور اور تشریح طلب ہے اس کے لغوی معنی تعلق اور دوستی کے ہیں۔ لیکن یہ مذہب شیعہ کی ایک اصطلاح بھی ہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی حضرت علی مرتضےٰ رضہ وغیرہ ان چار شخصیتوں کے ساتھ خصوصی عقیدت کے ہیں۔ جنہیں شیعہ صاحبان اہل بیت کہتے ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ عقیدت تو اہلسنت بھی رکھتے ہیں لیکن شیعی موالاۃ اتنی عقیدت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ عقیدت ہے جو اہل سنت کے نزدیک غلط سمجھی جاتی ہے۔ لفظ تشیّع اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں ابن جریر کے متعلق یہ لفظ اسی شیعی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جو ہمارے نزدیک غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ شیعیت اور اصطلاحی اہلبیت کے ساتھ عقیدت میں غلو کی موجودگی کے بعد بھی یہ کہنا کہ یہ مضر نہیں ہے۔ اور ایسے شخص کی تاریخ کو معتبر سمجھنا کسی منصف مزاج کے نزدیک صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔

مشہور محدّث حافظ احمد بن علی السلیمانی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے لیکن علاّمہ ذہبی نے اس کی تردید کی ہے اور سلیمانی کے علم و فضل کا اعتراف کر کے یہ کہا ہے کہ سلیمانی نے ان ابن جریر کو نہیں مُراد لیا ہے بلکہ محمد بن جریر بن رستم کے متعلق یہ بات کہی ہے، جو شیعہ تھا مگر اس تردید کی بنیاد اور دلیل ابن جریر بن یزید کے ساتھ حسن ظن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ حافظ سلیمانی (جن کے علم و تقویٰ کا اعتراف علامہ ذہبی کو بھی ہے) نے اگر یہ الزام ابن جریر بن رستم پر لگایا تھا۔ تو اسکے دادا کے نام کی تصریح کیوں نہ کر دی تاکہ تشابہ نہ باقی رہتا۔ اور اگر وہ اس واقف ہی نہ تھے۔ تو انہوں نے اس کے متعلق یہ بات کہی کیسے؟ واقفیت کے باوجود امتیاز قائم نہ کرنا تو اس بات کی واضح علامت ہے کہ ان کی مُراد یہی محمد بن جریر بن یزید صاحب تاریخ و تفسیر ہی ہیں۔ اسلئے کہ ان کی شخصیت معروف و مشہور تھی۔ ابن جریر بن رستم اتنا مشہور نہیں تھا۔ اور

ایسی صورت میں وہی شخصیت عموماً مراد ہوا کرتی ہے۔ جو زیادہ مشہور و معروف ہو۔ تعجب ہے کہ اس قوی قرینہ کے ہوتے ہوئے علامہ ذہبی نے سلیمانی کے قول کا ایک ایسا محمل تلاش کیا جس کی دلیل ابن جریر کے ساتھ بے جا حُسنِ ظن کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ لسان المیزان میں انہیں محمد بن جریر طبری کے متعلق ابن حبان کا یہ قول بھی منقول ہے۔

قال ابو جعفر الطبری امام من ائمۃ الامامیۃ۔ ابو جعفر طبری نے جو امامیہ (اہلِ تشیّع) کے امام ہیں (یہ بات کہی)

علامہ ذہبی نے اس کی بھی تردید فرمائی ہے مگر تردید بے دلیل ہے اور اس کی بنیاد بھی طبری کے ساتھ وہی حُسنِ ظن ہے۔ علامہ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ابن حبان نے سلیمانی کے قول سے دھوکہ کھایا ہے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اسلئے کہ سلیمانی ان پر وضع حدیث کا الزام لگا رہے ہیں۔ اور ابن حبان ان کے متعلق بالکل دوسری بات کہہ رہے ہیں۔ یعنے انہیں شیعوں کا مقتدا کہہ رہے ہیں۔ دونوں باتوں کا فرق ظاہر ہے ایسی حالت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ابن حبان سلیمانی کے قول کی بنا پر انہیں شیعہ کہہ رہے ہیں کہ دونوں الزام ایک تو نہیں ہیں۔ بلکہ غور کیجئے تو دونوں میں ایک طرح کا تعارض ہے۔ شیعوں کے لئے وضع احادیث تو وہ شخص کریگا۔ جو اپنی شیعیت کو چھپائے اور سنّی بن کر وضع احادیث کرے تاکہ شیعہ ان کے ذریعے سنّی مسلمانوں کو الزام دے سکیں ایسی بخلاف اس کے شیعوں کا امام اور مقتدا وہی شخص بن سکتا ہے۔ جو اپنی شیعت کا اظہار کرے۔ دونوں باتوں کے جمع ہونے کا عقلی و منطقی امکان تسلیم کرنے کے بعد بھی علامہ ذہبی کا مندرجہ بالا خیال بعید از قیاس ہی رہتا ہے۔ اور عادتاً مذکورہ بالا دونوں باتیں جمع نہیں ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابن حبان کی رائے تو اپنے معلومات پر مبنی ہے۔ ان کی ذاتی رائے ہے اور علامہ ذہبی کی تنقید نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً جب یہ تقیہ کے پردے میں اپنا رفض چھپاتے ہوئے ہوں گے۔ اس وقت کا حال سلیمانی نے تحریر کیا ہے۔ پھر یہ پردہ چاک ہو گیا ہوگا۔ اور

وہ کھل کر میدان میں آ گئے ہوں گے۔ ابن حبان نے اسی وقت کی کیفیت بیان کی ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مورخ ابن جریر طبری میں شعیت ہونا تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ یہاں تک کہ ان کے حامی علامہ ذہبی بھی ان کے تشیع کے قائل ہیں۔ وہ انکار ان کے وضاع ہونے سے کرتے ہیں۔ نہ کہ ان کے تشیّع سے۔

اسکے علاوہ ان کے اُوپر دو الزام اور ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ شیعوں کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ گویا شیعہ ہونے کے ساتھ وضاع بھی تھے۔ دوسرے یہ کہ خود شیعہ ہی نہ تھے۔ بلکہ شیعوں کے پیشوا بھی تھے۔ گویا غالی قسم کے شیعہ تھے۔ ان دونوں الزامو کی صحت کے بارے میں ہم نے جو بحث کی ہے۔ اس سے کم ازکم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ ان دونوں الزاموں کی صحت کا احتمال قوی ہے۔ یہ چیز کم ازکم ان کی پوزیشن کو ان دونوں الزاموں کے اعتبار سے بھی مشکوک و مشتبہ ضرور بنا دیتی ہے۔ یعنی شیعیت کے ساتھ وضاع اور غالی ہونے کا احتمال ان کی کتاب اور ان کی شخصیت کو کس قدر بے وزن اور ناقابل اعتماد بنا دیتا ہے اور قاری کو ان کی روایات کے بارے میں کس درجہ احتیاط کی تلقین وتاکید کرتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جسے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ تاریخ کا بیان ہے کہ ان کی شیعیت پر سے تقیہ کا ملمع ان کی حیات ہی میں اُتر گیا تھا۔ علماءِ حنابلہ ان سے واقف ہو گئے تھے جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے مسلمانوں کے قبرستان مدفون نہیں ہونے دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ونسبوہٗ الی الرفض انہیں رافضی کہا۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص۱۴۶)

ایک واضح نشانی اس سلسلہ میں یہ بھی ملتی ہے کہ انہوں نے سیدنا معاویہ رضؓ کے متعلق معاذاللہ لعنۃُ اللہ علیہ لکھا ہے۔ [1] پھر لکھتے ہیں :۔

---

[1] (دیکھئے طبری جلد ۱۳ بعنوان "الذیل المذیل من تاریخ الصحابۃ والتابعین۔ ذکر من اتّصل مشہ تذکرہ وفات حضرت جعفر رضؓ)

"بعض فقہی مسائل اور حدیث غدیر خم کے معاملہ میں شیعہ مسلک سے اتفاق کی بناء پر بعض لوگوں نے خواہ مخواہ انہیں شیعہ قرار دے ڈالا۔ (ص ۳۱۳)

محترما! آپ کو خبر نہیں کہ آپ نے خود بھی انہیں شیعیت کی سند عطا فرما دی ہے لطف یہ ہے کہ اسکے منکر بھی نہیں۔

کوئی مذہب واعظ کیا جانے تسبیح بھی ہے زنار بھی ہے
اس طرز سخن سے کیا سمجھے اقرار بھی ہے۔ انکار بھی ہے۔

حدیث غدیر خم کی شیعی تشریح، شیعہ مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے، جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو، وہ قطعی طور پر زمرۂ اہل سنت سے خارج ہے اور فرقۂ شیعہ میں داخل ہے۔ اس مجمل کی شرح درج ذیل ہے۔

ایک روایت ہے کہ نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک سفر میں مقام غدیر خم پر پہنچ کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا۔ من کنتُ مولاہُ فعلی مولاہ۔

ترجمہ: میں جس کا مولیٰ ہوں، علی بھی اس کا مولی ہے۔ ۔

یہ روایت بعض کتب اہل سنت میں بھی موجود ہے۔ مگر نقاد حدیث کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ اگر ثابت تسلیم کی جائے تو اس کا مفہوم اہلسنت کے نزدیک یہ ہے کہ میں جس کا دوست ہوں۔ علی رضا بھی اس کے دوست ہیں بخلاف اس کے شیعہ اسے ان کی خلافت وامامت پر نص قطعی سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مولی معنے اولی بالتصرف ہے اور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں صراحتاً فرما دیا ہے کہ میرے بعد علی رضا میرے خلیفہ اور امام المسلمین ہوں گے۔ یہی وہ باطل عقیدہ ہے جو پورے شیعہ مذہب کی بنیاد ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا حضرات خلفاءِ ثلاثہ کو معاذ اللہ غاصب سمجھے گا۔ اور ان کی خلافت کو حضرت علی رضا کے حق میں ظلم اور ان کی حق تلفی خیال کرے گا۔ یہ ہے حدیث غدیر خم کا معاملہ اور شیعہ مسلک جس میں حسب اعتراف مودودی صاحب طبری شیعوں سے متفق تھے۔ یعنے وہ بھی حضرت علی رضا کی خلافت کو منصوص سمجھتے تھے اور انہیں آنحضور کا

دن عہد اور بلحاظ استحقاق " خلیفہ بلا فصل " سمجھتے تھے۔ میں متحیر ہوں کہ اس کے بعد بھی ان کی شیعیت سے انکار کی جرأت کس طرح ہوتی ہے۔

شیعوں کا بنیادی عقیدہ رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص سنّی ہو سکتا تو اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ تثلیث کا قائل ہونے کے باوجود آدمی مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔

ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ طبری کو علماءِ حنابلہ نے صرف اس وجہ سے شیعہ کہہ دیا کہ وہ امام احمد بن حنبل رح کو فقیہ نہیں تسلیم کرتے تھے۔ ان علماء کے ساتھ یہ سُوءِ ظن آخر کس دلیل پر مبنی ہے؟ پھر یہ کہ اس سبب مخالفت سے رفض کے الزام کو کیا مناسبت ہے۔ اگر غلط ہی الزام انہیں لگانا تھا تو خارجی کیوں نہ کہہ دیا؟ دوسرے علماء نے اس کی تردید کیوں نہ کی؟ ابن جریر تو ایک مشہور صاحب علم شخص تھے۔ اجتہاد بھی کرتے تھے۔ اگر وہ سنّی تھے تو سنیوں کے ایک طبقہ پر ان کا اثر ضرور ہو گا۔ اور علماءِ اہل سنّت میں کچھ نہ کچھ لوگ ان کے ضرور معتقد ہوں گے۔ کیا وجہ ہے کہ علماء و عوام نے علماءِ حنابلہ کی ادنیٰ مخالفت و مقاومت بھی نہیں کی اور انہیں مقابر مسلمین میں مدفون کرنے پر انہوں نے ذرا سا بھی اصرار نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنابلہ کا الزام صحیح تھا اور طبری مذکور واقعی رافضی تھے۔ ان کا مزید قرینہ یہ ہے کہ طبریہ اس وقت شیعیت کا ایک مرکز تھا۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی۔ امام نسائی، امام ابو داؤد کا زمانہ اور طبری کا زمانہ ایک ہے۔ لیکن ان حضرات نے ان سے کوئی حدیث نہیں لی ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔

مودودی صاحب نے ان کی تفسیر کے متعلق علّامہ ابن تیمیہ رح کی جو رائے نقل کی ہے۔ اس کا مفہوم سمجھنے میں مولانا سے غلطی ہوئی ہے۔ امام ابن تیمیہ رح ان کی تفسیر کو معتزلہ وغیرہ کی عقلی تفاسیر پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی تفسیر بالروایت ہے اور اس میں معتزلہ و باطنیہ وغیرہ دور از کار تاویلات سے کام نہیں لیا گیا ہے، یہی ان کے فقرہ " لیس فیہ بدعۃ " کے معنی ہیں۔ لیکن اسکے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ اس

میں جو روایتیں آئی ہیں وہ سب کی سب صحیح یا قابل قبول ہیں جس شخص نے بھی تفسیر طبری کا مطالعہ کیا ہے۔ ہرگز ایسی خوش اعتمادی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ علامہ ابن تیمیہ رح کا ایسا محقق؟

امام موصوف کی اس رائے سے نہ طبری کی کوئی توثیق ہوتی ہے۔ نہ ان کی تاریخ کی توثیق اگر ہوتی ہے تو ان کی تفسیر کی اور وہ بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ ایک خاص حیثیت سے جس کا ذکر امام نے اس طرح کیا ہے۔ اما التفاسیر التی بایدی الناس فاصحها تفسیر محمد بن جریر الطبری فانہ یذکر مقالات السلف بالاسانید الثابتۃ یعنے مروّجہ تفاسیر میں (سب تفسیروں میں نہیں) تفسیر طبری سب سے زیادہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ وہ مفسرین سلف کے اقوال صحیح سندوں سے نقل کرتے ہیں۔ کشاف کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں بدعت ہے۔ یعنی انکار صفات وغیرہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے بدعت کے معنی بدعت اعتزال کے لئے ہیں نہ کہ ہر قسم کی بدعت کے۔

طبری کی شخصیت کو چھوڑ کر ذرا ان کی کتاب پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ اس سلسلہ میں پہلے مشہور مؤرخ و سیرت نگار علامہ شبلی مرحوم کی رائے ملاحظہ فرمائیے جن کی حیثیت بقول مودودی صاحب "وکیل صفائی" کی نہیں تھی۔ فرماتے ہیں:۔

> طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ الابرش، ابن سلمہ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں" (مقدمہ سیرت النبیؐ)

علامہ نے وغیرہ لکھ کر بات مختصر کر دی ورنہ یہ فہرست خاصی طویل ہے۔ اس میں ابو مخنف، کلبی جابر، جعفی سیف بن عمر وغیرہ کے ایسے کذاب اور وضاع اور شیعہ رواہ بڑی کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بازاری قصوں کو بھی اس کتاب میں خاصی جگہ دی گئی ہے۔ جس شخص کا جی چاہے، کتاب دیکھ کر ہمارے اس تبصرے کی تصدیق کرے۔[1]

---

[1] یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مذہب اہل سنت والجماعت کی اساس و بنیاد سنت پر قائم ہے۔ بخلاف

رہا یہ امر کہ اس میں صحیح روایتیں بھی موجود ہیں۔ اس سے کتاب کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم اس کے دعویدار نہیں ہیں کہ تاریخ طبری از سرتاپا کذب و دروغ ہے بلکہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جھوٹ اور سچ کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس کی وہی روایت قابل قبول ہوگی جو اصول و معیار کے مطابق ہو۔ مجموعی طور پر کتاب قابل اعتماد اور قابل قبول نہیں ہوگی۔

مودودی صاحب خود اقرار کر چکے ہیں کہ ابن کثیر اور ابن خلدون کا مدار طبری پر ہے۔ علامہ شبلی رحؒ کی صراحت سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ مابعد کی سب تاریخیں ابن الاثیر، ابوالفداء وغیرہ کا اصلی سرچشمہ یہی کتاب ہے۔ بلکہ بقول علامہ یہ سب کتابیں طبری ہی کی تلخیصات کہی جا سکتی ہیں۔ اسے ناقابل اعتماد قرار دینے کے بعد، بعد کی کتابیں منطقی طور پر غیر معتبر ہو جاتی ہیں۔

مودودی صاحب نے طبری کی توثیق میں متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تشیع کے ثبوت کے بعد یہ سب توثیقات بے وزن ہو جاتی ہیں

اس کے شیعہ مذہب کی حقیقی بنیاد تاریخ پر قائم کی گئی ہے نہ کہ کتاب وسنت پر۔ سنت کا تو ان کے یہاں تصور ہی دوسرا ہے۔ رہ گئی کتاب تو اس سے انہوں نے درحقیقت صرف اپنی بیان کردہ تاریخ کی تائید کا کام لینے کی کوشش کی ہے۔ فی نفسہٖ اسے دین کی اساس نہیں بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید اپنی تفسیر و تشریح میں تاریخی روایات کا محتاج ہے جنہیں انہوں نے مذہبی روایات کی حیثیت دیدی ہے۔ ابن جریر طبری کے زمانہ تک شیعہ مذہب کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے وہ مواد فراہم کیا جس نے اس مذہب کی عمارت باقاعدہ تعمیر کی گئی۔ نہج البلاغۃ جو مذہب شیعہ کی معتبر ترین اور بنیادی کتاب ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ اس کا بہت بڑا حصہ انہیں خطبات و روایات پر مشتمل ہے جو طبری نے اپنی تاریخ میں فراہم کئے ہیں۔ اس طرح اُس فاضل شخص نے شیعہ مذہب کی بہت اہم اور اساسی خدمت انجام دی ہے اور درحقیقت کتاب لکھنے سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن افسوس کہ اہل سنت نے ان کے تقیہ سے دھوکہ کھایا اور ان کی کتاب کو تاریخ کی حیثیت دی۔ حالانکہ وہ فن تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ شیعہ مذہب کی ایک بنیادی کتاب ہے۔

اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ توثیق کرنے والے حضرات شیعہ مذہب اور خود طبری سے پوری طور پر واقف نہ تھے۔ یہ ناواقفیت بالکل تعجب خیز نہیں۔ شیعہ حضرات کے تقیہ اور کتمان کی ایسی مثالیں بکثرت ہیں۔ بطور مثال مشہور شیعی مجتہد قاضی نور اللہ شوستری کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو لباس تقیہ پہن کر مدت دراز تک ہندوستان کے منصب قضا پر مامور رہے، بالآخر راز کھلا۔

—— (۲) ——

ابو جعفر محمد بن جریر طبری (مؤرخ و مفسر) کا مذہب

مَیں نے اظہارِ حقیقت جلد اول میں لکھا تھا کہ شیعہ مؤرخین اور رواۃ نے اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے اور تاریک بنانے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ خصوصاً اسلام کی ابتدائی دو صدیوں کے بارے میں تو انہوں نے جھوٹ بولنے غلط بیانی کرنے اور خیانت و بد دیانتی کر کے واقعات کو مسخ کرنے میں اپنی پوری ذہانت صرف کر دی۔ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ دَور مذکور کی جو تاریخیں اس وقت موجود ہیں۔ ان سب کا اصل مأخذ شیعہ مورخین ہی کے تصانیف اور روایات ہیں۔ اس دَور کی کوئی ایسی تاریخ موجود نہیں جو کسی سُنّی نے لکھی ہو۔ اور جس کا مأخذ شیعہ رواۃ و مؤرخین کے بیانات نہ ہوں۔ شیعہ مورخین ازراہِ تقیہ و نفاق خود کو سنّی ظاہر کرتے تھے اور اہلسنت کو فریب دے کر گمراہ کرنا ان کا مشن اور مقصد تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم محمد بن جریر طبری ہے۔ جس کی تاریخ بعد کے شیعہ اور سنّی مورخین کی کتابوں کا سب سے بڑا مأخذ ہے۔ مَیں نے لکھا تھا۔ کہ یہ شخص شیعہ تھا۔ ازراہِ تقیہ و نفاق خود کو سنّی ظاہر کرتا تھا۔ تاکہ اہلِ سنّت کو فریب دینا آسان ہو جائے۔ اس کا کافی وشافی ثبوت بھی پیش کر چکا ہوں۔ لیکن دورانِ تحریر جلد ثانی اس کا کچھ مزید ثبوت ہاتھ آیا۔ خیال ہوا کہ اسے بطور ضمیمہ جلد ثانی کے ساتھ ملحق کر دیا جائے اور اس سلسلہ میں عام طور پر جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ انہیں بھی دُور کر دیا جائے۔ مَیں نے عرض کیا تھا کہ لسان المیزان میں علامہ

ابن حجر رح نے اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ فیہ تشیع یسیر و لہ موالاۃ لاتضر
اس طرح اس کی شیعیت کا تو اقرار فرمایا۔ مگر یسیر اور لا تضر کے الفاظ اپنی طرف سے لکھ
کر اسکے جرم کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیان واقعہ تو فیہ تشیّع " کے فقرے پر ختم ہو گیا
اس کے بعد ان کی رائے ہے بیان واقعہ نہیں اور اس رائے کو صحیح تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں امام ذہبی نے بھی میزان
الاعتدال میں ابن جریر مذکور کے تشیع کا اقرار کیا ہے۔ مگر اسے یسیر کہہ کر اس کی شناعت
کو کم کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ امام ذہبی رح نے اسی میزانُ الاعتدال میں علامہ احمد بن
علی المعروف امام سلیمانی کا مندرجہ ذیل قول بھی اسکے متعلق نقل کیا ہے۔

کان یضع للروافض۔ روافض کے لئے روایتیں وضع کیا کرتا تھا۔

علامہ ابن حیان نے اسی طبری کے متعلق لکھا ہے۔ ہو امام من ائمۃ الامامیۃ یعنے
وہ امامیہ (شیعوں) کا امام (مقتدیٰ) ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ ابن حجر رح
اور ذہبی نے ابن جریر کی شیعیت کی جو تردید کی ہے وہ کسی طرح قابل قبول نہیں بس
سلسلہ میں اتنا اور عرض کرنا ہے۔ کہ علاّمہ ابن حجر رح کا زمانہ ولادت ۷۷۳ھ اور زمانہ
وفات ۸۵۲ھ جب کہ علاّمہ ابن حبان کی ولادت ۶۵۴ھ اور وفات ۷۴۵ھ میں ہوئی
یہ ابن حجر رح کے سلسلہ مشائخ میں داخل ہیں۔ اور زمانہ کے لحاظ سے بہ نسبت ابن حجر رح
ابن جریر کے زیادہ قریب ہیں۔ اس کے حال سے جتنی واقفیت انُہیں ہو سکتی تھی
وہ ابن حجر رح کو نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے ان کا قول قابل اعتماد ہے۔ اور علامہ ابن حجر رح
کی تردید بے وزن۔

امام حافظ احمد بن علی سلیمانی رح کا زمانہ تو ابن جریر کے زمانہ سے اور زیادہ قریب
ہے۔ اس کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ سلیمانی کی ولادت ۳۲۱ھ اور وفات ۴۱۳ھ
میں ہوئی۔ گویا اس کی وفات اور ان کی ولادت کے درمیان صرف گیارہ سال کا فاصلہ ہے
ان کے والد بزرگوار نے ابن جریر کو ضرور دیکھا ہوگا۔ بلکہ ان کے بعض اساتذہ نے بھی اسے
دیکھا ہوگا۔ اس کے شاگردوں کو تو سلیمانی نے بھی دیکھا ہوگا۔ ان حالات میں اس کے
مذہب کے متعلق ان کی رائے اور اطلاع زیادہ وقیع اور قابل اعتماد ہے۔ انہوں نے

جو تحریر فرمایا ہے کہ وہ رافضی تھا اور روافض کے لئے روایتیں وضع کیا کرتا تھا۔ اسی کو صحیح مانا جائے گا۔ علامہ ذہبی کی تردید بالکل ساقطُ الاعتبار اور بے وزن ہے کیونکہ ان کی ولادت ۶۷۳ھ میں ہوئی۔ یعنی جب طبری کی وفات کو تین سو تریسٹھ برس گذر چکے تھے۔ ابن حجرؒ کا زمانہ تو اور بعد کا ہے۔ یعنی وہ تو آٹھویں صدی میں پیدا ہوئے جبکہ ابن جریر کی وفات کو تقریباً پانچ سو برس گذر چکے تھے۔ اس لئے امام سلیمانی یا ابن حبان کے مقابلے میں ان کا قول بے وقعت ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے لسانُ المیزان میں اس کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ رافضی نہ تھا۔ مگر وہ قول ذومعنیین ہے۔ اسلئے صفائی میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ روافض بکثرت اس قسم کی باتیں کر کے اہل سنت کو فریب دیتے ہیں۔ اور جب اپنے ہم مذہبوں سے ملتے ہیں تو اپنے مقتداؤں کی طرح اِنَّمَا نحنُ مستھزِءُوْنَ کہہ کر اس کے وہ معنی بیان کرتے ہیں۔ جو ان کے دل میں تھے۔ اور ان لوگوں سے نفاق کی داد حاصل کرتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ علامہ ابن حجرؒ طبری کی صفائی پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ والعلمُ عند اللہ، یہ فقرہ غمازی کر رہا ہے کہ موصوف کو خود اس صفائی پر اعتماد نہیں۔

ثبوتِ مزید

اب طبری مذکور کے رفض کے دو قوی ثبوت اور ملاحظہ ہوں

(۱) یاقوت حموی معجمُ البلدان جلد اول صہ ۶۳ پر شہر آمل کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔ کہ ابن جریر کا مولد" آمل" تھا۔ اسلئے بعد میں لکھا ہے کہ ابوبکر محمد بن العباس الخوارزمی نے جو آملی تھے اور ابن جریر کا بھانجا اور شاگرد تھا۔ کہا ہے:۔

بآمل مولدی وبنو جریر	فاخوالی ویحکی المرءُ خالہٗ
فھا انا رافضی عن تراث	وغیری رافضی عن کلالہٗ

ترجمہ: آمل میری جائے پیدائش ہے اور بنو جریر میرے ماموں ہیں۔ اور آدمی اپنے ماموں کے مشابہ ہوتا ہے تو سن لو کہ میں وراثتاً رافضی ہوں اور دوسرے لوگ دُور کے تعلق سے رافضی ہیں۔

یاقوت حموی نے اسے نقل کر کے خوارزمی مذکور کے قول کو غلط قرار دیا ہے۔ مگر بے دلیل۔ ظاہر ہے کہ خوارزمی مذکور ابن جریر کا بھانجا اور اس کا شاگرد ہے۔ وہ اپنے ماموں اور استاد کے حال سے خوب واقف تھا۔ یاقوت نے ۶۲۶ھ میں وفات پائی۔ ان کے اور ابن جریر کے درمیان تین صدیوں سے زیادہ زمانہ حائل ہے۔ انہوں نے تو اسکے شاگردوں کو بھی دیکھا نہ ہوگا۔ اسلئے خوارزمی کا بیان صحیح مانا جائے گا کہ ابن جریر رافضی تھا۔ یاقوت کا بیان یقیناً غلط ہے۔ ابن جریر کے بھانجے اور شاگرد کے اس صاف اور صریح بیان کے بعد بھی اسے سنی کہنا کھلی ہوئی زیادتی ہے۔

(۲) علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ اپنی مشہور کتاب المنتظم فی تاریخ الملوک والامم (مطبوعہ دار المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۳۵۷ھ جلد ۶ صہ ۱۷۲) پر محمد بن جریر طبری مذکور کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں۔

ولد فی اخر سنة اربع واول	(طبری مذکور) ۲۲۴ھ کے آخر میں اور ۲۲۵ھ
سنة خمس وعشرين و	کی ابتدا میں پیدا ہوا۔ اور ۳۱۰ھ میں ۲۸
مأتين وتوفی وقت المغرب	شوال کو بروز اتوار بوقت مغرب فوت
من عشية الاحد ليومين	ہوا۔ دوشنبہ کو دن چڑھے رحبہ یعقوب
بقيا من شوال سنة عشر	میں باب خراسان کے قریب اپنے مکان
وثلث مائة ودفن وقد اضحی	کے سامنے ایک حجرے میں دفن کیا گیا
النهار يوم الاثنين برحبة	اور کہا گیا ہے کہ رات کو مدفون ہوا اور
يعقوب فی ناحية باب	اس کے دفنانے میں شرکت کے لئے کسی
خراسان فی حجرة بازاء	کو اطلاع نہیں دی گئی۔ ثابت بن سنان
داره وقيل بل دفن ليلاً	نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ اس کی

ولم يؤذن به احد وذكر
ثابت بن سنان فی تاریخہ
انہ انما اخفیت حالہ لانّ
العامّۃ اجتمعوا ومنعوا
من دفنہ بالنہار وادعوا
(علیہ الرّفض ثمّ ادعوا علیہ
الالحاد۔ قال المصنّف کان ابن
جریر یری جواز المسح علی
القدمین ولا یوجب غسلہما
فلہٰذا نسب الی الرفض۔ وکان
قد وقع فی حقہ ابوبکر بن
داؤد قصہ الی نصر الحاجب
بذکر عنہ اشیاء فانکرہا
منہا انہ نسبہ الی رأی
جہم وقال انہ قائل (بل
یداہ مبسوطتان) ای نعمتاہ
فانکر ہٰذا وقال ماقلتہ ومنہا
انہ روی ان روح رسول اللہ
صلّی اللہ علیہ لمّا خرجت
سالت فی کفّ علیّ حسّاہا
فقال انما الحدیث (مسح
بہا علی وجہہ ولیس فیہ
حسّاہا) قال المصنّف رحمہ

تدفین کا) حال اس لئے مخفی رکھا گیا۔
کہ عوام جمع ہو گئے اور اس کے دفن
سے مانع ہوئے اور اس پر پہلے رافضیت
کا اور پھر الحاد کا الزام لگایا مصنف
(ابن جوزی رح) کہتے ہیں کہ ابن جریر
پاؤں پر مسح کا قائل تھا اور ان کے
دھونے کو فرض نہیں سمجھتا تھا۔ اسی
لئے اسے رافضی کہا گیا۔ اس کے بارے
میں ابوبکر بن داؤد نے بات نصر حاجب
تک پہنچائی اور اس پر کئی الزام لگائے
جن کا اس نے انکار کر دیا۔ ان میں سے
ایک الزام یہ تھا کہ وہ جہم کا ہم خیال ہے
اور بتایا کہ وہ (ابن جریر) آیت قرآنی
بل یداہ مبسوطتان) کی تفسیر
نعمتاہ کرتا ہے۔ اس نے (ابن
جریر نے) اس الزام سے انکار کیا کہا
کہ میں نے یہ نہیں کہا ان میں سے ایک
الزام یہ تھا کہ اس نے (ابن جریر نے)
یہ روایت بیان کی ہے کہ جب رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک
خارج ہوئی تو حضرت علی رض کی ہتھیلی
پر آگئی اور وہ اسے نگل گئے (اس کے
جواب میں ابن جریر نے) کہا کہ حدیث

الله وهٰذا محال ایضاً ألا إنّه	میں یہ نہیں ہے کہ وہ اسے نگل گئے. بلکہ
کتب ابنُ جریرٍ فی جواب	یہ ہے کہ انہوں نے اسے (آنحضور صلی اللہ
هٰذا الی نصرُ الحاجب لا	علیہ وسلم کی روح مبارک کو) اپنے چہرے پر مل
عصابةٌ فی الإسلام کهٰذه ؟	لیا۔ مصنف (ابن جوزیؒ) کہتے ہیں کہ یہ بھی
العصابةِ الخسیسةِ وهٰذا	غیر ممکن ہے۔ (یعنی روح مبارک حضرت
قبیح منه لان کان ینبغیٰ	علی رضؓ کے ہاتھ پر آنا اور ان کا اسے چہرے
ان یخاصم مَن خاصمهٗ	پر مل لینا بھی محال ہے۔) باوجود اس کے
واما ان یذم طائفة جمیعاً	ابن جریر نے اس کے جواب میں نصر حاجب
وهو یدری الی من ینتسب	کو لکھا کہ اسلام میں کوئی جماعت اس ذلیل
فغایة فی القبح	جماعت کی ایسی نہیں ہے۔ مصنف رحمہ اللہ
	(ابن جوزی) کہتے ہیں کہ اس کی (ابن جریر)
	کی یہ بات بہت بری ہے۔ اس کا جس سے

جھگڑا تھا اسی کو کہتا۔ مگر اس کی پوری جماعت کو بُرا کہا اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ کس جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ انتہائی قبیح بات ہے۔

علامہ ابن جوزی نے اس کا پورا نام "محمد بن جریر بن کثیر بن غالب ابو جعفر الطبری لکھا ہے۔ محمد بن جریر میں تو کوئی اختلاف نہیں مگر اس کے بعد ناموں میں اختلاف ہے۔ (جس کی تفصیل انشاءاللہ چند سطروں کے ملاحظہ سے گزرے گی)

علامہ ابن جوزی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریر مسح رجلین کا قائل تھا اور یہ شیعوں کا مسلک ہے۔ اہلسنّت کا اجماع ہے کہ وضو میں دونوں پاؤں کا دھونا فرض ہے۔ پاؤں کے مسح کا قائل ہونا شیعیت کی نمایاں علامت ہے۔ اس سے بڑھ کر رفض کی علامت وہ فاسد عقیدہ ہے۔ جسے طبری نے بصورت روایت بیان کیا ہے۔ یہ خیال کہ العیاذ باللہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی رُوح مقدس حضرت علیؓ کی ہتھیلی پر آگئی اور انہوں نے اپنے چہرے پر مل لی۔ [illegible] دوسرا یا گمراہی بلکہ

کفر ہے۔ کیا کوئی سنی یہ باطل عقیدہ رکھ سکتا ہے؟ سوا شیعوں کے اس قسم کا عقیدہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اس سے روز روشن کی طرح روشن ہے کہ طبری شیعہ اور غالی رافضی تھا۔

طبری مذکور کی رافضیت پر جو دلائل جلد اوّل[۱] میں مذکور ہوئے۔ ان پر مندرجہ بالا دو دلیلوں کا اضافہ کیجیئے، ان میں سے ہر دلیل اپنی جگہ اثبات مدعا کے لئے کافی ہے۔ مگر سبائی سحر کا کرشمہ ہے کہ علماءِ اہل سنّت کی بڑی تعداد اسے رافضی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور اسے امام ابوجعفر طبری کہتی ہے۔

دو ابن جریر یا ایک

جو حضرات ابن جریر مذکور کو سنی کہنے پر مصر ہیں۔ کہ ابن جریر دو تھے۔ محمد بن جریر بن یزید۔ یہی شخص تاریخ طبری اور تفسیر طبری کا مؤلف ہے اور یہ سنی تھا۔ دوسرا محمد بن جریر بن رستم ہے۔ جو غالی شیعہ تھا۔ جن لوگوں نے زیر بحث ابن جریر کو شیعہ کہا ہے۔ انہیں دھوکا ہو گیا۔ ابن جریر ابن یزید کو انہوں نے ابن جریر بن رستم سمجھ کر رفض کو اس کی جانب منسوب کر دیا۔

اس غلط تاویل کا ایک جواب تو میں جلد اوّل میں دے چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ یہ بات بالکل غلط بلکہ نہایت لغو ہے۔ سلیمانی، ابن حبان کے ایسے صاحبان علم و دانش اور فن رجال کے ماہرین کا ایسا دھوکہ کھانا بعید از قیاس ہے۔ پھر یہ کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ ان حضرات نے دھوکہ کھایا؟ مزید یہ کہ علامہ ذہبی و علامہ ابن حجر جو اس کی طرف سے دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اس کے تشیع کے معترف ہیں صرف غالی شیعہ ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ مگر یہ نفی بے دلیل ہے۔ اس لئے قابل التفات نہیں۔ علاوہ بریں شیعہ ہونا ہی ناقابل اعتماد ہونے کے لئے کافی ہے۔ غالی ہونا ضروری نہیں۔ المنتظم اور معجم البلدان سے جو منقول ہوا۔ اس میں تو اس دھوکہ والی غلط بات کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ ان دونوں کے قابل مصنفین

---

[۱] جلد اول سے مراد اظہار حقیقت جلد اول ہے

نے تو صاف صاف اسی مشہور ابنِ جریر کے متعلق گفتگو کی ہے۔ جو تاریخ طبری و تفسیر طبری کا مؤلف ہے۔

اس بحث کی ضرورت تو اس صورت میں ہے۔ جب دو "ابن جریر" فرض کئے جائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دوئی کا تصوّر ہی غلط ہے۔ ابن جریر بن یزید اور ابن جریر بن رستم ایک ہی شخص ہے۔ اس کا دادا کا نام رستم تھا۔ وہ کافر تھا۔ جب مسلمان ہوا تو یزید نام رکھا گیا۔ رستم اور یزید ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ ایک نام اسلام لانے سے پہلے کا ہے اور دوسرا اسلام لانے کے بعد کا۔ یہ شبہ صحیح نہیں کہ شیعہ کا نام "یزید" کیسے رکھا گیا۔ کیونکہ اس زمانہ میں شیعہ "یزید" نام رکھنے میں کوئی تکلّف نہ کرتے تھے۔ دوسرے ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہونے کے وقت وہ شیعہ نہ ہوا ہو۔ رافضیت بعد کو اختیار کی ہو۔ یا بطور تقیہ یہ نام اختیار کیا ہو۔ تاکہ اہلسنت کو فریب دینا آسان ہو جائے۔ یا وہ خود شیعہ ہی نہ ہوا ہو۔ جریر یا ابن جریر نے رافضیّت اختیار کی ہو۔ مختصر یہ کہ دادا کے نام کی وجہ سے پوتے کے مذہب کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ محمد بن جریر کی رافضیت اپنی جگہ ثابت ہے۔ خواہ اسکے دادا کا نام یزید ہو یا کچھ اور۔

محمد بن جریر بن یزید اور محمد بن جریر بن رستم دونوں کا تذکرہ اہلسنت اور شیعوں دونوں کی کتب رجال میں ملتا ہے۔ اول الذکر کو دونوں کی کتابوں میں سنی ظاہر کیا گیا ہے ثانی الذکر کو شیعہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوئی کا تصوّر شیعوں ہی کا فریب ہے جس میں بعض علماءِ اہلسنّت مبتلا ہو گئے۔ قرینہ یہ ہے کہ علامہ سلیمانی رحمہ اللہ کا زمانہ ابن جریر کے زمانہ سے قریب ہے اور جو شیعی اسماء الرجال کے وجود میں آنے کے بعد ہی پیدا ہوا۔ اور شیعوں کا کید و فریب ہے۔ چونکہ مورخ و مفسّر ابن جریر طبری نے تقیہ و نفاق کا لبادہ اوڑھ کر اور خود کو سنّی ظاہر کر کے شیعیت کی خوب تبلیغ کی۔ تاریخ و تفسیر دونوں میں شکر لپیٹ کر رفض کا زہر ناواقف اہلسنّت کے حلق سے اُتارنے کی کوشش کی اور سراپا کذب و دروغ، موضوع روایتیں اور شیعہ وضّاعوں

کذابوں کی بیان کردہ جھوٹی حکایتیں مدوّن کر کے شیعہ مذہب کے لئے بنیادیں فراہم کیں اس لئے شیعی علماء نے اس کی کوشش کی کہ مرنے کے بعد اس کی لاش بھی تقیہ و نفاق کے کفن سے ڈھکی رہے۔ تاکہ اہلسنت ہمیشہ دھوکہ کھاتے رہیں۔ اس مقصد سے انہوں نے دو ابن جریر کا افسانہ تراشہ اور اہلسنّت کو فریب میں مبتلا کر دیا۔ ثبوت مزید کے لئے شیعوں کی کتاب نہج البلاغہ پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ اہلسنت کے نزدیک تو یہ کتاب سرے سے ساقط الاعتبار ہے۔ مگر شیعہ اسے حضرت علی رضہ کے خطبات کا مجموعہ کہتے ہیں۔ اور بمنزلہ آیات اللہ سمجھتے ہیں۔ اس میں جو خطبات منقول ہیں۔ ان میں بڑی تعداد تاریخ طبری سے ماخوذ ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ابن جریر طبری مؤرخ سنّی ہوتا تو شیعہ اس کی کتاب پر اعتماد کیوں کرتے۔ اور یہ جعلی خطبات اس سے کیوں نقل کرتے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور شیعہ بھی اسے شیعہ ہی سمجھتے تھے۔ مگر اہلسنّت کو دھوکہ دینے کے لئے اسے سنّی مشہور کر دیا۔ اور ایک ابن جریر کے دو بنا دیئے۔ پھر یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ طبریہ کی ایسی چھوٹی سی بستی میں دو شخص ایسے ہوں جن کے نام ولدیت، وقت ولادت و وفات ایک ہی ہوں۔ دونوں مؤرخ اور شہرت حاصل کریں۔ مگر عوام و خواص اُن کے درمیان کی کوئی علامت نہ مقرر کریں اور وہ خود بھی اس امتیاز کی کوئی کوشش نہ کریں۔

نام کے بارے میں اختلاف

اس حد تک تو متفق علیہ ہے کہ اس شخص کا نام ابوجعفر محمد بن جریر تھا۔ مگر اسکے بعد اختلاف ہے۔ فہرست ابن ندیم میں اس کا نام ابوجعفر محمد بن جریر ابن یزید بن خالد لکھا ہے اور شیعہ عالم رجال نجاشی نے یزید کے باپ کا نام کثیر بن غالب لکھا ہے اور علامہ ابن جوزی سے منقول ہو چکا کہ انہوں نے بھی جریر کے باپ کا نام کثیر بن غالب بتایا ہے۔ تو کیا ان سب کو الگ الگ شخصیتیں سمجھا جائیگا۔؟ اگر نہیں تو ابن جریر بن رستم کو ابن جریر بن یزید کے علاوہ الگ اور مستقل شخصیت فرض کرنے

کرنے کی کیا وجہ؟ یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ ایک ہی ابن جریر ہے۔ جس کے دادا پردادا کے نام میں اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کے ذیل میں یہ داخل ہے کہ اسکے دادا کا نام بعض کے نزدیک "یزید یا کثیر" کے بجائے رستم ہے۔ صرف دادا کے نام میں اختلاف ہے۔

ائمہ و اکابر علماء کا طبری سے اعراض

کسی شخص کے قابل اعتماد یا ناقابل اعتماد ہونے کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے اس کے ساتھ ان ثقہ فہیم اور قابل اعتماد اشخاص کا رویہ اور طرز عمل بھی فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ جو اسکے زمانے میں موجود اور اس کے اسقدر قریب ہوں کہ اس کے حالات سے آگاہ ہو سکتے ہوں۔ خصوصاً جب کوئی ایسا سبب بھی موجود ہو جو اسکے حالات معلوم کرنے اور اس سے تعلق قائم کرنے کا محرک ہو۔ اس زاویئے سے ابن جریر طبری مذکور کی حالت پر غور کیجئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجۂ ذیل ائمہ محدثین اسکے زمانہ میں موجود تھے۔ اور ان سے اس کی ملاقات ممکن بلکہ بہت سہل تھی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی اس سے کوئی روایت نہیں لیتا۔ نہ طبری ان سے کوئی روایت لیتا ہے۔ ان حضرات میں سے کوئی اس کی توثیق بھی نہیں کرتا نہ کوئی کلمہ خیر اسکے بارے میں کہتا ہے۔ بلکہ سب اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ اور اسے قابل ذکر بھی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ یہ حضرات جمع روایات کے شائق تھے اور ان کی عظمت و شہرت کیوجہ سے مشتاقانِ حدیث دُور دُور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے سفر بھی بکثرت کئے۔ طبری نے بھی سفر کئے اور بغداد میں مدت تک رہا۔ وہ خود بھی مشہور ہو چکا تھا۔ یہ بات بعید از قیاس۔ بلکہ محال عادی نظر آتی ہے کہ یہ حضرات طبری سے اور وہ ان سے ناواقف ہو۔ باوجود اس کے ان حضرات کا اسے نظر انداز کرنا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ یہ حضرات اسے ثقہ اور قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ائمہ محدثین صحاح ستہ کے مؤلفین ہیں۔

جن کے اسماء گرامی مع سن وفات درج ذیل ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی وفات کے وقت طبری کا سن کیا تھا؟ ملاحظہ ہو۔

امام بخاری	متوفی	۲۵۶ھ	ابن جریر اس وقت ۳۲ سال کا تھا۔
امام مسلم	″	۲۶۱ھ	″ ″ ″ ۳۷ ″ ″
امام ابن ماجہ	″	۲۷۳ھ	″ ″ ″ ۴۹ ″ ″
امام ابوداؤد	″	۲۷۵ھ	″ ″ ″ ۵۱ ″ ″
امام ترمذی	″	۲۷۹ھ	″ ″ ″ ۵۵ ″ ″
امام نسائی	″	۲۷۹ھ	″ ″ ″ ۷۹ ″ ″
امام طحاوی	″	۳۲۱ھ	ابن جریر ان کا ہمعصر ہے ۳۱۰ھ میں مرا

ان حضرات کے علاوہ اس زمانہ کے اکابر علماء میں سے کسی نے اس کی ادنٰی سے ادنٰی توثیق بھی نہ کی، نہ اسے قابلِ اعتناء سمجھا۔ اس کی وفات سے ایک صدی کے بعد خطیب بغدادی نے اس کی کتابیں دیکھ کر اسکے علم کی تعریف کی۔ مگر اس کی توثیق انہوں نے بھی نہ کی۔ انہوں نے نہ اسے دیکھا تھا۔ نہ اسکے شاگردوں کو دیکھا تھا۔ توثیق کرتے بھی تو قابلِ اعتبار نہ ہوتی۔ باوجود اسکے انہوں نے اس کے لئے توثیق کا کوئی لفظ نہیں استعمال کیا۔ علم کی تعریف توثیق کے مرادف نہیں۔ نہ اسے مُستلزم ہے۔ صاحبِ علم تو رافضی بھی ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مشہور محدّث ابن خزیمہ معاصر نے طبری کے متعلق اس کی تفسیر دیکھ کر فرمایا کہ "میں نے رُوئے زمین پر اس سے بڑا عالم نہیں دیکھا اور حنابلہ نے اس پر بہت ظلم کیا (یعنے اسے رافضی کہا) ابن خزیمہ کا یہ قول ابن خالویہ حسین ابن احمدان سے روایت کرتا ہے اور یہ اس کا ان پر افتراء و بُہتان ہے۔ ابن خالویہ مذکور رافضی ہے۔ علّامہ ابن حجر رح لسان المیزان جلد ۲ میں اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

کان اماميًا عالمًا بالمذهب (ابن خالویہ) امامی (شیعہ) تھا اور (اپنے)

وقد قرء ابو الحسین النصیبی مذہب کا عالم تھا۔ ابو الحسین نصیبی شیعی
مومن الامامیۃ علیہ نے اس کی وہ کتاب اس سے پڑھی ہے۔
کتاب فی الامامۃ جو اس نے مسئلہ امامت پر لکھی تھی۔

ابن خالویہ سنیوں کو دھوکہ دینے کے لئے طبری کو سنی اور قابل اعتماد ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد سے اس نے یہ روایت وضع کی اور مندرجہ بالا قول گھڑ کر ابن خزیمہ رحکیطرف منسوب کر دیا۔ انہوں نے یہ بات نہیں فرمائی۔ ہماری بات کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ابن خزیمہ نے طبری سے کوئی روایت نہیں لی۔ حالانکہ یہ اسکے معاصر تھے۔ ان کی وفات ۲۲۳ھ میں طبری کی ولادت سے ایک سال پہلے ہوئی اور وفات ۳۱۱ھ میں یعنے اس کی وفات سے ایک سال بعد ہوئی۔ متاخرین علماءِ اہلسنّت کا اس کی مدح و توثیق کرنا۔ اسے ثقہ اور سنی سمجھنے کے لئے کافی نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان علماء متأخرین کو اس کا علم کیسے ہوا؟ جب علم کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ اُن کے پاس نہیں۔ تو ان کی رائے بے وزن اور غلط کہی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس اور دلائل بھی ہیں۔ مگر بخوف طوالت اُنہیں قلم انداز کرتے ہیں۔

نوٹ :- اب مولانا محمد علی شیخ الحدیث جامعہ رسولیہ کا مضمون ابن جریر طبری کے تشیع پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب "میزان الکتب" میں پیش کیا ہے۔

(مولانا محمد علی صاحب جامعہ رسولیہ شیرازیہ بلال گنج لاہور کے شیخ الحدیث ہیں۔ خواجہ نور الحسن شاہ صاحب کلیانوالہ اور پیر محمد باقر علی شاہ صاحب سجادہ نشین کے سلسلے میں شامل ہیں۔ شیعیت کے متعلق مولانا موصوف کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تحفہ جعفریہ پانچ جلد۔ فقہ جعفریہ چار جلد۔ عقائد جعفریہ چار جلد۔ دشمنان امیر معاویہؓ کا علمی محاسبہ دو جلد اور زیر نظر کتاب میزان الکتب جس کے شروع میں "الاھداء" کے تحت لکھتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کا آغاز مولانا فضل الرحمٰن صاحب خلف الرشید مولانا ضیاء الدین صاحب مدنی خلیفۂ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی کی دعا سے کیا ہے یہ تمام کتب مؤلف کے مدرسہ سے مل سکتی ہیں۔)

۲۲

کتاب بست و دوم

تاریخ الطبری مصنفہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری

از مولانا محمد علی شیخ الحدیث جامعہ رسولیہ

تاریخ طبری تصنیف ابوجعفر محمد بن جریر طبری بھی ایسے مواد پر مشتمل ہے۔ جو اہل سنت کے معتقدات کے خلاف ہیں۔ انہیں باتوں کو کچھ ناسمجھ شیعہ پیش کر کے عوام اہل سنت کو گمراہ کرنے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

تاریخ آئمہ:

آنحضرت کے انتقال کے بعد جن لوگوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت سے انکار کیا۔ وہ جناب سیدہ کے گھر پر تھے۔ تو حضرت ابوبکر نے حضرت عمر رض کو بھیجا۔ کہ جو لوگ خانۂ سیدہ میں ہیں۔ ان کو وہاں نہ رہنے دیں۔ اور وہ نکلنے سے انکار کریں تو بروز شمشیر وہاں سے نکالیں۔ اس پر حضرت عمر رض آگ لکڑی لے کر وہاں اس قصد سے پہنچے۔ کہ گھر میں آگ لگا دیں۔ یہ سن کر جناب سیدہ نے کہا۔ اے پسر خطاب کیا تو میرا گھر جلانے آیا ہے۔؟ حضرت نے کہا بے شک اسی ارادے سے آیا ہوں۔ ورنہ جو لوگ اس گھر میں ہیں۔ وہ سب چل کر ابوبکر کی بیعت کریں دوسری روایت میں ہے۔ کہ جب حضرت عمر رض نے گھر میں آگ لگانے کی قسم کھائی تو لوگوں نے کہا کہ اس گھر میں تو فاطمہ بھی ہیں۔ حضرت عمر رض نے کہا ہوا کریں۔ (تاریخ طبری جلد سوم ص ۱۹۸)

(تاریخ ائمہ مصنفہ سید علی حیدر نقوی ص ۱۵۱ تا ۱۵۲)

نوٹ: یہ عبارات اور ایسی ہی دوسری عبارات سے اہل تشیع یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ کہ ہمارا

مسلک صحیح ہے۔ کیونکہ خود سنیوں کی کتابوں میں ایسی کئی شہادتیں موجود ہیں۔ کہ ابوبکر اور عمر فاروق، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دشمن تھے۔ اور بنتِ رسول کی دشمنی دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی ہے۔ لہٰذا دشمنانِ رسول و آلِ رسول منصب خلافت کے مستحق کیونکر ہو سکتے ہیں۔

جواب:

"تاریخ طبری" کے مصنف محمد بن جریر طبری کا مختصر سوانحی خاکہ پہلے پیشِ خدمت ہے۔

ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب ۲۲۴ھ میں طبرستان کے شہر آمل میں پیدا ہوئے۔ آمل شہر کی نسبت سے آملی بھی کہلائے۔ اور طبرستان کی طرف نسبت سے طبری بھی کہلائے۔ دونوں میں سے مشہور "طبری" ہے۔ علم و فضل میں اپنے وقت کے بے مثل شخص تھے۔ اور مسلمان علماء میں ان کا بہت اونچا مقام تھا۔ اہل سنت اور اہل تشیع کی کتابوں میں انہیں "اہل سنت کا امام" لکھا گیا ہے لیکن ان کے بارے میں بعض حضرات اس بات کے قائل ہیں۔ کہ ان میں تشیع پایا جاتا تھا۔ ان قائلین کے چند دلائل ملاحظہ ہوں۔

دلیل اوّل

ابن جریر طبری میں تشیع تھا۔ دلائل ملاحظہ ہوں

ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا، جو شیعیت میں غلو رکھتا تھا۔ ان کا حقیقی بھانجا ابوبکر محمد بن عباس خوارزمی جو ایک بلند پایہ ادیب اور ہجو گو شاعر تھا۔ غالی رافضی تھا۔ اس کا باپ علاقہ خیوا کے مقام خوارزم کا رہنے والا تھا۔ اور ماں مؤرخ طبری کی بہن جریر کے گھرانے کی تھی۔

وَهُوَ ابْنُ اُخْتِ اَبِیْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ جَرِیْرِ الطَّبَرِی

صاحب تاریخ (ابن خلکان ص ۴۰۰) اس نے اپنے ننہال میں پرورش پائی۔ اور آخر بن بویہ ایسے نامی غالی شیعہ امراء کی سرپرستی میں رہا۔ وہ اپنے ماموں (ابن جریر طبری) کے رافضی مسلک ہونے کا اظہار درج ذیل اشعار میں فخریہ بیان کرتا ہے یہی اشعار شیخ عباس قمی نے اپنی کتاب الکنیٰ والالقاب

میں بھی درج کیے ہیں۔

الکنی والالقاب :

بِآمُلَ مَوْلِدِیْ وَبَنُوْ جَرِیْرٍ
فَاَخْوَالِیْ وَیَحْکِیْ الْمَرْءُ خَالَہٗ
فَہَا اَنَا رَافِضِیٌّ عَنْ تُرَاثٍ
وَغَیْرِیْ رَافِضِیٌّ عَنْ کَلَالَہٖ

(الکنی والالقاب جلد اول ص ۲۲ مطبوعہ تہران طبع جدید بحث ابو بکر)

ترجمہ : مقام آمل میری جائے پیدائش ہے۔ اور جریر کے بیٹے میرے ماموں ہیں۔ اور آدمی اپنے ماموؤں کے مشابہ ہوتا ہے۔ ہاں ہاں میں جدی پشتی شیعہ ہوں۔ اور میرے سوا شیعہ کہلانے والا جدی پشتی نہیں بلکہ دور کا شیعہ ہے۔

دلیل دوم

ابن جریر اپنی تصنیف تاریخ الامم والملوک (المعروف تاریخ طبری) میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یوں کہتا ہے۔

تاریخ طبری :-

كَانَ جَعْفَرُ بْنُ ابى سفيان مِمَّنْ ثَبَتَ يَوْمَ حُنَيْنٍ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وسلم مِنْ اَصْحَابِهٖ وَلَمْ يَزَلْ مَعَ اَبِيْهِ مُلاَزِمًا لِرَسُوْلِ اللهِ حَتّٰى قُبِضَ وَتُوُفِّيَ جَعْفَرُ فِيْ وَسَطِ خِلاَفَةِ مُعَاوِيَةَ لَعَنَهُ اللهُ -

(تاریخ طبری جلد ۱۳ ص ۲۴ ذکر من مات او قتل سنہ ۸۰ مطبوعہ بیروت)

ترجمہ :-

جعفر بن ابی سفیان ان صحابہ کرام میں سے ایک ہیں - جو غزوہ حنین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے - اور زندگی بھر یہ اپنے والد ابوسفیان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر رہے - یہ جعفر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے درمیان میں فوت ہوئے

تاریخ طبری :-

وَقَدْ روٰى نَوْفَل بن معاويه عن النبى صلى الله عليه وسلم وَتُوُفِّيَ نَوْفَل بالمدينة فِيْ خِلاَفَةِ يَزِيْد بن معاويه لعنهما الله

ترجمہ :

نوفل بن معاویہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث کی ہے اور یہ نوفل مدینہ منورہ میں یزید بن معاویہ (ان دونوں پر لعنت ہو) کی خلافت کے دوران فوت ہوا - (تاریخ طبری جلد ۱۳ ص ۲۸)

نوٹ : ان دونوں حوالہ جات میں ابن جریر طبری نے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر

لعنت بھیجی۔ اور یہ فعل یا عقیدہ کسی سنی کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس فعل کی وجہ سے بھی اس کی شیعیت ثابت ہوتی ہے۔

دلیل سوم

البدایہ والنہایہ:- ابن جریر طبری کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا۔

ابو جعفر بن جریر الطبری...... وَقَدْ كَانَتْ وَفَاتُهُ وَقْتَ الْمَغْرِبِ عَشِيَّةَ يَوْمِ الْاَحَدِ لِيَوْمَيْنِ بَقِيَا مِنْ شَوَّالٍ مِنْ سَنَةِ عَشَرٍ وَثَلٰثَمِائَةٍ وَقَدْ جَاوَزَ الثَّمَانِيْنَ بِخَمْسِ سِنِيْنَ اَوْ سِتِّ سِنِيْنَ وَفِيْ شَعْرِ رَاْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ سَوَادٌ كَثِيْرٌ وَدُفِنَ فِيْ دَارِهٖ لِاَنَّ بَعْضَ عَوَامِّ الْحَنَابِلَةِ وَرُعَاعِهِمْ مَنَعُوْا مِنْ دَفْنِهٖ نَهَارًا وَنَسَبُوْهُ اِلَى الرِّفْضِ.......... وَلَمَّا تُوُفِّيَ اِجْتَمَعَ النَّاسُ مِنْ سَائِرِ الْاَقْطَارِ بَغْدَادَ وَصَلُّوْا عَلَيْهِ بِدَارِهٖ دُفِنَ بِهَا...

ترجمہ: ابوجعفر جریر طبری کی وفات بوقت مغرب ہفتہ کے دن ہوئی جبکہ ۳۱۰ ہجری مکمل ہونے کو صرف دو دن باقی تھے۔ بوقت انتقال ابن جریر کی عمر پچاسی یا چھیاسی برس تھی۔ اور اس کے سر اور داڑھی کے بال اکثر سیاہ تھے۔ اپنے گھر میں ہی دفن کیے گئے کیونکہ کچھ حنبلی حضرات نے دن کے وقت انہیں دفن کرنے سے روک دیا تھا۔ اور انہیں رافضیوں کی طرف منسوب کیا تھا...... جب فوت ہوئے۔ تو تمام اطراف کے لوگ بغداد جمع ہو گئے۔ اور اسی گھر میں ان کی نماز جنازہ پڑھی جس میں انہیں دفن کیا گیا تھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۱۴۶-۱۴۷ مطبوعہ بیروت)

دلیل چہارم

تذکرۃ الحفاظ:

حدیث خم غدیر جو کہ اہل تشیع کے ہاں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولائت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس حدیث کو ابن جریر نے کئی طریقوں سے صحیح ثابت کیا ہے۔ چونکہ اس کی صحت شیعیت کی تقویت ہے۔ لہٰذا اس وجہ بھی ابن جریر کے تشیع ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام ذہبی "تذکرۃ الحفاظ" میں رقم طراز ہیں۔

تذکرۃ الحفاظ:

وَلَمَّا بَلَغَهُ اِنَّ ابْنَ اَبِیْ دَاؤد تَکَلَّمَ فِیْ حَدِیْثِ غَدِیْرِ خُمٍّ عَمِلَ کِتَابَ الْفَضَائِلِ وَتَکَلَّمَ عَلٰی تَصْحِیْحِ الْحَدِیْثِ قُلْتُ رَاَیْتُ مُجَلَّدًا مِنْ طُرُقِ الْحَدِیْثِ لِابْنِ جَرِیْرٍ فَانْدَهَشْتُ لَهٗ وَلِکَثْرَةِ تِلْکَ الطُّرُقِ۔

(تذکرۃ الحفاظ جلد دوم ص ۷۱۲ مطبوعہ بیروت طبع جدید)

ترجمہ: جب ابن جریر کو یہ علم ہوا کہ ابن ابی داؤد نے غدیر خم کی حدیث پر اعتراض کیا ہے۔ تو اس نے اس کی تردید اور حدیث کی صحت کے موضوع پر کتاب الفضائل لکھی۔ میں (ذہبی) نے ابن جریر کی مذکور کتاب کی ایک جلد دیکھی ہے۔ میں اسے پڑھ کر حیران ہو گیا۔ اور اس کے کثرت طرق نے مجھے ششدر کر دیا۔

نوٹ:۔ ابن جریر کی ایک کتاب الخصائص نامی کا تذکرہ الذریعہ جلد ۷ ص ۱۶۳ پر بھی ہے جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل پر لکھی گئی ہے۔

دلیل پنجم

لسان المیزان:

اَحْمَدُ بْنُ عَلِیِّ السُّلَیْمَانِیُّ الحَافِظُ فَقَالَ کَانَ یَضَعُ لِلرَّوَافِضِ۔

(لسان المیزان جلد پنجم ص ۱۰۰ مطبوعہ بیروت)

(میزان الاعتدال جلد سوم ص ۳۵)

ترجمہ: حافظ احمد بن علی سلیمانی کہتے ہیں۔ کہ ابن جریر رافضیوں کے لیے حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔

دلیل ششم

البدایۃ والنہایہ:۔

اِنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ بِجَوَازِ مَسْحِ الْقَدَمَیْنِ فِی الْوُضُوْءِ وَاِنَّہٗ لَا یُوْجِبُ غَسْلَہُمَا وَقَدْ اِشْتَہَرَ عَنْہُ ہٰذَا۔

(البدایۃ والنہایۃ جلد ۱۱ ص ۴۷ مطبوعہ بیروت)

ترجمہ: ابن جریر وضو کے دوران پاؤں کے مسح کا قول کیا کرتا تھا اور ان کا دھونا واجب نہیں سمجھتا تھا۔ اور یہ بات اس کی بہت مشہور تھی۔

تفسیر طبری:۔

عَنْ عِکْرَمَۃَ قَالَ لَیْسَ عَلَی الرِّجْلَیْنِ غَسْلٌ اِنَّمَا نَزَلَ فِیْہِمَا الْمَسْحُ۔ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ قَالَ اِمْسَحْ عَلٰی رَأْسِكَ وَقَدَمَیْكَ ...... وَالصَّوَابُ مِنَ الْقَوْلِ عِنْدَنَا فِیْ ذَالِكَ اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَ بِعُمُوْمِ مَسْحِ الرِّجْلَیْنِ بِالْمَاءِ فِی الْوُضُوْءِ کَمَا اَمَرَ

بِعُمُومِ مَسْحِ الْوَجْهِ بِالتُّرَابِ فِي التَّيَمُّمِ

(تفسیر طبری جلد ۵ ص ۸۲-۸۳ مطبوعہ بیروت)

ترجمہ: حضرت عکرمہ سے روایت ہے۔ کہ پاؤں کا دوران وضو دھونے کا حکم نہیں بلکہ ان کا مسح کرنا نازل ہوا ہے۔ امام ابوجعفر کہتے ہیں۔ کہ اپنے سر اور دونوں قدموں پر مسح کیا کرو۔ ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے۔ کہ پاؤں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے عام مسح کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس طرح تیمم میں چہرہ کے عموم کا مسح کو نافرمایا ہے۔

نوٹ: شیعہ سنی فقہ کے مابین مختلف مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے۔ کہ اہل سنت وضوء کے دوران پاؤں کے دھونے کے قائل ہیں۔ اور اہل تشیع ان پر مسح کے قائل۔ ابن جریر نے شیعہ مسلک کو صواب قرار دے کر اپنی شیعیت بیان کردی۔

دلیل ہفتم

ابن جریر کی تاریخ الامم والملوک بہت مشہور تصنیف ہے۔ اس کتاب کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ ابومخنف لوط بن یحییٰ سے مروی ہے۔ گزشتہ اوراق میں کتاب یازدہم کے عنوان کے تحت ہم مقتل ابی مخنف کی روشنی میں اس کا امامی شیعی ہونا ثابت کرچکے ہیں۔ علاوہ ازیں ابن جریر نے وہ روایات جو اہل سنت کے عقائد کے مخالف ہیں۔ انہیں واقدی سے بھی روایت کیا ہے۔ واقدی یعنی محمد بن عمر کو اگرچہ اہل سنت کی کتب اسمائے رجال میں سنی بھی لکھا گیا ہے۔ اور تنقید بھی کی گئی ہے۔ یہ بہت بڑا کذاب ہے۔ لیکن کتب شیعہ میں اسے تقیہ باز شیعہ کہا گیا ہے۔ اہل سنت تو بس ظاہر پر چلتے ہیں۔ لیکن گھر کے بھیدی بخوبی جانتے ہیں۔ کہ یہ ہمارا آدمی ہے۔ اور گدھا شیر کی کھال پہن کر شیر بنا ہوا تھا۔ واقدی کو شیعہ تسلیم کرنے کا کتب شیعہ سے حوالہ ملاحظہ ہو۔

الذریعہ: قَالَ ابْنُ النَّدِيْمِ اَنَّهٗ كَانَ يَتَشَيَّعُ حَسَنَ الْمَذْهَبِ يَلْزِمُ التَّقِيَّةَ۔ (الذریعہ جلد ۱۶ ص ۱۲۰)

ترجمہ: ابن ندیم نے کہا۔ کہ واقدی مذہب شیعہ رکھتا تھا۔ اور وہ اس میں اچھے مذہب پر تھا۔ اور اپنے لیے تقیہ لازم کیے ہوئے تھا۔

الکنی و الالقاب:

وَقَالَ ابْنُ النَّدِيْمِ اِنَّ الْوَاقِدِی كَانَ يَتَشَيَّعُ حُسْنَ الْمَذْهَبِ يَلْزِمُ التَّقِيَّةَ وَهُوَ الَّذِی رَوٰی اَنَّ عَلِيًّا عَلَيْهِ السَّلَام كَانَ مِنْ مُعْجِزَاتِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰه عليه وسلم كَالْعَصَا لِمُوْسٰی عليه السّلام وَاِحْيَاءِ الْمَوْتٰی لِعِيْسٰی بْنَ مَرْيَمَ عليه السّلام وَغَيْرِ ذَالِكَ مِنَ الْاَخْبَار۔ (الکنی و الالقاب جلد سوم ص ۲۸۰ تذکرۃ الواقدی)

ترجمہ: ابن ندیم نے کہا۔ کہ واقدی مذہب شیعہ میں بہت اچھا تھا۔ اور تقیہ کا خوگر تھا۔ یہ وہی ہے۔ کہ جس نے روایت کی۔ کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے تھے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے عصا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مردے زندہ کرنا۔ وغیر ذالک۔

تاریخ طبری:

قال محمد وحدثنی عبد اللّٰه بن موسٰی المخزومی قَالَ لَمَّا قُتِلَ عُثْمَانُ رضی اللّٰه عنه اَرَادُوْا حَزَّ رَاْسِهٖ فَوَقَعَتْ عَلَيْهِ نَائِلَةُ وَاُمُّ الْبَنِيْنَ فَمَنَعَتْهُمْ وَصَحْنَ وَضَرَبْنَ الْوُجُوْهَ وَخَرَقْنَ ثِيَابَهُنَّ۔ (تاریخ طبری ۳۵ھ جلد ۵ ص ۱۴۴)

ترجمہ: کہا محمد (واقدی) نے مجھے عبد اللہ بن موسےٰ مخزومی نے روایت بیان کی۔ کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ اور قاتلوں نے

آپ کا سرِ انور جدا کرنے کی کوشش کی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیویاں نائلہ اور ام البنین آپ پر گر پڑیں۔ اور ان کو اس سے روک دیا۔ اور خوب چیخیں چلائیں۔ اور اپنے چہرے پیٹے۔ اور کپڑے بھی پھاڑے۔

تاریخ طبری:۔

قَالَ اَبُوْ مخنف فَحَدَّثَنِیْ ابو زهیر العبسی عن قرة بن قیس التمیمی قَالَ نَظَرْتُ اِلٰی تِلْكَ النِّسْوَةِ لَمَّا مَرَرْنَ بِحُسَیْنٍ وَ اَهْلِهٖ وَ وَلَدِهٖ صَحْنَ وَ لَطَمْنَ وُجُوْهَهُنَّ قَالَ فَاعْتَرَضْتُهُنَّ عَلٰی فَرَسٍ فَمَا رَاَیْتُ مَنْظَرًا مِنْ نِسْوَةٍ قَطُّ كَانَ اَحْسَنَ مِنْ مَنْظَرٍ رَاَیْتُهٗ مِنْهُنَّ ذَالِكَ۔ (تاریخ طبری جلد ششم ص ۲۶۲ ۶۱ھ)

ترجمہ: ابو مخنف نے کہا۔ مجھے ابو زہیر عبسی نے قرہ بن قیس تمیمی سے روایت بیان کی۔ کہ میں نے ان عورتوں کو دیکھا۔ جو امام حسین رضی اللہ عنہ کی نعش کے قریب سے گزریں۔ ان کے اہل اور ان کی اولاد کے پاس سے گزریں۔ تو چیخیں اور اپنے چہروں کو پیٹا۔ راوی کہتا ہے۔ کہ میں جب گھوڑے پر سوار ان کے پاس آیا۔ تو ان عورتوں کا ایسا منظر دیکھا جیسا کہ زندگی بھر میں نے نہ دیکھا۔

نوٹ: مذکورہ دونوں روایات ثبوت ماتم اور کپڑے پھاڑنے پر دلالت کرتی ہیں۔ ان دونوں میں اول الذکر کا راوی "واقدی" اور مؤخر الذکر کا راوی "ابو مخنف" ہے۔ یہ دونوں مسلک و مذہب کے اعتبار سے امامی شیعہ ہیں۔ ان کا گزشتہ اوراق میں تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ ایک سنی العقیدہ شخص کو بھلا کیا ضرورت تھی۔ کہ ایک مسئلہ کے لیے روایاتِ شیعہ ذکر کرتا پھرے۔ جو اہل سنت کے نزدیک سرے سے ہی غلط ہیں

اس سے معلوم ہوا۔ کہ محمد بن جریر کا تشیع کی طرف میلان تھا۔ یہ تھیں وہ سات عدد دلیلیں جو ابن جریر کے تشیع اپنانے کے ثبوت میں تھیں۔ ان دلائل میں سے دلیل چھ پر اگرچہ امام ذہبی نے جرح کی۔ اور لکھا۔ کہ جو لوگ ابن جریر پر رافضیوں کی خاطر احادیث وضع کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ یہ ابن جریر نہیں بلکہ ایک ایسے نام کا رافضی یعنی محمد بن جریر بن رستم تھا۔ پھر علامہ ذہبی یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ رافضیوں کی خاطر ابن جریر صاحب طبری کا حدیثیں وضع کرنا یہ طعن بھی کاذب ہے۔ لہٰذا اس سے اُن کی شخصیت مطعون نہیں ہوتی۔

امام ذہبی نے ابن جریر کی صفائی میں جو کچھ فرمایا۔ وہ اس قدر مضبوط نہیں کہ اس سے بقیہ چھ دلائل بھی ختم ہو جائیں۔ حدیث خم غدیر کے بارے میں ابن جریر کا دو ضخیم جلدیں لکھ دینا۔ اور اس کی صحت ثابت کرنا۔ کیا یہ اس امر کی دلیل نہیں۔ ابن جریر حضرت علی المرتضےٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو منصوص من اللہ بواسطہ نبی کریم سمجھتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اس نے رافضیوں کو خوش کرنے کی خاطر اس حدیث کو ادھر ادھر من گھڑت طریقوں سے منسوب کر کے "صحیح" ثابت کرنے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح اگر یہ کٹر سنی تھا۔ تو ابو مخنف اور واقدی وغیرہ سے ثبوت ماتم پر روایات جمع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود اس کا حقیقی بھانجا محمد بن عباس خوارزمی قسمیہ بیان کرتا ہے۔ کہ میں اور میرا ماموں ابن جریر جدی پشتی شیعہ ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو "لعنۃ اللہ علیہ" کے الفاظ سے ذکر کرنا کس سنی کا عقیدہ ہے۔ اور بوقت مرگ حنبلی العقیدہ مسلمانوں کا انہیں قبرستان میں دفن کرنے سے روکنا آخر اس کی کیا وجہ تھی۔ اور پاؤں پر مسح کو دھونے کی بہ نسبت صحیح کہنا یہ وہ الزام ہیں۔ کہ جن سے برات ناممکن ہے۔

مختصر یہ کہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے۔ کہ ابن جریر سنی تھا۔ تو پھر اس کی وہ روایات جو اہل تشیع کے حق میں جاتی ہیں۔ وہ صرف اس ایک آدمی کی ہیں۔ اس کے خلاف دیگر تمام علمائے اہل سنت نے اُن کو تسلیم نہ کیا۔ بلکہ ان کے خلاف بکثرت روایات

ذکر فرمائیں اس بیے ایسی روایات ہم اہل سنت پر قطعاً حجت نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً ابو مخنف اور واقدی سے مروی ثبوت ماتم کی روایات اگرچہ بالفرض ابن جریر نے بھی ہوتے ہوئے ذکر کیں۔ اور دیگر سنی تصانیف میں اور عقائد میں ماتم حرام ہے۔ تو ہم ابن جریر کی اس کاوش کو کس طرح تسلیم کر لیں۔ کہ ایک یہ سچا ہے۔ اور دوسرے تمام سنی حضرات جھوٹے ہیں؟ ایسی روایات سے شیعہ تو خوش ہو سکتے ہیں۔ لیکن اہل سنت پر حجت ہرگز نہیں ہو سکتیں۔

توضیح:

قارئین کرام! یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ "طبری" نسبت والے تین آدمی مشہور ہوئے ہیں۔ اول محمد بن جریر بن رستم طبری آملی۔ اس شخص کے شیعہ ہونے میں کسی کو انکار نہیں۔ الذریعہ، الکنیٰ والالقاب، اعیان الشیعہ وغیرہ کتب میں اس کے تشیع کی تصریح موجود ہے۔ دوم محمد بن جریر بن زید طبری۔ یہ وہ ہیں۔ کہ جن کے بارے میں گزشتہ صفحات میں آپ نے پڑھا۔ تاریخ طبری کے مصنف اور تفسیر طبری کے مؤلف یہی ہیں۔ ان کا بظاہر شمار اگرچہ اہل سنت کے علماء میں ہوتا ہے۔ لیکن ان پر تشیع کا الزام دلائل کے ساتھ ہے۔ کیونکہ ایسے اختلافی مسائل جن میں اہل سنت اور اہل تشیع کا اختلاف ہے۔ ان میں ان کی کتابوں میں اہل تشیع کی طرف جھکاؤ ہے۔ اسی بنا پر ان کی تحریرات ہم اہل سنت پر حجت نہیں ہو سکتیں۔ تیسرا شخص احمد بن عبداللہ محب الدین طبری ہے۔ جس کی مشہور تصنیف ریاض النضرۃ ہے ان کے حالات فی الحال نہیں لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی ہم نے کتب اسمائے رجال میں انہیں تلاش کیا۔

آخر میں ابن جریر طبری کے بارے میں ایک ثبوت پیش خدمت ہے جس میں خود شیعہ بھی اس میں تشیع کے قائل نظر آتے ہیں:

تنقیح المقال: وَدَامَ فِیْ رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ اِثْبَاتَ کَوْنِ الرَّجُلِ

إِمَامِيًّا لَا عَامِيًّا وَاسْتَدَلَّ بِوُجُوْهٍ قَاصِرَةٍ عَنْ ذَالِكَ مِثْلَ كَوْنِهِ بِبَلْدَةٍ كَانُوْا أَقْدَمِيْ التَّشَيُّعِ خُصُوْصًا فِيْ زَمَنِ السَّلَاطِيْنِ آلِ بُوَيْه وَعَدَمِ قُبُوْلِهِ أَحَدًا مِنَ الْمَذَاهِبِ الْأَرْبَعَةِ الَّتِيْ انْحَصَرَ فِيْهَا أَهْلُ السُّنَّةِ ...... بِأَنَّهُ ذَكَرَ طُرُقَ خَبَرِ الْغَدِيْرِ وَلَا يَقَعُ لَهُ إِلَّا شِيْعِيٌّ۔ (تنقیح المقال جلد دوم ص۔ ومطبوعہ تہران طبع جدید باب میم)

ترجمہ: روضات الجنات کے مصنف نے ابن جریر کے امامی شیعی ثابت کرنے کی ٹھانی۔ اور پھر اس پر جو دلائل پیش کیے۔ وہ اس قدر مضبوط نہیں کہ ان سے اس کا شیعہ ہونا یقینی ثابت ہو جائے۔ مثلاً ایک دلیل یہ کہ ابن جریر اس شہر کا باشندہ تھا۔ جو قدیمی (جدی پشتی) شیعہ تھے۔ بالخصوص ان بادشاہوں کے دور میں جو آل بویہ کے تھے۔ دوسری دلیل یہ کہ ان مشہور چار مذاہب میں سے ایک کو بھی ابن جریر نے قبول نہ کیا۔ جن میں سنیت کا انحصار ہے۔ اور یہ بھی دلیل کہ اس نے غدیر کی حدیث کو مختلف طریقوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جو ایک شیعہ ہی کر سکتا ہے۔

نوٹ: تنقیح المقال کی عبارت سے ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے۔ کہ اہل تشیع کے نزدیک بھی ابن جریر کی شخصیت مشکوک ہے۔ کچھ با دلائل اسے اپنا کہتے ہیں۔ اور بعض دوسرے اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ ابن جریر وہ شخص ہے۔ جو شیعہ سنی دونوں کے مابین متنازع اور مشکوک شخصیت ہے۔ لہذا جو اس کی روایات مسلک شیعہ کے مطابق وموافق ہیں۔ وہ ہمیں اسی طرح قبول نہیں۔ جس طرح اس کی وہ روایات جو مسلک اہل سنت کی مؤید ہیں انہیں شیعہ تسلیم نہیں کرتے۔ وباللہ التوفیق